ہوئے تم دوست جس کے

اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ (القرآن)

ڈاکٹر حقی حق

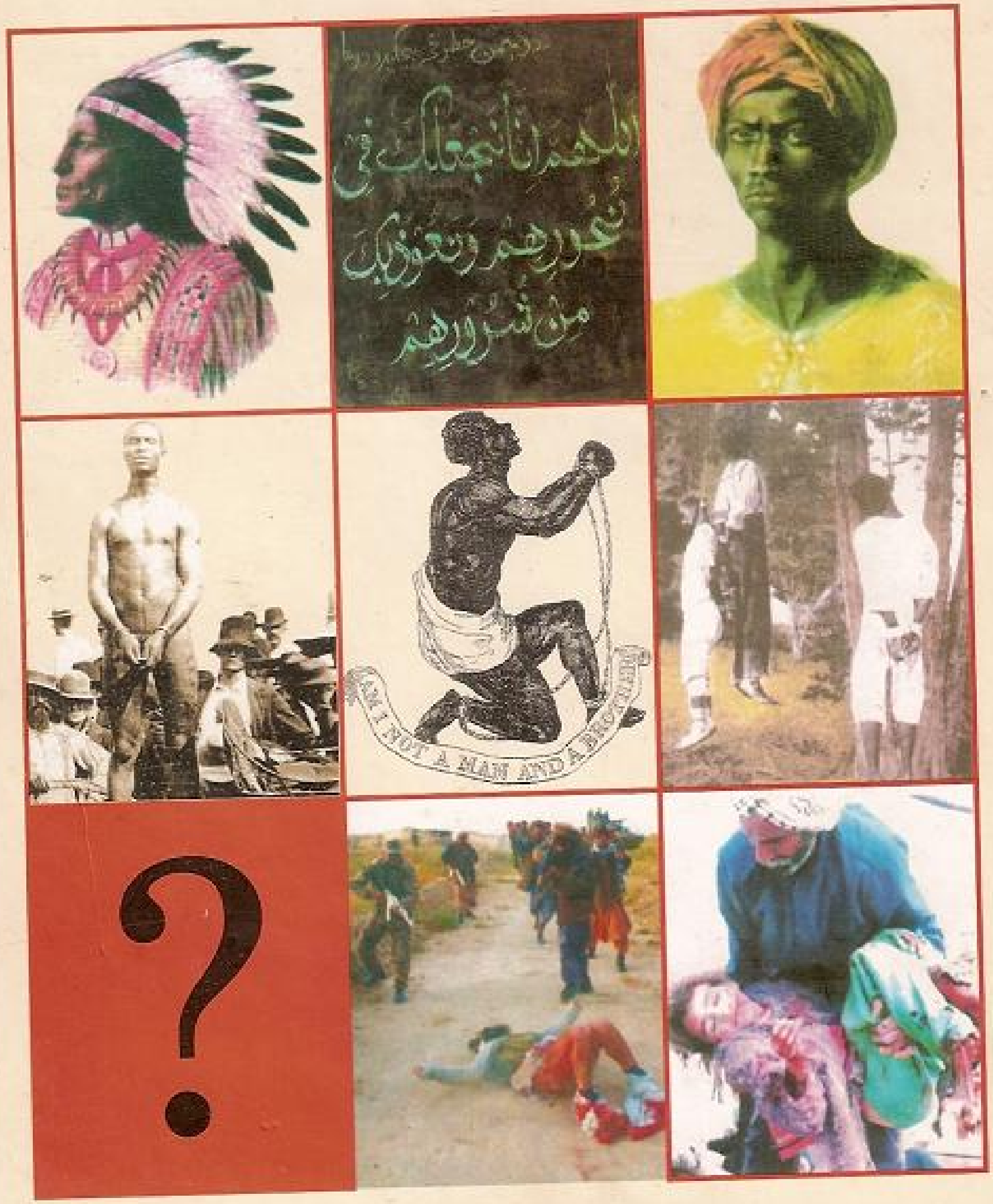
اللهم انا نجعلك في نحورهم ونعوذبك من شرورهم
AM I NOT A MAN AND A BROTHER
?

بسم الله الرحمن الرحيم

In The Name of Allah The Beneficent,
The Merciful

شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان اور نہایت رحم والا ہے

ہوئے تم دوست جس کے

اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔
(القرآن)

ڈاکٹر حقی حق

شفیق پبلیکیشنز شفیق بک سنٹر
چوک گڑھی شاہو لاہور پاکستان
Ph: 92-42-6304761 - 6370989

زبیر احمد
نے
شفیق پبلیکیشنز سے
شائع کی

جملہ حقوق بحق اقبال فاطمہ محفوظ ہیں۔
اس کتاب سے کسی بھی طرح کا مواد استعمال کرنے کے لیے
پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔

اشاعت دوم: مئی 2007ء
سرورق : آمنہ حق
کمپوزنگ : بابر جاوید
قیمت : -/500 روپے
امریکہ 15 ڈالر
برطانیہ 10 پونڈ

ISBN 969-8443-21-5

جہانگیر بک ڈپو
آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔ فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319
تقسیم کنندہ: سیلز ڈپو لاہور: اردو بازار، فون: 042-7220879
سیلز ڈپو کراچی: اردو بازار۔ فون: 021-2765086
سیلز ڈپو راولپنڈی: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک۔ فون: 051-5539609
سیلز ڈپو ملتان: اندرون بوہڑ گیٹ۔ فون: 061-4781781
سیلز ڈپو فیصل آباد: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار۔ فون: 041-2627568

جہانگیر بکس

Web Site:http://www.jbdpress.com E-mail:info@jbdpress.com

Huway Tum Dost Jis Kay

Dr. Haqqui Haq

Shafiq Publications
Shafiq Book Center
Chowk Garhi Shahu, Lahore, Pakistan
Ph: 92-42-6304761-6370989

STOCKISTS ABROAD:

KITAB GHAR

6403,North Oakley Chicago, IL 60659 U.S.A.
Tel: (773) 743-6005 Fax: (773) 743-6016

MANSOOR BOOK SHOP

70-64 Broadway Jackson Heights, New York N.Y. 11372 U.S.A.
Ph: (718) 446-9554
Email: mansoorbooksshop.com

MUSLIM PRINTERS & BOOK SELLER

432 Stratfor Road, Spark Hill, Birmingham B11 4LB U.K.
Tel: 01 21 773-8301 Fax: 01 21 773-1735
Email: islamicinfo/btclick.com

ROLEX BOOKS

81-83 Wilmslow Road, Rusholme, Manchester M14 5SU U.K.
Tel: (0161) 225-4448 Fax: (0161) 225- 4884
Email: rolexbooks@iname.come

NAWA-E-TOKYO PUBLICATION

Boeki Building 2nd Floor, 6-13-1 Aoyagi, Soka-Shi
Satiama-Ken 340-00022 JAPAN
Tel: (0489) 33-0081 Fax: (0489) 36-7029
Email: nawaetokyo@gol.com

MALIK NEWS AGENCY

P.O.Box 5449 Dubai, U.A.E.
Tel:(4) 223-2241 & (4) 222-5652 Fax: (4) 222-5035
Email: mnews@emirates.net.ae

ICNA BOOK SERVICE

100 McLevin Avenue, Unit 3A,
Scarborough, on MIB 1H5 CANADA
Tel: (416) 609-2452 Fax: (416) 2922-2437
Email: icnabook@canada.com

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

(غالب)

قرینہ

سحر سے نوحہ گری رہی	17
یا اللہ لگا نہ ہو	43
دستاویزاتِ رستاخیز	97
مہر سرِ محضر	137
جوع الارض جاہ	146
الامان الحفیظ	174
صفِ مشقِ ستم	189
اے روزگار کیوں تیری گردش نہ تھم گئی	215
سر جادہ گریہ	225
تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے	239
فریب کاری شب	245
حال بد حال	291
پھر حشر کے سامان ہوئے ایوان ہوس میں	303
وہ کون تھے وہ کہاں گئے	372
منتظرِ تیغِ جفا	447
حوالہ جات	451

مجھے ہے حکمِ اذاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

پیش گفتار

امریکہ مُسلمانوں کے حق میں سورۃ النصر کی نوید نہیں بلکہ سورۃ الرعد کا تسلسل ہے۔

تاریخ سے منہ موڑے رکھنے کے المیوں میں یہ المیہ بھی شامل ہے کہ ہم امریکہ کو فاتحینِ اُندلس کی باقیات کے حوالے سے دیکھنے میں ناکام رہے ہیں۔ ہسپانیہ میں جن ہاتھوں نے تیس لاکھ مسلمانوں کو بپتسما عیسائیت کے نام پر قتل کیا تھا، اب وہی ہاتھ بپتسما جمہوریت کے نام پر کئی تیس لاکھ مسلمانوں کے خونِ ناحق سے رنگے ہیں۔ بپتسما عیسائیت سے بپتسما جمہوریت تک ہم ایک ہی نظریے، ایک ہی عفریت اور ایک ہی ہاتھ سے قتل ہوئے ہیں۔ بپتسما اول (عیسائیت) سن 1502ء سے بپتسما ثانی (جمہوریت) سن 2006ء تک ہمارا قاتل ایک ہی رہا ہے۔

ہوئے تم دوست جس کے' اسی دستِ سفاک کی تلاش کا سفر ہے۔

سقوطِ غرناطہ ہمارے لیے اپنی نوعیت میں سقوط سے زیادہ تسلسل اور اُندلس سے بڑھ کر مریکہ ثابت ہوا کہ اُندلس کے بعد بھی ہماری شہ رگ پھر اسی عفریت کے خونی جبڑوں میں ہے جسے ہسپانیہ میں ہم اپنے جُرمِ ضعیفی کا خراج پانچ صدیاں پہلے بھی دے چکے ہیں۔ ان پانچ صدیوں میں نہ تو مصلحتِ شام میں کمی آئی، نہ ہمارے کوفہ نفاق میں قرار آیا۔ نہ جُرمِ ضعیفی کٹا، نہ مرگِ مفاجات تھمی۔

یہ کتاب تین حصوں، دو سقوط، ایک پڑاؤ اور ڈھیر ساری بھیم الحالی کے درمیان نظریاتی تسلسل کی تلاش اور یکسانیت کی نشان دہی پر مبنی ہے۔ یہ سقوطِ اُندلس اور امریکہ کی تاریخ سے زیدہ اُمّہ اور امریکہ کا مقدمہ ہے، ایسا مقدمہ جس کا فیصلہ ہنوز باقی ہے۔

ہمارا مرنا دونوں طرح سے طے ہے۔

ہم جن کے ساتھ ہیں وہ ہم سے اس ساتھ کی قیمت لگائے بیٹھے ہیں، اور اس ساتھ میں

ہم جن کے خلاف ہو گئے ہیں وہ ہم سے مخالفت کا معاوضہ مانگتے ہیں۔ تاریخ کہتی ہے کہ ہمیں ہر دونوں کو یہ ادائیگی سروں کی جنس میں کرنا ہو گی۔ عندالطلب فصلِ سر کٹے گی تو یہ ادا ہو گی، اور قرائن کہتے ہیں کہ بالآخر یہ معرکہ، یہ آخری جنگ اسی سرزمینِ پاک میں تمام ہو گی جو ایک اور سقوط سے پہلے سقیم کے منطقی مدارج میں سرگرداں ہے۔ آلِ ازابیلا اور اولادِ فرڈی عینڈ کا اسلام دشمنی میں راسخ ہونا عین فطری، تاریخی، روایتی اور منطقی طرزِ عمل ہے۔ اسی طرزِ عمل کی کھوج ہمیں پانچ صدیاں پیچھے دو جنوری 1492ء کی صبح تک لے گئی جہاں سقوطِ غرناطہ کا المیہ وقوع پذیر ہو رہا تھا۔

ہمیں حیرانی ہوئی کہ یہ کبھی بھی ہمارے ساتھ نہیں تھے۔

نوم چومسکی لکھتے ہیں کہ ''مماثل تاریخی واقعات کا جائزہ لیں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ان میں مماثلت تھی یا یہ ایک دوسرے سے مختلف تھے، تو اس کا جواب ہمیشہ ہاں یا ناں، دونوں میں ہو گا''۔ نوم چومسکی کے اس نظریے کی کسوٹی پر اگر ہم ملکہ ازابیلا سے شروع ہونے والی اسلام دشمنی اور عیسائی انتہا پسندی کو امریکی حکومتوں تک پھیل جانے والی اسلام دشمنی کے پس منظر میں پرکھیں تو اس میں 'ناں' والی کوئی بات نہیں۔ اس طرف ہاں ہی ہاں ہے، یکسانیت ہی یکسانیت، مماثلت ہی مماثلت۔ اسی طرح جب ہم سقوطِ غرناطہ کے موقع پر مسلمان اور عیسائی حکمرانوں کے درمیان خفیہ عہد و پیمان، صدقے واری اور کیفیتِ یک جان دو قالب کا موجودہ مسلمان حکمرانوں اور امریکی حکمرانوں کے بیچ یک جہتی، بھائی چارے اور خفیہ ایجنڈے سے موازنہ کرتے ہیں تو اِدھر سے بھی ہمارا سر کاٹنے پر ''جناب آہستہ آہستہ''...... کا پیغام بھیجا جاتا ہے۔ اس طرف بھی کوئی 'ناں' کوئی اختلاف نہیں ہے۔ 'ہوئے تم دوست جس کے' میں ہماری کاوش بس اسی قدر چاہیئے کہ یہ یکساں پہلو، یہ گہری مماثلت، پہلو بہ پہلو، قدم بہ قدم آشکارا کر دی جائے کہ اصل میں دونوں ایک ہیں۔

اذان دے دی جائے تو سجدہ گزاروں کی آمد سے نااُمیدی نازیبا ہے۔

بریگیڈیئر صدیق سالک (مرحوم) 'میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے اس کتاب کو اَدب سے دُور اور تاریخ کے قریب رکھنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں تاریخی واقعات پر ادبی خول چڑھانے بیٹھ جاتا، تو خول تو شاید چمک اٹھتا، مگر حقائق ماند پڑ

> جاتے، اس لیے میں نے ساری رُوداد سیدھے سادے انداز میں رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کہیں کہیں کوئی ادبی جملہ آگیا ہے، تو اس کی حیثیت میری نظر میں اندھیری رات میں تنہا ستارے جیسی ہے جو چمکتا تو ہے، مگر اس سے تاریکی کم نہیں ہوتی"۔

یوں تو ہم کسی ادبی جملے سے تاریکی چھٹ جانے کے زعم میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے لیکن صدیق سالک کے برعکس ہم ادب کے دامن کو ہرگز اس قدر تنگ نہیں سمجھتے کہ تاریخی حقائق و واقعات قلم بند کرتے ہوئے اس پر تنگیِ داماں کی مہر ثبت کر دی جائے۔ لکھنے کی واجبی صلاحیت اپنی جگہ لیکن اس کے باوجود ہم کبھی ادب کے تنگیِ داماں پر شاکی نہیں رہے۔ ہم نے کبھی ادب سے قریب رہنے کی شعوری کوشش کی نہ تاریخ و تحقیق کو ادب سے دُور رکھنے کی۔ خول چڑھے کہ اُترے، مانڈ پڑے کہ چمکے ہم شکر گزار رہتے ہیں کہ یہ کبھی ہمارا مسئلہ نہیں رہا۔ لیکن اسلامی ناولوں، اسلامی تاریخ میں جنسی ہیجان کا پیچ لگانے، لذتِ حکایت، لقمہ حرام اور لفظوں کے مول تول سے پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔ قارئین کے لیے غالباً تاریخ اور ادب کی یک جائی تو نئی بات نہ ہو لیکن ادب، تاریخ اور تحقیق کا اکٹھ قدرے نامانوس تجربہ ہو سکتا ہے لیکن اس میں ہرج والی کوئی بات نہیں۔ تجربے تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور آواز و لفظ و بیان بھی بدلتے رہتے ہیں۔

سقوطِ غرناطہ کے المیے سے جنم لینے والا امریکی دریافت کا المیہ بھی اُمّہ کے حق میں اسی قدر المناک ثابت ہوا کہ جس قدر سقوطِ غرناطہ بذاتِ خود الم انگیز تھا۔ یہ تو عین ممکن ہے کہ میں پنی بے حیثیتی اور کم علمی کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان حیرت انگیز تعلق، تسلسل اور مماثلت و خاطر خواہ طریق سے آشکارا کرنے میں ناکام رہا ہوں۔ لیکن اس توقع پر فیصلہ آپ کے ہاتھ یتا ہوں کہ اس کوشش میں میرا اخلاص، میری تقصیر، نیت، فردِ جرم اور حوصلہ وجہ ملامت نہیں بنے گا۔

حقّی حق

27 جولائی 2006 عیسوی

شکاگو، امریکہ

email: h.haq@att.net

حرفِ سپاس

سقوط غرناطہ سے متعلق دستاویزات کے حصول میں سپین کی وزارتِ ثقافت اور جنرل آرکائیوز ڈائیریکٹوریٹ کے معاون خصوصی ہوزے میٹیوز اور غرناطہ یونیورسٹی کے ماہرین دستاویزات میگیل پیڈ روکا میں تہہ دل سے شکرگُزار ہوں کہ انہوں نے دستاویزات تک رسائی، عکسی نقول اور ترجے میں بے لوث تعاون کیا۔ مارکیوز کو رویرا آرکائیو کی منتظمہ ڈاکٹر جیسکا بنیالس نے سقوط غرناطہ کے اس خفیہ معاہدے تک رسائی اور ترجے میں مدد کی جو والئ غرناطہ امیر ابو عبداللہ (باب دل) اور ملکہ ازابیلا و بادشاہ فرڈی نینڈ کے درمیان طے ہوا تھا۔ اسی طرح انہوں نے گورنر غرناطہ ابوالقاسم عبدالملک (1487ء- 1491ء) کے تحریر کردہ کچھ خطوط کے تراجم تک رہنمائی کی۔ ڈی زافرا، آرکائیو کے میرون والڈیز نے بھی دامنِ دل وا، اور دستِ تعاون دراز رکھا۔ میڈرڈ آرکائیو (رائل پیپرز) کے منتظم آرتو رومایورگا اور بارسلونا آرکائیو کی لزوائیور کا بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مطلوبہ و اہم دستاویزات تک رسائی میں ہر ممکن تعاون کیا۔

برکلے یونیورسٹی کے پروفیسر پال شیوڈن نے معاہدہ الازرق (1245ء) کے اپنے انگریزی ترجے سے ہمیں اردو میں ترجے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اسی طرح ہارورڈ یونیورسٹی کے جیمز میکلاہن اور پال آسٹن نے اپنے تحقیقی مقالوں سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ ییل یونیورسٹی کے ماہر لسانیات (عربی طرز تحریر) علا الرئیس نے عمر ابن سعد کی عربی میں خود نوشت سوانح کے ترجے کو اردو میں ترجمہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور طارق ڈیرک بیرڈ نے عمر ابن سعد کی سوانح عمری کے عربی نسخے کی عکسی نقل اور اسے شائع کرنے کی اجازت دی۔

میسا چوسٹس ہسٹاریکل سوسائٹی نے صدر جان ایڈمز کے خطوط کی عکسی نقول عنایت

فرمائیں۔ بنگلہ دیش لبریشن وار میوزیم (بنگلہ دیش پیپرز) نے سقوط مشرقی پاکستان کی دستاویز سقوط کی عکسی نقل فراہم کی۔ آرکنساس ہسٹارک پروگرام، جم کرو میوزیم، لائبریری آف کانگریس، شکاگو کلچرل فورم، امریکن ٹیچرز ایسوسی ایشن، چانسری کلرک آفس ریکارڈز (ایڈمز کاؤنٹی)، امریکن میڈیا لائبریری، بلیک ہسٹری میوزیم ڈوسابو، یو ایس سینسس بیورو، یو ایس سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ وائٹ ہاؤس پیپرز (پبلک ریکارڈز)، ریڈ انڈینیز آرٹس اینڈ کلچرل میوزیم، یو ایس کانگریس ریکارڈز، یو ایس سپریم کورٹ ریکارڈز اور کئی دوسرے اداروں کی خدمات اور تعاون حاصل رہا۔ ڈاکٹر طیب منیر اور عطاء الحق قاسمی نے اپنی قیمتی آراء سے مستفید کیا۔ جب کہ شفیق پبلی کیشنز کے حافظ عزیز احمد اور زبیر احمد نے سرورق، تصحیح، تدوین اور ترتیب میں گرانقدر مشوروں سے نوازا، اور اشاعت کے اوّل تا آخر ہر مرحلے میں شامل حال رہے۔ میں ان سب افراد اور اداروں کا مشکور ہوں۔

انہی افراد کے اخلاص اور اداروں کے تعاون سے ہم سقوط غرناطہ سے متعلق ان اصل دستاویزات کو مع اردو ترجمے کے پیش کرنے کے قابل ہو سکے جو پہلی بار منظر عام پر لائی جا رہی ہیں۔

حقّی حق

25 نومبر 1491ء کو قصرِ الحمرا میں آخری بار فجر کی اذان کے ساتھ ہی والئی غرناطہ امیر ابوعبداللہ (باب دل) کے گھرانے کی خواتین وادی بشارہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ حسبِ حکم الحمرا سے روانگی ان خواتین پر قیامت کی گھڑی تھی۔ وہ روتی جاتی تھیں۔ ان کی آہ و فغاں سے الحمراء کے در و دیوار کانپتے تھے اور گریہ و زاری سے بشارہ گونجتی تھی۔ سقوط کی صبح جو آہ و بکا شروع ہوئی تھی پانچ صدیوں سے زیادہ پر پھیل گئی۔ یہ تھمنے میں ہی نہیں آتی۔ اُمہ کے نزار بطن پر پرانے زخم بھرتے بھی نہیں ہیں کہ نئے آجاتے ہیں۔ ایک اور پھٹ‘ ایک اور گہرا شگاف۔ سقوط کی گھٹی لگی ستم آمادہ سحر ہمیں یوں لاحق ہوئی کہ سالہا سال سے ہم نمناک دیکھتے ہیں اور صدی در صدی گریہ زار جیتے ہیں۔

ہمیں تو سحر سے نوحہ گری رہی۔

سحر سے نوحہ گری رہی

مسلم امہ پر ایک سال سیاہ و خون آشام ایسا بھی آیا جو اپنی سیاہ بختی میں پانچ صدیوں پر اور خون آشامی میں اس سے بھی زیادہ پر پھیل گیا اس نا مبارک و نحس سال کے اثرات نے ہمہ وقت پُر امید مسلمانوں کو نوحہ گروں میں اور نتائج نے مرثیہ خوانوں میں بدل دیا۔ ہم پانچ صدیوں کا ماتم چھ صدیوں سے منا رہے ہیں نہ ہمارا ماتم ہی کٹتا ہے نہ ہی بختی۔ ماتم زدگی کی ان طویل چھ صدیوں میں نہ ہی ہمارے کسی نخل پر بار آیا' نہ مسافت کٹی نہ گردش تھمی۔ مسلم اُمہ مسلسل بھنور کی آنکھ میں اور مستقلاً خون آشامی کی زد میں ہے۔

یہ سال اپنے جلو میں خون ہی خون' ذلت و ہزیمت' بے آبروئی اور بے چارگی' تباہی و بربادی اور آزمائشیں ہی آزمائشیں لے کر آیا۔ آزمائش ایسی کڑی کہ لَا اِلٰہ اِلا للّٰہ محمد رسول اللّٰہ سے دست بردار ہو جاؤ تو جان کی امان پاؤ' ذلت ایسی کہ راہ چلتے لوگ مسلمانوں کو عیسائی ہو جانے پر مبارک باد دیتے تھے۔ بے آبروئی ایسی کہ زمین شق ہو کہ آسمان ٹوٹے' مسلمان صالح عورتیں جو اپنے نامحرموں سے بھی فاصلے اور پردے میں رہی تھیں برہنہ سر و بے ردا' ننگے پاؤں اور نیم برہنہ اپنی شرم گاہوں پر ہاتھ رکھے غرناطہ کے گلی کوچوں میں پناہ کی تلاش میں بے سمت بھاگتی پھرتی تھیں اور ان کے پیچھے پیچھے مدہوش عیسائی لشکری اپنے گھوڑے دوڑاتے تھے جب وہ بھاگتی ہوئی ان سراسیمہ و بدنصیب عورتوں کے سروں پر پہنچ جاتے تو منہ بھر بھر کے ان پر شراب کی کلیاں کرنے لگتے۔ یہ امیر ابو عبداللہ کی کم ہمتی کی دلیل تھی یا غیرت ایمانی کی کمی کا شاخسانہ کہ غرناطہ اور اس کے قرب و جوار میں 35 ہزار اسلامی سپاہ کی موجودگی کے باوجود وہ سقوط پر آمادہ ہو چکا تھا۔

1۔(اردنگ واشنگٹن: 1850)

قریب پانچ صدیوں بعد ہمیں ایک اور امیر عبداللہ مل گئے ۔ مشرقی پاکستان میں امیر عبداللہ خان نیازی کے پاس بھی اسلامی سپاہ تو وافر تھی لیکن ان کی شجاعت، تقویٰ اور غیرت ایمانی بھی اپنے نام کی طرح امیر ابوعبداللہ فرماں روا غرناطہ کے ہم پلہ ہی نکلی انہوں نے نوے ہزار سے زیادہ لشکریوں کے ہونے کے باوجود ابوعبداللہ کی یاد تازہ اور سقوط غرناطہ کے زخم ہرے کردیئے ۔

بے چارگی کا یہ عالم تھا کہ شرعی ریش سے آراستہ چہرے آہ و فغاں کرتے، روتے، سسکیاں بھرتے، آنسوؤں سے تر بتر بھیگی داڑھیوں سمیت غرناطہ کے بازاروں میں داڑھیاں کٹوانے کے انتظار میں قطار اندر قطار کھڑے رہتے ۔ بالآخر ذلت، رسوائی، بے چارگی اور خون خرابے پر تباہی و بربادی مسلط ہوگئی جو مسلمان عیسائی ہو گئے تھے انہیں عیسائی کہہ کر مارا گیا کہ یہ تو ہمارے عیسائی بھائی بند ہیں ۔ ان کے قتل پر آپ کو اعتراض کیوں اور واویلا کیا ؟ جنہوں نے استقامت دکھائی اور اپنے دین سے دست بردار نہ ہوئے انہیں دشمن کہہ کر مارا گیا ۔ مسلمانوں پر ایسا کڑا وقت پڑا تھا کہ وہ کسی طرح بھی محفوظ نہیں تھے ۔

آج بھی مسلمانوں پر ایسا کڑا وقت پڑا ہے کہ وہ کسی طرح بھی محفوظ نہیں ہیں ۔

سقوط اندلس اسلام پر عیسائیت کی، رواداری پر نسلی امتیاز کی اور فراخدلی پر تنگ نظری کی ایک ہزار سال میں یہ پہلی فتح تھی سو اپنی خون آشامی میں بدترین اور نتائج میں ہولناک تھی ۔ سقوط اندلس کے نتیجے میں مسلمان جس ابتلاء آزمائش، المیے اور ہزیمت سے دو چار ہوئے اس کا نوحہ لکھتے ہوئے ابوالبقاء الرندی نے اسے قیامت کی چال باندھا ۔ رندی خوش فکر اور خوش نوا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ خوش وقت بھی ثابت ہوئے کہ وہ مزید مسلمان ریاستوں، فلسطین، کشمیر، مشرقی پاکستان، افغانستان اور عراق میں مسلم امہ کا المیہ اور زبوں حالی دیکھنے سے محفوظ رہے ۔ سقوط اندلس، شاعر آزردہ اظہار کے نزدیک قیامت کی چال کے مانند تھا تو جانے چیچنیا، کشمیر، افغانستان اور عراق میں مسلمانوں کی موجودہ ابتری کو وہ کسی آفت سے منسوب کرتے :

یہ مصیبت تو قیامت کی چال کے مانند
ایسی شدید اور گہری ہے جس کے سامنے
اور تمام مشکلات ماند پڑ جاتی ہیں

بپتسما اوّل (عیسائیت) 1502

بحکم ملکہ ازابیلا عیسائی ہو جاؤ یا سپین سے جاؤ

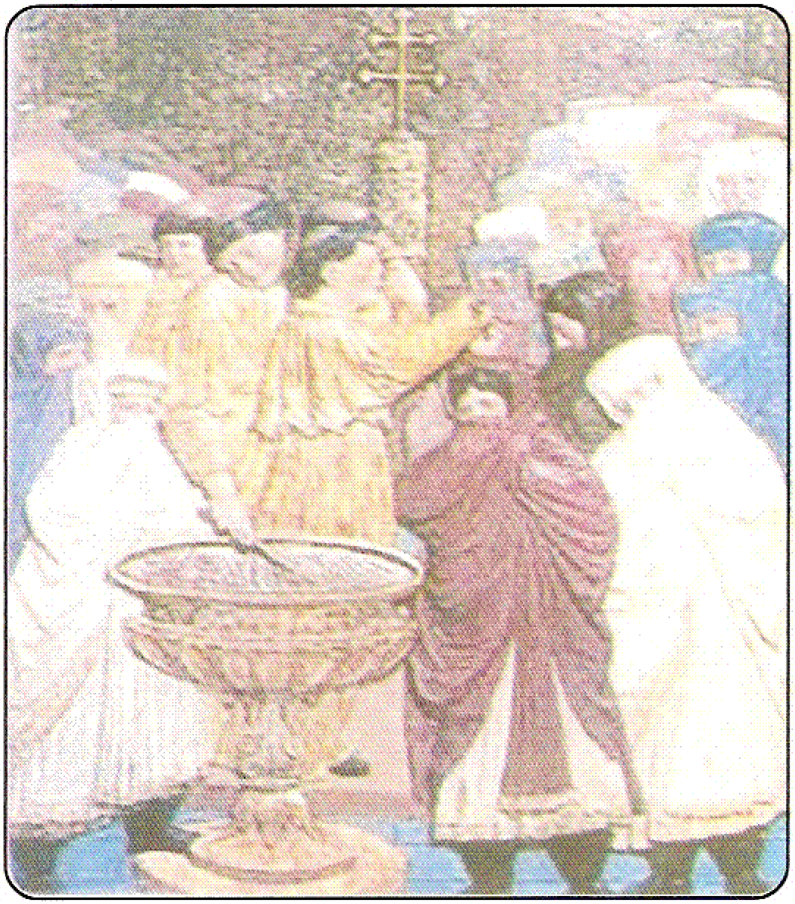

غرناطہ کے میئر فلپیے بگارنی کی زیر نگرانی باپردہ مسلم خواتین کو 1502
میں عیسائیت کا بپتسما دیا جا رہا ہے

بپتسما ثانی (جمہوریت) 2003ء

تم ہمارے ساتھ ہو یا ہمارے خلاف ہو

بحکم جارج ڈبلیو بش

2003ء: عراق میں مسلمانوں کو جمہوریت کا بپتسما دیا جا رہا ہے۔

بپتسما نسوانی حقوق و روشن خیالی 2004ء

افغانستان میں مسلم خواتین کو جنہیں چشم فلک نے کبھی بے پردا نہیں دیکھا ہوگا،
نسوانی حقوق، روشن خیالی اور امریکی جمہوریت سے متعارف کرایا جارہا ہے۔

وگرنہ اب کے نشانہ کمان داروں کا
بس ایک تم ہو، سو غیرت کو راہ رکھ دو

زمانے بیت جائیں گے ...... مگر
اندلس کے سقوط کا المیہ
بھلایا نہیں جا سکے گا
مسلمان اسے کبھی نہیں بھولیں گے۔ (ابوالبقاء الرندی)

سقوطِ اندلس پر ابو البقاء الرندی کا زور بیان اثر انگیز اور کلام دل گیر ثابت ہوا مگر اس المیے کی اثر پذیری کے بارے میں وہ کج قیاف نکلے۔ ابھی سقوط کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ مصر، ترکی اور ملک شام سے مسلمان امیروں کے سفارت کار ملکہ ازا بیلا اور بادشاہ فرڈی ننینڈ کے دربار میں خیر سگالی کے پیغامات پہنچانے کے لیے شرف باریابی کے منتظر بیٹھے رہتے تھے۔ بوالبقاء الرندی علم کلام میں تو یکتا نکلے مگر مسلم امہ کی موٹی کھال، چکنے پنڈے، عبرت کے فقدان اور صفت زود فراموشی کا انہیں ادراک نہ ہوسکا۔ سقوط اندلس جو شاعر خوش توقع کے نزدیک بھلایا ہی نہیں جا سکتا تھا حیران کن حد تک مسلمانوں کو یاد تک نہ رہا خصوصاً سقوط ندلس سے ہمارے حصے میں تو شاعر مشرق کی دو چار نظمیں اور نسیم حجازی صاحب کے دو چار ناول ہی آسکے یہ الگ بات کہ حجازی صاحب کے ناولوں سے پچاس کی دھائی کے رومان پسند اور ساٹھ کی دھائی کے شہنشاہِ جذبات قسم کے افراد ہی مستفید ہوسکے۔ معتصم باللہ کے عہد میں جس طرز تحریر پر چمڑی اتارنے اور جان مارنے کی تعزیر مقرر تھی پاکستان میں اس کے فروغ پر حجازی صاحب کی چھاپ گہری ہے۔ اسلامی تاریخ و واقعات میں رنگ آمیزی، حکایت اور جذبات کا پلیچ لگانے سے جو ثواب دارین وابستہ ہے حجازی صاحب اس سے ضرور مستفید ہوتے رہیں گے۔

حق بحقدار رسید۔ انشاء اللہ۔

سقوط اندلس سے سبق اور حصول عبرت میں ہمارے تہی دست رہ جانے کی وجوہات میں نسیم حجازی جیسے پائے کے لکھاریوں کا بھی کچھ ہاتھ رہا ہوگا۔ بہر حال ہاتھ جس کا بھی اور جتنا رہا ہو لیکن سقوط اندلس سے عبرت کا ایک ماشہ بھی بر آمد نہ کیا جا سکا، اگر کیا جاسکتا تو امہ بعد سقوط، سقیم پڑاؤ، پناہ، مہاجرت، نقل مکانی، بے دخلی اور خود سپردگی سے محفوظ رہی ہوتی۔

سقوط اندلس پر ترک شاعر ہجد مصطفےٰ کا نوحہ بھی اس واقعے کی الم انگیزی پر کلاسیک کا جگہ رکھتا ہے:

میری چشم خونباب ہو
یا گریہ بار چشم فلک
ایک ہی رنگ سے آلودہ ہیں
اندلس کے گلی کوچوں میں بہنے والے
ناحق خونِ مسلم کی سرخی
کبھی ماند نہ پڑنے والے
خیال کی طرح فروزاں رہے گی (مجید مصطفیٰ)

1492 کا سال اقوام عالم کی تاریخ میں عموماً اور مسلم امہ کی تاریخ میں خصوصاً خصوصی اہمیت کا سال تھا کہ اسی سال ہسپانیہ میں مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ اقتدار کا سورج غروب ہوا اور امریکہ کی دریافت کا چاند چڑھا اور یہ دونوں تاریخی واقعات ایک ہی خاتون سے وابستہ ہوئے۔ 1492ء کا سال شروع ہوتے ہی ملکہ ازا بیلا کی تمنا بر آئی اور سپین میں مسلمانوں کے خلاف اس کی طویل جدوجہد کامیاب ہوگئی۔ 1492 کے آخر آخر اس کے بحری مہم جوؤں نے شمالی امریکہ دریافت کرکے ایک نئی دنیا‘ ایک پورا براعظم ملکہ ازا بیلا کی ملکیت میں دے دیا سو ایک ہی سال میں ازا بیلا کو ملنے والی دو بڑی کامیابیوں نے آنے والی کئی صدیوں کے لیے انسانیت کو شرمسار اور لہولہان کر دیا۔

دو جنوری 1492 کی سہ پہر اندلس کے مسلمانوں پر بہت بھاری تھی۔ یہ سقوط کی پہلی شام تھی۔ کلمہ گوؤں پر ابتلا کی طویل رات کا آغاز ہو چکا تھا۔ غرناطہ کی کشادہ مسجدیں ملکہ ازابیلا اور فرڈی نینڈ کے عیسائی لشکریوں اور گھوڑوں کے پیشاب سے متعفن ہو رہی تھیں۔ مسجدوں کے صحن ان کے فوجی ساز و سامان اور ہتھیاروں سے لدے ہوئے خچروں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس شام غرناطہ میں اذان کی بجائے ہر طرف سے مسلمانوں کی آہ و بکا سنائی دیتی تھی یا شراب سے مدہوش‘ جشن فتح مناتے ہوئے عیسائی لشکریوں کے ہنکارے۔ غرناطہ میں جگہ بہ جگہ آگ لگی تھی جس میں قرآن‘ نادر کتابیں اور نایاب قلمی نسخوں کی صورت میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ علمی میراث کو نذر آتش کیا جا رہا تھا۔ عبدالرحمٰن الداخل کے قائم کردہ مرکزی کتب خانے کی تین لاکھ سے زیادہ جلدوں کے جلنے سے غرناطہ میں ایسا کثیف دھواں چھا گیا کہ جس کی سیاہی مسلمانوں کی سیاہ بختی سے ہرگز کم نہیں تھی۔

ایک طرف غرناطہ کے مسلمانوں پر یہ قیامت ٹوٹ رہی تھی اور ان کی عزت' آبرو اور ناموس لٹ رہی تھی تو دوسری طرف غرناطہ کے حکمران ابوعبداللہ قصر الحمراء میں اپنے امراء و حکام کے ساتھ سقوط کے معاہدے کے مطابق غرناطہ کی چابیاں ملکہ ازابیلا کو پیش کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ابوعبداللہ' شاہی خاندان کے افراد اور امراء زرق برق لباس زیب تن کیئے تھے۔ ان کے زرہ بکتر سونے چاندی کی کڑیوں سے چمک رہے تھے اور ان میں جواہرات ٹنکے تھے۔ قصر الحمراء میں ملکہ ازابیلا' بادشاہ فرڈی نینڈ' عیسائی افواج کے جرنیلوں' امراء اور حکام کے استقبال کے انتظامات مکمل ہوچکے تھے۔ آج الحمراء کی شان ہی نرالی تھی۔ محل میں جگہ بہ جگہ مرمر کے فرش لشکارے مارتے تھے کہیں دیبا کے گاؤ تکیے سجے تھے اور کہیں حریرو پرنیاں کے پردوں پر پکھراج کے تازہ بتازہ حاشیے تھے۔ موتیوں کی لڑیاں آرائش کو بڑھاتی تھیں۔ چاندی کے چمکتے عصا' سونے کے مورچھل' سونے چاندی کا چتر اور حریر کے پتے ماحول کو طلسماتی بنائے ہوئے تھے۔ سونے کے سار بان' زر نگار تخت' جواہرات سے مرصع تخت پوش اور سیاہ بخت تخت نشین۔ دیکھنے میں تو الحمراء اپنی آرائش' امارت اور قدر و قیمت میں بے مثال نظر آتا تھا مگر اندلس میں مسلم اقتدار کی یہ آخری شام' آخری ہچکی اور آخری بد عملی تھی۔ سمے پر اختیار جاتا رہے تو ساتھ ہی فیصلہ کرنے کا شرف' فیصلے کی تکریم اور قوت فیصلہ بھی جاتی رہتی ہے۔ سو' امیر ابوعبداللہ (باب دل) کا یہ آخری فیصلہ بھی مسترد کردیا گیا کہ غرناطہ کی کلید سقوط کی علامت کے طور پر الحمراء میں پیش کی جائے گی۔ ملکہ ازابیلا نے امیر ابوعبداللہ کی خواہش کے برعکس الحمراء سے باہر فاصلے پر سقوط کے ڈراپ سین کا حکم جاری کیا۔ ملکہ ازابیلا اپنے شوہر بادشاہ فرڈی نینڈ' بیٹے پرنس ڈان' لاؤ لشکر' فاتح افواج' امراء' مشیروں' رعونت' حکام اور درباریوں کے جلو میں غرناطہ کی چابیاں وصول کرنے پہنچی تو اس کے ہمراہ اس کا مذہبی مشیر اعظم کارڈینیل ہرنینڈ و ٹالا ویرا اور اس کا اطالوی بحری مہم جو مہمان کرسٹوفر کولمبس بھی موجود تھا جسے سقوط غرناطہ کی تقریب میں شرکت کے لئے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ کولمبس نے اس رات اپنے روزنامچے میں لکھا:

> "آج میں نے موجودہ سال (1492) کی دو جنوری کو دیکھا کہ الحمراء کے مناروں پر ملکہ عالیہ (ازابیلا) کا شاہی نشان بزور قوت لہرا دیا گیا اور پھر مسلمان (مور) بادشاہ ابوعبداللہ کو شہر کی فصیل کے دروازے پر ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ کے ہاتھ چومتے ہوئے دیکھا" 2۔ (کرسٹوفر کولمبس: 1492)

کرسٹوفر کولمبس 1451 میں اٹلی میں اون اور ریشم کے پارچہ باف ڈومینیکو کولمبس کے ہاں پیدا ہوا اور جلد ہی لکھنا پڑھنا سیکھ گیا۔ کم عمری میں ہی اپنے باپ کے کاروبار میں شریک ہوگیا لیکن اس کی دلچسپی ہمیشہ بحری جغرافیے سے رہی ۔ نوعمری میں ہی کولمبس نے بحری نقشے بنانے اور سمجھنے شروع کر دیئے تھے ۔ 14 سال کی عمر میں وہ بحری جہاز پر ملاح کی حیثیت سے ملازم ہوگیا اور 21 سال کی عمر میں اس کا شمار بحری مہم جوؤں میں ہونے لگا ۔ 1477 میں کولمبس مستقلاً پرتگال میں آبسا چونکہ پندرہویں صدی میں پرتگال کے ساحلوں سے بحری مہم جوئی اٹلی کی نسبت زیادہ منعفت بھری تھی ۔ 1478 میں لزبن میں کولمبس کی شادی پورٹو سانٹو کے گورنر بارٹو لو مو کی بیٹی فلیپا مونیز سے انجام پائی ۔ اسی دوران کولمبس کے ذہن میں ایسی بحری مہم جوئی کا سوال سنجیدگی سے ابھرنے لگا کہ جس کا نتیجہ مالی منعفت، حیران کن نتائج اور نا معلوم زمینوں کی دریافت سے ہو۔ گورنر بارٹو لوموجو خود بھی بحری مہم جوئی سے وابستہ رہا تھا اور سمندری جغرافیے پر حیران کن حد تک سائنسی معلومات رکھتا تھا۔ کولمبس کا بہترین رہنما ثابت ہوا ۔ بارٹولو مو کی وفات پر اس کے تمام کاغذات اور کتابیں کولمبس کے تصرف میں آ گئیں جن میں تفصیلی سمندری نقشے، چارٹ، سمندر میں مختلف علاقوں کے موسمی حالات، پانی کا دباؤ، لہروں کا اٹھان، امکانی مصائب، بحری مہم جوؤں کے انٹرویوز، بحری جہازوں کی موزونیت، اور اسی طرح کی بیش بہا معلومات نے کولمبس کے مغرب کی طرف سے مشرق میں پہنچنے کے نظریہ کو صیقل کردیا ۔ کولمبس اپنے تجربے، معلومات اور تحقیق سے اس نظریہ میں پختہ ہوچکا تھا کہ انتہائی مشرق میں مغرب کی طرف سے سمندری راستے سے پہنچا جاسکتا ہے ۔

غالباً کولمبس نے اپنے اس نظریے کی بنیاد مارکو پولو کے اس نظریے پر رکھی جس میں مارکوپولو نے قبلائی خان کے عہد میں چین کا محل وقوع جزائر کنیری کے متوازی قرار دیا تھا۔ سو کولمبس کے خیال میں یہ عین ممکن تھا کہ اگر وہ جزائر کنیری سے بحری مہم کا آغاز کرے تو وہ مغرب کی سمت سے سمندر میں سفر کرتے ہوئے بالآخر مشرق میں پہنچ سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ پندرہویں صدی میں زمین کا گول ہونے کی بجائے بیضوی مانا جانا اور تمام سمندروں کا آپس میں جڑے ہونے کا تصور بھی کولمبس کو اپنے نظریے پر ثابت قدمی سے جمے رہنے پر مائل رکھتا تھا۔

پندرہویں صدی کے مہم جوؤں کی مجبوری کے عین مطابق کولمبس کو بھی ایک ایسے مقتدر اعلیٰ سرپرست کی ضرورت تھی کہ جو اس کی دریافت کردہ دنیا کو قانونی، سیاسی، مالی وفوجی تحفظ

فراہم کر سکے تا کہ وہاں پر آباد کاری کے حقوق محفوظ رکھے جاسکیں اور نئی دریافت کردہ کالونی قانونی ملکیت کے حصار میں آ کر کسی اور کے دعویٰ ملکیت سے محفوظ ہوجائے۔ سرپرستی کی اس ضرورت کے مد نظر کولمبس نے 1481 میں پرتگال کے بادشاہ جان دوئم سے اپنی بحری مہمات کی کفالت اور سرپرستی کرنے کی درخواست کی جو پرتگال کی جغرافیائی کونسل نے مسترد کردی۔ اسی طرح 1482 میں برطانیہ اور 1484 میں فرانس کے بادشاہ نے بھی کولمبس کی درخواست کو شرف قبولیت سے محروم رکھا۔ 1485 میں کولمبس سپین کے شاہی دربار سے مدد حاصل کرنے کی غرض سے سپین آیا اور قرطبہ میں مقیم ہوگیا۔ یوں وہ قرطبہ، غرناطہ اور سرقسطہ میں امراء اور حکام کو اپنی مہم جوئی کے منصوبے کے حق میں استوار کرتا رہا۔ اندلس میں کولمبس کا قیام طویل اور انتظار طویل تر ہوتا گیا چونکہ اس دوران سپین کے اکثر ریاستی حکمران مسلمانوں کے خلاف نبرد آزمائی میں مصروف تھے۔ کاسٹائل کی ملکہ ازابیلا اور آراگون کا بادشاہ، دونوں ریاستوں کی مشترکہ افواج کے ذریعے سپین کو متحد کرنے اور وہاں سے مسلمانوں کی بیخ کنی کرکے سپین کو عیسائی چرچ کے تحت لانے کے منصوبے پر کاربند تھے۔

1492 میں اندلس کی آخری مسلمان حکومت کے سقوط کے ساتھ ہی ملکہ ازابیلا نے اپنی سلطنت کو دور دراز تک وسعت دینے، شاہی خزانے کو بھرنے اور ملک ہوس گیری کی تسکین کی خاطر کولمبس کے نئی دنیا کی دریافت کے منصوبے پر بات چیت کے لیئے اسے شرف ملاقات بخشا۔ ملکہ ازابیلا کے مذہبی مشیر فادر مارچینا نے اس ملاقات کا احوال اپنی یاد داشتوں میں قلم بند کیا ہے۔ فادر مارچینا لکھتا ہے کہ:

> ''7 اپریل 1492 کی صبح ملکہ ازابیلا نے کولمبس کو ملاقات کے لیے طلب کیا تو وہ اپنے شوہر فرڈی نینڈ کی نسبت کولمبس سے زیادہ گرم جوشی اور خوش اخلاقی سے پیش آئی۔ وہ اپنے شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ قیمتی آرام دہ کرسی پر اپنے شوہر فرڈی نینڈ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی جبکہ فرڈی نینڈ قدرے لاتعلق اور بے زار نظر آتا تھا۔ ملکہ کے ریشم جیسے سنہرے بال، گہری نیلی آنکھیں اور مدھم آواز ماحول کو طلسماتی بنائے ہوئے تھی اور وہ اپنے شوہر سے زیادہ مذہبی اور دور اندیش نظر آتی تھی۔ ملکہ کا ہم عمر کولمبس ملکہ کے سامنے دست بستہ و خمیدہ کھڑا تھا۔ اس موقع پر ملکہ ازابیلا

اور کولمبس کے درمیان براہ راست یوں مکالمہ ہوا۔"

ملکہ ازا بیلا۔تم کیا توقع رکھتے ہو؟

کولمبس : مجھے امیر البحر کا خطاب اور مراعات تفویض کی جائیں اور میں جن ملکوں کو فتح یا دریافت کروں وہاں مجھے سپین کی شاہی حکومت کا وائسرائے مقرر کیا جائے۔ اس کے علاوہ نودریافت کردہ علاقوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کا دسواں حصہ میرے لیے مختص ہو جبکہ میں اس بحری مہم کے کل اخراجات کے آٹھویں حصے کی سرمایہ کاری پر تیار ہوں۔

ملکہ ازا بیلا : اس آٹھویں حصے کی سرمایہ کاری کی وضاحت ہونی چاہیے۔

کولمبس:اس آٹھویں حصے کی ذاتی سرمایہ کاری کے عوض متوقع آمدنی میں سے مزید آٹھویں حصے کے حصول کی توقع رکھتا ہوں۔ میں جو بھی علاقے اور ملک دریافت یا فتح کروں گا وہاں پر عیسائیت پھیلانے کا' کام صدق دل اور پوری کوشش سے کروں گا۔ میں نا معلوم زمینوں پر عیسائیت کا نمائندہ بن کر اور عیسائی چرچ کا پیغام لے جانا چاہتا ہوں۔ میں دریافت کردہ ملک سے ہونے والی آمدنی کا معقول حصہ یروشلم میں مسلمانوں سے عیسائی معبد گاہوں کی بازیافت میں خرچ کرنے کا مضبوط ارادہ رکھتا ہوں۔"

3۔(امریکن ہسٹری۔جلد اول: 1800)

کولمبس کے خیالات پر ملکہ ازا بیلا فرط مسرت سے جھوم اٹھی اور بے ساختہ کہا کہ اگر اس بحری مہم کے لیے مجھے اپنے جواہرات بھی رہن رکھنا پڑیں تو میں دریغ نہیں کروں گی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بادشاہ فرڈی نینڈ' کولمبس کے منصوبے پر تحفظات رکھتا تھا' ازا بیلا نے کولمبس کی تمام شرطیں خوش دلی سے تسلیم کرتے ہوئے اسے جلد از جلد اس بحری مہم پر روانہ ہوجانے کی ہدایت کرتے ہوئے رخصت کیا۔

17 اپریل کو غرناطہ میں اس مشہور عالم معاہدے پر دستخط ہوئے جس کی رو سے کولمبس امیر البحر اور نئی دریافت ہونے والی دنیا میں ملکہ ازا بیلا کا وائسرائے مقرر ہوا۔ معاہدے نے نئی دنیا کی دریافت کی بحری مہم کے لیے کولمبس کو تین بحری جہاز' سونے کے دو ہزار سکے (ماراویدیز)

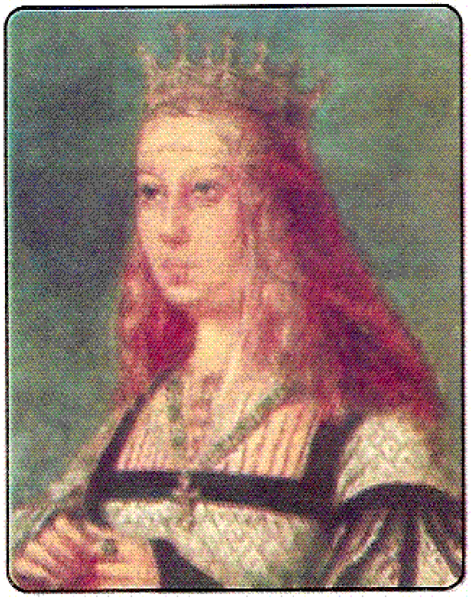

ملکہ ازابیلا
(1451-1504)

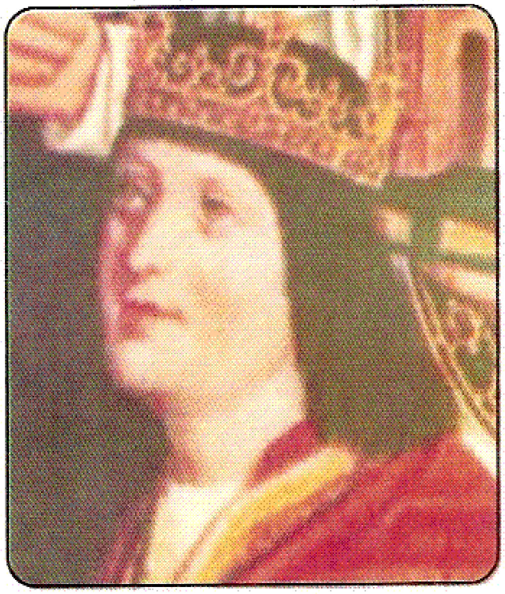

بادشاہ فرڈی نینڈ
(1452-1516)

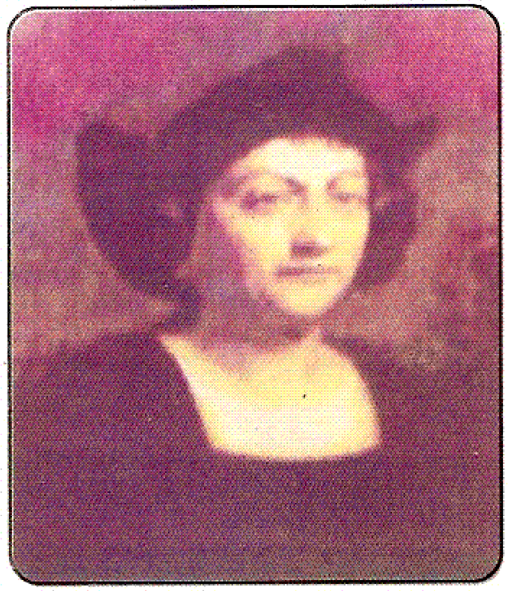

کرسٹوفر کولمبس
(1451-1506)

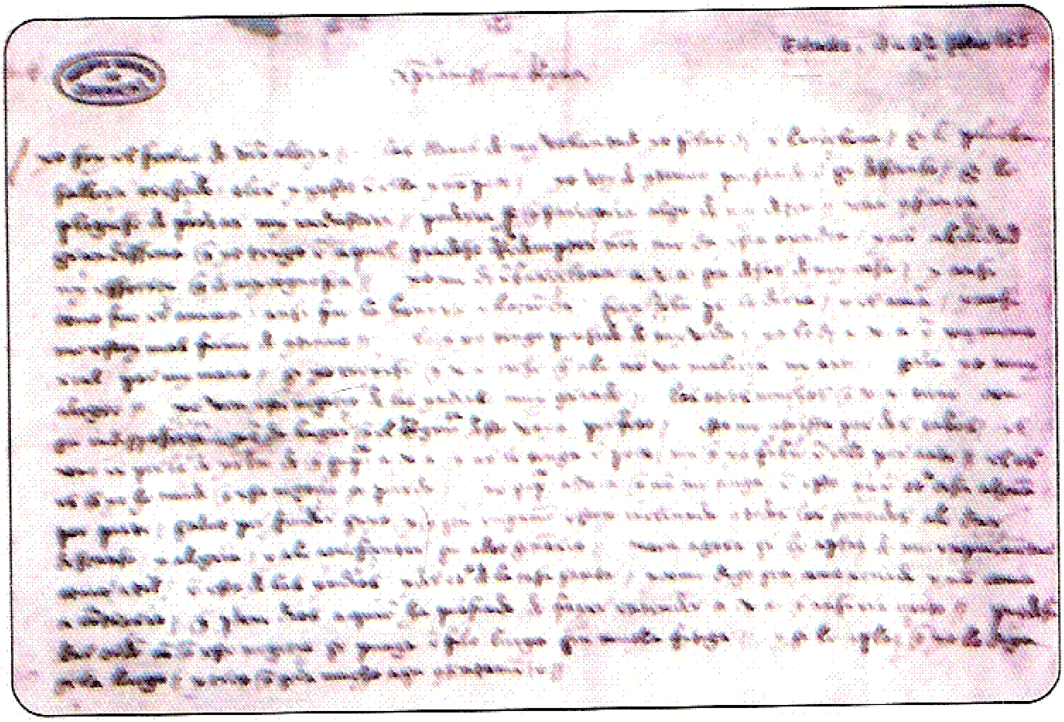

1486ء: نئی دنیا کی دریافت کے لیے بحری مہم کی سرپرستی کی درخواست ۔ کرسٹوفر کولمبس کا ملکہ ازابیلا کے نام خط کا عکس

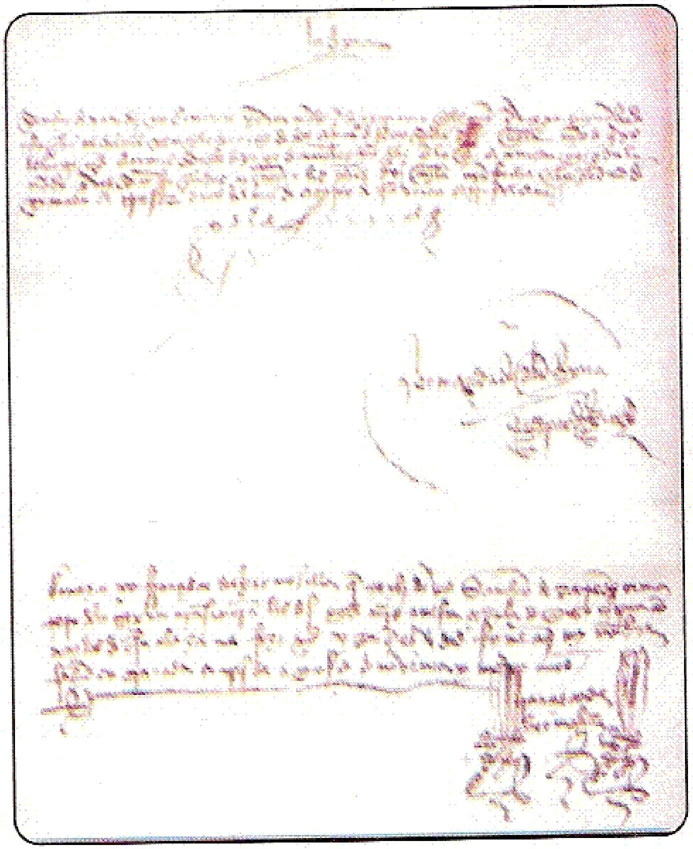

قصرِالحمراء (غرناطہ) 17 اپریل 1492: نئی دُنیا (براعظم امریکہ) کی دریافت کی مہم میں سرمایہ کاری کا معاہدہ
ملکہ ازابیلا اور کولمبس کے درمیان معاہدے کا عکس

سو، ملاح اور فوجی، سیاسی و قانونی تحفظ فراہم کر دیا۔ معاہدے پر ملکہ ازا بیلا، بادشاہ فرڈی ننڈ، کرسٹوفر کولمبس، فادر مرچینا اور ملکہ کے مالیاتی معتمد جیسپر ٹریزو کے دستخط ثبت ہیں۔ اس اعلانیہ معاہدے کے سوا اندر خانے بھی کچھ یقین دھانیاں اور وعدے وعید ملکہ اور کولمبس کے درمیان فادر مرچینا اور کارڈ ینیل ہرنینڈو ٹالا ویرا کے توسط سے ہو چکے تھے جب کہ ملکہ کے یہودی مصاحبین نئی دنیا کی دریافت کے منصوبے کے حق میں ملکہ ازابیلا پر شدید دباؤ ڈال رہے تھے جن میں مالی دباؤ سرِ فہرست تھا۔

اس خفیہ معاہدے میں کولمبس کی طرف سے سپین کے کیتھولک چرچ کے سربراہ فرائے پیریز کی شخصی ضمانت اور چرچ کی کاوشیں بھی شامل تھیں۔ ملکہ کو یہ یقین دلایا جا چکا تھا کہ کولمبس دریافت کردہ نئے ممالک سے حاصل کردہ سونا، ہیرے، جواہرات، غلام خدمت گار اور نوادرات کے ڈھیر لگا دے گا جس سے نہ صرف ملکہ کے ذاتی اثاثوں میں اضافہ ہوگا بلکہ اس سے سپین کے سرکاری خزانے کو بھی سہارا ملے گا جو مسلسل جنگی اخراجات کی بناء پر دیوالیہ کے قریب پہنچ چکا ہے۔ (واضح رہے کہ سقوطِ غرناطہ کے بعد فاتح عیسائی حکمرانوں کے خزانے الحمراء سے ملنے والی دولت کے بل بوتے پر دیوالیہ ہونے سے محفوظ رہے تھے)

چھ ماہ کی مختصر مدت میں اسی معاہدے کے بطن سے امریکہ نے جنم لیا یوں ملکہ ازابیلا کی خون آشامی، اس کی سرشت میں رچی ہوئی بے رحمی، اسلام دشمنی، سرمایہ داری، انسانی خون کی منہ لگی لذت اور نسل کشی کا تجربہ جو اسے اندلس کے مسلمانوں کی نسل کشی سے حاصل ہوا تھا سپین سے امریکہ پہنچ گیا۔ پندرہویں صدی کے آخر آخر اگر اندلس کے مسلمان حکمران اس قدر کمزور نہ ہو گئے ہوتے اور مزید کچھ عرصہ مسلم اقتدار قائم رکھ سکتے تو کیا عجب کہ کولمبس کو اپنی درخواست کسی مسلمان امیر کی خدمت میں پیش کرنی پڑتی اور امریکہ کا نیا براعظم مسلم اقتدار سے وابستہ ہوتا ہے

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقشِ پا، پایا

جس امریکہ کی دریافت پر ملکہ ازابیلا جیسے اسلام دشمن کی مہر ثبت ہے اس امریکہ سے مسلم امہ کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے جو کہ پہنچ رہا ہے لیکن وہ فائدہ جس کی توقع مسلمان حکمرانوں نے امریکہ سے وابستہ کر رکھی ہے، کبھی نہیں ہوگا۔ امریکہ کی ساخت اور سائیکی ہی اپنی ہیئت

ترکیبی میں مسلمانوں کے خلاف اور ناحق خونِ مسلم پر استوار ہے اسے کسی بھی طرح مسلم اُمہ کے حق میں رام نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمانوں کو جب بھی پہنچے گا امریکہ سے نقصان ہی پہنچے گا۔ مسلمانوں کے حق میں امریکی حمایت کی بیل کا منڈھے چڑھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ امریکی دریافت کے پس منظر میں ملکہ ازابیلا کی اسلام دشمنی اور مسلمانوں کی ہزیمت اہم ترین عنصر کے طور پر کارفرما ہے اس کیمسٹری کو بدلا نہیں جاسکتا۔

امریکہ کی اصل کے اجزائے ترکیبی کی رو سے امریکہ کے ہاتھوں مسلمانوں کی ہزیمت اور مسلم اُمہ کا قتلِ عام کسی اچنبھے کا باعث ہرگز نہیں ہونا چاہیے' اچنبھا تو اس بات پر ہوتا کہ اگر امریکہ کے ہاتھوں مسلمان اور مسلم اُمہ محفوظ رہے ہوتے۔ امریکہ کی نظریاتی اساس یا پائیت' یہودیت اور عیسائیت کے اس انتہا پسند اور دہشت گرد نظریے پر استوار ہوئی جسے 1452 میں ”عیسائیت کا اصول دریافت“ کے نام سے پوپ نکولس پنجم نے متعارف کرایا تھا۔ مسلمانوں کے خلاف طویل صلیبی جنگوں کے دوران اور اس کے بعد یورپ کے عیسائی بادشاہوں اور عیسائیت کی مذہبی قیادت کو ایسی نظریاتی قوت کی شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ جس کے حوالے سے نہ صرف غیر عیسائیوں کے قتلِ عام کو جائز قرار دیا جاسکے بلکہ عیسائی فوجیوں کو بھی آمادہ پیکار' رہنے اور قتل ہوتے رہنے پر قائم رکھا جاسکے۔ ان دونوں اہم ضرورتوں کے پیشِ نظر چودھویں اور پندرھویں صدی میں عیسائیت کی مذہبی قیادت کی طرف سے طرح طرح کے نظریات متعارف کرائے گئے۔ 1452 میں دو سو آٹھویں پوپ نکولس پنجم' جو 1447 سے 1455 تک مرکزی رومن کیتھولک چرچ کے سربراہ رہے' ایک ایسا غیر انسانی اور ظالمانہ نظریہ متعارف کرانے کا سبب بنے جو' اب تک کروڑوں انسانوں کی جان لے چکا ہے اور ہنوز مستعمل ہے۔ پوپ' نکولس نے پرتگال کے بادشاہ الفانسو کے نام ایک مذہبی حکم نامہ جاری کیا جس میں نظریہ دریافت (Doctrine of Discovery) کو متعارف کراتے ہوئے اس کی تشریح میں لکھا' کہ نظریہ دریافت کے مطابق۔

> ”غیر عیسائیوں کی زمینوں پر قبضہ' ان کے قتلِ عام' مکمل بربادی' انہیں غلام بنانا اور ان کے مال' ملکیت پر قبضہ کر لینے کا حکم دیا جاتا ہے اور یہ عیسائیت کے اصول اور حق دریافت کے مطابق ہے۔“ 4۔ (پوپ نکولس پنجم: 1455)

اس مذہبی حکم نامے کی آڑ میں پرتگال نے نہ صرف افریقہ سے غلاموں کی تجارت کو

فروغ دیا بلکہ عیسائیت کا "حق دریافت" استعمال کرتے ہوئے افریقہ کے مغربی ساحلوں پر قبضہ کرکے پرتگالی تسلط میں شامل کر لیا۔ ہوس اقتدار، لوٹ مار اور قتل عام کو نظریے کی قوت نے مذہبی ضرورت میں بدل دیا۔ پرتگال کے بعد سپین کی ملکہ ازابیلا نے نظریہ دریافت کو مسلمانوں کے خلاف کامیابی سے استعمال کیا اور بلا امتیاز لاکھوں مسلمان اور یہودی اس ظالمانہ نظریے کے بھینٹ چڑھ گئے۔

1492 میں کرسٹوفر کولمبس کو اسی حق دریافت سے مسلح کر کے ملکہ ازابیلا نے نئی دنیا کی دریافت اور فتوحات پر روانہ کیا لہٰذا جب کولمبس امریکہ پہنچا تو اس کے پاس چرچ، پوپ، ملکہ اور بادشاہ کی طرف سے غیر عیسائیوں کے قتل عام کا اجازت نامہ اور اس کی پشت پر اس قتل عام کا مذہبی ونظریاتی جواز موجود تھا۔ مشہور مورخ جان بائڈ تھیچر لکھتے ہیں کہ:

> "سپین کی شاہی حکومت کے ہاتھوں امریکہ کی دریافت اور ریڈ انڈینیز کا قتل عام بھی نظریہ دریافت کے تحت انجام پایا۔" 5۔(جان بائڈ تھیچر: 1903)

1493 میں عیسائیت کے رسوائے زمانہ دوسو چودھویں پوپ الیگزینڈر ششم نے چرچ کی طرف سے جاری کردہ ایک خفیہ فرمان میں توقع ظاہر کی کہ:

> "اب عیسائی سلطنت تیزی سے بڑھے گی چونکہ دریافت کردہ نئے ملکوں کی آبادی کو غلام بن جانے یا بپتسما لینے کے لازمی عمل سے دو چار کر دیا گیا ہے۔" 6۔(پوپ الیگزینڈر ششم: 1493)

پندرہویں صدی کے آخری نصف میں عیسائیت کے مرکز ویٹیکن سٹی سے وقتاً فوقتاً ایسے مذہبی حکمنامے جاری کیئے جاتے رہے جن سے جبر، تشدد، ناانصافی اور غاصبانہ قبضے کو مذہبی جواز و حمایت حاصل ہوگئی۔ یورپی حکمرانوں کی ملک ہوس گیری کو ان فرامین سے نظریاتی قوت میسر آتی رہی۔ درج ذیل کے مذہبی فرمان اپنی نوعیت میں شدید اور غیر عیسائی خلق خدا کے لیے آلہ قتل ثابت ہوئے۔ اسقف اعظم الیگزینڈر ششم کے عالمی مذاہب اور انسانیت کے خلاف انتہا پسندانہ نظریات یہیں تک محدود نہیں تھے بلکہ چرچ کی پالیسی کے مطابق وہ نہ صرف مسلمانوں، یہودیوں اور ریڈ انڈینیز کے خون ناحق کو جائز قرار دینے کے مرتکب ہوئے بلکہ بدترین مذہبی دہشت

گردی کے فروغ میں ممد و معاون رہے۔ 4 مئی 1493ء کو سینٹ پیٹرز (روم) میں ایک اجتماع میں اپنے ایک فرمان میں سپین کی ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ کو مخاطب کرتے ہوئے وہ گویا ہوئے کہ:

> ‘‘عیسیٰ کی پیاری بیٹی کاسٹائل کی ملکہ ازابیلا اور عیسیٰ کے پیارے بیٹے بادشاہ فرڈی نینڈ ہمیں پتہ چلا ہے کہ تم طویل عرصے سے ایسی نئی دنیا اور دور دراز علاقوں کو دریافت کرنے کی کوشش میں ہو جو ابھی تک دریافت نہ ہوئے ہوں تاکہ نو دریافت کردہ لوگوں کو عیسائیت کا سچا پیروکار اور‘ راسخ العقیدہ عیسائی بنایا جاسکے۔ ہم جانتے ہیں کہ ریاست غرناطہ کے طویل محاصرے اور مکمل فتح یابی میں دشواری کے باعث نئی دنیاؤں کی دریافت کے مقدس کام میں تاخیر ہوتی رہی ہے لیکن اب جیسا کہ ہمارے لارڈ عیسیٰ کی خوشنودی کے مطابق عیسیٰ کے پیارے بیٹے کرسٹوفر کولمبس کو نئی دنیاؤں میں عیسائیت کا پیغام پہنچانے کے لیے چن لیا گیا ہے اور کولمبس ایسے علاقوں کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوچکا ہے جو پہلے سے دریافت شدہ نہیں تھے۔ اگرچہ وہاں کے رہنے والے غیر مہذب اور نیم برہنہ ہیں جنہیں ہر ممکن طریق سے عیسائیت کے زیر اثر لانا ہوگا’’
>
> 7۔ (پوپ الیگزینڈر ششم: مئی 1493)

ہم دیکھتے ہیں کہ چرچ کی طرف سے متعارف کرائے گئے ‘‘نظریہ دریافت’’ نے پندرہویں اور سولہویں صدی کے یورپی بادشاہوں کو نہ صرف ان کی قتل و غارت کا مذہبی جواز مہیا کر دیا بلکہ یہ غیر انسانی اور غیر فطری نظریہ کسی نہ کسی صورت میں آج بھی کارفرما ہے۔ بظاہر اس کی مذمت ہی کیوں نہ کی جاتی ہو لیکن اندر خانے اس نظریے کے اطلاق کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ امریکہ میں اگر ایک طرف انسانی حقوق کا رولا عین عروج پر ہے تو دوسری طرف قابل نفرین ‘‘نظریہ دریافت’’ پر بھی عمل ہو رہا ہے۔ آج کل جب امریکہ کو دو رخا اور دوہرا معیار‘ رکھنے کا طعنہ دیا جاتا ہے تو یقیناً اس میں کچھ ہاتھ نظریہ دریافت کا بھی ضرور ہوگا جسے انسانی حقوق کے نمائشی اور فرمائشی پروگرام نے پس پشت تو دھکیل دیا ہے لیکن اس کی موجودگی سے

پوپ الیگزینڈر ششم

4 مئی 1493

"یہ مذہبی حکمنامہ چرچ کی طرف سے جنوبی امریکہ کی زمینوں پر بادشاہ فرڈی نینڈ کے حق ملکیت کی تصدیق وتوثیق کرتا ہے۔ اگر کوئی بھی اس کی مدافعت کرے تو وہ (بادشاہ فرڈی نینڈ) مذہبی وقانونی تقاضا پورا کرنے کے لیے ان سے جنگ کرسکتا ہے، انہیں قتل کرسکتا ہے اور انہیں غلام بنا سکتا ہے بالکل اسی طرح جیسا کہ جاشوا نے اہل کنعان کو غلام بنالیا تھا"

(پیپل بُل: 1493)

انکار ممکن نہیں ہے۔ اس بارے میں مشہور مورخ و محقق ہنیز کوننگ رقم طراز ہیں کہ:

> "لاطینی امریکہ پر قبضے کا تسلسل دور دراز کے جنگلوں اور پہاڑوں میں آج بھی جاری و ساری ہے ہم اسے وسطی امریکہ میں ایمزون انڈینیز کی زمینوں پر جاگیرداروں اور، رسہ گیروں کے حالیہ قبضے کی صورت میں آج بھی دیکھ سکتے ہیں جبکہ 1980 کی دھائی میں صدر رونالڈ ریگن اور صدر جارج بش سینیئر کی زیر صدارت امریکی حکومت نے گوئٹے مالا اور وسطی امریکہ کے دوسرے علاقوں میں ماین انڈینیز کی نسل کشی کے لیے رقوم فراہم کی ہیں اور یہ یقیناً نظریہ دریافت کا تسلسل ہے۔"

9۔(ہنیز کوننگ : 1993)

جبکہ نیو یارک ٹائمز کی ماریا نوارو کہتی ہیں کہ:

> "گوئٹے مالا کی فوج جس نے ماین انڈینیز کی نسل کشی شروع کر رکھی ہے اور ہزاروں ماین انڈینیز پر جسمانی تشدد، اغواء اور ان کے قتل کی ذمہ دار ہے۔ امریکی حکومت اسی فوج کو روپیہ، تحفظ اور تربیت فراہم کرنے میں ملوث رہی ہے۔"

8۔(ماریا نوارو: 1999)

ہم سمجھتے ہیں کہ ریاست کا قیام خواہ کسی بھی نظریے کے تحت وجود میں آیا ہو اور "زمینی تقاضوں" کے ساتھ اس بنیادی نظریے میں تبدیلی آتی رہی ہو حتیٰ کہ ریاست اس نظریے کی نفی پر ہی آمادہ و کمر بستہ کیوں نہ ہو جائے لیکن وہ بنیاد، وہ نظریہ، وہ اصول، وہ اساس بہر حال موجود رہتی ہے اور اپنے ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہے کہ جس پر اس ریاست کی عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ مثلاً ہندوستان ہندو ازم کے جس نظریے پر قائم ہوا، اس پر سیکولر ازم کے جتنے بھی پیچ لگاتے رہیں مگر اصل بنیاد یعنی ہندو ازم پوری شدت و قوت سے موجود ہے۔ اسے محسوس کیا جاسکتا ہے، دیکھا جاسکتا ہے اور یہ نظر بھی آتا ہے اسی طرح ملک پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا، اب یہاں روشن خیالی، آزاد خیالی، ہم خیالی اور میانہ خیالی کا چاہے جتنا بھی طور مار باندھ لیا جائے مگر اس نظریاتی اساس سے مفر ممکن نہیں ہے جو اس مملکت خداداد کی بنیاد میں پوری توانائی سے موجود ہے۔ میراتھن میں نامحرم جوان مردوں کے شانہ بشانہ دوڑتی ہوئی دو سو زنانیوں پر لعنت ملامت کرتی ہوئی دو کروڑ عورتوں کی موجودگی اس نظریاتی بنیاد کے موجود ہونے

کی ضمانت ہے۔ جس بنیاد کو جھٹلانے اور توڑ دینے میں نجات سمجھی جارہی ہے وہ دراصل نجات نہیں بلکہ آزمائش' سزا' اور سزا در سزا کا عمل ہے۔

یہ طے ہے کہ ریاستیں جس نظریہ اور اصول پر قائم ہوتی ہیں انہیں جھٹلانے اور ان سے جان چھڑانے کی کوشش کے باوجود نظریہ ریاست کی مٹی اور پانی میں' زمین کی شریانوں میں' لب و لہجے میں اور ثقافت و سائیکی میں بہر حال موجود رہتا ہے تو امریکہ اس اصول سے کیونکر مستثنیٰ ہوسکتا ہے؟ امریکہ کی نظریاتی بنیاد ملکہ ازا بیلا کی اسلام دشمنی' مذہبی دہشت گردی اور عیسائیت کے حق دریافت پر استوار ہوئی تھی سو' اب امریکہ سے دس بیس مسلمان حکمرانوں کو خیر کی توقع ہو' تو ہو لیکن مسلم امہ کے حق میں دعائے خیر کی ہی ضرورت ہے۔ اگر کسی کو افغانستان اور عراق میں نظریہ دریافت کا اطلاق اور اس غیر انسانی نظریے سے وابستہ دہشت گردی نظر نہیں آتی تو اس کورچشمی کی جو بھی وجوہات ہوں لیکن تین صدیوں کے امریکی تمدن سے صرف اسی قدر تبدیلی آئی ہے کہ نظریہ دریافت میں آزادی اور جمہوریت کے لفظ شامل کر لیئے گئے ہیں۔ عالمی برادری کے انسانی حقوق کی روا روی میں اب عیسائیت کی بجائے آزادی اور جمہوریت کا بپتسما دیا جاتا ہے۔ ملکوں ملکوں آزادی اور جمہوریت کا امریکی پلچ اپنی جگہ لیکن نظریہ دریافت کا جبر اور خون آشامی بہر حال سر چڑھ کے بولتی ہے۔ افغانستان اور عراق میں اس کی تعبیر و تفسیر کے لیئے کسی عالمانہ قیافے کی ضرورت نہیں ہے کولمبس نے جب امریکہ اچھی طرح دریافت کرلیا اور وہ جزائر غرب الہند میں ''اوسطاً بارہ لاکھ ریڈ انڈینیز سالانہ'' تہ تیغ کرنے لگا تو عیسائیت' چرچ' ملکہ اور کولمبس کا کام چل نکلا' پاؤں امریکہ میں جم گئے اور مال و زر و غلاموں سے لدے پھندے جہاز سپین پہنچنے لگے تو ملکہ ازا بیلا نے قتل ہونے والوں کو بھی مراعات دینے کا فیصلہ کیا۔ ان مراعات میں مقتولوں کو وجہ قتل بتانے اور قتل کی پیشگی اطلاع دینے کا موثر انتظام کیا گیا۔

10۔ (لاس کیسس :1552)

ملکہ ازا بیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ کی طرف سے کولمبس کو یہ حکم موصول ہوا کہ ''دریافت'' کردہ علاقوں میں قتل و غارت شروع کرنے سے پہلے لازم ہے کہ عوام کے مجمع میں یہ شاہی فرمان با آواز بلند ہسپانوی یا لاطینی زبان میں پڑھ کر سنایا جائے سو' امریکہ میں ہسپانوی وائسرائے کرسٹوفر کولمبس ہر نئے حملے اور قتل گری سے پہلے ریڈ انڈینیز کے ہجوم کے سامنے یہ شاہی فرمان پڑھتے جبکہ سننے والے ہزاروں کے مجمع میں ہسپانوی یا لاطینی سمجھنے والا

کوئی بھی نہ ہوتا:

> ’’خداوند ہمارے لارڈ نے تمام قوموں کا اختیار ایک آدمی سینٹ پیٹر کو دیا ہے جو دنیا کے تمام انسانوں میں اعلیٰ ہے اور سب کو اس کی اطاعت کرنی چاہیے اور وہی تمام نوع انسانی کا قائد ہے۔ انسان جہاں بھی رہتے ہوں اور کسی بھی قانون کے تابع ہوں یا کسی بھی عقیدے کے ماننے والے ہوں سب پر اس کی اطاعت لازم ہے لیکن اگر تم ایسا نہیں کرو گے اور بدنیتی سے اس کی اطاعت میں تاخیر کرو گے تو میں تصدیق کرتا ہوں کہ خداوند کی مدد سے ہم پوری قوت سے تمہارے ملک میں داخل ہو جائیں گے اور ملکہ عالیہ جو غیر مہذب اقوام کو تباہ کر دینے پر قادر ہیں چرچ کی نافرمانی پر ہر ممکن طریقے سے تمہارے خلاف جنگ کریں گی۔ ہم تم پر قابض ہوجائیں گے اور تمہاری عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیں گے اور انہیں ملکہ کے حکم کے مطابق فروخت کر دیا جائے گا۔ تم سے تمہارا مال اسباب چھین کر تمہیں ملکیت سے محروم کر دیا جائے گا۔ تمہیں ان غلاموں کی طرح جو حکم عدولی کے مرتکب ہوتے ہیں ہر ممکن سزا دی جائے گی ہمارے ان اقدامات سے جو بھی مالی و جانی نقصان تمہیں پہنچے گا اس کی ذمہ داری تم پر ہی عائد ہوگی نا، کہ ملکہ عالیہ پر اور نہ ان افواج پر جو ہمارے ساتھ یہ کارخیر انجام دیں گی۔‘‘

11-(El- Requerimiento : 1513)

(وضاحت: سولہویں صدی کے مشہور قانونی فلسفی دان لوپیز روبیس نے یہ تحریر سپین کے عیسائی حکمرانوں کی مذہبی و اخلاقی حاکمیت کے حق میں لکھی تھی جو رفتہ رفتہ ’’دستاویز پیشگی اطلاع برائے قتل عام‘‘ میں بدل گئی۔ مصنف)

یوں تو کرسٹو فر کولمبس کو ملکہ ازابیلا کا یہ شاہی فرمان پڑھے پانچ صدیاں بیت چکی ہیں مگر لگتا ہے کہ فرمان ہنوز پڑھا جا رہا ہے، اور اب اس کی تصدیق کرنے والوں میں رمز فیلڈ، ڈک چینی، کونڈو لیزا رائس، پال بریمر، زلمے خلیل زاد، ٹونی بلیئر اور کولن پاؤل شامل ہیں جو غیر مہذب

و غیر ترقی یافتہ اقوام کو پتھر کے زمانے میں پہنچادینے کا عندیہ دیتے رہتے ہیں۔ یہ نئے خداوند‘ یہ نئے کولمبس جب بھی جمہوریت‘ آزادی‘ روشن خیالی‘ حملہ برائے حفظ ماتقدم اور نیو ورلڈ آرڈر کا مژدہ سناتے ہیں تو ہمارا بے قابو دھیان ایک ہی جست میں مجبور و مقہور‘ بات نہ سمجھنے اور قتل ہوجانے والے مجمع‘ اقوام طاقتور کے نظریہ حق دریافت اور ملکہ عالیہ ازا بیلا کی پیشگی اطلاع قتل کی مہربانی پر جا ٹھہرتا ہے یوں جیسے کہ ان میں کچھ مماثلت ہو‘ تسلسل ہو۔ ایک ہی واقعہ دوہرایا جا رہا ہو۔ جیسے لفظ بدل بدل کے وہی بات کہی جا رہی ہو‘ ایک ہی بات کو بہ طرز دگر کہا جا رہا ہو۔ مکرر ارشاد ارشادِ مکرر ہو رہا ہو۔ مجمع بھی ویسا ہی ہو‘ نابلد‘ ناتواں‘ بات نہ سمجھنے والا اور قتل ہوجانے والا ...... ہمیں تو یہ مماثلت اسرار بھری لگتی ہے کیا عجب کہ اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں بھی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے بہر حال کھلی نشانیاں بھی تو مرحمت فرمائی ہیں‘ کھول کھول کر بھی تو بیان کیا ہے۔ گمان کہتا ہے کہ کھلی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ جب یہودی النسل کرسٹوفر کولمبس امریکہ پہنچا تو:

> ”کولمبس نئی دنیا میں عیسائی دنیا کے لیے ایسا مرکز بنانا چاہتا تھا جہاں سے اسلام کے خلاف صلیبی لشکر بھی روانہ ہوں۔ اس کی ذاتی یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ یروشلم کی فتح کا آرزومند تھا۔ گو کہ یورپ جدید دور میں داخل ہوچکا تھا تاہم صلیبی جنگی جنون اب بھی اس پر طاری تھا۔ جدید مغرب‘ صلیبی جنگوں کے خوابوں اور خدشوں میں الجھا ہوا تھا۔ یہ خواب اور اندیشے کولمبس کے ساتھ اوقیانوس پار کر کے امریکہ بھی پہنچ گئے۔“ 12۔(کیرن آرمسٹرانگ: 2001)

امریکی دریافت میں سرمایہ کاری کرنے والی مسلمانوں کی دشمن اول‘ اس دریافت اور نسل انسانی کے قتل عام کو حق دریافت کا نظریاتی سائبان مہیا کرنے والے تنگ نظر اور انتہا پسند اسلام دشمن عیسائی اسقف اور اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے والے بدخو اور حریص فطرت یہودی کے اشتراک اور ان تمام اسلام دشمن عناصر کی مربوط کوششوں سے جو ریاست اور قوم وجود میں آئی اور جو زمین آباد ہوئی وہاں پر اسلام دشمنی کے جنون پر نہ تو کسی کو حیرت ہونی چاہیے اور نہ ہی یہ خوش فہمی کہ اسلام دشمنی کی اساس پر وجود میں آنے والی ریاست کو تعاون‘ خوشامدانہ اطوار اور خود سپردگی کے زور پر اپنے حق میں رام کیا جاسکتا ہے۔

کرسٹو فر کولمبس کی خواہش کے عین مطابق اس نئی دنیا میں عیسائی دنیا کے لیے ایسا محفوظ و مضبوط مرکز وجود میں آچکا ہے کہ جہاں سے عالم اسلام کے خلاف لشکر پہ لشکر روانہ ہو رہے ہیں۔ سازشیں ہو رہی ہیں' منصوبے باندھے جا رہے ہیں اور چالیں چلی جا رہی ہوں۔ ادھر لشکر' سازشیں' منصوبے اور چالیں ہیں ادھر قفل لگے ہیں' پردے پڑے ہیں' مہریں لگی ہیں اور گرہیں پڑی ہیں۔ مسلم امہ کے اکثر حکمران اعلانیہ اور بیشتر اندر خانے اسی مرکز سے جڑے ہیں۔ ذاتی اور شخصی مفادات' بے حمیتی اور خود سپردگی نے یوں آنکھیں بند کر رکھی ہیں کہ وہ تاریخ کی شہادت سے انکار کر رہے ہیں۔ طمع اور بے آبروئی نے ایسا زور باندھ رکھا ہے کہ وہ اُمہ کے ابطال پر اور اس کا مذاق اڑانے پر اتر آئے ہیں۔ قفل' مہر' پردے' گرہیں اور مذاق اڑانا اپنی جگہ لیکن ہمارے ان رویّوں پر تنبیہ موجود ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ: خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ (سورۃ البقرہ)

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ج وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ لا قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ لا اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ○

ترجمہ: اور جب ملتے ہیں ایمان والوں سے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اکیلے ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو صرف (ان کا) مذاق اڑا رہے تھے۔ (سورۃ البقرۃ)

یوں تو مسلمان حکمرانوں کی غیر مسلم حکمرانوں سے اندر خانے' خفیہ خفیہ اور اکیلے ملاقاتوں میں مسلم امہ کا مذاق اڑانے اور امہ کو نقصان پہنچانے کی تاریخ طویل ہے مگر بیسویں صدی کے وسط سے ادھر واشنگٹن ڈی سی میں مسلمان حکمرانوں اور امریکی صدور کے درمیان' ون ٹو ون' اکیلے اور خفیہ ملاقاتوں کا زور بندھا ہے ادھر امہ مسلسل جگ ہنسائی' خسارے' تسخیر اور تمسخر کی زد میں ہے۔ ان ون ٹو ون ملاقاتوں میں جانے ہمارا مذاق زیادہ اڑایا جاتا ہے یا ہمارے خلاف

سازش زیادہ ہوتی ہے۔ واقعہ جو بھی ہو لیکن ایسی ہر ون ٹو ون ملاقات کے بعد مسلمانوں کی گردن مزید ایک اور کڑکی تلے آجاتی ہے۔ ون ٹو ون ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جسے ایران کے محمد رضا شاہ پہلوی نے پروان چڑھایا تھا' انور السادات' شاہ حسین' جنرل محمد سوہارتو' جنرل ایوب خان' خالد بن عبدالعزیز' جنرل جعفر نمیری' فہد بن عبدالعزیز' شاہ حسن اور حسنی مبارک سے ہوتے ہوئے یہ کار بد جنرل پرویز مشرف تک آن پہنچا ہے۔ ادھر جنرل پرویز مشرف صدر امریکہ سے ون ٹو ون' کا ڈول ڈالتے ہیں ادھر ہم وانا کے مکینوں' پاکستان کے آئین' اسمبلیوں' مدرسے کے طالبوں اور باریش جوانوں کو حسرت اور الوداعی خدشے سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ یا اللہ خیر' جانے اس بار ہمارے حق میں کیا طے پایا ہو۔ بات ہمارا مذاق اڑانے تک رہی ہو یا اس سے بھی آگے تک گئی ہو۔

* * *

قصر الحمرا کی چابیاں ملکہ ازابیلا و بادشاہ فرڈی نینڈ کو پیش کرتے ہوئے زیاں‘ شکست اور سب کچھ کھو دینے کے احساس نے امیر ابو عبداللہ (باب دل) کو غمزدہ کر دیا۔ ان کی آنکھیں لہو رنگ اور لہجہ دل گیر ہو گیا۔ انہیں رقت زدہ دیکھ کر بادشاہ فرڈی نینڈ نے از راہِ ترحم کہا ”شک نہ کرو ہمارے وعدوں پر“ قریب کھڑے مورّخ نے اس فرمانِ شاہی کو از بر اور تاریخ نے محفوظ کر لیا۔ اب اسے تاریخ کی بے رحمی کہیئے یا اس کا دوہرایا جانا کہ پانچ صدیوں بعد صدر جارج بش بھی ہماری حالت زار پر لفظ بہ لفظ یہی کہہ رہے ہیں کہ ہمارے وعدوں پر شک نہ کرو یوں جیسے بادشاہ فرڈی نینڈ کی روح ان میں حلول کر گئی ہو۔ کیا عجب کہ ان کے وعدے بھی بادشاہ فرڈی نینڈ کے وعدوں کی طرح شرمندہ ایفاء رہیں۔

یا اللہ لگا نہ ہو

”شک نہ کرو ہمارے وعدوں پر نہ ہی دوستی کے اس ثمر پر
جس سے جنگ کی وجہ سے ہم محروم رہے ہیں۔“
(بادشاہ فرڈی نینڈ: 2 جنوری 1492ء)

ہم انا، عزت نفس اور ایمان کے اس آخری درجے تک آن پہنچے ہیں کہ دُعا بھی مانگیں تو وہ بھی موجودہ بے توقیری اور بے آبروئی کے تحفظ کی ہی مانگتے ہیں۔ ہماری حالت میدان جنگ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس سورما کی سی ہو چکی ہے جسے غلطی سے تیر آن لگا تھا۔ وہ سینے میں چبھے تیر اور بہتے خون کو دیکھتا تھا اور کہے جاتا تھا کہ یا اللہ لگا نہ ہو۔ دوستی کی ثمر بھری ان ملاقاتوں پر ہم بھی یہی کہے جاتے ہیں۔

یا اللہ
سازش نہیں
مذاق، مخولیوں کی خیر ہے
پر سازش نہ ہوئی ہو
یا اللہ لگا نہ ہو

یہ جاننے کے باوجود بھی کہ مسلمانوں کا مذاق اڑانے کے لیے اکیلے میں ملاقات ضروری نہیں ہے یہ تو سرعام بھی ہو رہا ہے۔ اکیلے میں تو وہی ہوتا ہے جس کا دلوں میں خدشہ ہے لیکن ہمیں سورۃ البقرہ کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔

زمیں تو پاؤں تلے سے سرک چکی لیکن
مناؤ خیر کہ اب سر سے آسمان گیا

اب تو سورۃ الحج ہی ہماری مصیبت کو اور سورۃ النساء ہی ہمارے بار کو ٹالے تو ٹالے۔ ہم بہر حال اپنی کرنی کر گزرے ہیں۔ جن احکامات ربانی کو ٹالتے ٹالتے نعوذ باللہ ہم کالعدم کے کنڈے تک لے آئے ہیں اور جنہیں یہود کے خط تنسیخ اور نصاریٰ کے خد حذف کی زد میں دے دیا ہے کیا عجب کہ ہماری حیات نو ان احکامات کی تکمیل سے ہی مشروط ہو۔

ملکہ ازابیلا اور کرسٹوفر کولمبس نے اسلام دشمنی، غیر عیسائیوں سے تعصب، مذہبی و فرقہ وارانہ تنگ نظری، سرمایہ داری، دھونس اور دھاندلی کے علاوہ وعدہ خلافی اور فریب کا بیج بھی امریکی زمین میں کامیابی سے بیجا۔ بات سے پھرنا، کہے سے مکرنا اور معاہدے سے پلٹنے کا ننگ بھی زمین کی مناسبت سے یہاں خوب پھلا پھولا۔ کولمبس جب امریکہ پہنچا تو اس کے تجربے میں معاہدہ سقوط غرناطہ کا المناک انجام بھی شامل تھا۔ جو حشر اس تحریری معاہدے کا ہوا، کرسٹوفر کولمبس اس سے پوری طرح باخبر تھا۔ اور اس کا اظہار اس کے رویے میں نمایاں تھا۔ سقوط غرناطہ کی شرائط طے کرنے کے لیے ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ کی طرف سے جو حکام مقرر کیے گئے تھے ان میں جنرل گونز الوفرینڈز، بادشاہ کا سیکرٹری فرنانڈو زافرا کے علاوہ ملکہ و بادشاہ کا مذہبی مشیر ہرنینڈ و ٹالا ویرا بھی شامل تھا۔ 1۔(اورنگ واشنگٹن:1850)

(واضح رہے کہ سقوط کے وقت الحمرا کے مرکزی برج سے اسلامی پرچم اتار کر سلور کی صلیب نصب کرنے کی ذمہ داری ہرنینڈ و ٹالا ویرا کو ہی سونپی گئی تھی جو اس نے بہ احسن پوری کی تھی)

مسلمانوں سے سقوط غرناطہ پر مذاکرات کے اسی عرصے میں کوسٹوفر کولمبس کسی نامعلوم اور پُراسرار وجہ سے ہرنینڈ و ٹالا ویرا کا مہمان بنا رہا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لینے میں کسی عالمانہ قیافے کی ضرورت نہیں ہے کہ سقوط غرناطہ کے معاہدے کی شرط شرط اور لفظ لفظ سے کولمبس نہ صرف آگاہ تھا بلکہ یہ بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ کولمبس، ہرنینڈ و ٹالا ویرا، اور فادر مرچینا کے درمیان خصوصی تعلق سقوط کی شرطوں پر بھی اثر انداز ہوا ہو۔ 2۔(جیر یمنوزوریتا:1562)

کولمبس نے مسلمانوں سے ملکہ ازابیلا کی نفرت اور وعدہ خلافی کو قریب سے دیکھا تھا قرائن کہتے ہیں کہ اس واقعہ سے اس نے یہ بھی ضرور سیکھ لیا تھا کہ کمزور اور طاقتور کے درمیان

کیا مکالمہ اور کیا شرائط' کیا معاہدہ' کیا وعدے وعید اور کیا قول کی حرمت۔ یہ تجربہ امریکہ میں کولمبس کے بہت کام آیا۔ معاہدہ سقوط غرناطہ کی طرز پر وہ ریڈ انڈینز سے معاہدے کرتا ان کے مطالبے اور شرائط مان جاتا اور موقع ملتے ہی ریڈ انڈینز کو قتل کردیا جاتا۔ چونکہ اس نے معاہدہ غرناطہ سے بعینہٖ یہی سیکھا تھا کچھ اس کی منافع سرشت اور یہود فطرت کا تقاضا بھی یہی تھا۔

قول نبھانے اور معاہدے کے احترام کی یہ طرز خاص ملکہ ازابیلا کی طرف سے امریکہ کے لیے تحفہ خاص میں بدل گئی۔ تاریخ پر نظر رکھنے والے کہتے ہیں کہ امریکی حکومت کے معاہدے اور امریکی صدور کے وعدے وعید اسی قدر حرمت بھرے ہوتے ہیں۔ جیسے معاہدہ سقوط غرناطہ اور مسلمانوں کے لیے اسی قدر فائدہ بھرے ہوتے ہیں جتنا کہ بحری بیڑے کا چلنا۔ سو یہ دونوں واقعات حافظے میں رہنے ضروری ہیں کہ مسلمانوں کو امریکہ بنانے والوں سے جس قدر تحفظ معاہدہ غرناطہ **1491**ء سے حاصل ہوا تھا۔ **1971**ء میں امریکہ کے بحری بیڑے سے وہ اسی قدر مستفید بھی ہوگئے۔ مسلمانوں کے خلاف تعصب' ناانصافی' مذہبی منافرت' سازش اور وعدہ خلافی کی جو تند لہر اور باد مخالف **1492**ء میں سپین سے چل کر امریکہ تک پہنچی تھی' پانچ صدیاں اور طویل فاصلہ اس کی کاٹ کو کم نہیں کرسکا' نہ ماننے کی بات اور ہے مگر یہ تند لہر اور بادِ مخالف ہمارے لیے موج اجل میں بدل چکی ہے۔ اس موج اجل میں ہمارے لیے ایک حیرانی اور ایک المیہ پوشیدہ ہے۔ المیہ تو یہ ہے کہ اس بار ہمارے معصوم بچے' پردہ نشین خواتین اور باریش جوان اس اجل کی امتیازی زد میں ہیں۔ **1502**ء میں جس طرح عبیدہ سلیمانکا' المیرۂ غرناطہ اور قرطبہ میں شرعی ریش کے حامل مسلمان ترجیحی ہدف تھے بعینہٖ باریش آج بھی اس طرح قتل کیے جارہے ہیں اور حیرانی یہ ہے کہ بال کٹی' آنکھ لگی' ڈورے پڑی' غازہ ملی' سینہ کھلی' گھر سے اکھڑی' میراتھن میں دوڑنے والی' غیر مردوں سے مصافحہ اور نامحرموں سے ہنس کر ملنے والی' ناچ گانے کی محفلوں میں بے قابو اور محفل موسیقی میں جھومنے والی' مخلوط میل ملاقات میں دوپٹہ اچھالنے اور بانہیں پھیلانے والی' جالی دار کپڑے اور شوخ رنگ زیر جامے پہننے والی روشن خیال' چتر زبان اور شعلہ بیان اس اجل سے عموماً محفوظ رہی ہے۔ درج ذیل کے دوچار واقعات ہی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس بار کمان داروں کی زد میں کون ہے اور ان کے ہدف کا رخ کس طرف ہے:

2001 میں قلائی نیازی (افغانستان) میں امریکی بمباری سے شادی میں

شریک 62 افراد شہید کردیئے گئے۔ شہداء کی اکثریت پردہ دار خواتین اور بچوں پر مشتمل تھی۔

جولائی 2002ء میں اورزگان (افغانستان) میں امریکی بمباری نے ایک شادی والے گھر کو ماتم کدے میں بدل دیا۔ شہید ہو جانے والے 120 افراد میں اکثریت پردہ دار خواتین اور نوعمر بچوں کی تھی۔

مئی 2004ء میں شام اور عراق کی سرحد پر ایک گاؤں میں امریکی بمباری سے 42 افراد قتل کیے گئے۔ مقتولوں میں دس پردہ دار خواتین اور پندرہ بچے شامل تھے۔

فروری 2005ء میں موصل اور تکریت (عراق) میں ایک دن میں 163 افراد قتل کیے گئے' مقتولوں میں 48 پردہ دار خواتین اور 67 بچے شامل تھے۔

13 جنوری 2006ء کو ڈمہ ڈولا' باجوڑ (پاکستان) میں امریکی بمباری سے 18 افراد قتل کیے گئے۔ مرنے والوں کی اکثریت عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھی۔

30 جولائی 2006ء کو قانا (لبنان) میں امریکی ساختہ لیزر گائیڈڈ اور کروز میزائلوں سے بمباری کرتے ہوئے' اسرائیلی فضائیہ نے 40 پناہ گزین بچوں سمیت 65 افراد شہید کردیئے۔

عراق پر حالیہ امریکی قبضے کے دوران عراقی اموات کے بارے میں جان ھاپکنز یونیورسٹی کی تحقیقی ٹیم کے سربراہ لیس رابرٹس اپنی تحقیقی رپورٹ میں لکھتے ہیں:

> "عراق میں وحشیانہ قتل و غارت کا نشانہ بننے والوں کی اصل تعداد صرف 17 ماہ میں آج 28 اکتوبر 2004ء تک ایک لاکھ عراقی مقتولوں سے متجاوز ہوچکی ہے۔ یہ تعداد امریکی میڈیا اور تھنک ٹینکس کے مہیا کردہ اعداد وشمار سے 58 گنا زیادہ ہے۔ اتحادی افواج کے ہاتھوں مارے جانے والے ان ایک لاکھ افراد کی اکثریت عورتوں اور بچوں پر مشتمل ہے۔"

3۔ (لیس رابرٹس: 2004)

25 نومبر 1491ء کو 67 شقوں اور پانچ ذیلی دفعات پر مشتمل معاہدہ سقوط غرناطہ کی درج

ذیل دستاویز ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ کی خدمت میں حتمی منظوری کے لیے پیش کی گئی، جو انہی کی ایما پر معتمد خاص فرنانڈو زافرا نے تیار کی تھی۔

معاہدہ سقوط غرناطہ 1491

1۔ اولاً مسلمانوں کا بادشاہ، ملٹری چیفس، عدلیہ کے حکام، قاضی، مذہبی مشیر، گورنرز، علماء، عمال و حکام اور غرناطہ و گردونواح کے مسلمان امن، محبت اور اچھی اُمید کے ساتھ اگلے چالیس دنوں میں قصر الحمراء اور قصر الحزان کو مع تمام ان کی فصیلوں، میناروں، برج اور دروازوں کے شاہی حکومت یا شاہی حکومت کے مقرر کردہ نمائندہ خاص کے حوالے کردینے کا عہد کرتے ہیں۔

2۔ چالیس دنوں کے خاتمے تک اندلس کے مسلمان بہ رضا و رغبت رضا کارانہ طور پر شاہی حکومت یا اس کے حکام کے سامنے غیر مشروط طور پر سقوط کی تکمیل کریں گے۔

3۔ سقوط کی شرائط پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے مور (مسلمان) بادشاہ ابوعبداللہ (باب دل) کا معتمد خاص یوسف ابن قاسم اور ابوعبداللہ کا بیٹا مع پانچ سو یرغمالیوں کے شاہی حکومت کے حوالے کیے جائیں گے۔

4۔ یہ پانچ سو یرغمالی افراد، یوسف ابن قاسم، ابوعبداللہ کے ولی عہد بیٹے، امراء، سلاطین، حکام، اشرافیہ، وزیر، مشیر، جنگی سرداروں اور مذہبی رہنماؤں کے گھریلو افراد، آل اولاد اور عزیز و اقرباء پر مشتمل ہوں گے۔

5۔ مقرر کردہ چالیس دنوں سے دس دن پہلے یہ تمام یرغمالی افراد شاہی حکومت کے تسلط میں دیئے جائیں گے اور وہی ان افراد کی دیکھ بھال، بہبود اور اخراجات کی ذمہ دار ہوگی۔

6۔ سقوط کی تکمیل ہوتے ہی ان یرغمالی افراد کو واپس کر دیا جائے گا بجز ان افراد کے جنہوں نے اس دوران اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول

کر لی ہو گی۔

7۔ قصر الحمراء اور الحزان کے سقوط کے ساتھ ہی اندلس کے تمام علاقے اور ان میں مقیم مسلمان ملکہ ازابیلا بادشاہ فرڈی نینڈ اور ان کے ولی عہد شہزادہ ڈان وان کی رعیت میں شامل ہو جائیں گے۔

8۔ ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ کی مشترکہ افواج چالیس دنوں تک مسلمانوں پر تمام حملوں کو معطل رکھیں گی۔

9۔ اس عرصے میں اگر کوئی بیرونی کمک مسلمانوں کو حاصل نہ ہو سکی تو سقوط غرناطہ عمل میں آ جائے گا۔

10۔ ملکہ و بادشاہ کے مذہبی مشیر ہرنینڈو ٹالا ویرا کی قیادت میں الحمراء پر پیشگی قبضے کے لیے آنے والے عسکری شہر کے عام راستوں سے الحمراء میں داخل نہیں ہوں گے۔ بلکہ ان کی خفیہ رسائی کے لیے علیحدہ مگر خفیہ راستہ بتایا جائے گا یہ خفیہ راہداری مہیا کرنے کی ذمہ داری امیر ابوعبداللہ پر ہو گی۔

11۔ تمام عیسائی قیدیوں کو جو مسلمانوں کے قبضے میں ہیں کسی جزیے کی ادائیگی کے بغیر رہا کر دیا جائے گا۔

12۔ مسلمانوں کے بادشاہ ابوعبداللہ (باب دل) اور دوسرے امراء و سلاطین، حکام و سرداروں کو کاسٹیلین کے تاج شاہی سے وفاداری کا حلف اٹھانا ہو گا۔

13۔ البشارہ کا علاقہ بادشاہ ابوعبداللہ کی دسترس میں دے دیا جائے گا۔

14۔ عالی قدر شاہی حکمران مسلمان بادشاہ کو اور اس کے خاندان کے افراد، امراء اشرافیہ و حکام کو ان کی جائیداد سے محروم نہیں کریں گے۔ ان کے مال و متاع کی حفاظت کی جائے گی۔

15۔ بلا امتیاز امیر غریب، چھوٹے بڑے تمام مسلمانوں کے مال و جان کے تحفظ کی ضمانت دی جاتی ہے۔

16۔ مسلمانوں کی اجتماعی املاک (مساجد) مینار اور منبروں کو تحفظ حاصل ہوگا۔

17۔ مساجد سے متعلق جائیداد کی آمدنی پر حسب سابق مسلمانوں کو ہی اختیار حاصل رہے گا۔

18۔ مساجد اور اوقاف حسب دستور قائم رہیں گے اور ان امور میں عیسائی مداخلت نہیں کریں گے۔

19۔ مسلمانوں کے باہمی تنازعات اور مقدموں کے فیصلے شرعی اور اسلامی قوانین کے مطابق کیئے جائیں گے۔

20۔ اسلامی شرع و قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے والے مسلمان قاضی ہی مسلمانوں کے درمیان فیصلے کرنے پر مقرر و مجاز ہوں گے۔

21۔ غرناطہ اور اس کے گردونواح میں مقیم مسلمانوں کے جنگی ہتھیار اور گھوڑے شاہی حکومت کے تصرف میں آ جائیں گے۔

22۔ مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی ہوگی اور اس مذہبی آزادی کا تحفظ کیا جائے گا۔

23۔ مسلمان قاضی شاہی حکومت کے نامزد کردہ حکام کے ماتحت مذہبی آزادی کو یقینی بنائیں گے۔

24۔ مسلمان تین سال تک ہر طرح کے خراج کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہوں گے۔

25۔ اس مدت کے بعد مسلمان شاہی حکومت کو اسی قدر سالانہ خراج دیا کریں گے جتنا کہ وہ مسلمان حکومت کو دیا کرتے تھے۔

26۔ تین سال کے اندر جو مسلمان افریقہ میں جا کر آباد ہونا چاہیں انہیں کسی بھی بندرگاہ سے بغیر کسی معاوضے کی ادائیگی، جانے کی اجازت ہوگی۔

27۔ مسلمانوں کو افریقہ لے جانے کے لیے دس بڑے بحری جہاز شاہی

حکومت کی طرف سے مختص کیے جائیں گے جو انہیں بلا معاوضہ ستر دنوں کے اندر اندر لے جانے کے پابند ہوں گے۔

28۔ تین سال کی مقرر کردہ مدت کے بعد بھی مسلمانوں کو سپین سے جانے کی اجازت ہوگی بشرطیکہ وہ سفر کے اخراجات کی ادائیگی پر رضا مند ہوں۔

29۔ مسلمانوں کو قابل انتقال جائیداد اور ہلکے ہتھیار اپنے ساتھ افریقہ لے جانے کی اجازت ہوگی۔

30۔ مسلمان خواہ غریب ہوں یا امیر کسی کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

31۔ مسلمانوں کو شہر کے اندر یا شہر سے باہر کسی بھی جگہ رہنے کی اجازت ہوگی۔

32۔ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

33۔ کسی عیسائی کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہودیوں پر بھی یہی ضابطہ نافذ العمل ہوگا۔

34۔ موجودہ جنگ میں جو مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا ہے وہ انہی کی ملکیت میں رہے گا۔

35۔ مسلمانوں کے گھروں پر یا مسجدوں میں عیسائی فوجی (پہرے دار) متعین نہیں کیے جائیں گے۔

36۔ کسی عیسائی کو مسلمانوں کے گھروں میں داخل ہونے یا تاک جھانک کی اجازت نہیں ہوگی۔

37۔ ٹیکس کی عمومی شرح سے زیادہ کوئی اضافی رقم یا خصوصی ٹیکس مسلمانوں سے وصول نہیں کیا جائے گا۔

38۔ پبلک آفس کے کسی بھی یہودی یا عیسائی عمال کو جو بادشاہ ابوعبداللہ کا مقرر کردہ ہوگا اسے مسلمانوں پر قانون کے نفاذ اور ان کے معاملات

پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا۔

39۔ جو عیسائی مذہب اسلام میں داخل ہوگئے ہیں انہیں ترکِ اسلام پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

40۔ اگر کوئی مسلمان عیسائی ہونا چاہے تو وہ بہ رضا و رغبت ایسا کرسکتا ہے اور اس کے تصفیئے کا آخری حق صرف مسلمانوں کو ہی ہوگا۔

41۔ ایسی عیسائی عورتیں جو قبول اسلام کے بعد مسلمانوں کے نکاح میں آچکی ہیں انہیں دوبارہ عیسائیت کی طرف مراجعت پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

42۔ اس معاہدے سے پہلے وہ تمام عیسائی مرد و زن جو اسلام قبول کرچکے ہیں انہیں بزور طاقت عیسائیت پر مراجعت کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

43۔ اسلام سے عیسائیت پر مراجعت کے خواہش مند افراد کو مسلمان اور عیسائی علماء کی مشترکہ کمیٹی کے سامنے اپنے تبدیلی مذہب کا اعلان اور موقف بیان کرنا ہوگا۔

44۔ عیسائی عورتوں اور مسلمان مردوں کے بچوں کو بلوغت کے بعد اپنی مرضی سے کوئی بھی مذہب اختیار کرنے کی اجازت ہوگی۔

45۔ کسی مسلمان مرد کو عیسائیت قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا نہ ہی کسی مسلمان عورت کو عیسائی مردوں سے شادی پر مجبور کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ مسلمانوں اور عیسائی علماء کی کمیٹی کے سامنے عیسائیت قبول کرلے۔

46۔ کسی بھی مسلمان عورت کو عیسائی مردوں سے عشق و محبت اور بے راہروی کی بنیاد پر شادی کی اجازت نہیں ہوگی۔

47۔ محاصرہ غرناطہ کے دوران بنائے گئے مسلمان قیدیوں کو سقوط کے وقت رہا کردیا جائے گا۔

48۔ اپنے عیسائی آقاؤں سے بھاگے ہوئے ایسے مسلمان جو غرناطہ میں

پناہ لے چکے ہیں انہیں واپس کرنے کی بجائے بادشاہ ابو عبداللہ اُن کی قیمت ان کے عیسائی آقاؤں کو ادا کرے گا۔

49۔ کسی فرد کو کسی دوسرے فرد کے جرائم پر سزا نہیں دی جائے گی۔

50۔ عالی قدر شاہی حکمران، ولی عہد اور بعد میں آنے والے ہسپانوی حکمران مسلمانوں کو امتیازی نشان پہننے پر مجبور نہیں کریں گے جیسا کہ یہودیوں پر امتیازی نشان پہننے کی پابندی رہی ہے۔

51۔ مسلمان زرعی ٹیکس سے مستثنٰی نہیں ہوں گے انہیں اپنی فصلوں اور مال مویشیوں کا دسواں حصہ ہر سال ماہ اگست میں زرعی ٹیکس کے طور پر ادا کرنا ہوگا۔

52۔ سقوط کے وقت غرناطہ اور گردو نواح کے مسلمان اپنے تمام عیسائی قیدیوں کوا ور غلاموں کو شاہی حکام کے حوالے کرنے کے پابند ہوں گے۔

53۔ عیسائی قیدیوں کی رہائی بغیر کسی جزیئے تاوان یا معاوضے کی ادائیگی کے بغیر عمل میں لائی جائے گی۔

54۔ بادشاہ ابو عبداللہ یا اس کے حکام، امراء وسلاطین کسی عیسائی فرد کو شاہی حکومت کی اجازت کے بغیر اپنا غلام (خدمت گار) نہیں رکھ سکتے۔

55۔ عالی قدر ملکہ و بادشاہ کسی یہودی کو مسلمانوں سے ٹیکس کی وصولی پر معمور نہیں کریں گے نہ ہی کسی یہودی کو مسلمانوں پر عمال یا افسر مقرر کیا جائے گا۔

56۔ بادشاہ ابو عبداللہ، مسلمان علماء، دانشور، جنگی سردار اور عام مسلمان رعایا کو اپنے خیالات ونظریات کا اظہار کرنے کی آزادی ہوگی۔

57۔ ملکہ و بادشاہ ان خیالات ونظریات کا احترام کریں گے اور شاہی حکومت ان سے دوستانہ اور مہذبانہ سلوک روا رکھے گی۔

58۔ مسلمانوں سے ان کے ملبوسات، مال اسباب، پرندے، پودے، مویشی

اور ذاتی اثاثہ جات چھین لینے پر پابندی ہوگی۔

59۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تنازعات کے فیصلے عیسائی اور مسلمان قاضی مل کر انجام دیں گے تاکہ کسی بھی فریق کو حصول انصاف میں دشواری اور طریق انصاف پر شک وشبہ نہ رہے۔

60۔ ایسے تمام مسلمانوں کی املاک اور اثاثوں کو جو علاقائی عیسائی سرداروں کی عملداری میں پناہ گزین ہیں تحفظ حاصل ہوگا۔

61۔ اس معاہدے سے پہلے جو عیسائی غلام (خدمت گار) اور قیدی مسلمانوں کی پناہ میں مارے جاچکے ہیں مسلمانوں سے اس کی باز پرس نہیں ہوگی۔

62۔ ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں ایسے حکام متعین کریں گے جو اس معاہدے کا احترام کریں گے اور مسلمانوں سے عزت و احترام سے پیش آئیں گے۔ ایسے عیسائی عمال و حکام قابل مواخذہ ہوں گے جو اس معاہدے پر عمل درآمد میں کوتاہی کے مرتکب پائے جائیں گے۔

63۔ سابق مسلمان امیر الزاغل کے کسی نمائندے کو ابو عبداللہ پر کوئی اختیار نہیں دیا جائے گا نہ ہی الزاغل کے کسی نمائندے کو بادشاہ غرناطہ ابو عبداللہ پر کاسٹیلین کی شاہی حکومت کی طرف سے حاکم مقرر کیا جائے گا۔

64۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذبح خانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا جائے گا۔

65۔ مسلمانوں کو شاہی افواج میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور اگر مسلمان شہ سوار شاہی فوج میں شامل کیے جائیں گے تو انہیں اس کا معقول معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

66۔ عالی قدر ملکہ و بادشاہ کی شاہی حکومت غرناطہ اور اس کے گرد و نواح

میں ذرائع آب پاشی کے وسائل کی حفاظت کرے گی اور ان ذرائع کو نقصان پہنچانے والے قابل تعزیر ہوں گے۔

67۔ غرناطہ اوراس کے گرد و نواح میں تمام یہودیوں پر اس معاہدے کا یکساں اطلاق ہوگا اور یہودی بھی اس معاہدے سے مستفید ہوں گے۔ بربر اور افریقی علاقوں میں جانے والوں کو 8 دسمبر 1491 سے اگلے تین سالوں کے اندر اندر سپین سے جانا ہوگا۔ عالی قدر شاہی حکومت اس بات کو یقینی بنائے گی کہ سقوط غرناطہ کے ہوتے ہی اس معاہدہ سقوط غرناطہ کی تمام شرائط بیک وقت نافذ العمل ہوں۔ اس معاہدے کو مؤثر بنانے کے لیے کیتھولک رومن پوپ (روم) کے دستخط اس معاہدے پر کرائے جائیں گے اور وہی اس کی تعمیل کا ضامن ٹھہرایا جائے گا۔

دستخط	دستخط
امیر ابوعبداللہ، بادشاہ غرناطہ	ملکہ ازابیلا و بادشاہ فرڈی عینڈ
ابوالقاسم عبدالملک	فرنانڈو زافرا
(گورنر غرناطہ، ومشیر خاص)	(سیکرٹری ومعتمد خاص)
اسلامی سلطنت، حکومہ اندلس	شاہی عیسائی حکومت
غرناطہ، الاندلس، ہسپانیہ	کاسٹیلین۔ ہسپانیہ

بمطابق سال عیسائیت مسیح: 1491 بتاریخ 25 نومبر

4۔ (سیمانکاز آرکائیو: والا ڈولڈ، سپین)

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۝

معاہدہ سقوط غرناطہ اپنی نوعیت میں جس قدر تفصیلی اور مسلمانوں کے حق میں جتنا بے ضرر نظر آتا تھا، حقیقتاً اسی قدر ضرر رساں ثابت ہوا۔ معاہدہ غرناطہ کی کسی ایک شق پر بھی عدم عمل درآمد سے معاہدوں سے پھرنے کے رجحان نے زور پکڑا۔ اس تجربے نے کولمبس پر جو اثرات مرتب کیے وہ شمالی امریکہ میں اس کے کردار و افعال میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ کولمبس کا یہ تجربہ اور رویہ اس زمین میں خوب پھلا پھولا۔ اس کاربد کو یہاں یوں بھاگ لگے کہ یہ ملکہ ازابیلا سے کولمبس میں، کولمبس سے برطانوی آبادکاروں میں اور برطانوی آبادکاروں سے امریکی حکومتوں

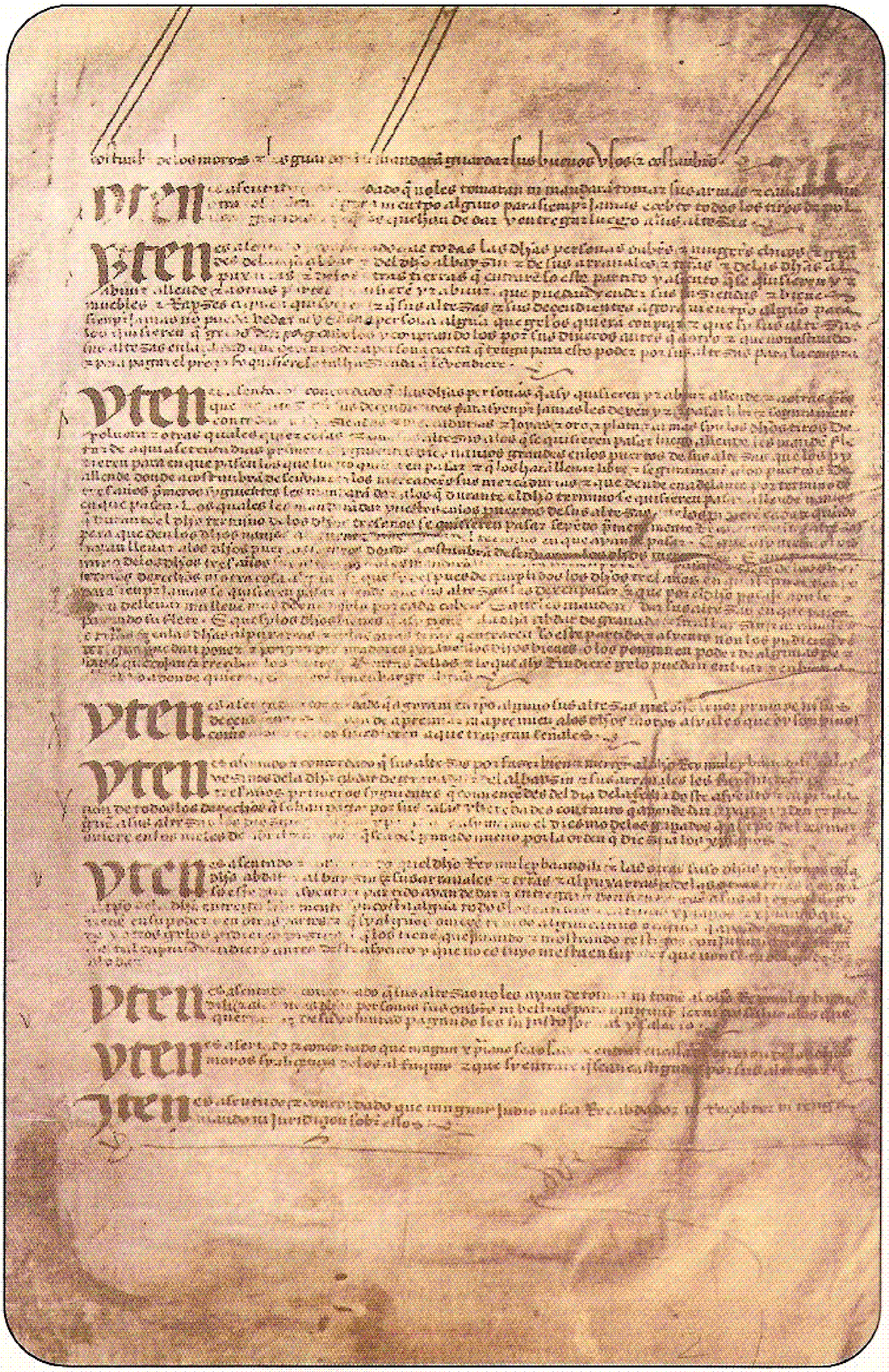

دستاویز معاہدہ سقوط غرناطہ کا مصدقہ عکس (25 نومبر 1491)

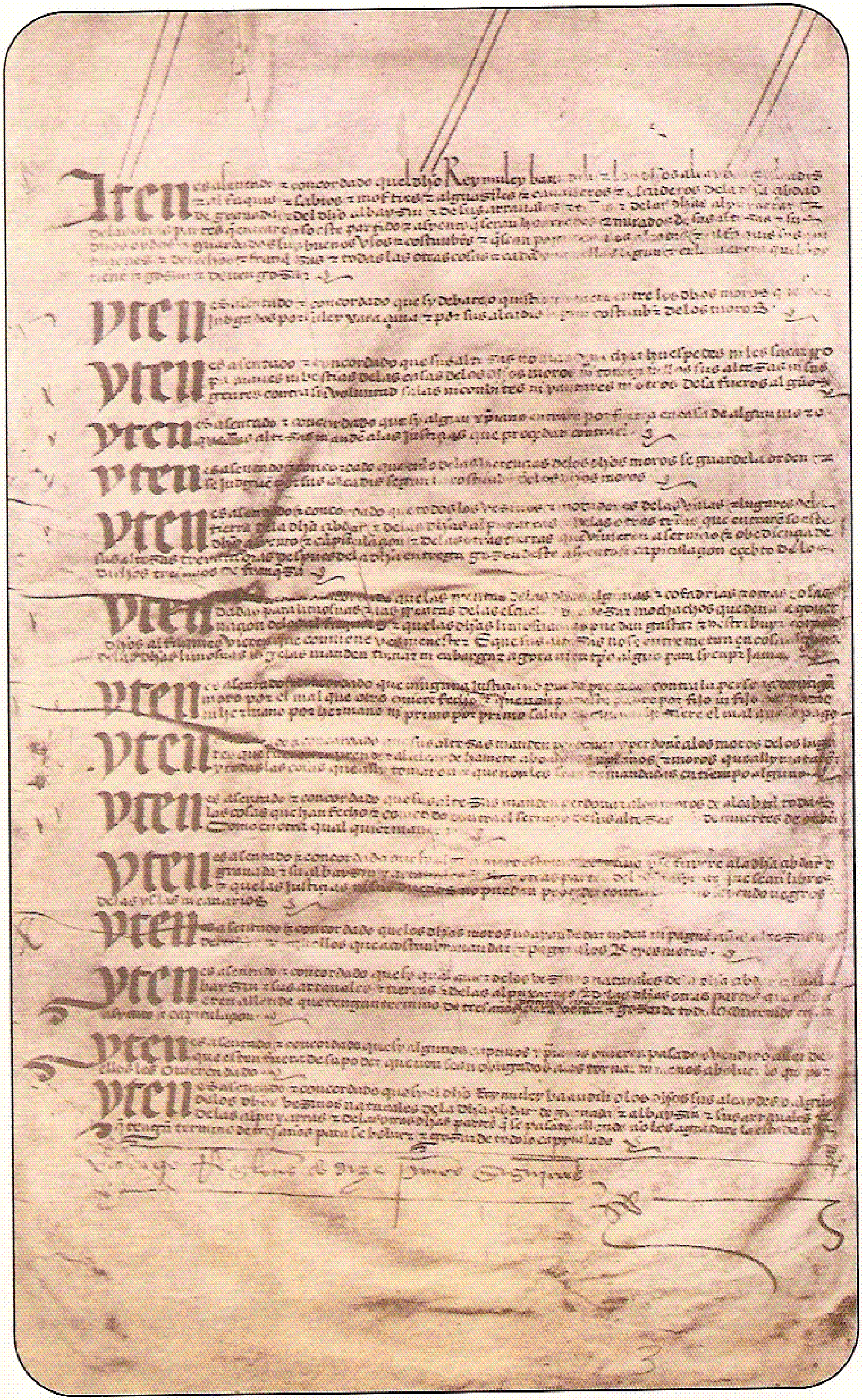

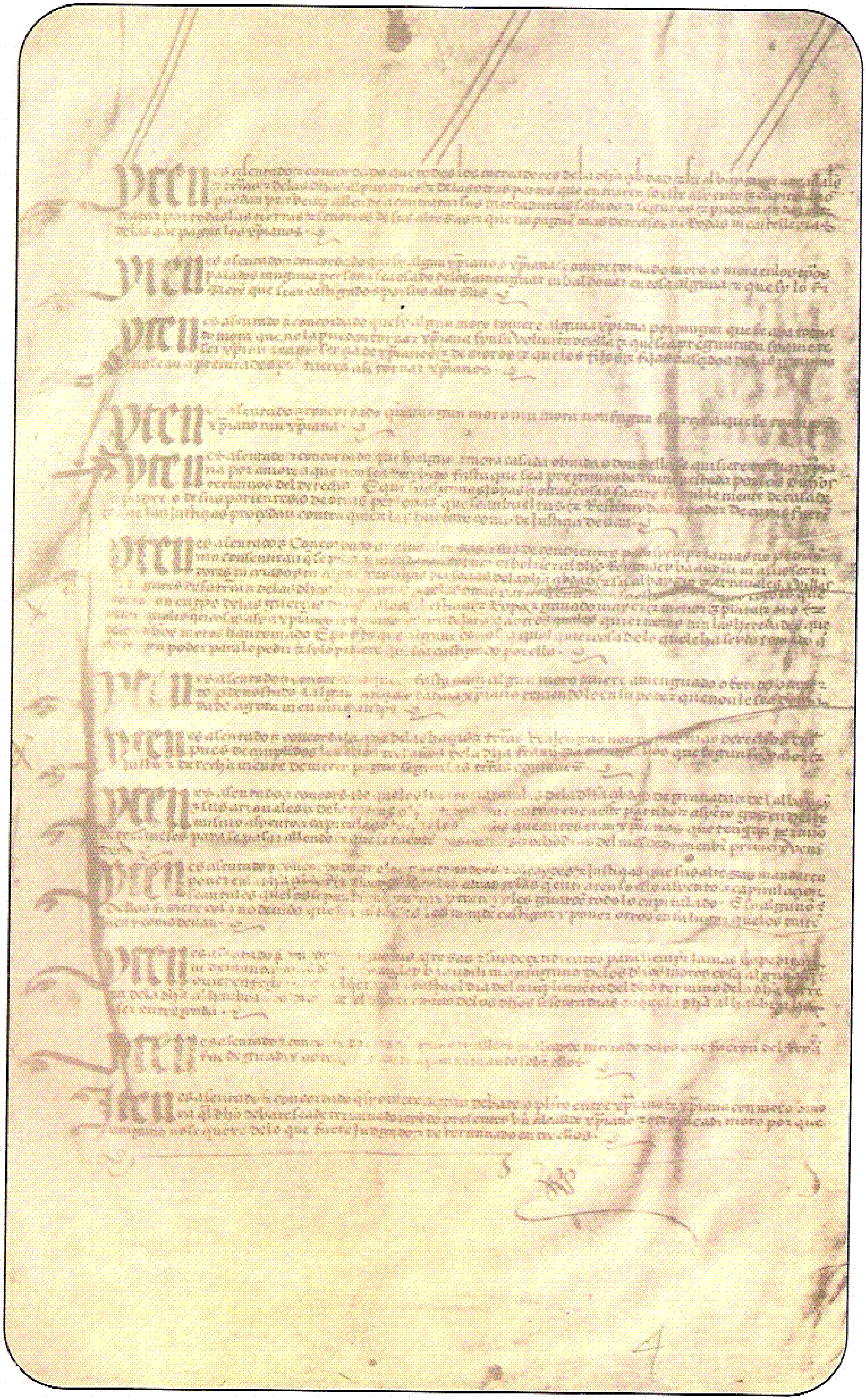

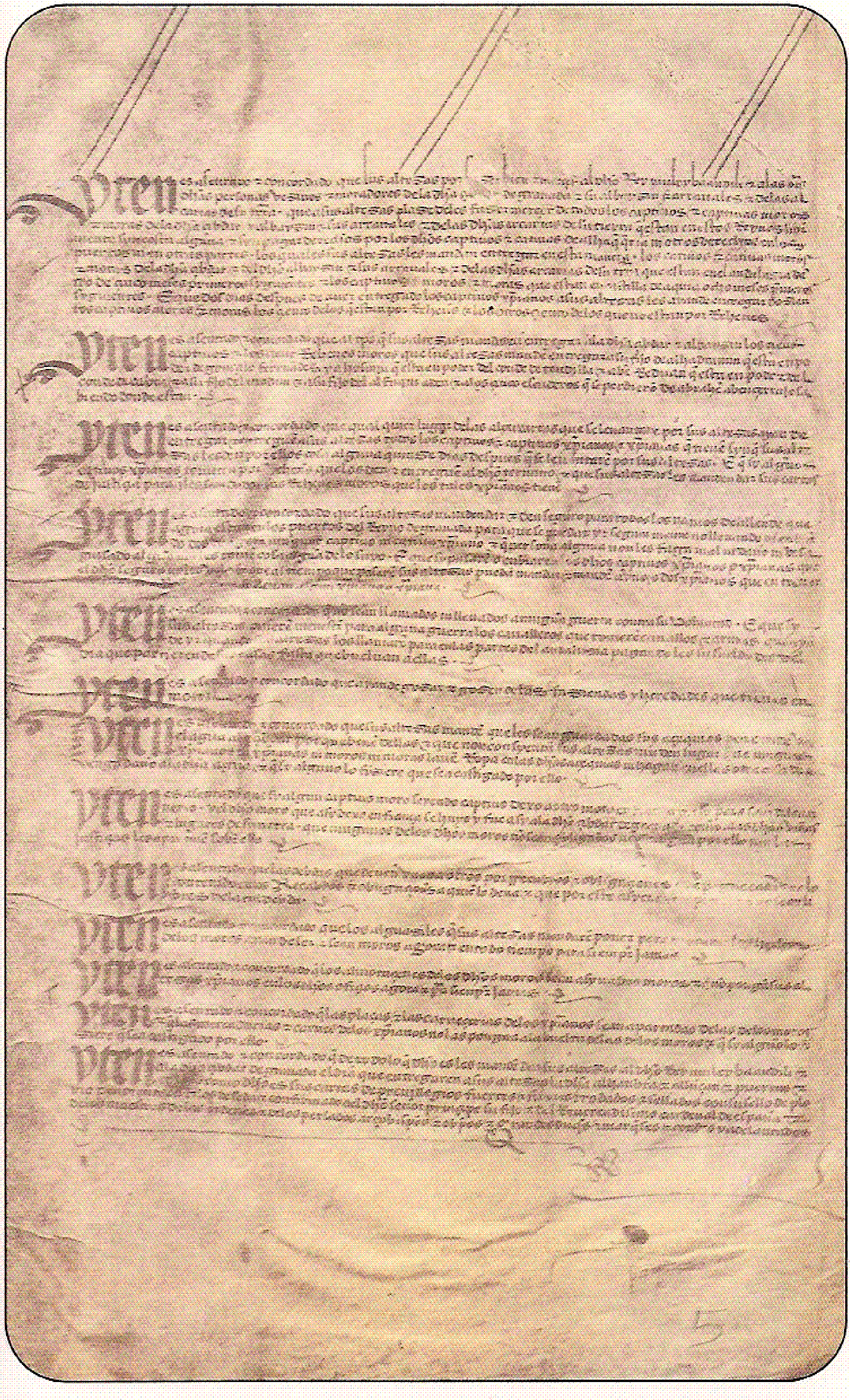

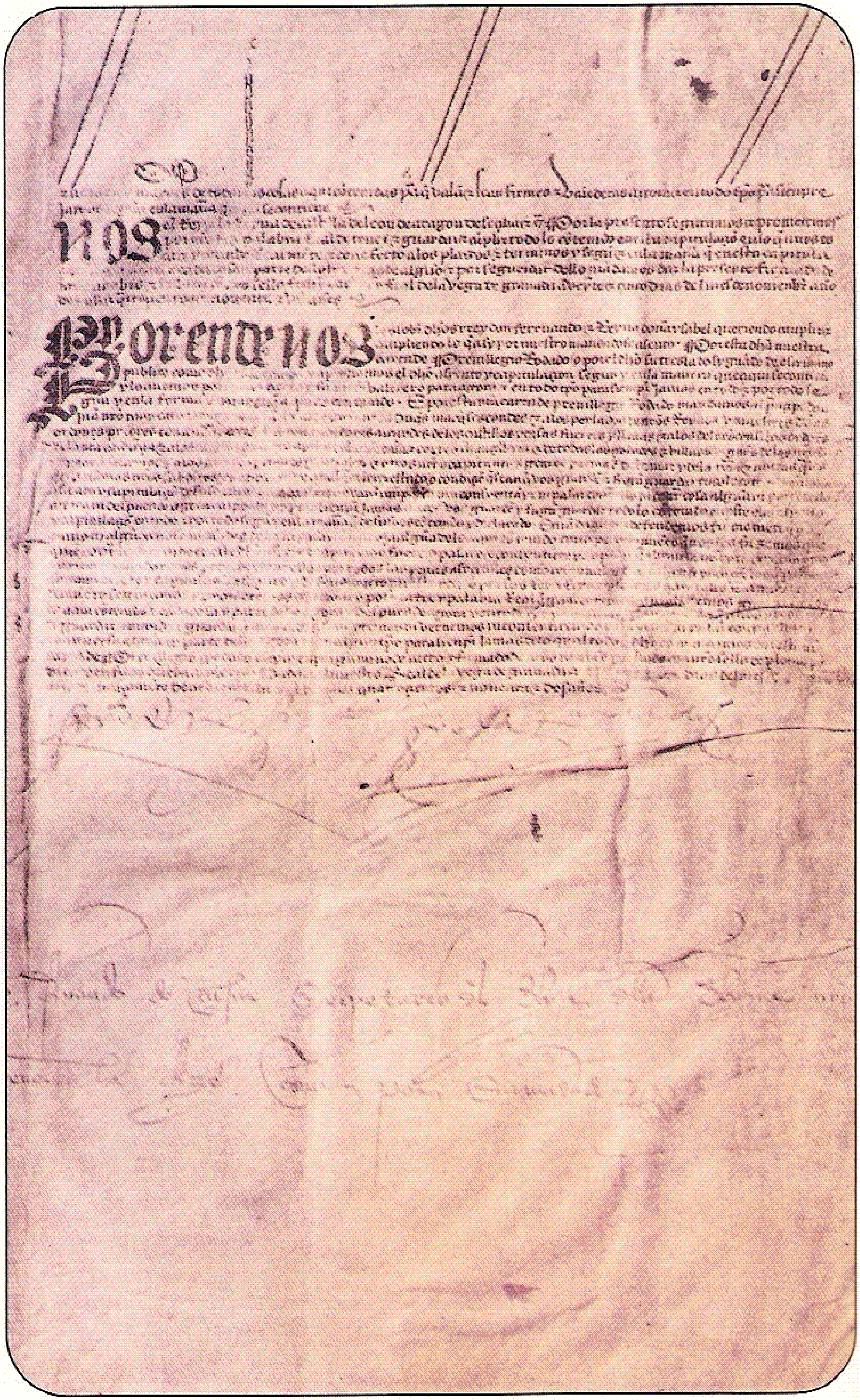

Nos

Por ende nos

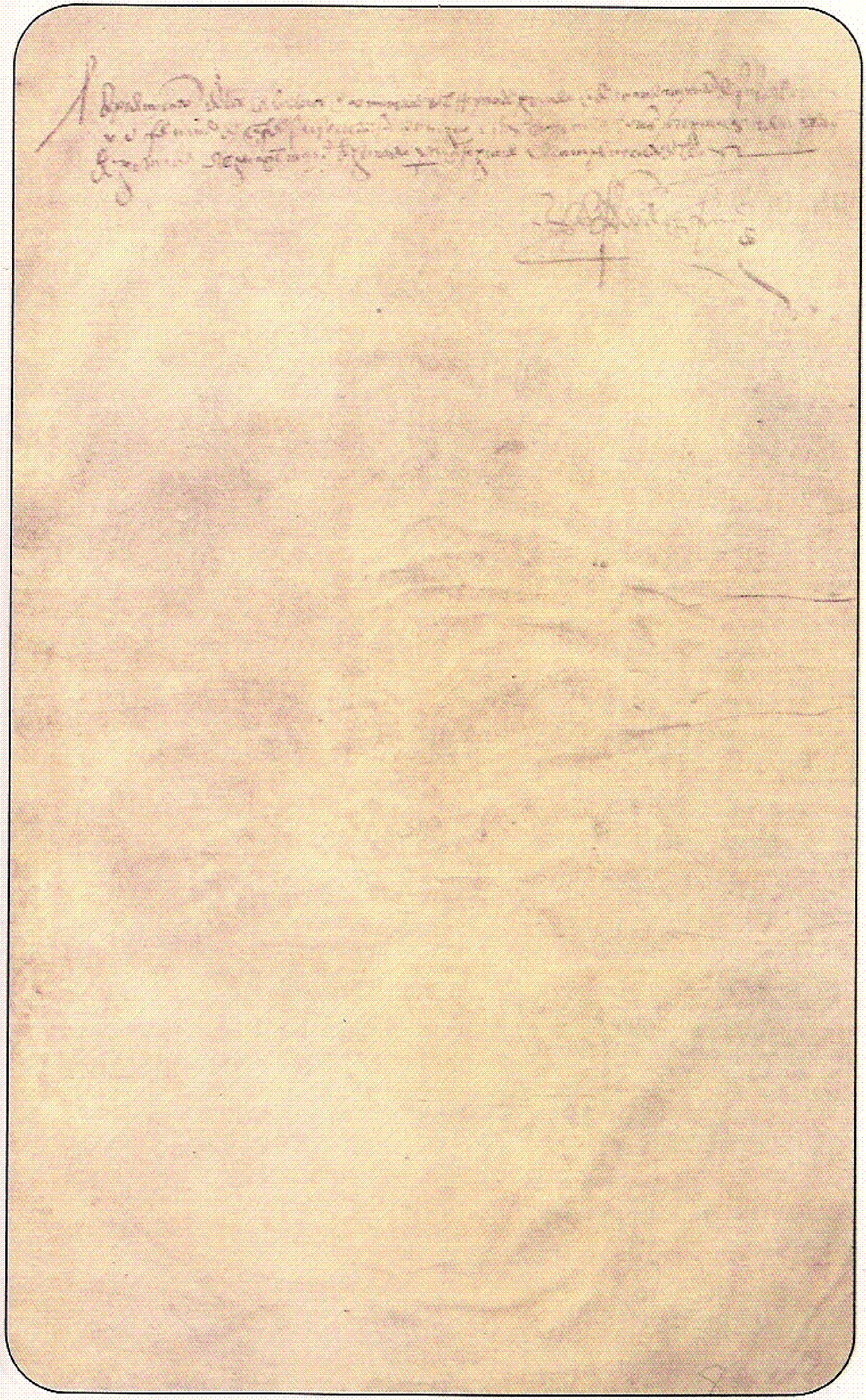

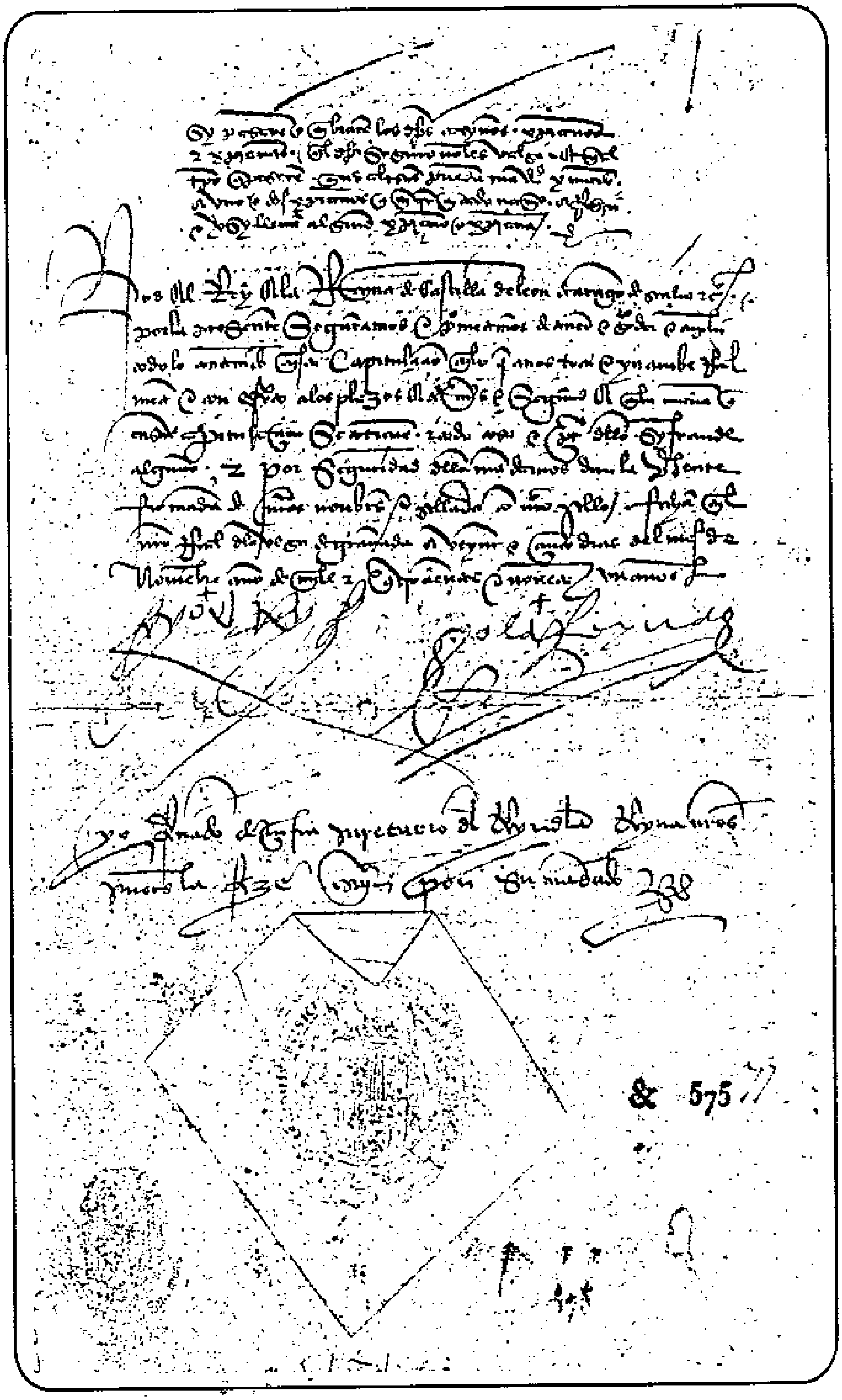

[illegible]

Nos el Rey y la Reyna de Castilla de Leon de Aragon de Secilia etc. por la presente seguramos e prometemos de vos e guardar e cumplir todo lo contenido en esta capitulacion [illegible] en todo [illegible] alguno, e por seguridad dello vos mandamos dar la presente firmada de nuestros nombres e sellada con nuestro sello. Fecha en la nuestra [illegible] de Granada a [illegible] dias del mes de [illegible] año de mill e quatrocientos e noventa e dos años.

Yo el Rey

Yo la Reyna

yo Fernand de Çafra secretario del Rey e de la Reyna nuestros señores la fize escreuir por su mandado

& 575

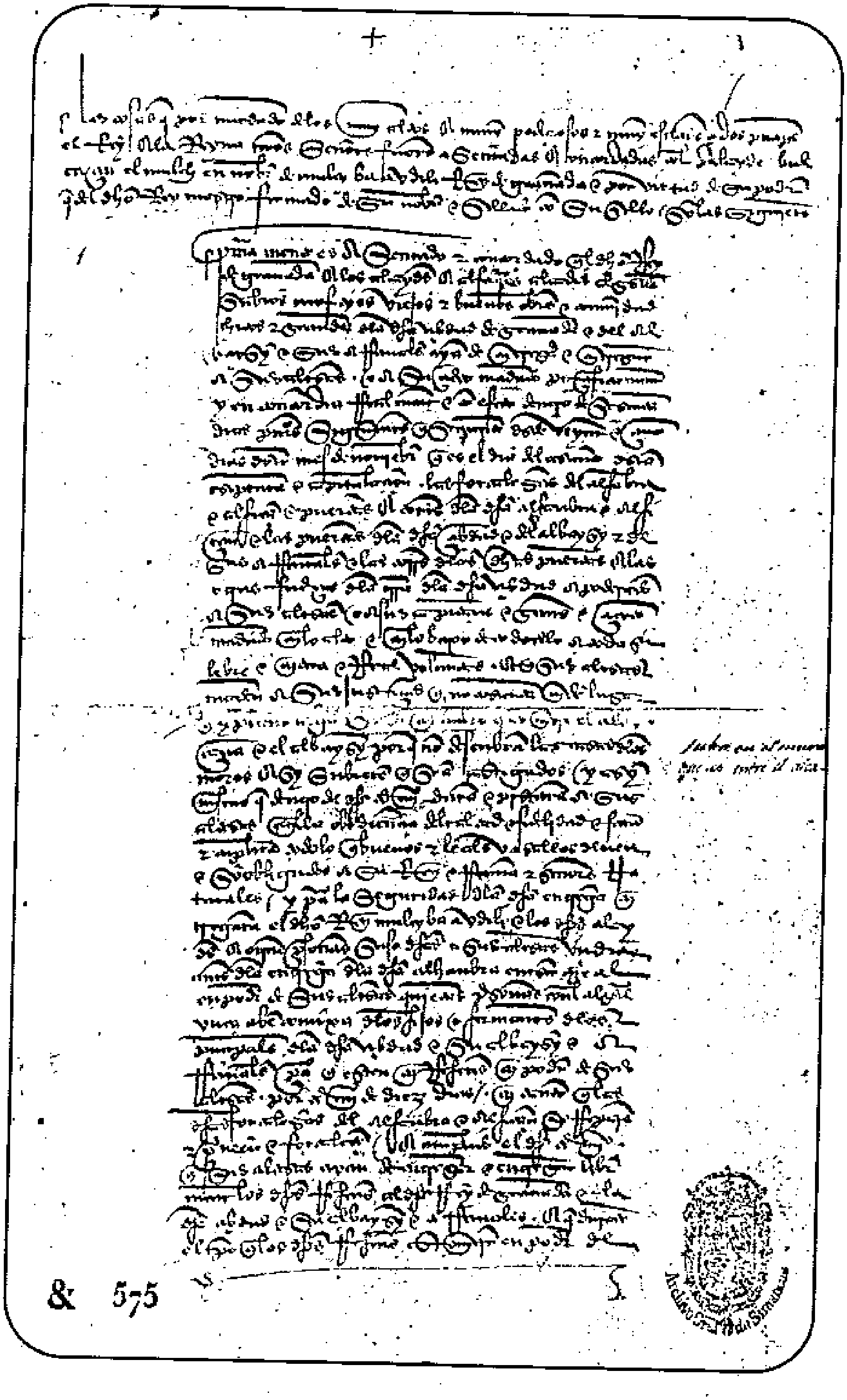

& 575

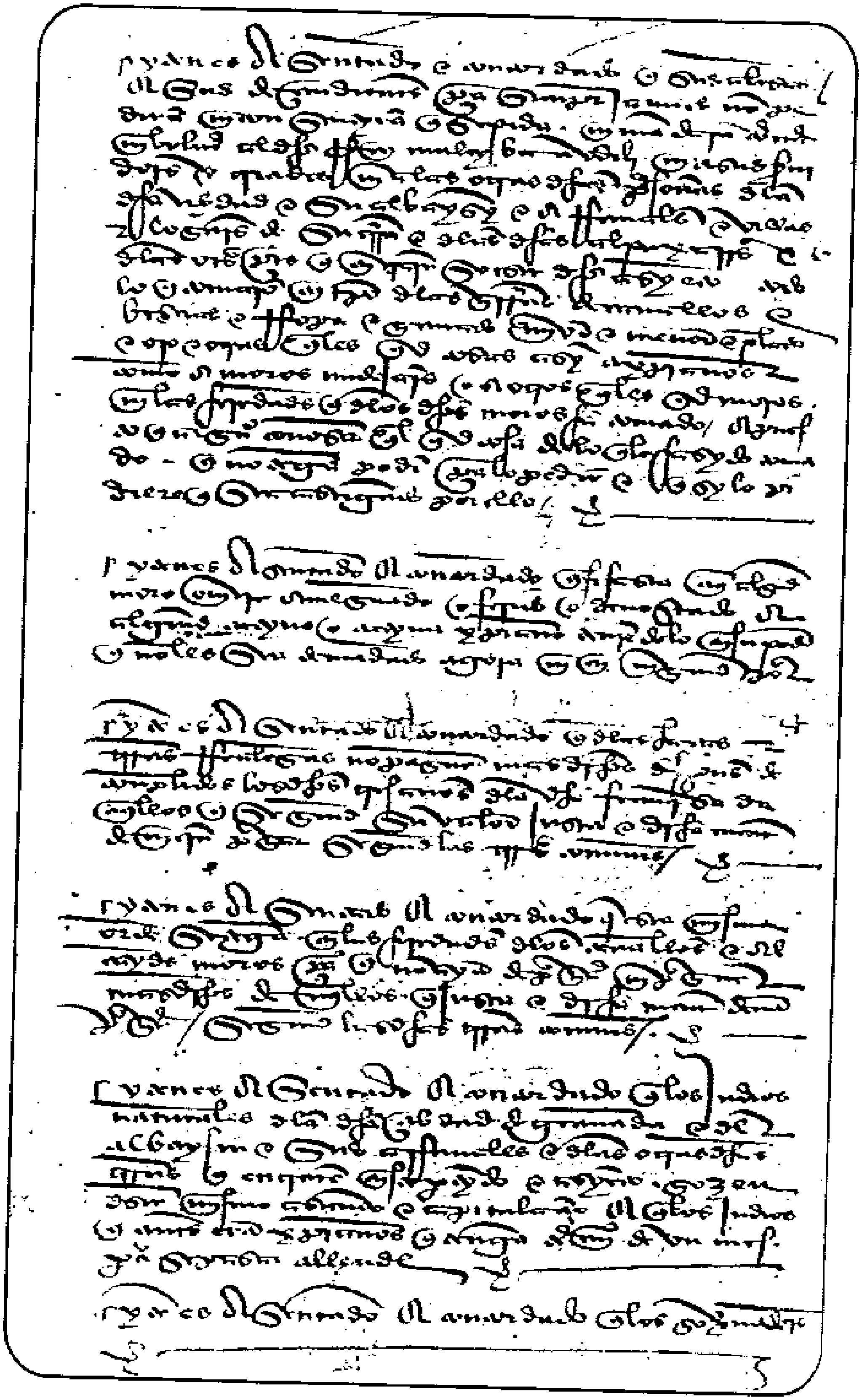

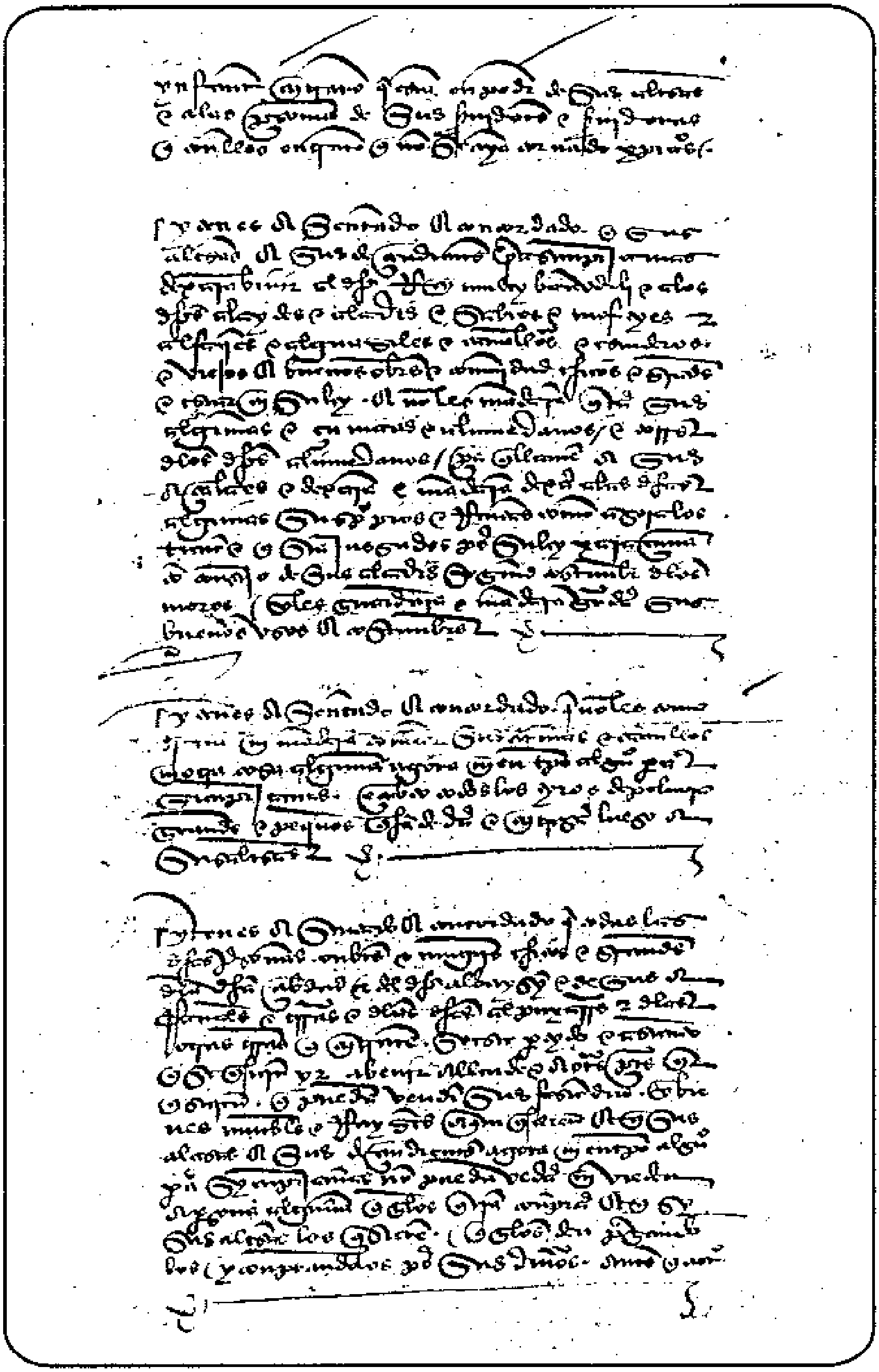

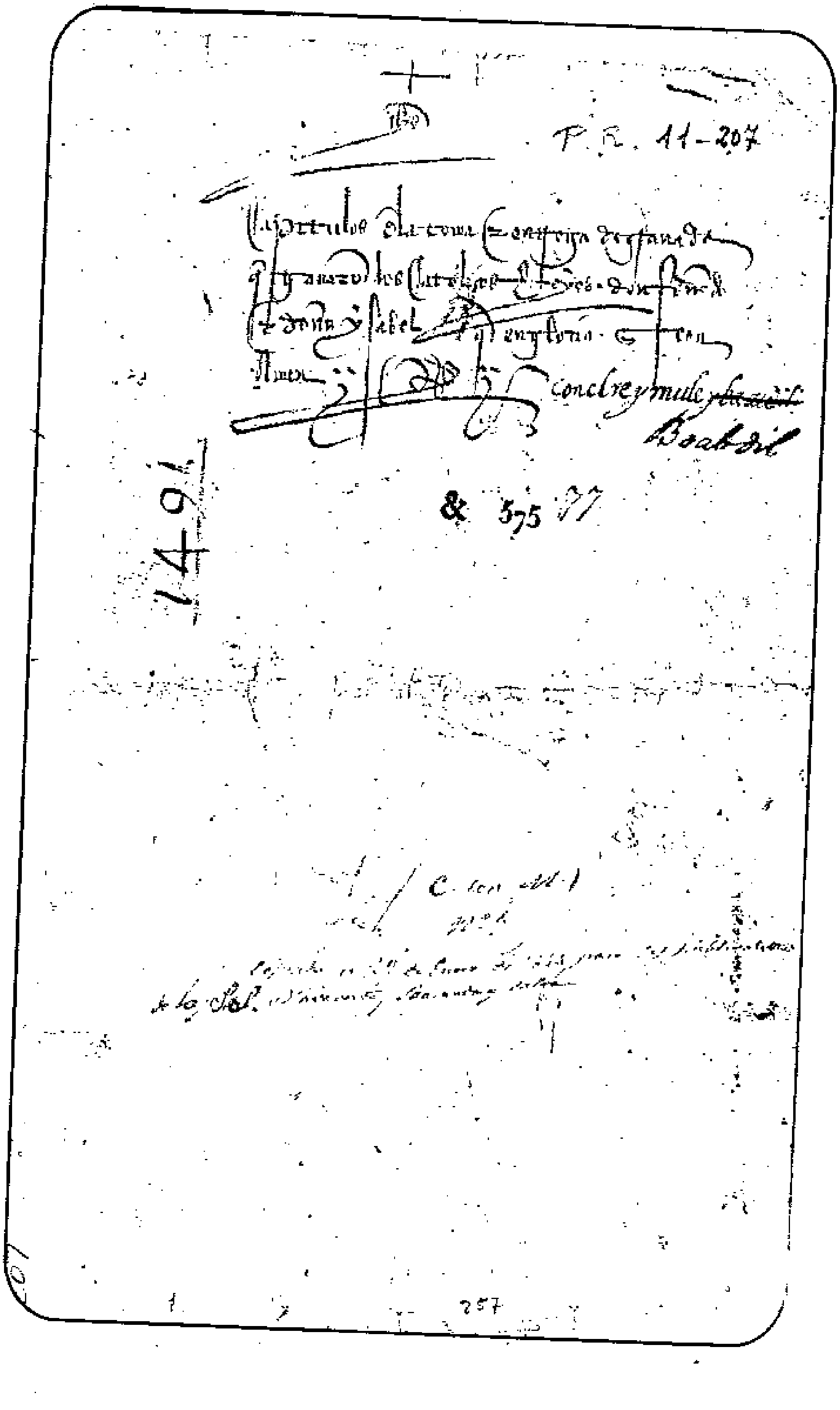

P. R. 11-207

Capitulos dela toma e entrega de granada
que fizieron los Catolicos Reyes don ferrnd
e doña ysabel [illegible] en gloria [illegible]
[illegible] con el rey muley ~~[illegible]~~

Boabdil

1491

& 575 77

C. [illegible]

[illegible]

257

میں منتقل ہوتا رہا۔ منتقلی کا یہ عمل اب مکمل ہو کر صیقل ہو چکا ہے۔ وعدہ شکنی کے امریکہ میں یوں پو بارہ ہوئے کہ کور چشموں کو اب یہی کاربد' کارخیر نظر آتا ہے۔

یا اللہ لگا نہ ہو۔

یوں تو مومنوں کے بارے میں نوید یہی ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسے جاتے لیکن ہم پر یا تو یہ نوید زیادہ کڑی ہے یا ہماری آزمائش زیادہ سخت ہے۔ واقعہ جو بھی ہو لیکن ہم بار بار ایک ہی سوراخ سے ڈسے گئے ہیں۔ اگر منہ موماناں ہونا ہماری تقصیر ہے تو یہ نازیبا ہے اور اگر کرتوت کافراں ہماری تعزیر ٹھہری ہے تو اللہ ہمیں معاف کرے۔

- سقوط غرناطہ
- سقوط دہلی (مسلم ہندوستان)
- سقوط بیت المقدس
- سقوط مشرقی پاکستان
- سقوط کابل
- سقوط بغداد
- سقوط؟

اللہ ہمیں سقوط کا ایک اور بج لگنے سے محفوظ رکھے۔ لیکن لگتا ہے کہ یہ لگے ہی لگے۔ ملکہ ازابیلا' بادشاہ فرڈی ننڈ' کرسٹوفر کولمبس' ملکہ الزبتھ' سر تھامس رو' لارڈ رابرٹ کلائیو' کونڈو لیزا رائس' ٹونی بلیئر اور جارج ڈبلیو بش ـــــ ایک تسلسل ہے جو ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ ایک عفریت ہے جس نے مسلم اُمہ کی گردن دبوچی ہوئی ہے' ایک ہی خون آشام ہے جس کے دانت پانچ صدیوں سے ہماری شہ رگ میں گڑے ہیں۔ نظریہ حق دریافت سے نیو ورلڈ آرڈر تک اور نیو ورلڈ آرڈر سے حملہ برائے حفظ ماتقدم تک ایک ہی نظریہ ہے جو نام بدل بدل کے اُمہ کا لہو چاٹ رہا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ادھر شقاوت اور مطالبے بڑھتے جا رہے ہیں اور اُدھر خود سپردگی۔ ادھر طرز جابرانہ عروج پر ہے اور ادھر ادائے فدویانہ۔ ادھر ہمیں ہر نیا سقوط پہلے کی نسبت زیادہ سقیم الحالی سے دوچار کر دیتا ہے۔ ادھر ہمارے عبداللہ پہلے سے زیادہ کج حوصلہ' عزت نفس سے عاری' ہتھیار پھینک' خود سپرد' نین مستانے اور ڈورے ڈال ہوتے جاتے ہیں۔ سقوط غرناطہ کے جرم عبرت میں ابو عبداللہ (باب دل) کے لیے ندامت اور ملامت کی خواہ جتنی بھی کالک ہو لیکن بدقسمت امیر کی

پشیمانی ماتم کناں اور درد بار نظر آتی تھی جب کہ ندامت، خجالت یا پشیمانی جیسی کسی چیز کو اپنے نیازی صاحب نے قریب تک نہ پھٹکنے دیا۔

مشہور تاریخ دان اور محقق وان ڈی ماریانا ابوعبداللہ کے آخری خطاب کے بارے میں میں لکھتے ہیں کہ غرناطہ میں قحط کی شدت، بھوک، مصائب، اموات اور غرناطہ کے ناقابل دفاع حالات کے پس منظر میں 31 دسمبر 1491ء کو امیر ابوعبداللہ اپنے امراء و وزرا کی کونسل سے آخری بار مخاطب ہوا تو شدت غم سے رندھی ہوئی آواز اور ماتمی کیفیت میں اس نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا:

> ”اپنے باپ سے بغاوت کرکے تاج شاہی حاصل کرلینا میرا جرم تھا جس کے نتیجے میں آج یہ دشمن ہماری سلطنت تک آن پہنچے ہیں۔ میرے اللہ نے میری تقصیر میرے سر پر رکھ دی ہے۔ میں نے تمہیں تلوار سے بچانے کی خاطر یہ معاہدہ کیا ہے۔ تمہیں قحط سے محفوظ رکھنے کے لیے تمہاری ازواج اور بیٹیوں کو جنگ کی انتقامی ہولناکیوں سے بچانے کے لیے، تمہارا مستقبل، تمہاری جائیدادیں، تمہاری آزادی، تمہارے قوانین اور تمہارے مذہب کی بقا کے لیے میں تمہیں بدقسمت ابوعبداللہ کی بجائے خوش بخت حاکم اعلیٰ (فرڈی ننڈ اور ملکہ ازابیلا) کی پناہ میں دیتا ہوں۔“
>
> 5۔(وان ڈی ماریانا:1592)

جب کہ صد صفت اور ہزار حیلہ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی، امیر ابوعبداللہ سے کہیں زیادہ چکنے، چپڑے اور گفتار کے غازی ثابت ہوئے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد وہ تیس سال سے زیادہ حیات رہے مگر اس تمام عرصے میں انہوں نے اپنے چکنے پنڈے، چپڑی باتوں اور فوجی کھال پر یک بوند نہ ٹھہرنے دی۔ وہ سقوط کی ساری ذمہ داری جی ایچ کیو، ناموافق سیاسی حالات، وسائل کی کمی اور پاکستان آرمی کی اس پالیسی پر ڈالتے رہے جس کے تحت مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہونا تھا۔ سقوط کے عینی شاہد بریگیڈیر صدیق سالک لکھتے ہیں:

> ”ان کے (جنرل نیازی) ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو سارے المیے سے بری الذمہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سقوطِ مشرقی

پاکستان کا ذمہ دار جنرل یحییٰ خان ہے۔''

6۔ (بریگیڈیئر صدیق سالک:1977)

جانے ہمارے لشکریوں کے نصاب میں سقوط مسلم ہسپانیہ کا المیہ اور سقوط غرناطہ سے عبرت کا موضوع شامل ہی نہیں ہے یا جنرل نیازی ہر قیمت پر اپنی اس شہرت کے دفاع پر کمر بستہ رہے کہ انہوں نے زندگی بھر کسی کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یوں تو خیر سے زندگی بھر کسی کتاب کو ہاتھ نہ لگانے کے اصول پر ہمارے جنرلز کی اکثریت کاربند رہی ہے لیکن جس طرح بھنور کی آنکھ میں محصور پر ہر الزام کلک کر کے فٹ بیٹھتا ہے سو جنرل نیازی کی کتاب سے محتاط رہنے کی شہرت ذرا زیادہ عریاں ہوگئی ورنہ اس حمام میں ننگے جرنیلوں کی کمی نہیں ہے۔ کچھ انہوں نے اس الزام کو جھٹلانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ واقعہ جو بھی ہو لیکن جنرل نیازی نے ہر دو ممکنات کو سچ کر دکھایا' یا تو سقوط غرناطہ کی شرائط اور بعد از سقوط جو حشر اس معاہدے اور مسلمانوں کا ہوا' ان کی مدھ بھری اور آمادہ اکھ مٹکا آنکھ سے گزرا ہی نہیں اور اگر گزرا تو وہ اس سے کوئی عبرت' کوئی سبق اور کوئی راہنمائی نہ لے سکے حالانکہ وہ اپنے دفاعی ٹوٹکوں اور فوجی اٹکل میں ممتاز رہے تھے۔ بھلے وقتوں کے انگریز جنرلز کی کئی کہاوتیں انہیں ازبر تھیں جن کے برمحل استعمال سے انہوں نے اپنے ننگے جوڑی داروں پر اپنے فوجی مطالعے کی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ بریگیڈیئر صدیق سالک نے اپنی کتاب میں جنرل نیازی سے اپنا ایک مکالمہ قلم بند کیا ہے جس سے نیازی صاحب کی دھاک لشکارے مارتی نظر آتی ہے۔ صدیق سالک لکھتے ہیں:

> ''قوم کو دھوکا دینے والے یحییٰ خاں واحد شخص نہ تھے' جنرل نیازی اس میدان میں ان سے بھی دو قدم آگے تھے۔ انہوں نے متعدد بار اعلان کیا: ''اگر جنگ چھڑ گئی' تو میدانِ کارزار بھارت کی سرزمین بنے گی۔'' اسی جنونی کیفیت میں وہ کبھی آسام اور کبھی کلکتہ پر قبضہ کرنے کی دھمکی دیتے۔ مَیں نے رائے عامہ کے نقطہ نظر سے ان سے گذارش کی کہ آپ ایسی بے پَر کی نہ اُڑائیں' کیونکہ اس سے بیجا توقعات بڑھتی ہیں جنہیں آپ کبھی پورا نہیں کرسکیں گے۔ اس پر انہوں نے کسی کتاب سے رٹا ہوا یہ جملہ دُہرایا کہ
>
> ''دھوکہ دہی بھی جنگ جیتنے کا ایک گُر ہے۔ خواہ شیطانی سہی۔''
>
> انہی دنوں (24 اکتوبر) انہوں نے مجھے صبح صبح اپنے دفتر میں طلب فرمایا اور

پوچھا:

''تمہارے دوست (غیر ملکی نامہ نگار) کیا کہتے ہیں؟''

''اُن کا خیال ہے کہ جنگ چھڑنے کو ہے۔''

''میں بھی اس کے لیے تیار ہوں' میرے دفاعی انتظامات مکمل ہیں' ستر ہزار تربیت یافتہ افراد پوزیشن میں ہیں۔ میرے پاؤں بڑے مضبوط ہیں......''

''......مگر فضائیہ اور بحریہ کی حمایت تو محدود ہے!''

''کوئی بات نہیں' میں نے فضائیہ اور بحریہ کی مدد کے بغیر جنگ لڑنے کا منصوبہ بنایا ہے۔''

''......پھر بھی میرا خیال ہے کہ اندر اور باہر دونوں طرف دشمن ہے' اس سے نپٹنے کے لیے آپ کے پاس وسائل بہت محدود ہیں' مجھے ڈر ہے کہ......''

''کس چیز کا ڈر ہے؟......''

''مجھے ڈر ہے کہ جنگ کی صورت میں سرحدوں کے باہر اور سرحدوں کے اندر دشمن کو آپس میں ملنے کے لیے ہماری پتلی سی دفاعی لائن میں سوراخ ڈالنا ہوگا جو زیادہ مشکل نہیں' کیونکہ اس کی حیثیت سینڈ وچ میں پتلے سے قتلے جیسی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر خطرے کی بات یہ ہے کہ بھارت شگاف ڈالنے کے لیے سرحد کے جس نقطے کو منتخب کرنا چاہے کرسکتا ہے' کیونکہ پہل اس کے ہاتھ میں ہے......''

''اوئے' تمہارے خدشات سراسر بے بنیاد ہیں۔ تم افرادی قوت کا حساب لگا کر یہ سب کچھ کہہ رہے ہو' تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جنگیں جرنیلوں کے زور سے جیتی جاتی ہیں' سپاہیوں کی تعداد سے نہیں___ اور تمہیں معلوم ہے کہ جرنیلی کا زور کیا ہوتا ہے___؟ صحیح وقت پر' صحیح مقام پر افواج کی صحیح تعداد کو متعین کرنا___'' یہ جملہ سُن کر مجھے لمحے بھر کو یہ احساس ہوا کہ شاید جنرل نیازی کی یہ شہرت کہ انہوں نے زندگی میں کبھی کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا' مبالغے پر مبنی ہے۔

7۔ (بریگیڈیر صدیق سالک: 1977)

جنرل نیازی جس طرح کی کہاوتوں' ٹوٹکوں اور اٹکل کے رچے ہوئے تھے اس طرح

کے علم سے بعینہٖ یہی ممکن تھا جو انہوں نے کیا۔ وہ اس بات کا ادراک ہی نہ کر سکے کہ اگر سقوط غرناطہ کی 67 شرائط اور لمبا چوڑا تفصیلی معاہدہ مسلمانوں کو بے آبروئی سے محفوظ نہیں رکھ سکا تھا تو آدھے صفحے اور تین شرطوں پر مشتمل سقوط مشرقی پاکستان کی دستاویز انہیں کس قدر تحفظ دے سکے گی لیکن وہ اپنے تئیں مطمئن تھے کہ سقوط کے نتیجے میں انہوں نے نوے ہزار فوجیوں کو بچالیا ہے حالانکہ فوجیوں کا بچایا جانا ایشو ہی نہیں تھا انہیں مشرقی پاکستان کے تحفظ اور پاکستان کی سالمیت کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری دے کر بھیجا گیا تھا۔ اس ضمن میں جنرل نیازی اس نظریے کے قائل تھے کہ ”میں نوے ہزار بیواؤں اور لاکھوں یتیموں کا سامنا کرنے کی بجائے نوے ہزار قیدی واپس لے جانا بہتر سمجھتا ہوں۔“ وہ نوے ہزار قیدی تو بچا لائے لیکن وطن عزیز کا افتخار، اُمہ کی عزت نفس، ہماری آبرو اور قائداعظم کی امانت وہیں چھوڑ آئے۔ غالباً جارجز کلیمنیو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ:

”جنگ بہت سنجیدہ موضوع ہے اس میں ملٹری پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔“ (جارجز کلینمیو)

دستاویز سقوط

> بنگلہ دیش میں پاکستان کی مشرقی کمان میں تمام مسلح افواج بھارت اور بنگلہ دیشی افواج کے جنرل آفیسر کمانڈنگ لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر رضا مند ہیں۔ اس ہتھیار سپردگی کا اطلاق یکساں طور پر پاکستان کی جملہ مسلح افواج پر ہوگا۔ جن میں بری، بحری، فضائی افواج، نیم فوجی ادارے اور سول آرمڈ فورسز شامل ہیں۔ یہ افواج جن مقامات پر موجود ہیں وہیں لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑا کی زیر کمان بھارتی افواج کے نزدیک ترین فوجیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گی۔
>
> اس دستاویز پر دستخط ہوتے ہی پاکستان کی مشرقی کمان لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑا کے زیر احکام آجائے گی۔ عدم عمل درآمد احکامات کو سقوط کی شرائط کی خلاف ورزی سمجھا جائے گا جس سے قابل قبول مستعمل جنگی قوانین کے مطابق نبٹا جائے گا۔ سقوط کی شرائط کے معانی و تشریح

میں کسی بھی ابہام کی صورت میں لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑا کا فیصلہ حتمی ہوگا۔

لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑا، اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ ہتھیار ڈالنے والوں سے جنیوا کنونشن کے مطابق عزت و احترام کا سلوک کیا جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں اور ہتھیار ڈالنے والے پاکستانی فوجی و نیم فوجی افراد کی سلامتی اور بہبود کی ضمانت دی جاتی ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑا کی زیر کمان افواج غیر ملکی افراد، مخصوص اقلیتوں اور مغربی پاکستان کے باشندوں کا تحفظ کریں گی۔

دستخط	دستخط
امیر عبداللہ خان نیازی	جگجیت سنگھ اروڑا
لیفٹیننٹ جنرل	لیفٹیننٹ جنرل
مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون بی	جنرل آفیسر کمانڈنگ انچیف
کمانڈر ایسٹرن کمان (پاکستان)	افواج بھارت/ بنگلہ دیش
	مشرقی محاذ
16 دسمبر 1971ء	16 دسمبر 1971ء

8۔ (بنگلہ دیش لبریشن وار میوزیم: بنگلہ دیش پیپرز: 1971)

جنرل نیازی مشرقی پاکستان پہنچتے ہی عالمی مشاہدین کی کڑی نظروں میں آ چکے تھے لیکن نہیں اس کا ادراک ہی نہیں تھا۔ میڈیا میں جو کچھ ان کے بارے میں لکھا گیا اس کی روشنی میں وہ پانی کے سر سے گزر جانے تک ڈنر پیلنے، مصنوعی اور جھوٹی رپورٹس دینے، بڑکیں مارنے، یشمی سکارف پہننے، خضاب لگانے، چکن تکہ سے دل اور بنگالی بیسواؤں سے من بہلانے میں مصروف رہے اور جب پانی سر سے گزر گیا تو وہ بھارتی ہائی کمان کو فحش اور فوش لطیفے سنا کر رام رنے میں مصروف ہوگئے۔ سقوط کے مماثل موقع پر جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کے برعکس میر ابوعبداللہ امیر غرناطہ پر آزردگی اور دل زدگی سے ایسی رقت طاری تھی کہ وہ تاریخ کے صفحوں میں بدقسمت ابوعبداللہ (باب دل) کے نام سے منسوب ہوکر محفوظ ہوگئی۔ وان ڈی ماریانا سقوط طہ کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

INSTRUMENT OF SURRENDER

The PAKISTAN Eastern Command agree to surrender all PAKISTAN Armed Forces in BANGLA DESH to Lieutenant-General JAGJIT SINGH AURORA. General Officer Commanding in Chief of the Indian and BANGLA DESH forces in the Eastern Theatre. This surrender includes all PAKISTAN land, air and naval forces as also all para-military forces and civil armed forces. These forces will lay down their arms and surrender at the places where they are currently located to the nearest regular troops under the command of Lieutenant-General JAGJIT SINGH AURORA.

The PAKISTAN Eastern Command shall come under orders of Lieutenant-General JAGJIT SINGH AURORA as soon as this instrument has been signed. Disobedience of orders will be regarded as a breach of the surrender terms and will be dealt with in accordance with the accepted laws and usages of war. The decision of Lieutenant-General JAGJIT SINGH AURORA will be final, should any doubt arise as to the meaning or interpretation of the surrender terms.

Lieutenant-General JAGJIT SINGH AURORA gives a solemn assurance that personnel who surrender shall be treated with dignity and respect that soldiers are entitled to in accordance with provisions of the GENEVA Convention and guarantees the safety and well-being of all PAKISTAN military and para-military forces who surrenders. Protection will be provide to foreign nationals, ethnic minorities and personnel of WEST PAKISTAN origin by the forces under the command of Lieutenant-General JAGJIT SINGH AURORA.

(JAGJIT SINGH AURORA)
Lieutenant-General
General Officer Commanding in Chief
India and BANGLA DESH Forces in the
Eastern Theatre

16 December 1971

AAK Niazi Lt-Gen

(AMIR ABDULLAH KHAN NIAZI)
Lieutenant-General
Martial Law Administrator Zone 8 and
Commander Eastern Command (Pakistan)

16 December 1971

> "2 جنوری کو سقوط کی صبح ابھی نمودار بھی نہیں ہوئی تھی کہ امیر ابو عبداللہ کی گھریلو خواتین منہ اندھیرے قصر الحمراء سے البشارہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ خواتین کی اس جماعت میں امیر کی والدہ سلطان عائشہ لہورہ اور بیوی زہرہ زورامہ کے علاوہ شاہی خاندان اور قریبی امراء کی خواتین شامل تھیں۔ سلطانہ عائشہ لہورہ نے تو ہمت کا ثبوت دیا اور خاموش رہیں لیکن باقی خواتین الحمراء کو مڑ مڑ کر دیکھتی تھیں اور روئے جاتی تھیں۔ ان کی آہ و بکا اور سسکیوں سے البشارہ کی سنسان وادی گونجتی تھی۔ ادھر غم اور صدمے سے نڈھال امیر ابو عبداللہ کو شہر غرناطہ کی چابیاں ملکہ ازابیلا اور فرڈی نینڈ کو پیش کرنے کا المناک مرحلہ درپیش تھا وہ شدت غم سے مغلوب رندھی ہوئی آواز میں چابیاں دیتے وقت فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابیلا سے صرف یہی کہہ سکا کہ "یہ چابیاں سپین میں مسلمان سلطنت کی آخری نشانی ہیں یہ ہماری مملکت اور ہمارے ہونے کی علامت ہیں۔ خدا کی منشاء یہی ہے کہ یہ تمہیں دے دی جائیں۔ یہ تمہیں اس اُمید پر سونپتا ہوں کہ تم ہم سے نرمی کا سلوک کرنے کے وعدے پر قائم رہو گے۔"
>
> اس کے جواب میں بادشاہ فرڈی نینڈ نے مختصر سے جواب میں کہا۔
>
> "شک نہ کرو ہمارے وعدوں پر نہ ہی دوستی کے اس ثمر پر جس سے جنگ کی وجہ سے ہم محروم رہے ہیں۔" 9۔ (وان ڈی ماریان:1592)

ادھر جنرل نیازی نئی دہلی سے سقوط کی دستاویز ڈھاکہ لانے والے بھارتی میجر جنرل جیکب اور میجر جنرل ناگرا کی تواضع لطیفوں سے کر رہے تھے۔ بھارتی جرنیلوں کو خوش رکھنے میں جنرل نیازی کی فحش گوئی کا اندازہ لگانے کے لیے کسی عالمانہ اٹکل کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ انہی کا' کام ہے جن کے حوصلے ہیں زیاد

ایک طرف ہمارے سپہ سالار اسلامی افواج کی اخلاقی جرأت کا یہ حال تھا کہ قیامت کی چال چلتی ساعت میں بھی وہ اپنی یاوہ گوئی سے دست بردار نہ ہوئے دوسری طرف بریگیڈیئر صدیق سالک انہی سے اخلاقی جرأت کے اعلیٰ ترین مظاہرے کی اُمید وابستہ کیے ہوئے تھے۔

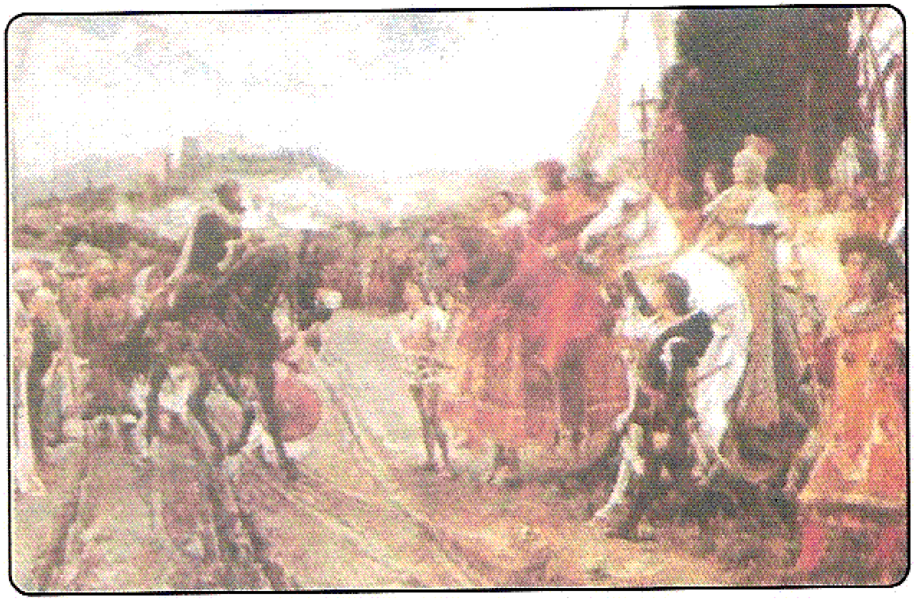

سقوطِ غرناطہ: والئ غرناطہ امیر ابو عبداللہ (باب دِل) ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ کو قصرِ الحمراء کی چابیاں پیش کر رہے ہیں۔ (آرٹسٹ : ایف پاڈیلا)

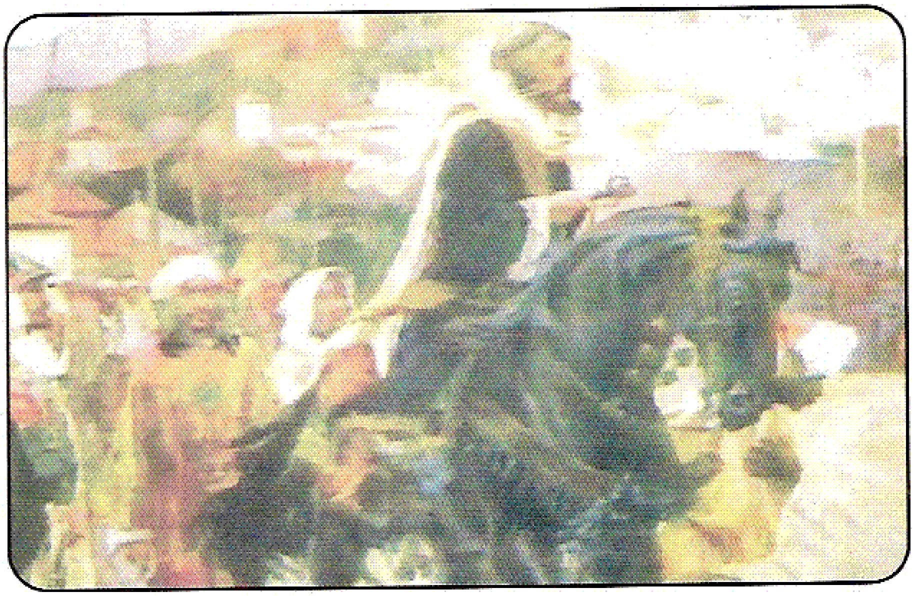

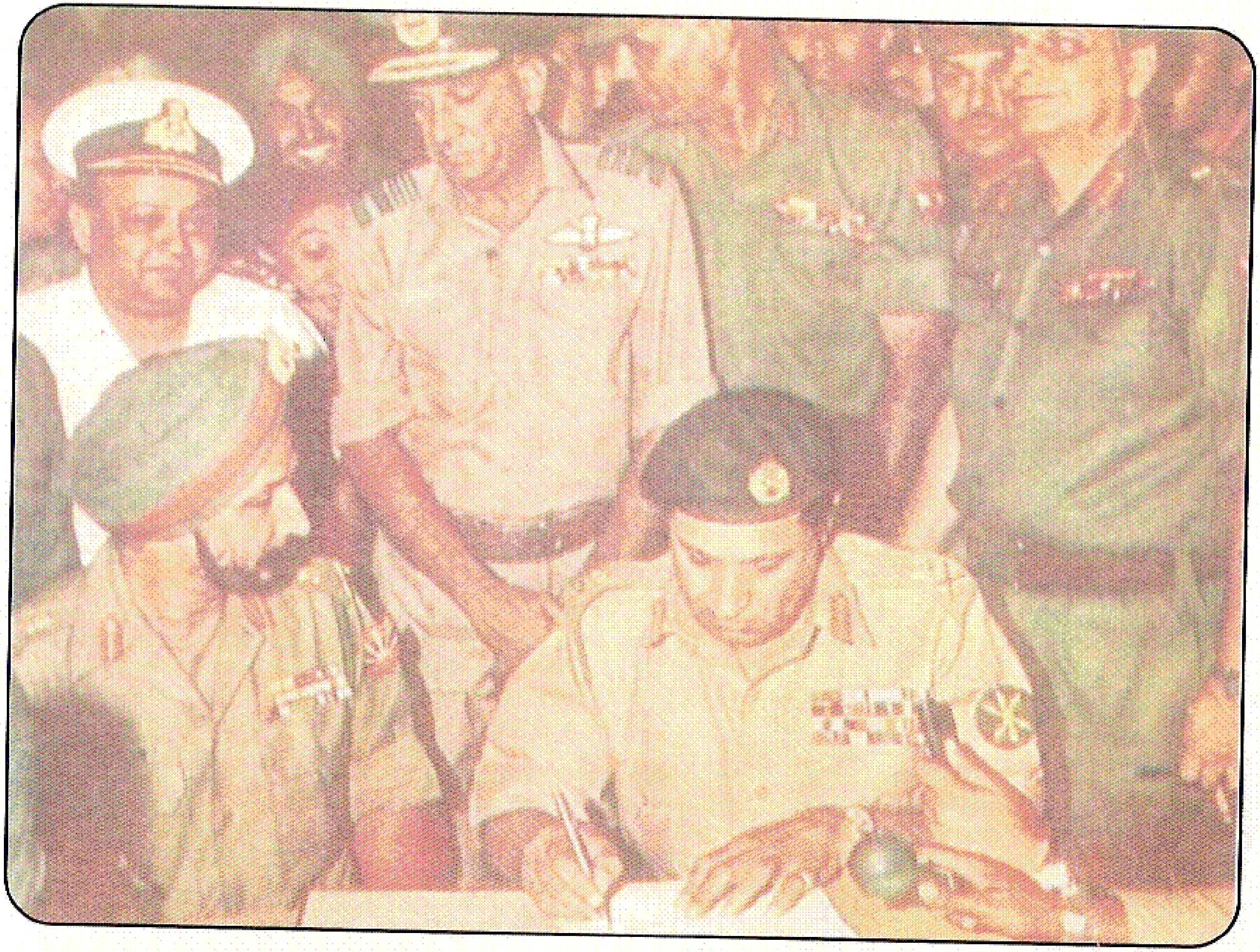

16 دسمبر 1971: جنرل امیر عبداللہ خاں نیازی، دستاویز سقوط مشرقی پاکستان پر دستخط کر رہے ہیں

ادیب ہونے کے ناطے سے جانے صدیق سالک خوش قیاف زیادہ تھے یا فوجی ہونے کے ناطے سے کج قیاف۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جب فضائیہ اور بحریہ جنگ کے ابتدائی ایام میں ہی اپنا اپنا کردار ادا کر کے میدان جنگ سے غائب ہوگئیں تو ساری ذمہ داری جنرل نیازی اور ان کی زیر کمان 45 ہزار ریگولر فوج اور 73 ہزار نیم عسکری نفری پر آن پڑی۔ اب جنگ کا فیصلہ دو باتوں پر تھا۔ فوج کی جسمانی بہادری اور اس کے کمانڈر کی اخلاقی جرأت'' 10۔ (بریگیڈیر صدیق سالک: 1977)

فوج کی جسمانی بہادری کے مظاہرے کا تو موقع ہی نہیں آیا اور وہ مفت میں ہی بدنام ہوگئی لیکن کمانڈر کی اخلاقی جرأت کا ایک عالم گواہ ہے۔ ان گواہوں میں میجر جنرل ناگرا' میجر جنرل جیکب اور لیفٹیننٹ جنرل اروڑہ بھی شامل ہیں۔ صدیق سالک نے ہمارے جرنیلوں سے توقع باندھی بھی تو اخلاقی جرأت کے میدان میں' اگر انہوں نے یہی توقع اخلاقی جرأت کی بجائے زرعی اراضی' پلاٹ' پلازوں اور مراعات کے میدان میں باندھی ہوتی تو اللہ جانتا ہے کہ ہمارے جرنیل نہ انہیں بددل کرتے' نہ افسردہ' نہ نااُمید۔ جنرل نیازی اپنے قیام مشرقی پاکستان میں قدم قدم پر اس مخصوص جرنیلی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے رہے جو ہمارے جرنیلوں سے منسوب ہے۔ ایک طرف وطن عزیز کی سالمیت' پاکستان آرمی کا وقار اور ہماری آبرو' داؤ پر لگی تھی دوسری طرف جنرل نیازی کے پان کا' ساہوکارہ' پان کی نقل وحمل' اس کاروبار کے داؤ پیچ اور مالی مفادات کی دیکھ بھال کے بعد جو توجہ اور وقت بچ رہتا وہ خوش خوراکی' فحش گوئی' خضاب لگانے اور وطن عزیز کے دفاع میں صرف ہوجاتا۔ جنرل نیازی کا چٹا ان پڑھ اندرون اور غیر مہذب بیرون عین اس وقت عریاں اور بے قابو ہوگیا جب کہ اسے پوشیدہ اور لگام ڈالے رکھنے کی اشد ضرورت تھی۔ ان کی نفسانی جبلّت عین ایسے میں جوان ہوئی کہ جب پوری قوم کے اعصاب شل اور فوج کے ہواس گم تھے۔ وہ اپنے اعمال سے جارج برنارڈ شا کا لکھا سچ ثابت کرکے رہے۔ جارج برنارڈ شا لکھتے ہیں:

> ''میں کبھی کسی فوجی سے سوچنے کی توقع نہیں رکھتا'' 11۔ (جارج برنارڈ شا: 1901)

جنرل امیر عبداللہ خاں نیازی کے انتقال پر اپنے ایک طویل مضمون میں اے۔ ایچ جعفر اللہ لکھتے ہیں:

> ”مشرقی پاکستان میں جنرل نیازی کے ساتھی آفیسرز میں ان کی شہرت کسبیوں کی صحبت میں خوش رہنے والے کمانڈر کی ہو چکی تھی۔ وہ پان کے سراسر منافع بھرے کاروبار میں پوری طرح ملوث تھے۔ پاکستان کی ڈوبتی بیڑی کے تلاطم خیز دنوں میں یہ ملٹری چیف اور ایڈمنسٹریٹر کا حال تھا۔“

12۔ (اے۔ایچ جعفر اللہ:2004ء)

جنرل نیازی سقوط مشرقی پاکستان کے بعد تیس سالہ زندگی میں اپنے تئیں اس قعر ملامت اور داغ ندامت کو دھونے کی کوشش کرتے رہے جو ان پر اور ان کی وجہ سے افواج پاکستان پر لگ چکا تھا۔ کیا عجب کہ جنرل نیازی کی ان کاوشوں میں ان پر گزرے ہوئی ذاتی بے حمیتی اور بے توقیری کے اس لمحے کو پوشیدہ رکھنا بھی شامل ہو جب سقوط کی دستاویز پر دستخط کرنے سے پہلے ان کے سر پر جوتے مارے گئے اور ان کے منہ پر تھوکا گیا۔ اس ساعت دل آزار کے بارے میں محمد اجمل نیازی رقم طراز ہیں:

> ”جب میں 1980ء کے اوائل میں بھارت گیا تو مجھے ایک محفل میں وہ وڈیو دھوکے سے دکھائی گئی جس میں میرے قبیلے کے جرنیل نیازی کے ہتھیار ڈالنے کی فلم دکھائی گئی۔ اس سے پہلے جنرل نیازی کے سر پر جوتے مارے گئے۔ اس کے منہ پر تھوکا گیا۔ کاش وہ خودکشی ہی کر لیتا۔“

13۔ (محمد اجمل نیازی:2005)

موازنہ ہائے عبداللہ ہمیں دلچسپ لگا اس میں یکساں حیلہ گری کے ساتھ ساتھ ہمارے ئے ڈھیر ساری عبرت پوشیدہ ہے:

- بوقت سقوط دونوں کے پاس اسلامی افواج مناسب تعداد میں موجود تھیں۔
- دونوں کے سامنے فوری سقوط کی بجائے طویل مدافعت کا راستہ کھلا تھا۔
- آمادگی سقوط پر دونوں کا طرز استدلال ہو بہو یکساں تھا۔
- دونوں کسی بحری بیڑے کی آمد کے منتظر رہے مگر وہ پہنچ کر نہ دیا۔
- اس قدر بڑی تباہی او رالمیے کے بعد بھی دونوں محفوظ اور اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ میں کامیاب رہے۔
- دونوں پر کوئی فرد جرم عائد نہ کی جاسکی اور دست مواخذ حرکت میں نہ آسکا۔

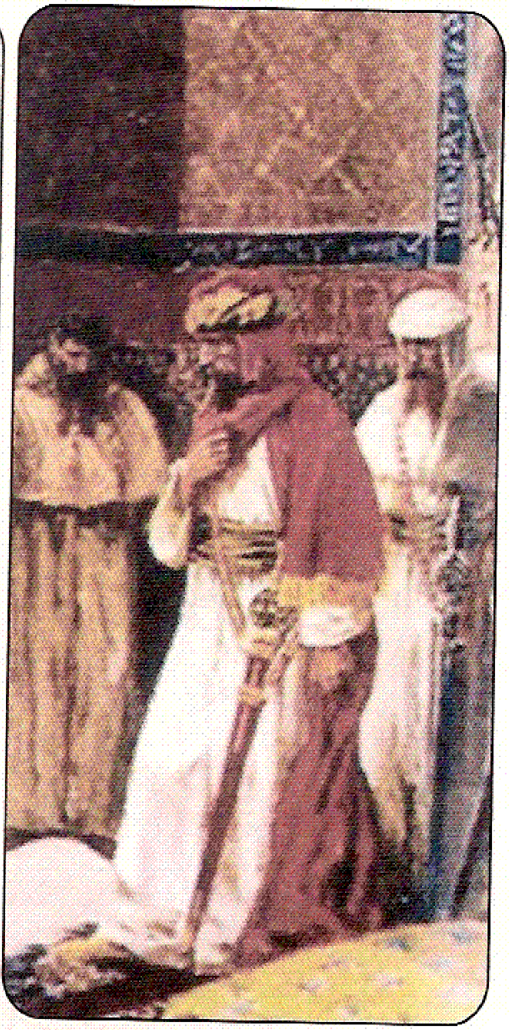

امیر ابو عبداللہ (باب دِل)
(1491)

جنرل امیر عبداللہ خان نیازی
(1971ء)

- سقوط کے بعد دونوں نے طویل عمر پائی۔

سقوط غرناطہ کا ہو یا کابل کا' ڈھاکہ کا ہو یا بغداد کا' مسلمانوں پر اس کے گہرے منفی اثرات مرتب ہوئے۔ سقوط مسلمانوں پر واجب ہی نہیں ہے۔ اپنی روایت' فطرت' ساخت اور سائیکی میں قوم ہاشمی کا سقوط سے کوئی میل کوئی لاگ لگاؤ نہ ہونے کی وجہ سے انہیں جب بھی سقوط درپیش ہوا وہ بکھر کر رہ گئے۔ ہم تو ابھی سقوط غرناطہ کا بیجا ہی کاٹتے ہیں۔ سقوط در سقوط کے اسرار تو آنے والی صدیوں میں کہیں جا کر کھلیں گے۔ سرِ دست تو ہمیں سقوط غرناطہ کے موقع پر بادشاہ فرڈی نینڈ کا یہ کہا ہی کافی ہے کہ "شک نہ کرو ہمارے وعدوں پر" ابھی معاہدہ غرناطہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی اور فرڈی نینڈ کا کہا فضا میں گونجتا تھا کہ معاہدہ غرناطہ پرزے پرزے ہوگیا۔ مسلمانوں پر ہسپانیہ کی زمین ایسی تنگ ہوئی کہ بالآخر وہاں سے ان کے جبری انخلاء کا حکمنامہ جاری ہوا۔ کہاں وہ معاہدہ غرناطہ کی تحفظاتی دفعات اور کہاں یہ 1609ء کا حکمنامہ بے دخلی۔

معاہدہ سقوط غرناطہ کے بعد سپین میں ایک دن بھی مسلمانوں پر خیر کا نہیں گزرا۔ معاہدے میں جو خوش آئند شرائط موجود تھیں وہ دیکھتے ہی دیکھتے طاق نسیاں ہوگئیں۔ مسلمانوں پر ترک اسلام اور قبول عیسائیت کے لیے ہر طرح کا جبر اور دباؤ روا رکھا گیا۔ دس سال تو اس دباؤ اور جبر کا نتیجہ دیکھنے میں گزر گئے لیکن اب مسلمانوں کی استقامت ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ ادھر عیسائی بنیاد پرستوں کا حلقہ ملکہ ازابیلا کے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا جس کی قیادت ٹولیڈو کا اسقف اعظم اور ادارہ احتساب کا نگران اعلیٰ کارڈینیل ذمی نیس کر رہا تھا۔ ذمی نیس کو ملکہ کا قرب حاصل تھا اس نے "مسلمانوں کا انخلاء یا بالجبر قبول عیسائیت" کے نظریے کو متعارف کرایا اور' رفتہ رفتہ ملکہ ازابیلا کو اس پر آمادہ کرلیا۔ بالآخر ملکہ ازابیلا کے دستخطوں سے 12 فروری 1502ء کو ایک حکمنامہ جاری ہوا جس کے مطابق ہسپانیہ کے مسلمانوں کو عیسائیت کا بپتسما لینے یا ہسپانیہ سے چلے جانے میں سے ایک کے لازمی انتخاب سے دوچار کردیا گیا۔ یہ نئی افتاد پرانے تمام مظالم سے سخت تھی۔ وہی ملکہ ازابیلا جس کے سقوط غرناطہ کی ان شرائط پر دستخط ثبت ہیں جن کے تحت مسلمانوں کی جان' مال' آبرو' مذہب' قوانین' رسوم' زبان اور ثقافت کے تحفظ کی ضمانت موجود تھی صرف دس برس بعد اسی ملکہ ازابیلا کے اس نئے حکمنامے سے معاہدہ سقوط غرناطہ کی نفی ہوگئی۔

14۔ (سیمنکاز آرکائیو' والا ڈولڈ سپین)

ملکہ ازابیلا کے بالجبر تبدیلی مذہب کے احکامات پر سو سال سے اوپر گزر گئے لیکن نہ تو مسلمانوں کی استقامت میں کوئی خاص فرق آیا نہ پاؤں میں لغزش۔ اگر جان بچانے کو کسی نے عیسائیت قبول کر بھی لی تو اندر سے وہ مسلمان ہی رہا۔ ان سو سالوں میں اندلس کے مسلمانوں پر ہر وہ ظلم آزمایا گیا جسے غیر انسانی جبلت نے تاریخ کے کسی بھی تاریک دور میں ایزاد کیا تھا۔ مسلمانوں پر ظلم وستم کی پوری صدی گزر گئی لیکن عیسائیت قبول کرنے والوں کے اعداد و شمار نہ بڑھ کے دیئے۔ مسلمانوں کو ترکِ اسلام پر مجبور کرنے میں اس ناکامی پر ٹولیڈو کا اسقف اعظم گیسپر ڈی کیوروگا 1588ء میں سٹیٹ کونسل ہسپانیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ”شیطانی عقائد کے پیروکار مسلمان نہ تو عیسائی مذہبی عبادات میں شریک ہوتے ہیں نہ ہی سڑکوں پر مقدس صلیبی جلوسوں میں نظر آتے ہیں۔ اپنے آپ کو پابندیوں سے بچانے کی خاطر وہ صرف اعتراف گناہ کے لیے پادریوں سے رجوع کرتے ہیں۔ وہ اپنے ہی لوگوں میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ اور اپنے بچوں کو بپتسما سے بچانے کے لیے چھپائے رکھتے ہیں۔ جب انہیں اپنے بچوں کو بپتسما دلوانے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ ہو تو وہ چرچ کی سیڑھیوں پر چلتے پھرتے کسی بھی اجنبی کو بچے کا مقدس باپ مقرر کر دیتے ہیں وہ ہم سے نجات کی دعاؤں کے کبھی طلب گار نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو اپنے مردہ مسلمانوں کے حق میں نجات کی دُعا کی فرمائش کرتے ہیں۔ اب جب کہ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ عیسائیت پر ایمان نہ لانے والوں کو تعلیم دیں اور ان کی نگرانی کریں تو لوگ نہ تو ان کو عیسائیت کی تعلیم دیتے ہیں اور نہ ہی ان کی نگرانی کرتے ہیں نہ کہ الٹا مسلمان انہیں تعلیم دینے لگ جاتے ہیں۔“

15۔ (گیسپر کیوروگا:1588)

سٹیٹ کونسل کے روبرو اسقف گیسپر کیوروگا' کا یہ بیان ہسپانیہ سے مسلمانوں کے جبری انخلاء میں ممد ثابت ہوا حتیٰ کہ عیسائی ترکش میں آخری تیر کو آزمانے کا فیصلہ ہوا۔ یہ آخری تیر 1609ء میں ہسپانیہ سے مسلمانوں کے جبری انخلاء کے حکمنامے کے ساتھ ہَوا ہُوا۔ ان سو سالوں میں

قبول عیسائیت کے خلاف مسلمانوں کی مدافعت کے ساتھ ساتھ اب ہسپانیہ کی سیاست و معیشیت بھی مسلمانوں کے ہسپانیہ سے انخلاء کی متقاضی تھی۔ نئے دریافت کردہ براعظم امریکہ سے مال غنیمت اور سونے کے جو جہاز سپین آتے تھے سترھویں صدی کے آغاز سے ہی وہ لوٹ مار کا شکار ہونے لگے تھے۔ بحری قزاقی ایک صنعت کے طور پر ابھری اور اس میں حسب توفیق یورپ کے تمام ممالک شریک ہوگئے۔ یہ ٹولہ فرانسیسی ہے اور یہ گروہ ولندیزی' یہ ڈاکو پرتگال سے آئے ہیں اور یہ چور بلجیئم کا ہے۔ یہ جیب کترا جرمن ہے اور یہ قزاق سویڈن کا۔ اس منظّم قزاقی میں سپین کے خلاف یورپ کا وہ حسد بھی شامل تھا جسے سپین کو امریکہ سے حاصل ہونے والے مال غنیمت کے خلاف پیدا ہونے والا فطری جذبہ سمجھا جاتا ہے۔ لوٹ مار کے مال پر لوٹ پڑنے سے سپین کے شاہی خزانے کو ناقابل تلافی نقصان ہونا شروع ہوا۔ 1607ء میں سپین کی حکومت دیوالیہ ہوگئی۔ اس مالی دیوالیے نے سپین کے بادشاہ فلپ سوئم کی ساکھ اور سپین کی شاہی حکومت کے اعتبار کو یورپ میں سوالیہ بنادیا۔

مسلمانوں کے جبری انخلاء کے قانون سے فلپ سوئم نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ایک تو وہ اہل سپین اور ریورپ کی توجہ اپنی حکومت کی ناکامیوں سے ہٹانے میں کامیاب رہا۔ دوسرا مسلمانوں کے جبری انخلاء سے ان کی چھوڑی ہوئی وسیع اراضی عیسائیوں کے ہاتھ آ گئی اس سے نہ صرف معیشیت کو سہارا ملا بلکہ فلپ سوئم عیسائیت کے نجات دہندہ کے طور پر سپین اور یورپ میں ہر دلعزیز ہوگیا۔ خصوصاً کیتھولک عیسائیت کے مرکز ویٹیکن سٹی روم میں اس کی بڑی واہ واہ ہوئی۔ 9 اپریل 1609ء کو بادشاہ فلپ سوئم (1598-1621) نے ہسپانیہ سے مسلمانوں کے جبری انخلاء کا درج ذیل حکمنامہ جاری کیا:

> بادشاہ فلپ سوئم کی طرف سے
>
> اہل غرناطہ' خطاب یافتہ عیسائی معززین' امراء' اراکین اشرافیہ' مذہبی علماء و معزز شہریوں کے نام:
>
> ” آپ لوگ میری ان تمام کوششوں سے واقف ہیں جو میں نے اس ملک سپین میں مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے انجام دی ہیں۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو بہترین ترغیبات و مراعات کی ضمانت دی گئی تھی اور انہیں ہمارے مقدس عقیدے کو قبول کرنے کے لیے ہر آسانی میسر

12 فروری 1502:

'اسلام چھوڑ دو یا سپین'

حکمنامہ ملکہ ازابیلا کا مصدقہ عکس

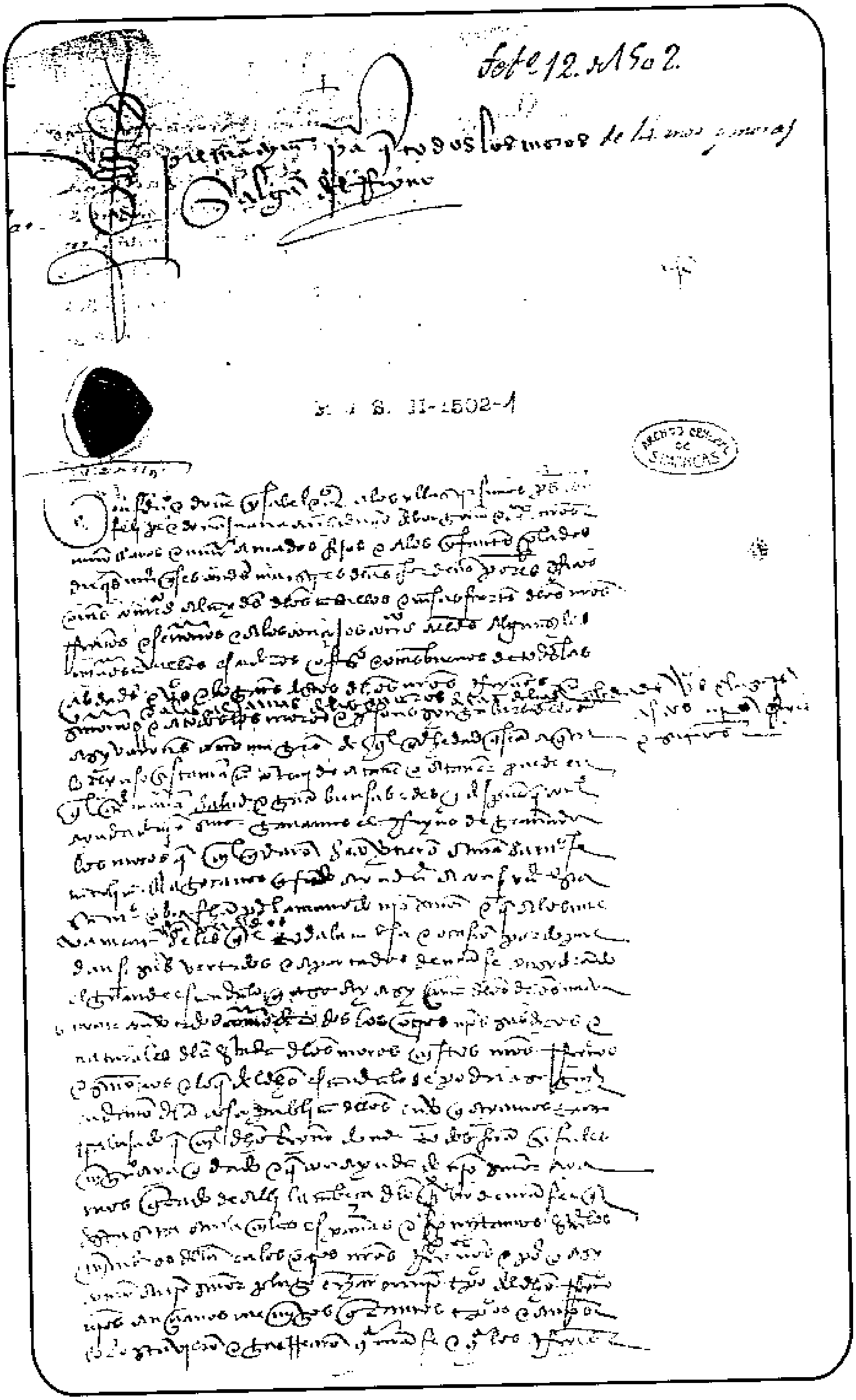

Febº 12. de 1502.

II-1502-1

ARCHIVO GENERAL DE SIMANCAS

http://urdulibrary.paighan.net/

[illegible]

[illegible] de Aragon de Valencia [illegible] de Toledo [illegible]

[illegible] moros [illegible]

[illegible] naturales [illegible] naturales [illegible]

[illegible]

Archivo General de Simancas

1502 P3

تھی لیکن اس میں ہماری کامیابی نہ ہونے کے برابر ہے چونکہ ہم نے بہ مشکل ہی کسی مسلمان کو عیسائیت قبول کرتے دیکھا ہے اس کے برعکس وہ اپنے ہی عقیدے میں مزید پختہ ہوتے رہے ہیں۔

پچھلے دنوں جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ عیسائی مذہبی علماء نے مجھ سے مطالبہ کیا ہے کہ مسلمانوں کی تبدیلی عقیدہ کے لیے ایسے اقدام کروں جس سے ہمارے لارڈ کو خوشی حاصل ہو جو کہ ان لوگوں (مسلمانوں) سے شدید ناراض ہے۔ ہمارے لارڈ نے مجھے ہدایت کی ہے کہ ان مسلمانوں کو غداری، اپنے مذہب پر ثابت قدمی اور گھناؤنے جرائم پر جائیداد اور زندگی سے محرومی کی یقینی سزا ضرور دی جانی چاہئے۔ کسی نہ کسی کو سختی اور بے رحمی سے انہیں (مسلمانوں) کو ان کے کیئے کی سزا دینی چاہئے۔ میں نے مذہبی علماء دانشوروں اور طبقہ اشرافیہ کے نمائندوں کو اسی سوچ بچار کے لیے بلایا تھا کہ مسلمانوں کی جلا وطنی کی بجائے کوئی اور تجاویز یا متبادل پیش کرسکیں لیکن یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ریاست ویلنسیا اور کاسٹائل کے مسلمان اپنے ضرر رساں ارادوں میں اور ہمارے دشمنوں سے ہمارے خلاف سازشوں میں ملوث رہے ہیں، میں نے اپنی ذمہ داریوں کو بہ احسن پورا کرنے کے لیے جن سے ملک و قوم کا تحفظ اور حفاظت مقصود ہے، اپنے لارڈ پر یقین کامل کے ساتھ کہ ہم اس کی رضا کے مطابق صحیح فیصلہ کریں جس سے اس کا وقار اور احترام بلند ہو، _____ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سلطنت ہسپانیہ سے تمام مسلمانوں کو باہر نکال کر بَربَر علاقوں (شمالی افریقہ) بھیج دیا جائے۔ مسلمانوں کے انخلاء کو یقینی اور حتمی بنانے کے حکم پر مکمل عمل درآمد کی غرض سے ہم یہ حکمنامہ جاری کرتے ہیں:

1۔ اولاً اس مملکت سے تمام مسلمان مرد و زن، اپنی آل اولاد کے ساتھ اس حکمنامے کے جاری ہونے کے تین دن کے اندر اندر بلا امتیاز کہ وہ جہاں

بھی رہتے ہوں حکام کے بتائے ہوئے مقامات پر چلے جائیں۔ وہ اپنے ساتھ ایسی منقولہ جائیداد لے جاسکتے ہیں جسے وہ اٹھا سکتے ہوں۔ جہاز' جو ان کو بَر بَر مملکت میں لے جانے کے لیے تیار ہیں انہیں بغیر کسی بدسلوکی یا غیر مناسب روّیے کے افریقہ تک لے جائیں گے۔

2۔ دوران سفر مناسب سہولتیں فراہم کی جائیں گی اور وہ حسب خواہش اپنا مال اسباب لے جاسکیں گے لیکن اس دوران کسی بھی مرحلے پر اس حکمنامے کی خلاف ورزی پر موت کی سزا دی جائے گی جس پر فوراً عمل درآمد ہوگا۔

3۔ اس حکمنامے کے جاری ہونے کے تین دن کی حد کے بعد اگر کوئی بھی مسلمان' کسی جگہ آزادانہ پایا گیا تو اسے گرفتار کرکے حکام کے حوالے کیا جائے گا اور اس کی جائیداد ضبط کرلی جائے گی۔ بوقت گرفتاری کسی بھی مدافعت کی صورت میں سزائے موت دی جائے گی۔

4۔ موت کی یہی سزا ہر اس مسلمان پر نافذ ہوگی جو اس حکمنامے کے جاری ہونے کے بعد اپنی رہائشی جگہ سے کسی دوسرے مقام پر جاتے ہوئے پکڑا جائے گا۔

5۔ حکام کے زیر نگرانی آجانے تک مسلمانوں کو اپنے گھروں میں ان کا انتظار کرنا ہوگا۔ خلاف ورزی کرنے والے کو موت کی فوری سزا کا سامنا کرنا ہوگا۔

6۔ ایسی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد جسے مسلمان ساتھ نہ لے جاسکیں' اسے تباہ کرنے' آگ لگانے یا بیچنے پر موت کی سزا دی جائے گی۔

7۔ متعلقہ علاقے کے مکینوں کو حسب ضرورت مسلمانوں کو سزائے موت دینے کا اختیار حاصل ہوگا۔ اس اختیار پر جواز یا باز پرس کی حد مقرر نہیں ہے۔

8۔ عالی قدر بادشاہ فلپ سوئم مسلمانوں کی متروکہ جائیداد کو عیسائیوں کے زیر استعمال لانے کو مناسب قرار دیتے ہوئے ایسی جائیداد کی تباہی کو قابل تعزیر ٹھہراتے ہیں۔ کوئی بھی قدیم یا جدید سپاہی یا غیر سپاہی عیسائی لفظ'

ارادے یا عمل سے مسلمانوں اور ان کی ازواج اور بچوں کی نہ بے عزتی کرسکتا ہے نہ ان سے کوئی مطالبہ کرسکتا ہے۔

9۔ کوئی عیسائی کسی مسلمان کو نہ اپنے گھروں میں چھپا سکتا ہے نہ پناہ دے سکتا ہے اور نہ ہی کوئی مدد دے گا ایسا کرنے پر چھ سال قید سخت کی سزا مقرر کی جاتی ہے جس میں ضمانت یا پیرول پر رہائی ممکن نہیں ہوگی۔

10۔ مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ بادشاہ فلپ سوئم کا مقصد مسلمانوں کو ہسپانیہ سے نکالنا ہے نہ کہ نہیں ہراساں کرنا یا دوران سفر صعوبتوں سے دوچار کرنا۔

11۔ افریقہ پہنچ جانے والے مسلمانوں میں سے دس مسلمان سپین واپس آ کر اس بات کی تصدیق کریں گے کہ دوران سفر انہیں کسی قسم کی مشکل در پیش نہیں آئی تھی۔

12۔ چار سال سے کم عمر کے لڑکے اور لڑکیاں بشرطیکہ وہ یتیم ہوں اپنے وارثوں کے ساتھ سپین میں رہ سکتے ہیں۔ انہیں ملک بدر نہیں کیا جائے گا۔

13۔ چھ سال سے کم عمر کے لڑکے اور لڑکیاں جو کہ قدیم عیسائیوں کی اولاد ہوں وہ اپنی ماؤں کے ساتھ سپین میں رہیں گے بے شک کہ ان کے باپ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں لیکن اگر باپ مسلمان ہو اور ماں عیسائی ہو تو ایسی صورت میں باپ کو سپین سے جانا ہوگا اور بچے ماں کے ساتھ یہیں رہیں گے۔

14۔ ایسے مسلمانوں کو سپین میں رہنے کی اجازت دی جاتی ہے جو مستقلاً عیسائیوں کے ساتھ رہ رہے ہوں اور عرصہ دو سال سے انہوں نے مسلمانوں کے کسی اجتماع میں شرکت نہ کی ہو۔ (اجتماع نماز جمعہ وغیرہ)

15۔ ایسے مسلمانوں کو بھی سپین میں رہنے کی اجازت دی جاتی ہے جنہوں نے اپنے علاقے کے عیسائی مذہبی رہنماؤں کی زیر نگرانی عیسائی عبادات میں حصہ لیا ہو اور متعلقہ عیسائی رہنما اس بات کی تصدیق کرسکے۔

16۔ بادشاہ فلپ سوئم اس بات کو مناسب سمجھتے ہوئے یہ اجازت دیتے ہیں کہ

اگر کوئی مسلمان افریقہ کی بجائے کہیں اور جانا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ مملکت ہسپانیہ کی دوسری ریاستوں سے گزرے بغیر اور تین دن کی مقرر کردہ حد کے اندر اندر ایسا کر سکے۔

مندرجہ بالا شاہی شرائط اور ارادے پر سختی سے عمل درآمد ہوگا اور اس حکمنامے میں بیان کی گئی سزاؤں پر کسی کوتاہی یا تاخیر کے بغیر پوری طرح ہر ممکن سختی سے عمل درآمد کیا جائے گا۔

ویلنیسیا 9 اپریل 1609
دستخط: بادشاہ فلپ سوئم
شاہی مہر: شاہی حکومت سپین

16۔ (میڈرڈ آرکائیو: فلپ سوئم پیپرز)

اس حکمنامے پر دستخط ہوتے ہی ہسپانیہ میں مسلمانوں پر قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا۔ کم و بیش تین لاکھ مسلمان اپنی جائے رہائش سے بندرگاہوں کی طرف ہانکتے ہوئے قتل کیے گئے۔ انخلاء کے اس فیصلے کے یکساں اطلاق سے مسلمان متاثرین کی تعداد کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بیشتر مورخین اس تعداد کو تین سے چھ لاکھ قرار دیتے ہیں۔ محقق اور مورخ ہنری لا پیرے نے بھی اس تعداد کو تین لاکھ لکھا ہے۔ انہوں نے 1609ء میں ہسپانیہ سے نکالے جانے والے مسلمانوں کی تعداد درج ذیل ریاست وار مسلمانوں کی تعداد پر رکھی ہے جو کہ اصل تعداد کی صرف ایک تہائی ہے:

ریاست/ علاقہ	ملک بدر کیے جانے والے مسلمانوں کی تعداد
مارسیا (اندیسہ)	45ہزار
غرناطہ	50ہزار
آراگون	61ہزار
کیٹالونیا	5ہزار
ویلنسیا	ایک لاکھ 35ہزار

17۔ (ہنری لا پیرے: 1986)

اس فہرست میں المیریا' قرطبہ' عبیدہ' بائزہ' مانعا اور سلیمانکا کے مسلمانوں کی تعداد شامل

نہ کرنے کی ہنری لاپیرے کی جو بھی وجوہات ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کم از کم پندرہ لاکھ مسلمان ہسپانیہ سے نکالے اور قتل کیے گئے۔ ہماری اس تعداد کی بنیاد ہسپانیہ میں تیرھویں صدی میں عہد نصریہ کے فرماں روا' امیر ابن الاحمر کے دور میں کی گئی مسلمانوں کی مردم شماری پر استوار ہے۔ اس مردم شماری کے مطابق صرف ریاست' ویلنسیا میں ہی مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ ساٹھ ہزار سے متجاوز تھی جب کہ ریاست غرناطہ میں پانچ لاکھ اور قرطبہ میں ایک لاکھ مسلمان موجود تھے۔ (ہیلن رالنگ:2002)

روایتی طور پر مسلمان تاریخ کے کسی بھی دور میں افزائش نسل کے مسائل سے دوچار نہیں رہے۔ ایک عالم ہماری اس قوت افزائش کا معترف ہے۔ اگر ہم نے پاکستان میں محض نصف صدی میں مسلمانوں کی آبادی کو تین گنا کر کے افزائش نسل میں خود کفالت کی دھاک بٹھا رکھی ہے تو کیا اندلس کے مسلمان دو صدیوں میں دوگنا بھی نہیں ہوئے ہوں گے۔ اس سیدھی سادی منطق کی رو سے ہماری کھوج کے مطابق سترھویں صدی کے آغاز میں ہسپانیہ میں مسلمانوں کی تعداد' تیس لاکھ سے چالیس لاکھ کے درمیان تھی مگر اس سے کم ہرگز نہیں تھی۔ شیخ منظور الٰہی نے "نیرنگ اندلس" میں اس تعداد کو تیس لاکھ لکھا ہے جب کہ الماڈو والپریزو نے "قرطبہ کی ایک صدی" میں جو 1632ء میں لکھی گئی تھی' سپین میں مسلمانوں کی تعداد کو 35 لاکھ لکھا ہے۔ لیکن بیشتر لکھاریوں نے اس تعداد کو تیس لاکھ ہی قرار دیا ہے۔ مشہور مذہبی محقق ڈبلیو۔ سی براؤنلی نے اس تعداد کو دو مختلف طرح سے لکھا ہے تاہم ان کی مہیا کردہ تعداد اندلس میں مسلمانوں کی تخمین کردہ تیس لاکھ افراد کی تصدیق کرتی ہے اور اس سے متنازع نہیں ہے۔ ڈبلیو۔ سی۔ براؤنلی لکھتے ہیں:

> "رومن کیتھولک چرچ کی قتل و غارت سے سپین میں پندرہ لاکھ مور (مسلمان) قتل ہوئے جب کہ جنوبی امریکہ اور یورپ میں بیس لاکھ یہودی اور میکسیکو' کیوبا' سینٹ ڈومنگو اور امریکہ میں ڈیڑھ کروڑ ریڈ انڈینز عرصہ چالیس سال کے دوران عیسائیت کے نام پر تہ تیغ کیے گئے۔" 18۔(ڈبلیو۔ سی۔ براؤنلی:1834)

اپنی دوسری تحریر میں جو' ان کی پہلی مہیا کردہ تعداد کی تصدیق کرتی ہے ڈبلیو۔ سی۔ ؤنلی رقم طراز ہیں:

> ”زبردستی کے عیسائی بپتسما دیے جانے کی مزاحمت کے نتیجے میں 15لاکھ مسلمان قتل ہوگئے۔ پوپ نے اپنے غلاموں پر جس شقاوت کو مسلط کردیا تھا اس کا یہی نتیجہ نکل سکتا تھا۔“ 19۔(ڈبلیو۔سی۔ براؤنلی:1836)

ملکہ ازابیلا نے 1502ء میں جن حلقوم پر غیر انسانی افعال کا آرا چلانے کی بنا ڈالی تھی پانچ سو سال بعد وہی حلقوم ایک بار پھر اسی آرے تلے آچکے ہیں:

عیسائی ہوجاؤ یا سپین سے جاؤ
اسلام چھوڑ دو یا سپین چھوڑ دو
تم ہمارے ساتھ ہو یا ہمارے خلاف ہو
ہم تمہیں اس ڈر سے مارتے ہیں
کہ کل کلاں تم ہمیں نہ مار دو
اگر تم ہمارے ساتھ نہیں ہو
تو تم ہمارے دشمن ہو
جو ہمارے ساتھ نہیں ہے
وہ صف دشمناں میں ہے
اس سے پہلے کہ تم حملہ کرو
ہم تمہیں آج ہی قتل کرتے ہیں

اس بات پر اب کیا اچنبھا کہ ملکہ ازابیلا کے غیر انسانی اور غیر فطری نظریے کو امریکہ میں ہی نروان ملا۔ اگر احیائے ازابیلا کو اسی کا پیدا کردہ غیر فطری بچہ پروان نہ چڑھاتا تو کون چڑھاتا' یوں امریکہ احسان فراموشی کے بار تلے آنے سے تو بچ گیا لیکن حیات انسانی اپنے تخلیق کار کی طرف مراجعت آمادہ ہے' وہ یقیناً اپنے پیدا کرنے والے کی فطرت پر پلٹتی ہے۔ تین سو سال کا علم و عرفان' مادی آسودگی' ٹیکنالوجی اور آسانیاں امریکی ذہن کو منور اور امریکی اندر کو مہذب نہ بنا سکیں۔ کسی نامعلوم وجہ سے امریکہ کا اندر خانہ مہذب نہ ہوسکا۔ یہ فیصلہ مشکل کام ہے کہ آج کا امریکہ علم زدہ زیادہ ہے یا جہالت اور تعصب بھرا۔ امریکی المیہ یہ ہے کہ علم و عرفان کی آسودگی سے صرف اسی قدر فرق پڑا ہے کہ اب براہ راست عیسائیت کا بپتسما دینے کی بجائے امریکی جمہوریت کا بپتسما دیا جاتا ہے۔ اس میں بھی کچھ تو انسانی حقوق کے ناٹک کا ہاتھ

رہا ہوگا' کچھ ملکوں ملکوں جگ ہنسائی کا خدشہ ورنہ افغانستان میں طالبان کو کنٹینرز میں دم پخت کرنے سے عراق میں ابوغریب جیل میں پیش آنے والے واقعات تک اور مقتول دشمنوں کی لاشوں کو آگ لگانے سے گوانتانوموجیل میں دشمن قیدیوں کی مذہبی کتاب کی بے حرمتی تک کے واقعات اسی قدر بہیمانہ اور غیر مہذب ہیں جتنا کہ 1502ء میں ملکہ ازابیلا کے ترکِ اسلام یا ترک سپین کے اقدامات ظالمانہ اور غیر مہذب تھے۔

صدر جارج واکر بش کی امریکی افواج نے عراق میں بعینہٖ وہی کیا جو ازابیلا کی جاہل سپاہ نے غرناطہ میں کیا تھا۔ ہر دو کی زد مسلمانوں کی علمی میراث' تہذیبی ورثے اور مسلم اُمہ کے قلب پر پڑی۔ ملکہ ازابیلا کے اسلام اور علم دشمن رویے کے بارے میں شیخ منظور الٰہی ''نیرنگ اندلس'' میں لکھتے ہیں:

> ''غرناطہ میں دوسو پبلک لائبریریاں اور ایک درجن رہائشی مکان ایسے تھے جہاں بیش بہا کتابوں اور مخطوطات کا ذخیرہ تھا جن میں قرآن کریم کے ہزار ہا نسخے اور عالمانہ تفسیریں تھیں۔ طب اور علم افلاک پر نادر کتابیں تھیں' فلسفے کی کتابوں میں ابن رشد کے نایاب متون شامل تھے' ایسے گوہر آبدار صدیوں کی ذہنی کاوش کا ثمر تھے جن کی ترتیب و تزئین میں سینکڑوں کاتب' نقاش' زرکوب اور جلد ساز برسوں منہمک رہے تھے۔ کتابت میں آب زر استعمال ہوا تھا۔ حاشیے میں کہیں بیل بوٹے اور گلکاری تھی کہیں متنوع رنگوں کا فشار۔ یکم دسمبر 1499ء کو حملہ آوروں نے اس میراث پر ہلہ بول دیا' وہ صدیوں کی عقل و دانش کا نچوڑ ریڑھیوں میں ڈال کر لے گئے۔ کتابوں کے پشتاروں تلے اُجڈ سپاہیوں کی پشت دوتا تھی۔ دن بھر باب الرملا کے تلے کتابوں کے انبار ایک پہاڑ کی شکل اختیار کرتے رہے۔ لوگوں کو تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھا کیا گیا۔ غم وغصہ سے چور مسلم معززین' آئمہ' تجار' اہل حرفہ اور کاشتکار وہاں موجود تھے' ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا' چہرے نفرت و حقارت کا مرقع تھے' کچھ خالی الذہن ہوکر فضا میں تک رہے تھے۔ اشارہ پاکر الاؤ روشن کیا گیا' جہنمی شعلے

> آسمانوں سے باتیں کرنے لگے۔ ثانیہ دو ثانیہ کربناک سناٹا تھا، پھر صدیوں کا علمی خزینہ خاکستر ہوتا دیکھ کر افسردہ مجمع سے دلدوز چیخیں سنائی دیں، ساتھ ہی ازلی و ابدی صداقت کے اثبات میں اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ گونجا۔ مجمع چھٹنے لگا، نیلگوں آسمان پر ٹانکے ہوئے ستارے سلگتے اوراق کو بھسم ہوتا دیکھا کیے۔
>
> قرطبہ، اشبیلیہ اور دوسرے شہروں میں حاکموں اور پادریوں نے ایسی لاکھوں کتابیں جلا ڈالیں، جو مخطوطات اس غارت گری سے بچ رہے وہ ہجرت کرنے والے مسلمان اپنے ساتھ تونس اور فاس لے گئے۔ یہ علمی سرمایہ مساجد سے ملحق کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ تاسف کا اظہار کرتے ہوئے معاصر امریکی ناول نگار جیمز مچز کہتا ہے: ”تاریخ اور علم کے خلاف یہ ایک گھناؤنا جرم تھا۔ سقوط غرناطہ کو کئی برس گزر چکے تھے۔ اس وقت آتش انتقام سرد پڑ جانی چاہئے تھی، ایسا بیش بہا علمی ذخیرہ ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ 20۔ (شیخ منظور الٰہی: 1996)

تعصب، جہالت اور تنگ نظری کا یہ منظر تو پانچ سو سال پرانا تھا اب جب کہ امریکہ کا علم چاند پر گڑا ہے اور کمند خلاؤں پر پڑی ہے، علم و آگہی کا سورج نصف النہار پر ہے۔ ذہنی ترقی کی چکا چوند سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔ بھیڑ اور بھیڑیئے روا داری اور حسن سلوک کے ایک ہی پتن پر پانی پی رہے ہیں اور انسانی حقوق کی بلّے بلّے میں مرد، مردوں کی بیویاں اور عورتیں، عورتوں کی شوہر بنی ہوئی ہیں لیکن اسلام اور علم دشمنی میں امریکی روّیہ ملکہ ازابیلا کے رویے سے مختلف نہیں ہے۔ افواج ازابیلا نے تو غرناطہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ علمی میراث کو نذرِ آتش کیا تھا لیکن افواج جارج بش نے عراق کے سات ہزار سالہ تاریخی و تہذیبی ورثے کو خاکستر کر دیا۔

پانچ اپریل 2003ء کو جب امریکہ کی فاتح افواج بغداد میں داخل ہوئیں تو اس داخلے کی بدترین زد نیشنل آرکائیو بغداد، قرآنی لائبریری بغداد، نیشنل میوزیم بغداد، موصل آرکائیو اور موصل لائبریری پر پڑی۔ تاریخ، علم اور تہذیب کے ان مراکز سے اٹھتے ہوئے دھوئیں نے

غرناطہ کے باب الرملا کی یاد تازہ اور زخم ہرے کر دیئے۔ ڈیلی ٹیلیگراف لندن کے نامہ نگار ڈیوڈ بلیئر رقم طراز ہیں:

> ''عراق کے نیشنل میوزیم کی تباہی سے ہزاروں سال کی تاریخ اور تہذیبی ورثہ ملبے کی صورت پاؤں کے نیچے آ چکا ہے۔ دنیا کا عظیم الشان علمی و تہذیبی ذخیرہ بغداد میں امن و امان کی بدترین صورت حال کی نذر ہو گیا ہے۔ سات ہزار سالہ مصدقہ تاریخ کے حامل ملک کا اپنے ماضی سے ناقابل تلافی حوالہ ٹوٹ چکا ہے۔ ایک لاکھ ستر ہزار نوادرات' دستاویزات' ظروف' نمونے' نقشے' تصویریں' قلمی نسخے اور قلمی قرآن شریف جلا دیئے گئے ہیں یا لوٹ لئے گئے ہیں۔ نیشنل میوزیم سے صرف ایک میل کی دوری پر عراق کی قومی لائبریری کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا ہے جس سے عراق کا تہذیبی ورثہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا ہے جس کی کسی بھی قیمت پر تلافی ممکن ہی نہیں ہے۔'' 21۔ (ڈیوڈ بلیئر:2003)

مشہور' دانشور' مصنف اور عالمی ماہر آثار قدیمہ فرینڈ و بائیز کہتے ہیں کہ:

> ''1258ء میں منگولوں نے بغداد میں جس طرح علمی و تہذیبی ورثے کو نذر آتش کیا تھا' اس کے بعد سے یہ انسانی تمدن' تاریخ' علم اور تہذیب پر سب سے بڑا حملہ ہے۔ یہ بہت بڑا ثقافتی اور تمدنی قتل ہے۔ جو امریکیوں کے ہاتھوں ہوا ہے۔ کم از کم دس لاکھ کتابیں' نوے لاکھ دستاویزات اور چودہ ہزار تاریخی تختیاں لوٹی اور جلائی جا چکی ہیں۔ امریکہ اور پولینڈ کے فوجی اس نایاب ورثے کو اردن اور کویت کے سرحدی علاقوں میں آرٹ کے عالمی بیوپاریوں کو بیچ رہے ہیں۔ آرٹ کے یہ بیوپاری ایک سیمیرین تختی پچاس ہزار ڈالر سے زیادہ میں خرید لیتے ہیں۔''
>
> 22۔ (فرینڈو بائیز:2004)

روز نامہ ڈان میں اس بربریت کی مذمت کرتے ہوئے اخبار اپنے اداریے میں لکھتا ہے:

> ”بغداد اور موصل کے عجائب گھروں کی لوٹ مار اور نیشنل آرکائیوز اور قرآنی لائبریری کی آتشزدگی نے منگولوں کے ہاتھ بغداد میں اسلامی تاریخی ورثے کی تباہی کی یاد تازہ کردی ہے۔ بغداد میوزیم کی آتشزدگی کے تین روز بعد عراقی نیشنل آرکائیو اور قرآنی لائبریری کی آتشزدگی قابل مذمت ہے کیونکہ اس وقت تک امریکن افواج کو معلوم ہو چکا تھا کہ کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ ضائع ہو جانے والے فن پاروں میں بابل' کالخو' نینوا' اُر' اسیرین' سمیرین اور پرشین تہذیب کے نوادرات بھی شامل تھے جب کہ بغداد کے عین وسط میں وزارت پٹرولیم حیران کن حد تک محفوظ رہی چونکہ اسے مکمل طور پر محفوظ کرلیا گیا تھا۔ ضائع ہو جانے والے ظروف کی تعداد سے اختلاف کرتے ہوئے امریکی سیکرٹری دفاع رمز فیلڈ نے طنزیہ حقارت سے کہا ہے کہ ایک لاکھ ستر ہزار!____ غالباً اتنے ظروف تو پورے عراق میں بھی نہیں ہوں گے۔“ 23۔ (روزنامہ ڈان:2003)

روزنامہ ڈان (پاکستان) کے اداریہ نویس نے جس قدر احتیاط سے بغداد میں امریکن افواج پر ”کیا توقع کی جاسکتی ہے“ کی آڑ میں قبل از وقت آگہی کا جو شبہ ظاہر کیا تھا اور جن فن پاروں کو ضائع ہو جانے کی چادر سے ڈھانپنے کی کوشش کی تھی' ان کی احتیاط اور کوشش کے باوجود کچھ ہی دنوں میں اس وقت شبہ یقین میں بدل گیا جب عراق سے امریکہ واپس پہنچنے والے امریکن فوجیوں کے سامان سے ”ضائع“ ہو جانے والے نوادرات برآمد ہونا شروع ہو گئے۔ ابھی ان بیش بہا نوادرات کی چوری میں ملوث ہاتھوں کا اندازہ ہی لگایا جا رہا تھا کہ آرٹ کرائم کانفرنس کے روبرو بیان دیتے ہوئے برٹش میوزیم کے نگران ڈاکٹر جان کرٹس نے بازی ہی پلٹ دی۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا:

> ”بغداد سے چوری ہونے والے نوادرات میں سے ایک ہزار نوادرات امریکہ سے برآمد ہوئے ہیں جو نیشنل میوزیم بغداد کو واپس کئے جا رہے ہیں۔“ 24۔ (جان کرٹس:24 مئی 2005)

ڈان کے اداریہ نویس نے جس بات کو بین السطور' احتیاط سے اور ضائع ہو جانے کی

اوٹ میں لکھ کر ڈنڈی مارنے کی کوشش کی تھی، برٹش میوزیم کے جان کرٹس نے اسے سرعام اور بے دھڑک کہہ دیا۔ کیا عجب کہ اسی لئے حکم اذاں ہر ایک پر واجب نہیں ہوا کہ اس میں محتاط کی بجائے بے دھڑک، پوشیدہ کی بجائے سرعام اور سرقے کو سرقہ کہنا ہی لازم ہے۔

ہماری جرم ضعیفی نے جہاں بہت سے اور نقصان ہمیں پہنچائے ہیں وہاں اس سے ہمارے اردو محاورے پر بھی شگاف پڑا ہے۔ بھلے وقتوں میں ''آزمائے ہوئے کو آزمانا حماقت ہے'' خاصا معتبر محاورہ سمجھا جاتا تھا اور آزمائے ہوئے کو مزید آزمانے سے پرہیز کیا جاتا تھا لیکن اب صورت حال کچھ یوں ہوگئی ہے کہ ہم آزمائے ہوئے کو مزید آزماتے رہنے پر بھی کمر بستہ ہوچکے ہیں۔ بادشاہ فرڈی نینڈ کی طرح صدر جارج بش بھی ہم سے یہی کہے جارہے ہیں ''شک نہ کرو ہمارے وعدوں پر'' گو کہ اندر سے ہم سب جانتے ہیں کہ صدر بش کے وعدے پر شک نہ کرنے کے باوجود بھی ہونا وہی ہے جو باشادہ فرڈی نینڈ کے وعدے پر شک نہ کرنے سے ہوا تھا۔

⁂

—قصر الحمراء— یورپ میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا امین جس کے ایوان خاص سے مسلم حکمران مشرقی یورپ کو تاراج کرنے کے حکمنامے جاری کرتے رہتے تھے کہ گردش پلٹ گئی یکا یک بجلی چمکی اور پلک بھی نہ جھپکی جا سکی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے قوموں کے درمیان گردش پلٹے جانے کی منشائے ربی کی زد میں آ گئے۔ 17 اپریل 1492 کو الحمراء کے اسی ایوان خاص سے ملکہ ازابیلا نے کرسٹوفر کولمبس کو امریکہ کی دریافت کا حکمنامہ جاری کیا۔ سؤ امریکہ مسلمانوں کے لیے درازی دستِ قاتل تو ہوسکتا ہے مگر سایہ دوست نہیں ہوسکتا۔

دستاویزاتِ رستاخیز

سرزمین ہسپانیہ میں مسلمانوں کے دونوں ماضی مدفون ہیں ۔ ایک بظاہر و آزردہ اور دوسرا پوشیدہ و دل آزار۔ ایک نظر آنے والا، محسوس کیے جانے والا، تخمینہ لگائے جانے والا جو وہاں مسلمانوں کی عمارتوں، طرز تعمیر اور یادگاروں میں دفن ہے ۔اور دوسرا پوشیدہ جو وہاں پر، لائبریریز آرکائیوز، ریکارڈ آفس اور دفاتر دستاویزات کے تہہ خانوں میں محفوظ ہے ۔ جو پوشیدہ ہے اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا اور جو نظر آتا ہے اس سے صرف نظر ممکن نہیں ہے ۔ اندلس کے باب میں ہمارا مؤرخ زور بیان میں پرتاثیر اور ہمارا محقق زور اثر سے عاری اور تن آسان نکلا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندلس میں ہماری بد اعمالیوں پر خود رحمی، جذباتیت اور عیسائی عصبیت کی آڑ آڑے آگئی اور کوفہ نفاق کی باہمی ستیزہ کاریاں دستاویزات میں دفن ہوگئیں۔ الحمراء کے در و بام قبضہ اغیار میں دیکھ کر اگر کلیجے منہ کو آتے ہیں تو اندلس کو کھو دینے کے دستاویزاتی حقائق کلیجہ چھلنی کر دیتے ہیں ۔ کلیجہ منہ کو آنا خودترسی اور خود رحمی سے عبارت ہے سو، آتا رہتا ہے، مگر اس کو چھلنی کرنے میں خود احتسابی اور محاسبہ کاری کی شرط عائد ہے سو، یہ چھلنی ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔ کیا عجب کہ اسی کارن عبرت کی عین ہمیں اندلس کے عجائب گھروں میں تو کشاں کشاں لے جاتی ہے مگر آرکائیوز کے تہہ خانوں کی مدھم روشنی ہماری آنکھیں چندھیا دیتی ہے کہ وہاں حمراء کے شکوہ اور واہ کی بجائے عبرت اور آہ ہے۔ صفحے صفحے پر نفاق لکھا ہے، سازش تحریر ہے، مندرجات بکھرے ہیں۔ ہوس جاہ عبارت ہے، بے حمیتی عریاں ہے، ہزیمت عیاں ہے، سودے بکھرے پڑے ہیں۔ مول تول لکھا ہے، کون کتنے میں بکا سب کی قیمتیں درج ہیں۔ یوں تو سقوطِ اندلس سے کشید عبرت میں ہماری تہہ دامنی پر اب اچنبھے سے بھی کیا حاصل ۔ خود فراموشی

اب ہمیں اس منزل پر باندھے کھڑی ہے جہاں بکاؤ مال کی قیمت جاننا بے معنی ہو چکا ہے۔ مصلحت کے تقاضے میں ایک دوسرے کی پردہ پوشی سرِ فہرست اور سب کچھ ''اچھا'' سر آنکھوں پر رہتا ہے۔ سو سقوط مشرقی پاکستان پر بھی دوسری نسل گزر رہی ہے مگر مملکت خداداد کے نصف کے زیاں پر کسی کو تابرخواست عدلیہ تک کی سزا نہ دی جا سکی۔

سقوط اندلس کی وجوہات پر دفتر کے دفتر لکھے جاچکے ہیں ۔ جلدوں پر جلدیں لکھی جاسکتی ہیں اور کتابوں پر کتابیں لکھی جائیں گی ۔ لیکن اس موضوع دل آزار کو ایک نامہ نفاق' دوصفحات اور چار نقشوں میں بھی سمیٹا جا سکتا ہے ۔ سچ پوچھیے تو دوصفحات بھی ہم نے جملے کے رچاؤ میں لکھ دیئے ہیں ۔ اس کے لیے تو چار نقشے' ایک چھاپہ اور ایک نقشہ نفاق بھی کافی ہے ۔ آٹھویں صدی کے وسط سے دسویں صدی کے وسط تک اندلس میں مسلمانوں کی ایک مرکزی حکومت جو چار لاکھ 94ہزار مربع کلومیٹر تک پر محیط تھی بارہویں صدی کے وسط تک دولاکھ دو ہزار مربع کلومیٹر تک مختصر ہوچکی تھی ۔ قریب آدھا سپین ہاتھ سے جاتا رہا مگر اسلامی ریاستوں کی تعداد بڑھتی رہی ۔ جہاں ایک تھی اب وہاں پانچ بن گئیں ۔ ادھر رقبہ کم ہوتا جاتا تھا ادھر تفریق بڑھتی جاتی تھی۔ سن 1037ء میں اندلس کی پانچ اسلامی حکومتیں 1137ء تک تیرہ اسلامی حکومتوں میں بدل چکی تھی مگر رقبہ 15ہزار مربع کلومیٹر رہ گیا تھاجو 1403 میں محض ساڑھے گیارہ ہزار مربع کلومیٹر تک سکڑ چکا تھا۔ قسطیلہ (کاسٹائل) کا بادشاہ الفانسودہم (1221-1289) اندلس میں چھوٹی چھوٹی اور کمزور مسلمانوں ریاستوں کے بڑھتے ہوئے رجحان اور مجموعی طور پر ان کے زیر اقتدار' رقبے میں کمی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :

> ''ابن ہود کی موت کے بعد (مسلمانوں کے زیر اقتدار) زمین بہت سے چھوٹے چھوٹے مسلمان بادشاہوں میں تقسیم ہوگئی۔'' 1۔ (ہسپانیہ کرانیکل: 1955)

یہ چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستیں اندلس کو لے ڈوبیں چونکہ یہ ریاستیں اپنی بقا اور تحفظ کے لیے ہمسایہ عیسائی حکومت کے تعاون کی محتاج تھیں۔ مرکز سے بغاوت اور غداری کی بنیاد پر قائم ہونے والی' ان مسلمان ریاستوں کے لیے عیسائی حکمرانوں کا دست تعاون ہمیشہ دراز رہا۔ دو چار سال بعد یہی دست تعاون دست غاصب اور دست مواخذ میں بدل جاتا ۔ وہ بہانے بہانے سے مسلمانوں سے زمین چھینتے رہتے ۔ یوں اپنوں سے بغاوت کر کے حاصل کردہ زمینوں کو قبضہ اغیار میں دیتے رہنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ قریب پانچ لاکھ مربع کلومیٹر زمین سکڑتے

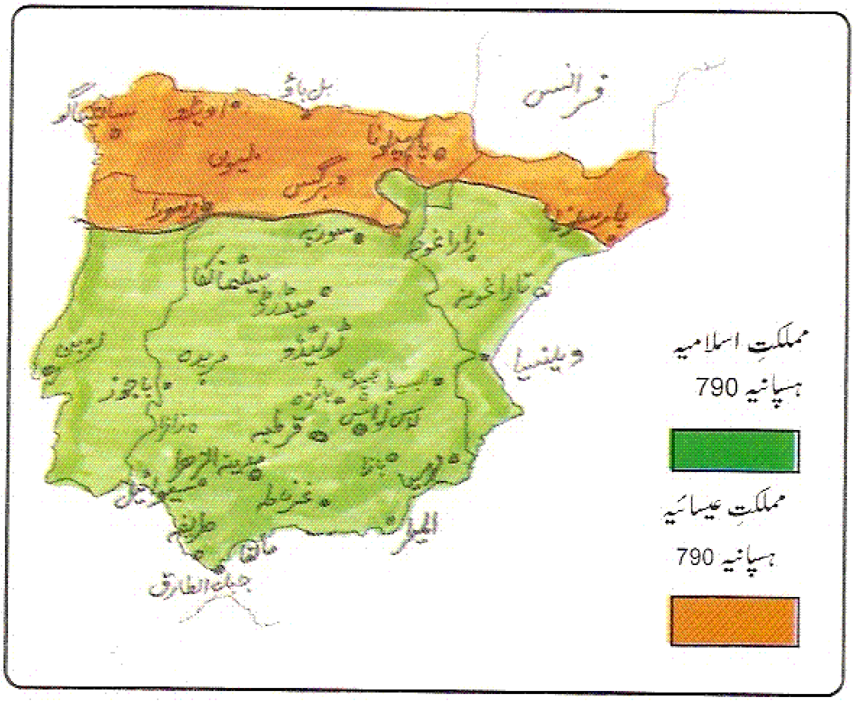
فرانس
بل باؤ
سانتیاگو
اوویڈو
لیون
برگس
پامپلونا
بارسلونا
زمورا
سوریہ
زاراغوزہ
سلمانکا
میڈرڈ
تاراغونہ
ٹولیڈو
ویلنسیا
لزبن
مریدہ
باجوز
بائزہ
لاس نواس
قرطبہ
مرسیہ
مدینۃ الزہرا
سیویل
غرناطہ
المیریا
طریفہ
مالاگا
جبل الطارق
مملکتِ اسلامیہ
ہسپانیہ 790
مملکتِ عیسائیہ
ہسپانیہ 790

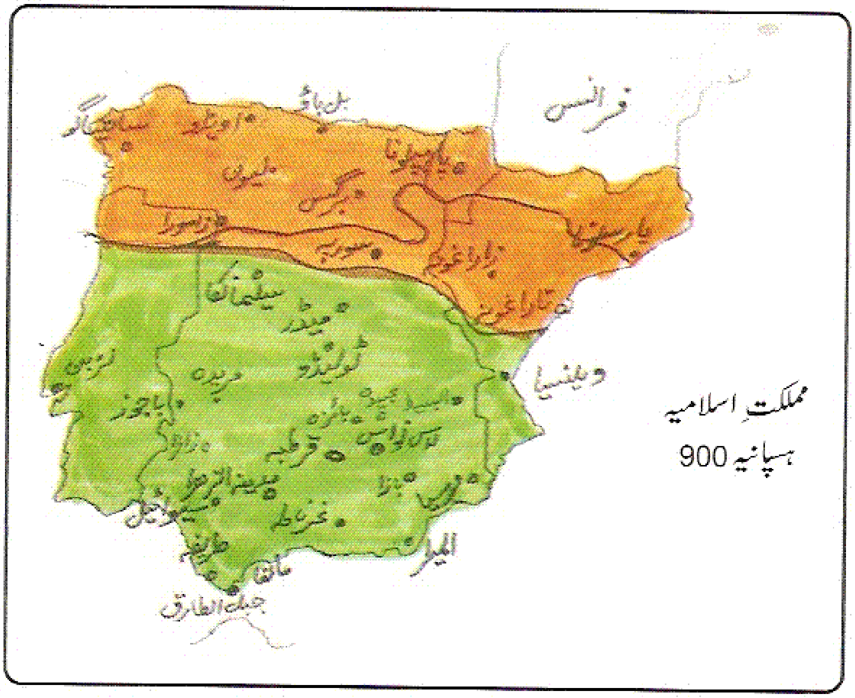
فرانس
بل باؤ
سانتیاگو
اوویڈو
لیون
برگس
پامپلونا
بارسلونا
زمورا
سوریہ
زاراغوزہ
تاراغونہ
سلمانکا
میڈرڈ
ٹولیڈو
ویلنسیا
لزبن
مریدہ
باجوز
بائزہ
لاس نواس
قرطبہ
مرسیہ
مدینۃ الزہرا
سیویل
غرناطہ
المیریا
طریفہ
مالاگا
جبل الطارق
مملکتِ اسلامیہ
ہسپانیہ 900

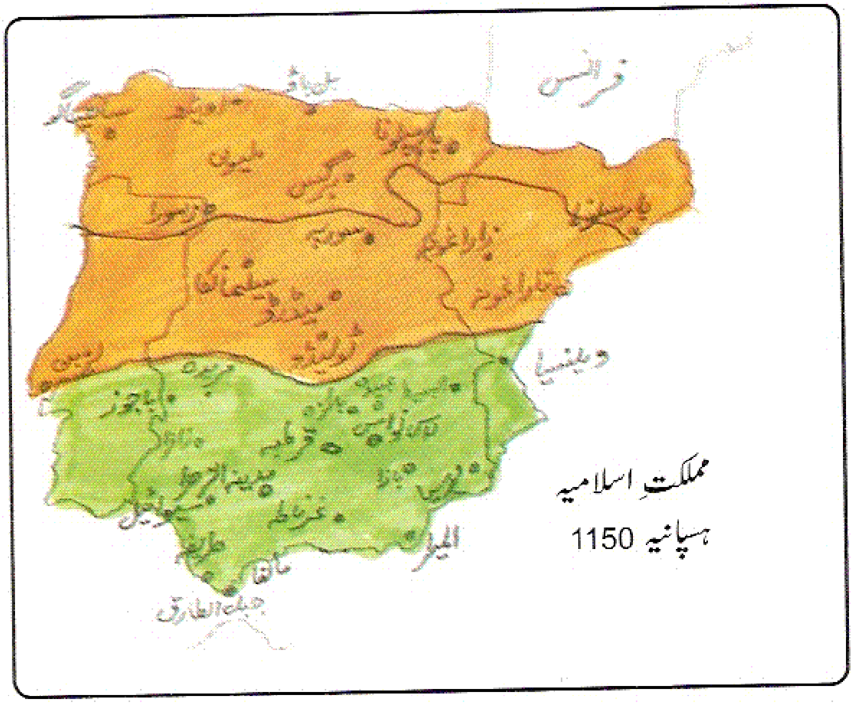
فرانس
بل باؤ
سانتیاگو
پامپلونا
لیون
برگس
زمورا
بارسلونا
ارا غون
سلمانکا
میڈرڈ
ٹولیڈو
تاراغونہ
ولینسیا
لزبن
باجوز
قرطبہ
مدینۃ الزہرا
سیویل
غرناطہ
طریفہ
مالقہ
المیریا
جبل الطارق
مملکتِ اسلامیہ
ہسپانیہ 1150

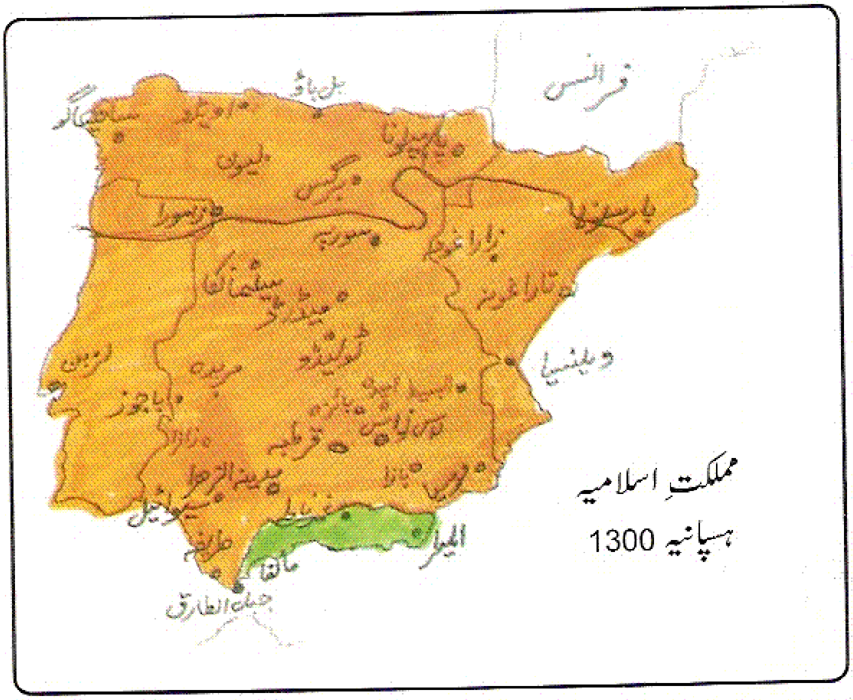
فرانس
بل باؤ
سانتیاگو
پامپلونا
لیون
برگس
زمورا
بارسلونا
ارا غون
سلمانکا
میڈرڈ
ٹولیڈو
تاراغونہ
ولینسیا
لزبن
باجوز
قرطبہ
مدینۃ الزہرا
سیویل
غرناطہ
طریفہ
مالقہ
المیریا
جبل الطارق
مملکتِ اسلامیہ
ہسپانیہ 1300

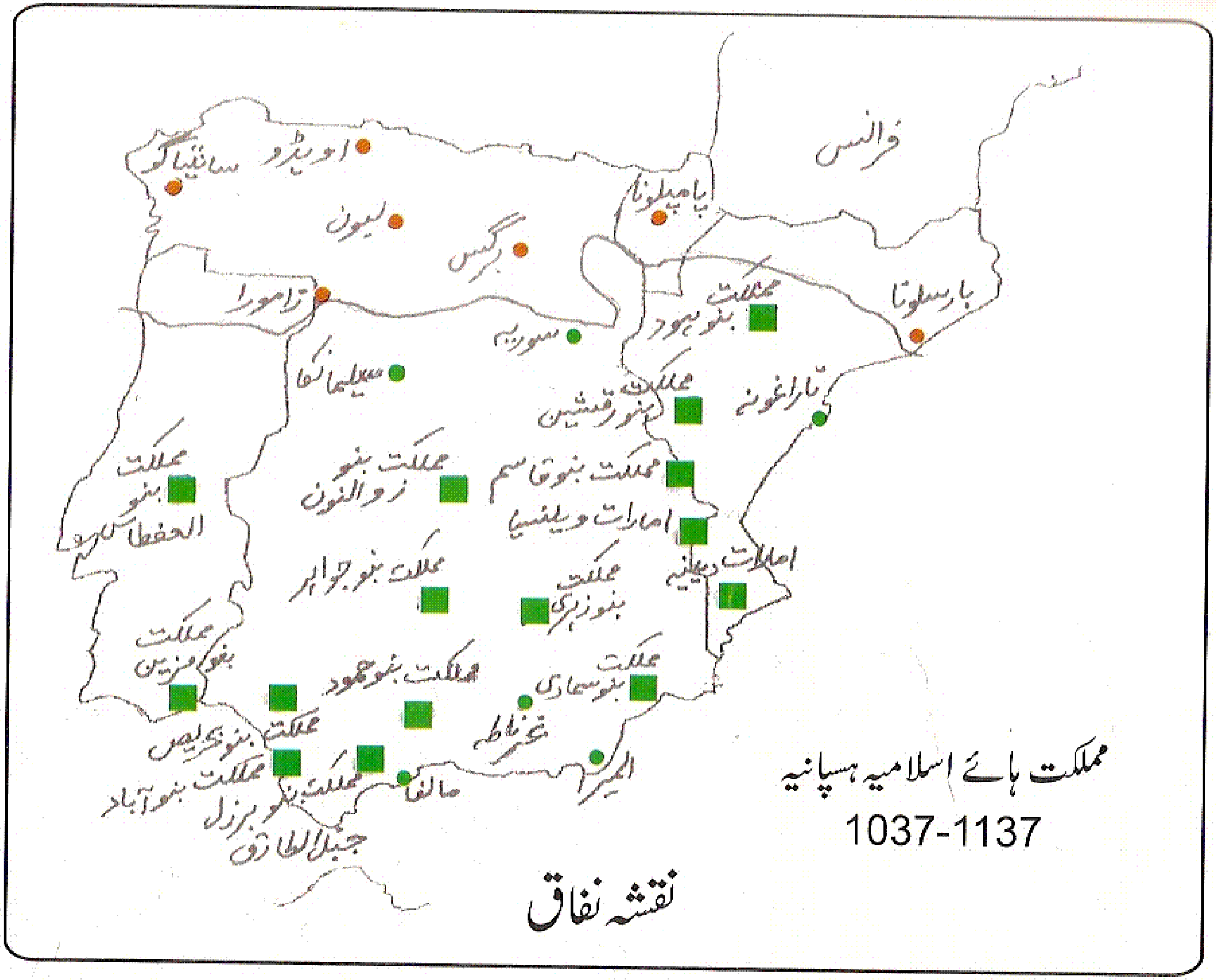
فرانس
پامپلونا
بارسلونا
سانتیاگو
اویڈو
لیون
برگس
زامورا
سوریہ
سلیمانکا
مملکت بنو ہود
تاراغونہ
مملکت بنو قشتین
مملکت بنو قاسم
امارات ویلنسیا
امارات دینیہ
مملکت بنو الحفطس
مملکت بنو ذوالنون
مملکت بنو جواہر
مملکت بنو زیری
مملکت بنو سمادح
مملکت بنو مزین
مملکت بنو حمود
مملکت بنو بکریص
مملکت بنو عباد
مملکت بنو برزل
مالقا
غرناطہ
المیریہ
جبل الطارق

مملکت ہائے اسلامیہ ہسپانیہ
1037-1137

نقشہ نفاق

سکڑتے بارہ ہزار مربع کلو میٹر محض پر محیط رہ گئی۔ 1212 میں سقوط طلیطلہ (ٹولیڈو) کے بعد مسلمانوں کے پاؤں پھر اندلس میں کہیں نہ جمے۔ سقوط طلیطلہ کے فوراً بعد لاس نواس بھی جاتا رہا۔ ایک کے بعد دوسرا شہر ہاتھوں سے نکلتا رہا جو بالآخر سقوط غرناطہ کے عظیم المیے پر منتج ہوا۔ لاس نواس کے بعد 1236 میں سقوط قرطبہ نے مسلمانوں کو اندلس میں پامال کر دیا تھا وہ اس سقوط سے کبھی جانبر نہ ہو سکے۔ قرطبہ کے بعد 1232 میں بریانہ‘ 1238 میں ویلنسیا‘ 1243 میں مرسیا‘ اور 1244 میں جتیوا کے سقوط کے بعد 1245 میں بادشاہ جمیز اول (1276-1208)‘ پرنس ڈان الفانسو اور مسلمان جنگجو سردار ابو عبداللہ محمد ابن حدیل بہ معروف الازرق (آج کل کے معیار سے دہشت گرد الا زرق) کے درمیان معاہدہ الا زرق طے پایا۔ اندلس میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ہونے والے اس معاہدہ کے دستاویز کو ہسپانیہ میں اول ترین‘ اہم ترین اور قدیم ترین دستاویز کہا جاتا ہے۔ 15 اپریل 1245 کو ہونے والا یہ معاہدہ دو طرفہ زبانوں (عربی اور کاسٹیلین سپینش) میں تحریر کیا گیا۔

بارسلونا آرکائیو میں اس دستاویز کے اصل نسخے کو خصوصی اہمیت کے شعبے میں رکھا گیا ہے ساڑھے سات سو سال سے زیادہ پرانی یہ دستاویز کاغذ کی طرح باریک پارچے پر تحریر ہے جسے تابوت بنانے والی کیمیائی لکڑی پر چسپاں کر دیا گیا ہے۔ گوکہ عربی متن کی سیاہی مدہم پڑ چکی ہے لیکن عربی کے مغربی (اندلسی) طرز تہجی میں تحریر کردہ نفیس اور کشادہ ساخت کی بدولت معاہدے کی عربی طرف بآسانی پڑھی جا سکتی ہے اس معاہدے کا درج ذیل اردو ترجمہ ہم نے پال شیوڈن کے انگریزی ترجمے سے کیا ہے برکلے یونیورسٹی کے ماہر عربی رسم الخطوط پروفیسر پال شیوڈن نے معاہدہ الا زرق کے عربی متن کا ترجمہ اپنے تحقیقی مقالے ’ہسٹورین‘ میں قلم بند کیا ہے۔

معاہدہ الازرق : 1245

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے ہمارے رسول اور ان کے خاندان پر اپنی رحمت فرمائے۔

یہ ایک قابل فخر معاہدہ جس کا فریق ثانی ایک خوش قسمت‘ ذی شان اور با وقار شہزادہ ڈان الفانسو‘ عظیم الشان بادشاہ جمیز اوّل کا بیٹا ہے جو آرا گون کا حاکم مطلق ہے۔ اس معاہدے کا فریق اوّل‘ قابل تعظیم

وزیر امتیازی و اعلیٰ عہدیدار ابو عبداللہ ابن حدیل ہے، خدا اس کو تکریم بخشے۔

اوپر لکھے گئے ذی شان شہزادے سے آج کی تاریخ سے جو کہ اس معاہدے کے آخر میں درج کر دی گئی ہے تین سال کے لیے یہ معاہدہ کیا جاتا ہے کہ اس (وزیر) کی جائیداد اور اسباب و اشیاء اس کے قلعوں میں رہیں گی۔ اوپر درج کیا گیا وزیر (ابو عبداللہ حدیل) پاپ اور تربینا نامی دو قلعے اوپر درج کیے شہزادے (ڈان الفانسو) کی تحویل میں دے گا جو کہ اسے تین سال کے لیے اسی وقت شہزادے کی تحویل میں دینا ہوں گے۔ باقی ماندہ قلعے تین سال کے لیے وزیر کے زیر قبضہ رہیں گے جن میں کاسٹل، چیروکس، مارگریڈا، الکالا، پنچٹ اور گیلی نیزا کے قلعے شامل ہیں جو کہ تین سالہ مدت کی تکمیل پر مذکورہ وزیر مذکورہ شہزادے کی تحویل میں دے گا جس میں الکالا کا قلعہ اور اس کے محصولات شامل نہیں ہوں گے جبکہ پنچٹ قلعہ سے متعلقہ دیہات سے ہونے والی آمدنی مذکورہ وزیر اور اس کی آل اولاد کے لیے اس وقت تک مختص رہے گی جب تک شہزادہ ڈان الفانسو کا عہد اقتدار قائم رہے گا۔

علاوہ ازیں مذکورہ شہزادہ ذی شان تین سال کے لیے ابیو اور طولوس سے حاصل ہونے والی آمدنی مذکورہ وزیر کو دینے کا پابند ہوگا۔ وزیر جب مار گریڈا، کاسٹل، چیرولس اور گیلی نیرا کامی درج کیئے گئے قلعے شہزادے کی تحویل میں دے گا۔ تو ان کے ساتھ ہی ایبو اور طولوس بھی شہزادے کی تحویل میں دے دیئے جائیں گے۔

شہزادہ ذی شان اس بات پر رضا مند ہے کہ وہ ابو یحییٰ ابن ابو شاق حاکم کاسٹل کو اسپیلا اور پیٹراکوس کے دیہات پر مکمل تصرف دے گا جو کہ اس وقت تک اس کی اور اس کی آل اولاد کے تصرف میں رہیں گے جب تک شہزادے کا عہد اقتدار قائم رہے گا۔

دونوں فریق متفق ہیں کہ مذکورہ قلعوں کے علاوہ وزیر جو بھی قلعہ فتح کرے یا مذاکرات کے ذریعے حاصل کرے ان کی آدھی آمدنی بھی شہزادہ کو مدت تین سال تک ادا کی جائے گی جبکہ تین سالہ مدت ختم ہونے پر باقی قلعوں کے ساتھ نئے حاصل کردہ قلعے بھی شہزادے کی تحویل میں دے دیئے جائیں گے۔

یہ معاہدہ بتاریخ 15 ذوالعقد سال ہجری 642 بمطابق 15 اپریل 1245 کو تحریر کیا گیا ہے۔

شہزادہ ڈان الفانسو کی طرف سے کاسٹیلین سپینش میں معاہدہ پر تحریر کردہ شرائط:

اور میں ڈان الفانسو جو کہ خدائی عنایت سے شہزادہ ہے اور بادشاہ آرا گون کا سب سے بڑا بیٹا ہے' ابوعبداللہ ابن حدیل کے ساتھ معاہدہ کرتا ہوں جو کہ وزیر اور الکالا کا امیر' قابل تعظیم' فیاض' عزت دار' اور وفا دار حلیف ہے۔ میں اسے الکالا اور پنچنٹ کے دو قلعے مرحمت کرتا ہوں جس پر بطور جاگیر اسے اور اس کے خاندان کو انہیں بیچنے' ان سے دست بردار ہونے انہیں رہن رکھنے یا اپنی مرضی کے مطابق کسی طرح بھی استعمال کرنے کا پورا اختیار ہوگا۔ علاوہ ازیں میں تمہیں دو پر گنے ایبو اور طولوس بمع محصولات عرصہ تین سال کے لیے عنایت کرتا ہوں اور تین سال کے بعد یہ دونوں پر گنے بمع دوسرے قلعوں کے میری تحویل دے دیئے جائیں گے۔

مزید یہ کہ میں قسم کھاتا ہوں اور یہ معاہدہ کرتا ہوں کہ ان تمام شرائط کی جیسا کہ اوپر لکھ دی گئی ہیں' پاسداری پر مخلص ہوں۔ الکالا کے حلیف کے طور پر تمہارے عاقل ہونے کی توقع رکھتا ہوں۔ اور اس کے لیے بھی جو میں تمہیں دے رہا ہوں۔ معاہدے کے عینی شاہدین کی موجودگی میں یہ تحریر پویوٹ میں اپریل کی سولہ تاریخ 1245 میں دی جاتی ہے۔

عینی شاہدین:
لارڈ ولیم ہیو گو
لارڈ گون بالڈ نائٹ
لارڈ پیٹر مازا
لارڈ پیٹر سانچیز
لارڈ رائمن ڈی مونٹ پلائر

2۔ (بارسلونا آرکائیو: 1245)

اس دستاویز کی اہمیت پرُ ہسپانوی مورخین خصوصاً بہت زور دیتے ہیں۔ ان کی توجیہہ اس بارے میں یہ ہے کہ معاہدہ الازرق کے بعد قریب ڈھائی سو سال مسلمان نسبتاً محفوظ رہے لیکن یہ کہتے ہوئے وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ 5 لاکھ مربع کلو میٹر زمین پر مقتدر اب 15 ہزار کلو میٹر پر اکتفا کیئے بیٹھے تھے۔ نہ ان سے چھیننے کو کچھ رہ گیا تھا نہ ان کے پاس گنوانے کو کچھ تھا۔ ہم اسے مسلمانوں کے محفوظ ہونے کی نسبت مسلمانوں کا منتظر ہونا سمجھتے ہیں۔ آخری سقوط، آخری بد عملی اور آخری ہچکی کے انتظار میں ان پر ڈھائی صدیاں بیت گئیں

یہ دفن آج ہوا ہے مرا تو کب کا تھا

ہسپانیہ میں ہمارے ماضی کے اصولی مدفن پر مئی 1486 ثبت ہے۔ 1482 میں امیر ابو عبداللہ (باب دل) نے اپنے والد محترم مولائے ابوالحسن امیر غرناطہ کو معزول کر دیا اور بے آبرو کر کے وہاں سے انہیں چلتا کیا۔ اپنے اقتدار کو حلال ثابت کرنے کے لیے وہ کاسٹائل پر چڑھ دوڑے مگر 1483 میں لوسینا کے مقام پر ایک جھڑپ کے دوران فرڈی نینڈ کے فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ 1483 سے 1486 تک ملکہ ازابیلا و بادشاہ فرڈی نینڈ کی قید کے دوران وہ سقوط غرناطہ پر ترغیبی دباؤ کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس دوران ذہنی اور اصولی طور پر وہ سقوط غرناطہ پر تیار ہو چکے تھے۔ سقوط کی اس ذہنی تیاری کے معاوضے میں یہ شرط سرفہرست تھی کہ انہیں اپنے والد مولائے ابوالحسن اور چچا ابو عبداللہ الزغل کے خلاف ملکہ و بادشاہ کی غیر مشروط حمایت حاصل رہے گی۔ غرناطہ پر ان کے اقتدار کو مکمل طور پر بحال کر کے اسے دوام بخشا جائے گا۔ یہ بحالی اقتدار ہر طرح کی فوجی، مالی اور سیاسی امداد سے وابستہ تھی۔ امیر ابو عبداللہ جب اس بے حمیتی پر اصولی اور ذہنی طور سے تیار ہو گئے تو ان سے فرمائش کی گئی کہ اس امر کو عرض نیاز کی صورت ملکہ و

بادشاہ کو لکھ بھیجیں۔

سال 1486 مہینہ مئی کا، دن نا معلوم......اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا۔ مسافت زدہ، فیصلہ کن اور فاصلہ کار کہ ابو عبداللہ نے ملکہ و بادشاہ کو لکھا کہ وہ کیتھولک ملکہ و بادشاہ کو غرناطہ سونپ دینے پر تیار ہو چکے ہیں یہاں ہمیں مئی کا ایک اور مہینہ یاد آتا ہے تابناک، درخشاں تر اور رخشندہ ترین یکم مئی 711 کو سر ساحل ہسپانیہ ایک طویل القامت چھریرے بدن اور قدرے پژمردہ چہرے والا سنجیدہ شخص اپنی مٹھی بھر سپاہ سے مخاطب تھا۔ ابو العباس احمد ابن محمد المقری نے طارق ابن زیاد کے اصل الفاظ قلم بند کیے ہیں:

> **أيّها الناس، أين المفر؟ البحر من ورائكم، والعدوّ أمامكم، وليس لكم والله إلا الصدق والصبر۔**
>
> اے لوگو۔ بھاگنے کے لیے یہاں کوئی راستہ نہیں ہے۔ تمہارے پیچھے سمندر ہے اور تمہارے سامنے دشمن، میں اللہ پر قسم کھاتا ہوں کہ تمہارے پاس صرف اخلاص ہے یا صبر۔ 3۔(ابوالعباس مقری: 1840)

امیر عبداللہ کے پاس نہ اخلاص تھا نہ صبر اور نہ بھاگنے کا راستہ وہ راستہ بناتے بناتے خود راہگزار بن گئے جس جاگیر کے لیے وہ غرناطہ دینے پر رضا مند ہو چکے تھے وہ ان سے لے لی گئی۔ جس جاہ و چشم کے وہ پر چائے ہوئے تھے اس کا آخر آن پہنچا تھا۔ 1496 میں انہیں اندلس سے دیس نکالا ملا تو وہ اپنے دودھیالی عزیز حاکم فز (مراکش) کے پاس مقیم ہوئے 1536 میں مولائے احمد کی طرف سے لڑتے ہوئے دریا بکوبا کے کنارے وہ اس حالت میں جاں بحق ہوئے کہ چڑھے ہوئے دریائے بکوبا کے کنڈے پر ان کی لاش پڑی تھی گھوڑے اور سپاہ جو اس دریا کو عبور کرتے تھے ان کی لاش پر پاؤں رکھتے، روندتے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ مورخ نے انہیں عبداللہ زغیبی لکھا تو ایسا غلط بھی نہیں لکھا۔ ان کی تدبیر یوں الٹی کہ راستہ بنانے اور گنجائش نکالنے کی خواہش شاقہ نے انہیں دوسروں کی راہگزر بنا دیا تھا۔ تاریخ نے ہمارے لیے مئی کے مہینے کو بیک وقت شجاعت، حمیت، اخلاص، حیلہ گری، اور ہوس جاہ کے حوالے سے اپنے صفحوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا کہ جس کے آغاز میں بارہ ہزار کی سپاہ سرفروش نے لاکھ کے لشکر کو آناً فاناً گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا تھا آخر آخر قلت سپاہ و علت اسباب کو وجہ سقوط سمجھتی

تھی۔

اندلس کا قصہ بس اس قدر، جانیئے کہ اس میں اسی قدر وقت لگا کہ جتنا اول مئی سے آخر مئی تک لگتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس آخر کے آنے میں ہماری آٹھ صدیاں لگ گئیں۔ طارق ابن زیاد نے جو بات اپنے لشکریوں سے کہی تھی بظاہر تو اس پر کسی پیغمبرانہ صفت یا شاعرانہ وجدان کا گمان نہیں گزرتا لیکن نو صدیوں بعد جب مسلمانوں کو اندلس سے بے دخل کیا گیا تو ابن زیاد کا کہا لفظ لفظ پورا ہو کر رہا۔ مسلمانوں کے لیے بھاگنے کا واقعی کوئی راستہ نہیں تھا ان کے سامنے سمندر تھا اور پیچھے دشمن، صبر ان پر تمام ہو چکا تھا اور اخلاص رخصت، انہیں کہیں بھی پناہ نہیں تھی۔ سو ابن زیاد کا اندیشہ پورا ہو کر رہا۔ وہ ہجوم در ہجوم قتل ہوئے، انبوہ کے انبوہ سمندر میں ڈوب گئے، کلمہ گو خلق سرزمین اندلس سے نابود ہو گئی۔ 22 ستمبر 1609 کو ویلنسیا کے عیسائی بادشاہ فلپ سوئم نے جب اندلس سے مسلمانوں کی جبری بے دخلی کا حکم جاری کیا تو انہیں اندلس چھوڑنے کے لیے تین دن کی مہلت دی۔ نو صدیوں کے ساکنان اندلس کو ترکِ اندلس کے لیے دیا گیا وقت بہت کم تھا۔ اتنے وقت میں وہ صرف قتل ہو سکتے تھے یا ڈوب سکتے تھے، سو وہ قتل ہو گئے جو قتل ہونے سے بچ رہے تھے انہیں سمندر نے نگل لیا 25 ستمبر تک بہر حال سپین مسلمانوں کے وجود سے آزاد اور ابن زیاد کا کہا پورا ہو چکا تھا۔

اگر بندہ مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے تو عجب نہیں کہ اس کی زبان بھی اللہ کی زبان ہوتی ہو۔ ابو عبداللہ کا یہ خط جس پر انہوں نے سقوط غرناطہ پر آمادگی ظاہر کی ہے پورے کی بجائے پرزوں کی صورت محفوظ ہے۔ خط کے ٹکڑوں کو جوڑ لیا گیا ہے۔ جہاں تاریخ لکھی تھی وہ حصہ محفوظ نہ رہ سکا یوں اس خط پر سال 1486 مہینہ مئی تو درج ہے لیکن تاریخ نہیں ہے۔

4۔ (ڈی زافرا، آرکائیو: غرناطہ: 1486)

5 جون 1486 کو ملکہ و بادشاہ کی طرف سے ایک اور دستاویز ابو عبداللہ کے نام لکھی گئی جس میں تین سالوں کے لیے ان تمام علاقوں، شہروں اور دیہاتوں کو تحفظ دینے کی پیشکش کی گئی جو امیر کے زیر اقتدار سمجھے جاتے تھے۔ اس دستاویز میں غرناطہ کے بیشتر علاقے کا دفاع اور تحفظ کی ذمہ داری عیسائی حکومت نے اپنے ذمہ لینے کی تجویز پیش کی ہے۔

5۔ (ڈی زافرا، آرکائیو۔ غرناطہ: 1486)

29 اپریل 1487 کو امیر عبداللہ نے ملکہ ازابیلا کو ایک اور خط بھیجا جس میں ملکہ سے

درخواست کی گئی کہ کسی بھی شورش' خرابی اور بیرونی حملے کی صورت میں غرناطہ کے دفاع میں کوتاہی نہ کی جائے۔ ہم آپ سے توقع لگائے بیٹھے ہیں کہ کسی بھی مشکل صورت حال میں آپ کی حکومت ہمیں غرناطہ میں غیر محفوظ نہیں چھوڑے گی اور ہم غرناطہ میں اپنے دفاع کے لیے آپ کی طرف دیکھتے ہیں۔

6۔(سیمنا نکاز آرکائیو۔ والاڈولڈ: 1491)

8 نومبر 1488 کو امیر عبداللہ نے ملکہ ازا بیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ کو شکریے کا خط لکھا اس خط کے پہلے حصے میں امیر نے عیسائی بادشاہوں کا شکریہ ادا کیا۔ کہ وہ اس کی رہنمائی' مشورے اور تحفظ کے لیے موجود ہیں۔ جبکہ خط کے آخری حصے میں اپنی وفاداری کی یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ میں بھی تمہارے لیے یکساں خیالات رکھتا ہوں۔

7۔(ڈی زافرا آرکائیو غرناطہ: 1488)

7 نومبر 1489 کو بادشاہ فرڈی نینڈ نے ایک خط حاکم بازا سیدی یحیٰی النیار کو لکھا جس میں انہیں عیسائی حکمرانوں کے حق میں بازا سے دست بردار ہونے کی ترغیب' تجویز اور مشورہ دیا گیا۔ اس کے برعکس نتائج اور عواقب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

8۔(مارکیوز کورویرا' آرکائیو۔:1489)

15 نومبر 1489' شاہی حکومت کی طرف سے ملکہ و بادشاہ نے سیدی یحیٰی النیار کو ایک اور خط لکھا۔ اس خط میں سقوط بازا پر' ان کا شکریہ ادا کیا گیا ہے کہ خون خرابے کے بغیر بازا کو عیسائی سلطنت میں دے دینے پر وہ ان کے شکر گزار ہیں۔

9-(ڈی زافرا' آرکائیو۔ غرناطہ: 1489)

ان دستاویزات میں ملکہ ازا بیلا کے سیکرٹری فرینڈو کافرا کے تحریر کردہ حسابات گوشوارے اور اخراجات کی تفصیل پر مبنی کچھ کاغذات بھی محفوظ ہیں۔ ان کاغذات میں نومبر 1491 کی تحریر کردہ ایک دستاویز میں مسلمان امراء حکام اور اشرافیہ کو دیے گئے تحائف اور انعامات کا ذکر ہے جو فرینڈو کافرا شاہی حکومت کی ہدایت پر خفیہ طور پر متعلقین کو پہنچاتے رہتے تھے۔ تحائف وانعامات دیئے جانے والوں کی اس فہرست میں ان علاقوں کے حاکم اور امراء شامل ہیں جنہوں نے کسی مزاحمت کے بغیر ملکہ و بادشاہ کو اپنے علاقے تفویض کر دیے تھے۔ جیسے حاکم بازا' حاکم لوجا' حاکم عبیدہ اور حاکم المیرا وغیرہ۔ ان تحائف میں مارا وید (کرنسی) کپڑے' نوادرات' برتن اور اسی طرح کی اشیاء شامل ہیں۔ ان اشیاء میں بروکیڈ کے کپڑے

ریشم کے صافے، مصری چنے، زیتون کا تیل اور زیتونی مصنوعات، فلورنس کے برتن، اطالیہ کے صابون، خوشبویات، چمڑے کی جرابیں، سینہ بند، اور نقد رقوم کی طویل فہرست موجود ہے۔

10۔(ڈی زافرا' آرکائیو۔غرناطہ: 1491)

فروری 1490 میں بادشاہ فرڈی نینڈ و ملکہ ازابیلا نے ایک شاہی حکم نامہ اپنے دستخطوں سے جاری کیا۔ جو ان کے امراء، حکام، فوجیوں اور مشیروں کے نام ہے۔ اس حکم نامہ میں ملکہ وبادشاہ نے 30 مارچ 1490 تک غرناطہ میں داخل ہوجانے کے احکامات جاری کیے اور لکھا کہ بہادری اور جرات مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے متعلقہ لوگ 30 روز کے اندر اندر غرناطہ میں داخل ہوجانے کو یقینی بنائیں۔ اس حکم نامے پر عمل درآمد نہ کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے گی اور ہم انہیں معاف نہیں کریں گے۔ ملکہ و بادشاہ بذات خود ان لوگوں کی قیادت کریں گے جو غرناطہ میں داخل ہونے کے لیے جمع ہوں گے۔

11۔(ڈی زافرا' آرکائیو:غرناطہ 1490)

بادشاہ فرڈی نینڈ کی طرف سے امیر ابوعبداللہ کو بھیجے گئے ایک اور خط کا ایک صفحہ (غالباً درمیانی صفحہ) بھی محفوظ ہے۔ اس خط میں بادشاہ نے امیر ابوعبداللہ کو مطلع کیا کہ تمہارے وزراء (ابوالقاسم عبدالملک، یوسف ابن قاسم وغیرہ) ہم سے زیادہ کا مطالبہ کررہے ہیں اور ان کے تقاضے بڑھتے جارہے ہیں گو کہ میں تم سے مخلص ہوں اور میں نے تم سے ہمدردی کا سلوک روا رکھا ہے لیکن اس موجودہ صورت حال پر میں دن بدن ناخوش ہوتا جاتا ہوں۔ میں یہ جاننے سے قاصر رہا ہوں کہ کیا تمہارے وزراء کے مطالبات تمہارے علم میں ہیں یا نہیں۔

12۔(ڈی زافرا' آرکائیو۔غرناطہ: 1490)

فرڈی نینڈ زافرا کی جانب سے ابوالقاسم عبدالملک کو بھیجے گئے ایک خط میں زافرا نے انہیں مطلع کیا جو غالباً ابوالقاسم کے خط کے جواب میں لکھا گیا ہے کہ میں نے تمہارے لکھے کے مطابق تمہارے نام اور تمہاری طرف سے بادشاہ کے ہاتھ، پاؤں، گھٹنے اور شانے پر بوسہ دیا اور تمہاری طرف سے جس قدر تعظیم ممکن تھی اس کا مظاہرہ کیا۔ تم صاف ستھرے، ظاہر و باطن میں یکساں اور معاملات کے کھرے ہو۔ تم حوصلہ رکھو اور انتظار کرو۔ میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ معاملات کو اپنے تابع رکھو۔

13۔(ڈی زافرا آرکائیو۔غرناطہ: 1490)

ملکہ و بادشاہ کی طرف سے براہِ راست ابوالقاسم عبدالملک کو لکھے گئے خط میں بادشاہ فرڈی نینڈ نے ابوالقاسم کو لکھا کہ مجھے میرے سیکرٹری فریڈی نینڈ زافرا نے بتایا ہے کہ تم ہماری

خدمت کرنا چاہتے ہو اور ہماری سرپرستی میں پناہ چاہتے ہو۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ تم ہمارے دربار میں حاضری دے کر شائستگی کا مظاہرہ کر چکے ہو۔ ہمارے اور زافرا کی طرف سے تمہیں پورے اختیارات ہیں جنہیں تم استعمال کر سکتے ہو۔ ہم تم پر مہربان رہیں گے اور عنایات کا تسلسل ٹوٹنے نہیں دیں گے۔ لیکن یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ تم کسی اور سے معاملات طے کرنے سے مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ میں حکم دیتا ہوں کہ تم زافرا سے ہدایات لیتے رہو اور احکامات کی بجا آوری میں کوتاہی کے مرتکب نہ ہونا۔ 14 (ڈی زافرا' آرکائیو' غرناطہ: 1491)

11 ستمبر 1491 کو ملکہ و بادشاہ نے امیر ابو عبداللہ کو تشفی کراتے ہوئے ایک اور خط لکھا ملکہ و بادشاہ نے لکھا کہ یہ ہمارے علم میں ہے کہ تم اور تمہارے آدمی ہماری خدمت کرتے رہے ہو تمہیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ہم تم سے معاملات ختم نہیں کر سکتے نہ ہی ہمارے درمیان تعلق ختم ہوسکتا ہے یہ بات اچھی طرح معلوم ہونی چاہیے جیسا کہ خدا کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تم ہمارے تحفظ سے لطف اندوز ہو گے۔ تمہیں یہ بات پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ تمہارے وزیر سے معاملات طے کرتے ہوئے تمہارے مفادات ترجیحی بنیادوں پر سامنے رکھے جائیں گے۔ لیکن عیسائی بادشاہوں کی ان ساری عنایتوں کی بنیاد اسی شرط پر استوار ہے کہ جو معاملات طے پا چکے ہیں ان پر عمل درآمد ہونا چاہیے اور ان سے انحراف صورت حال میں غیر یقینی بگاڑ پیدا کر دے گا۔ 15۔ (ڈی زافرا' آرکائیو۔ غرناطہ: 1491)

16 ستمبر 1491 کو ابوالقاسم عبدالملک اور یوسف ابن قاسم نے مشترکہ طور پر ایک خط بادشاہ فرڈی نینڈ کو عربی میں لکھا اور کاسٹیلین سپنیش میں اس کے ترجمے کے ساتھ دستخط شدہ کاپی بھی منسلک کر دی۔ عربی میں خط کا آخری حصہ ہی محفوظ رہ سکا جبکہ سپینش میں پورا خط موجود ہے۔ اس خط کا محفوظ نہ رہنا ہی بہتر تھا کہ محفوظ رہتا تو اندلس کے امراء کی بے حمیتی پر ناقابل تردید گواہی موجود رہتی اور اگر محفوظ رہ جاتا تو شاید نصاب عبرت کا صفحہ اول قرار دیا جاتا۔ ابن قاسم اور یوسف نے بادشاہ فرڈی نینڈ کو لکھا کہ اے ذی شان بادشاہ ہم تمہارے حضور پیش ہو کر تمہارے ہاتھ چومنا چاہتے ہیں اور تمہارے جسم کا ہر وہ حصہ جس کی اجازت دی جائے گی چومنا چاہتے ہیں تا کہ ان غلاموں کی وارفتگی تم خود دیکھ سکو جو وہ تم سے وابستہ کیے ہیں۔ ہم تصدیق کرتے ہیں کہ تمہارے مفادات سے صرفِ نظر نہیں کریں گے۔ زافرا ہمارا بھائی ہے۔ ہم اس سے احکامات کے ملنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے منتظر رہتے ہیں۔ وہ جونہی بادشاہ یسوع مسیح

کی طرف سے ہدایات ہمیں بھیجتا ہے پھر ان پر عمل پیرا ہونے میں کسی تاخیر اور کوتاہی کا کوئی حوالہ زافرا کے پاس نہیں ہے' جو آپ کو بتا سکے ۔ ہم اپنی وفا داری پر قائم اور آپ کے مفادات کے محافظ ہیں۔ یقیناً زافرا اس کی گواہی دینے میں فخر محسوس کرے گا۔

16(ڈی زافرا' آرکائیو۔ غرناطہ: 1491)

اس خط کے جواب میں بادشاہ فرڈی نینڈ نے یوسف ابن قاسم اور ابو القاسم عبدالملک کو لکھا کہ ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔ تم ہماری خدمات انجام دیتے رہے ہو' ہم تمہاری خدمات تسلیم کرتے ہیں۔ تمہیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ تم پر رحم کیا جائے گا ۔ ہم تمہیں اپنی سر پرستی میں لے چکے ہیں اور یہی بات بذات خود قابل اطمینان ہونی چاہیے کہ تم ہماری حفاظت میں ہو لیکن اس کے باوجود تم نے ابھی تک وہ سب کچھ نہیں کیا جس کی امید دلائی گئی تھی۔ اس طرح تم معاہدے سے پھر رہے ہو جبکہ تمہیں خدمات سونپنے میں معاہدے کی تکمیل کو ملحوظ رکھا گیا تھا لیکن تمہاری طرف سے معاہدے پر عدم عمل درآمد معاہدے سے انحراف کے مترادف ہے ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تم ہماری مدد کے ساتھ شہر (غرناطہ) میں خاطر خواہ اثر ڈال سکتے ہو جو کہ ابھی تک ظاہر نہیں ہوا تمہیں اس خطیر انعام کے بارے میں بتا دیا گیا تھا جو اس کام کی تکمیل پر تمہاری خدمات کے معاوضے میں تمہیں دیا جاسکتا ہے۔ 17۔(ڈی زافرا' آرکائیو۔ غرناطہ: 1491)

ایک دوسرے پر صدقے واری کی یہ کیفیت زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی۔ 13 اکتوبر کو فرڈینڈ و زافرا نے ابو القاسم عبدالملک کو لکھا: میرے بھائی مجھے تمہارا یہ خط پڑھ کر دکھ ہوا اور میں حیرت زدہ رہ گیا ہوں کہ تم میرے خلاف شکایات کر رہے ہو حالانکہ میں نے تم سے ہر ممکن بہترین سلوک کا رویہ اختیار کیئے رکھا ہے۔ اب میں تمہیں ضمانت نہیں دے سکتا کہ تمہارے اقدامات کی تحسین کی جائے گی اور تم پر یقیناً رحم کیا جائے گا۔ اس کا دارو مدار تمہیں سونپی گئی خدمات کی تکمیل پر ہی ہوگا۔ 18۔(ڈی زافرا' آرکائیو۔ غرناطہ: 1491)

فرڈینڈ و زافرا کے ابوالقاسم عبدالملک کو لکھے گئے اس خط کو کم از کم اسلامی ملکوں کے حکمرانوں کو مثال اور معیار سمجھنا چاہیے کہ آج بھی رحم اور تحسین کا دارو مدار ہمارے حکمرانوں کو سونپی گئی خدمات کی تکمیل سے ہی وابستہ ہے ۔ جنرل محمد ایوب خان' جنرل ضیاء الحق' اور جنرل پرویز مشرف تین مثالیں تو ہمارے اپنے حکمرانوں کی ہی ہیں پورے عالم اسلام کا حساب کرو تو ایسے خطو کا ڈھیر لگ جائے۔ قرائن کہتے ہیں کہ اس بار کنڈولیزا رائس فرڈینڈ وزافرا کا کردار ادا

کرتے ہوئے صدر جارج بُش (بادشاہ فرڈی ننڈ اور ملکہ ازا بیلا) کی طرف سے پرویز مشرف کو خط بھیجنے ہی والی ہیں یا بھیج بھی چکی ہوں کہ تمہیں سونپی گئی خدمات ہنوز تشنہ تکمیل ہیں تمہاری تحسین کا دارو مدار اسی تکمیل پر تھا جس میں رخنہ پڑ چکا ہے اس بات کی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ تم اب بھی ہماری آنکھ کا تارا ہو۔ جنرل پرویز مشرف اخلاص، عمل، منطق اور فہم کے آدمی ہیں۔ ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ وہ تاریخ دہرائے جانے کے اس الم انگیز لپیٹے کی زد سے خود کو محفوظ رکھیں گے۔

11 جون 1548 کو سٹی کونسل غرناطہ کی طرف سے سپین کے بادشاہ چارلس پنجم (کارلوس) کو سرکاری طور پر مطلع کیا گیا کہ سٹی کونسل غرناطہ میں معاہدہ سقوط غرناطہ (1491) کی اصل دستاویز، اس کی نقل، مندرجات یا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے شہر غرناطہ سے یہ دستاویز غائب ہوچکی ہے۔ سٹی کونسل کے اس خط پر ردعمل کے طور پر غرناطہ میں شاہی دربار کے ایک قانونی معتمد کرسٹو بل موریلاس کو اس دستاویز کی بازیابی پر مامور کیا گیا۔ 15 جولائی 1548 کو کرسٹو بل موریلاس نے بادشاہ کو لکھا کہ اس دستاویز کو تلاش کرنے میں جانفشانی کے باوجود اسے تلاش نہیں کیا جاسکا۔ جسے عیسائی بادشاہ فرڈی ننڈ اور مور حکمران بادیلی (ابو عبداللہ الزغل) کے درمیان معاہدہ سقوط غرناطہ کی اصل دستاویز کی حیثیت حاصل ہے کہا جاتا ہے کہ امبروسیوزارافی نامی شخص اس اصل دستاویز کو بادشاہ بادیلی (ابو عبداللہ الزغل) کے پاس لے گیا تھا تاکہ اسے اس کی نقل بمطابق اصل دے دی جائے جبکہ ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ جب اصل دستاویز ابو عبداللہ الزغل کو پیش کی گئی تو وہ اس نے رکھ لی اور کبھی واپس نہیں کی۔ اس کے بعد ڈومنگو پیرز نے فرینڈ وڈی کافرا سے معاہدے کی دستاویز حاصل کی لیکن یہ اصل دستاویز نہیں تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے سقوط کے معاہدے پر جس شخص بادیلی (ابو عبداللہ الزغل) نے دستخط کیئے وہ اس کا مجاز ہی نہیں تھا۔

19۔ (سیمانکاز آرکائیو۔ والا ڈولڈ: 1548)

کرسٹو بل موریلاس کے اس خط نے قریب چار صدیوں تاریخ میں الجھاؤ اور تحقیق میں دشواری پیدا کیئے رکھی۔ کرسٹو بل موریلاس ابو عبداللہ (باب دل) اور ابو عبداللہ الزغل (بادیلی) کے ناموں میں گہری مماثلت کی وجہ سے اپنے خط میں دستاویز پر اصل دستخط کنندہ کا نام لکھنے سے قاصر رہا یا وہ ان دونوں میں امتیاز روا نہ رکھ سکا۔ واقعہ جو بھی ہو لیکن واقعاتی اور تاریخی حیثیت سے کرسٹو بل موریلاس کے مذکورہ خط کے مندرجات سوالیہ ہیں۔ ابو محمد عبداللہ

الزغل 1489 میں ہی فرڈی نینڈ کی جفا کاریوں اور سازشوں سے مایوس ہوکر تلمسان (مراکش) جاچکے تھے۔ 1491 میں جب معاہدہ غرناطہ عمل میں آیا تو وہ اس سے بے نیاز کہ وہ دستخط کرنے کے مجاز تھے کہ نہیں اندلس میں سرے سے تھے ہی نہیں۔ نہ ہی وہ معاہدہ سقوط کے فریقین میں شامل تھے۔ سقوط غرناطہ کے تمام معاملات ابوعبداللہ محمد (باب دل) کے حوالے سے تمام ہوئے نہ کہ ان کے چچا ابوعبداللہ محمد الزغل (بادیلی) کے ناطے سے۔ ابھی اس خط سے پیدا ہوتے والی پیچیدگی اپنی جگہ قائم تھی کہ تین سو ساٹھ سال بعد 4 جنوری 1908 کو مارکیوز ڈی کورو ویرا نامی شخص سٹی ہال غرناطہ میں نمودار ہوا اور میئر غرناطہ سیگمنڈ وموریٹ کو معاہدہ سقوط غرناطہ کی دستاویز پیش کی جس پر ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ کی شاہی مہر ثبت ہے۔ اس موقع پر مارکیوز ڈی کوروویرا نے کہا کہ وہ اس تصحیح شدہ سقوط غرناطہ کی شرائط پر مبنی تاریخی دستاویز کو لوٹاتے ہوئے بہت خوش ہے چونکہ اس دستاویز پر کیتھولک بادشاہوں کے دستخط موجود ہیں اپنی قومی اور تاریخی ذمہ داری پوری کرنے پر میری روح سرشار ہے۔ میں حب الوطنی کا تقاضا پورا کرنے پر مطمئن ہوں۔ مارکیوز ڈی کوروویرا تو اپنی روح ہلکی اور ضمیر مطمئن کر کے چلے گئے لیکن ان کی دی گئی دستاویز نے محققین کو الجھاوے میں اور مورخین کو اچنبھے میں ڈال دیا۔ ان کے سامنے یہ سوال آکھڑا ہوا کہ اگر مارکیوز ڈی کوروویرا کی عطا کردہ اس دستاویز کو اصل مان لیا جائے تو سقوط غرناطہ کی ان دؤ دوسری دستاویز کو کیا کیا جائے جو پہلے سے موجود تھیں اور جنہیں ہمیشہ سے اصل نسخہ کہا جاتا تھا۔ اگلے 25 سالوں میں یہ عقدہ اس طرح حل ہوا کہ یہ دستاویز حقیقتاً امیر ابو عبداللہ (باب دل) اور ملکہ و بادشاہ کے درمیان وہ خفیہ معاہدہ ہے جو ان فریقین کے درمیان براہِ راست راز داری سے دؤ دوسرے (ایک خفیہ اور ایک غیر خفیہ) معاہدوں کی موجودگی میں مزید خفیہ طور پر طے پایا تھا۔

سقوط غرناطہ پر اعلانیہ معاہدہ جس میں سقوط کی شرائط' بعد از سقوط مسلمانوں کے حقوق' توقعات اور اندلس میں عیسائی حکومت کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں اور ضابطوں کا ذکر تفصیلاً تحریر ہے اس معاہدے پر 25 نومبر 1491 کو فریقین نے دستخط کیے جبکہ سقوط غرناطہ پر ایک خفیہ معاہدہ جو امیر ابوعبداللہ کی طرف سے ابوالقاسم عبدالملک' یوسف ابن قاسم اور منظور جیاری نے طے کیا 25 نومبر 1491 کو ہی دستخط کر کے ملکہ و بادشاہ کی حتمی منظوری کے لیے فرینڈ و زافرا کو دے دیا گیا تھا جس پر ملکہ و بادشاہ نے ایک سال کی تاخیر کے بعد 25 دسمبر 1492 کو

امیر عبداللہ (باب دِل) اور بادشاہ فرڈی نینڈ کے درمیان خفیہ معاہدے کا عکس

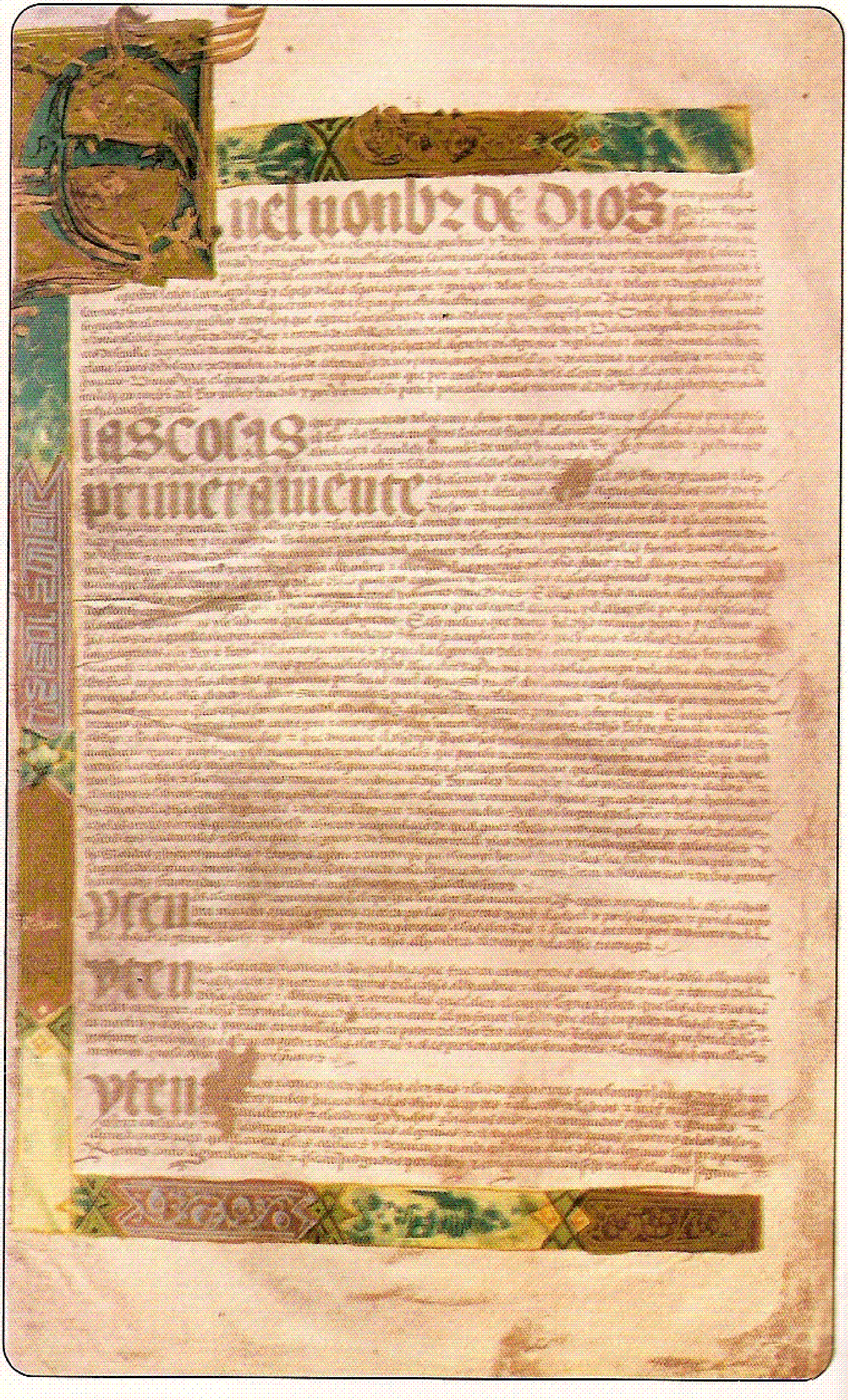

En el nonbre de dios

las cosas primeramente

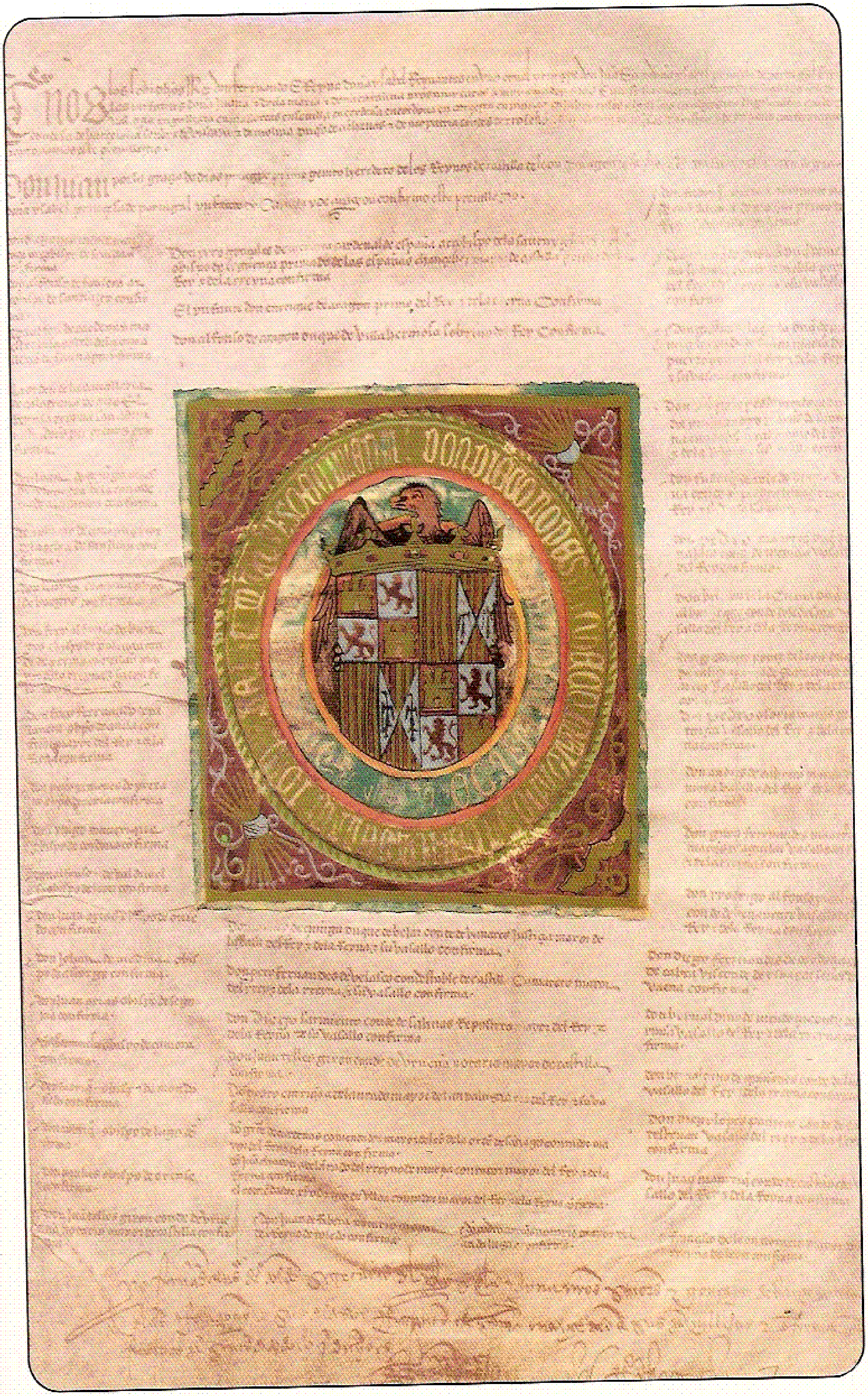

دستخط کیئے۔ سقوط غرناطہ پر ان دو معاہدوں کے بعد تیسرے اور اصلی معاہدے کی برآمدگی نے سوچ میں گنجل، تاریخ میں الٹ پھیر اور واقعات میں رخنہ ڈال دیا۔ واقعات کے محتاط تجزیے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ سقوط غرناطہ کے دو معاہدات (اعلانیہ وخفیہ) کے علاوہ ایک تیسرا خفیہ معاہدہ بھی موجود تھا جو براہِ راست امیر ابوعبداللہ اور ملکہ و بادشاہ کے درمیان فرنینڈو زافرا کی معاونت سے قرار پایا تھا۔ گو کہ اس معاہدے میں بیشتر نکات وشرائط پہلے دو معاہدوں سے مختلف نہیں ہیں لیکن اس دستاویز کے آخری صفحے پر امیر ابوعبداللہ کے دستخط اور ان کی ذاتی مہر کی عدم موجودگی معنی خیز ہے جیسا کہ ان کے دستخط مع عربی میں اضافی نوٹ اور ان کی ذاتی مہر کے ساتھ سقوط غرناطہ کی اس دستاویز کے آخری صفحے پر موجود ہیں جس پر ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ نے بظاہر کسی وجہ کے بغیر ایک سال تک دستخط نہیں کیے تھے۔ ملکہ و بادشاہ نے یہ دستخط 25 دسمبر 1492 کو ثبت کیئے جبکہ معاہدہ 25 نومبر 1491 کو حتمی طور پر طے پا چکا تھا۔

اس تاخیر کی مختلف مورخین نے مختلف توجیہہ پیش کی ہیں۔ ذوالقدر جنگ، خلافت اندلس، میں اس تاخیر کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''فرڈی نینڈ نے نمائشی ردوقدح کے بعد 1492 میں صلح نامے پر دستخط کردیئے'' جبکہ ارونگ واشنگٹن اس تاخیر کو ملکہ و بادشاہ کے فاتحانہ تکبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں اس کی وجوہات ان سے مختلف تھیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ملکہ ازابیلا و بادشاہ فرڈی نینڈ اچھی طرح جانتے تھے کہ معاہدہ سقوط غرناطہ کی سقوط غرناطہ کے بعد کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ مسلمان کسی بھی طرح اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اس معاہدے کی ایک شرط پر بھی عمل درآمد کرا سکتے۔ لہٰذا ملکہ و بادشاہ کے نزدیک غرناطہ کا موضوع تمام ہو چکا تھا۔ ان کے نزدیک معاہدے کی اس دستاویز پر دستخط کرنا یا نہ کرنا بے معنی عمل تھا خصوصاً اکتوبر 1492 میں جب کولمبس امریکہ دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا تو ملکہ و بادشاہ کی توجہ ادھر مرکوز ہوگئی۔ کرسٹوفر کولمبس سے براعظم امریکہ پر معاہدات کرنے کے لیے ملکہ ازابیلا وبادشاہ فرڈی نینڈ کا سپین میں غیر متنازع اور بلاشرکت غیرے مقتدر اعلیٰ ہونا ضروری تھا اور اس کے لیے سقوط غرناطہ کی دستاویز پر دستخط ضروری تھے جو انہوں نے 25 دسمبر 1492 کو کیے۔

معاہدہ سقوط غرناطہ اپنے اثرات میں جس قدر سفاک، تیز دھار اور مسلمانوں کے لیے مہلک آلہ قتل ثابت ہوا اسی طرح اپنی نوعیت میں پر اسرار، سازش بھرا اور فریب آراستہ بھی تھا۔ اس معاہدے پر وقفے وقفے سے دستخط ہوئے، ٹھہر ٹھہر کے منظوری دی گئی، وقتاً فوقتاً ترمیم و

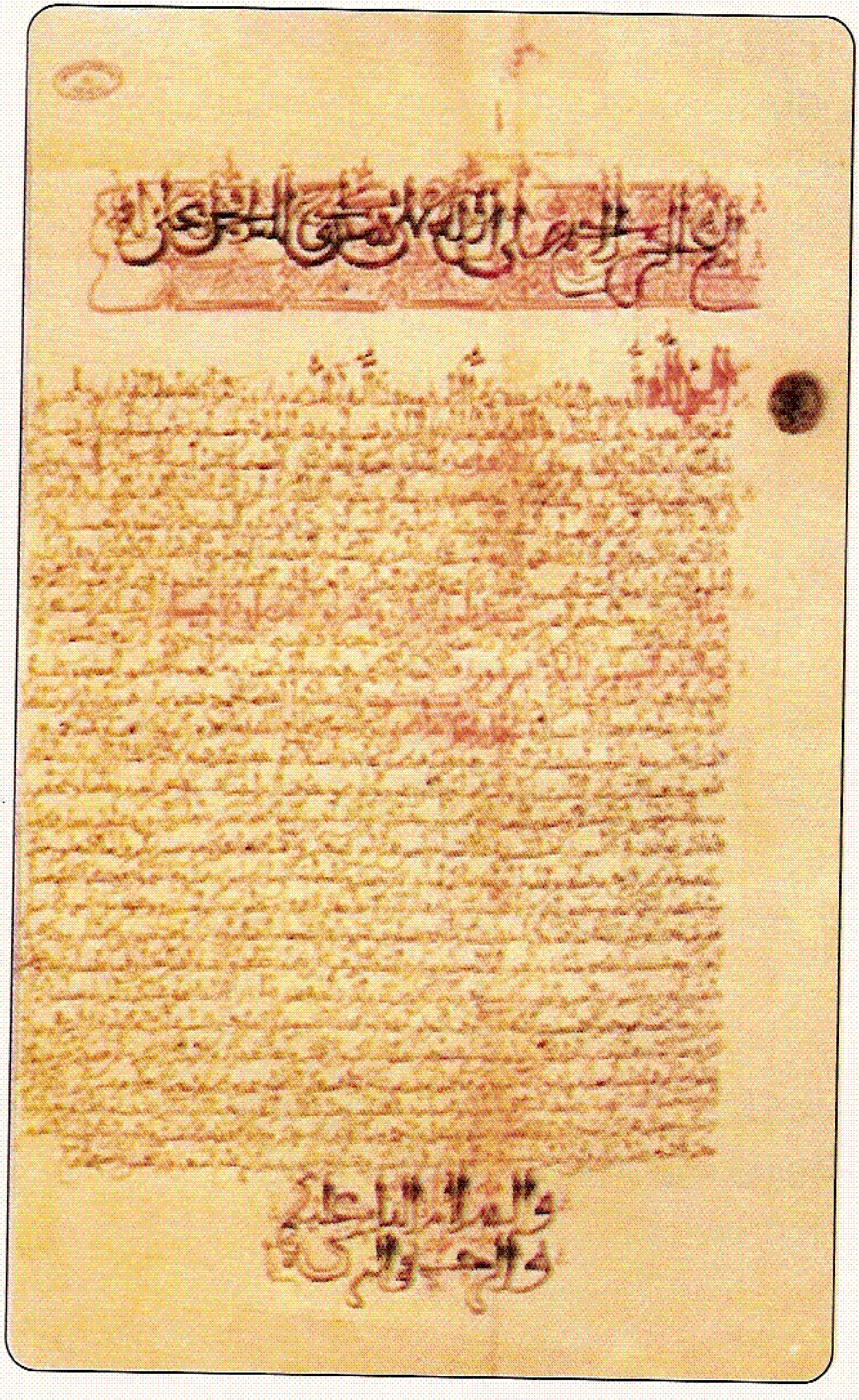

9 مئی 1489ء

گورنر غرناطہ ابوالقاسم عبدالملک کا خط والئی مصر کے نام۔ بحری بیڑہ بھیجنے اور محاصرہ غرناطہ کے دوران امداد کی درخواست

اضافہ ہوتا رہا۔ غرناطہ کے محاصرے سے بدلتی ہوئی جنگی، سیاسی اور معاشی صورت حال کے مطابق اس معاہدے کی شرطوں میں ترمیم و اضافہ جاری رہا۔ لیکن یہ دستاویزاتی الجھاؤ اس وجہ سے ہے کہ اولاً ملکہ کے معتمد خاص فرڈی نینڈ زافرا نے بنیادی معاہدے کی تین نقول تیار کیں جن میں سے ایک ملکہ و بادشاہ کے زیر نظر رہی، ایک اس کے اپنے زیر ملاحظہ رہی اور ایک گورنر غرناطہ ابوالقاسم عبدالملک اور امیر ابوعبداللہ کے درمیان مذاکرات اور ترمیم و اضافے میں استعمال ہوتی رہی جبکہ تیسری نقل ملکہ و بادشاہ کے مذہبی مشیروں، امرا، حکام اور شہزادگان کو ملاحظے کے لیے پیش کی گئی۔ یوں اس معاہدے پر تین مختلف سطحوں پر کام شروع ہوا حالانکہ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی اور یہ سب سراسر نمائشی اور دکھاوا ہی دکھاوا تھا۔ چونکہ ایک اور معاہدہ (جسے اصل معاہدہ کہنا چاہیے) امیر ابوعبداللہ (باب دل) اور ملکہ و بادشاہ کے درمیان براہِ راست اور خفیہ طور پر 1485 سے ہی زیر تجویز رہا تھا امیر ابوعبداللہ جنگ الیسانہ کی شکست کے بعد دو سال بادشاہ فرڈی نینڈ کی قید میں رہا تھا۔ فرڈی نینڈ کی قید سے امیر ابوعبداللہ کی رہائی اسی مقصد کے تحت عمل میں لائی گئی تھی کہ وہ سقوط غرناطہ کو سہل اور ممکن بنانے میں عیسائیوں کے دست راست کا کردار ادا کرسکیں یوں عام مسلمانوں کے دکھاوے کو جس معاہدہ غرناطہ کا ڈول 1490 میں ڈالا گیا تھا اندر خانے 1485 سے ہی زیر غور تھا جس میں امیر ابوعبداللہ کی طرف سے تجویز کردہ درج ذیل شرائط شامل ہیں جن میں وقت کے ساتھ ساتھ اور حالات کے مطابق ترمیم واضافہ ہوتا رہا اس خفیہ معاہدے کی کھچڑی بادشاہ فرڈی نینڈ، گورنر غرناطہ ابوالقاسم عبدالملک اور امیر ابوعبداللہ کے معتمد خصوصی یوسف ابن القاسم کے درمیان کئی سالوں پکتی رہی۔

تجاویز برائے سقوط غرناطہ: یکم اپریل 1485
تجویز کنندہ امیر ابوعبداللہ (باب دل)

- میرے نابالغ بیٹے کو (جسے جنگ الیسانہ میں شکست کے وقت زیر نگرانی لے لیا گیا تھا اور دوسرے (قیدیوں) کو رہا کر دیا جائے گا اور ان پر کوئی فرد جرم عائد نہیں کی جائے گی۔ عام معافی کے تحت جو لوگ غرناطہ یا اس کے مضافات میں قیام پذیر ہونا چاہیں ان کے وہاں رہنے پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ ان کی املاک محفوظ ہوں گی اور انہیں ہراساں نہیں کیا جائے گا۔

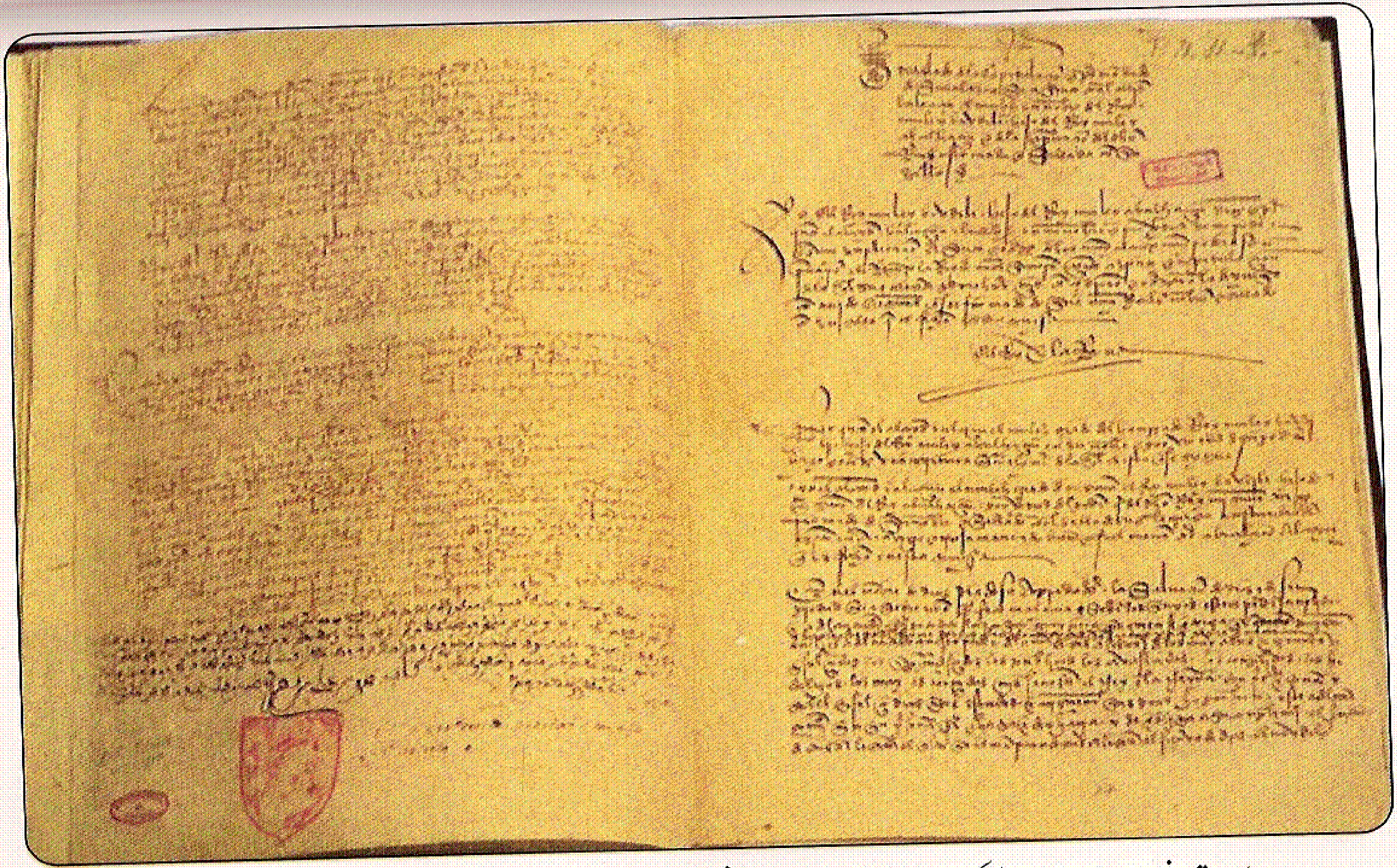

معاہدہ سقوطِ غرناطہ پر امیر ابو عبداللہ کی مہر اور دستخط (عربی میں اضافی شرط کے ساتھ) یہ صفحہ 8 جولائی 1493ء کو معاہدہ میں شامل کیا گیا۔

عیسائی شاہی خاندان اور امراء دائرہ قانون اور اپنی روایت کی حد میں رہیں گے جیسا کہ وہ ہمیشہ سے رہ رہے ہیں۔

عیسائی شاہی خاندان اور امراء دائرہ قانون اور اپنی روایت کی حد میں رہیں گے جیسا کہ وہ ہمیشہ سے رہ رہے ہیں۔

- غرناطہ میں مقیم ہونے والوں یا چھوڑ کر جانے والوں سے ان کا اسلحہ نہیں لیا جائے گا، انہیں کبھی غیر مسلح نہیں کیا جائے گا۔
- غرناطہ کے رہائشی جو وہاں سے جانا چاہتے ہیں ان کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد و اثاثہ جات سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ انہیں ان اثاثوں کو فروخت کرنے‘ ساتھ لے جانے یا وہ جو بھی کرنا چاہیں اس کی عام اجازت ہو گی۔
- غرناطہ سے جانے والے یا وہاں آنے والے اپنے زیورات‘ سونا اور زر نقد اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں اور لا سکتے ہیں۔
- 5 سال تک ان لوگوں کے اثاثے‘ زیورات اور زر نقد ہر طرح کی ادائیگیوں (ٹیکس) سے مستثنیٰ ہوں گے 5 سال کے بعد وہ اتنا ہی ٹیکس ادا کریں گے جتنا کہ مسلمان حکومت کو ادا کرتے تھے۔
- مسلمان کوئی امتیازی یا شناختی نشان نہیں پہنیں گے۔
- پسماندگان کو مرحومین کے قرض اتارنے کے لیے 5 سال کی مہلت دی جائے گی۔
- غرناطہ میں جنگی قیدی رہا کر دیئے جائیں گے۔ ان کی رہائی کے وقت انہیں اسیر بنانے والوں کو موقع پر طلب کر کیا جائے گا۔
- قصر الحمراء سے بے دخلی کے وقت جنگی قیدی دو رویہ کھڑے ہوں تا کہ انہیں اپنی رہائی کا یقین آ سکے۔
- بادشاہ یا شاہی خاندان کے افراد آزاد جنگی قیدیوں کو کسی بھی حیثیت میں (ذاتی خدمت گار یا غلام) نہیں بنائیں گے نہ ہی انہیں کسی بیگار پر

لگایا جائے گا۔

- بادشاہ اور امراء اس امر کو یقینی بنائیں گے کہ عیسائیوں کو مسلمانوں کے گھروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوگی اور عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کو دی گئی سزاؤں پر عمل درآمد نہیں کیا جائے گا۔
- بادشاہ و امراء مسلمانوں کو نہ تو اپنی فوج میں شامل ہونے پر مجبور کریں گے اور نہ ہی ان سے جبری بیگار لی جائے گی۔
- مسلمانوں کے گھروں میں بلا اجازت یا زبردستی داخل ہو جانے والے عیسائیوں کو زدوکوب، زخمی یا ہلاک کرنے والے مسلمانوں سے باز پرس نہیں ہوگی بعینہٖ جیسا کہ مسلمان حکومتوں میں مروج تھا۔
- غرناطہ میں داخل ہونے والے مسلمان، مذہبی رہنما، سکالر، جنرل، امراء اور حکام اور ان کے لواحقین قابل احترام سمجھے جائیں گے۔ ان کی شنوائی ہوگی، ان کی روایات کو ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔ جیسا کہ مسلمان حکومتوں میں ہوتا آیا ہے۔
- مسلمانوں کے باہمی تنازعات میں مسلمان قاضی ہی ان کے مقدمے طے کریں گے لیکن مسلمان اور عیسائی فریقین کی صورت میں بھی مسلمان منتظم اور مسلمان قاضی ہی ان کے فیصلے کریں گے۔
- مسلمانوں کے واجبات میں اگر عیسائی حصہ دار ہوں تو یہ یقینی بنایا جائے گا کہ مسلمانوں کو ان کا حصہ ضرور ملے اور مسلمان منتظم اس عمل کی نگرانی کریں گے۔
- ایسے معاملات جن میں زرِ نقد اور لین دین شامل ہو وہ متعلقہ افراد یا حکام سے ہی طے کیا جائے گا۔
- کسی مسلمان سے دوسرے مسلمان کے جرائم، گناہ اور معاملات پر باز پرس نہیں ہوگی۔ انصاف کو یہ طاقت حاصل نہیں ہے کہ وہ باپ کے جرائم کا بیٹے سے اور بھائی کے جرائم کا بھائی سے محاسبہ کرے۔

- ان تجاویز کا اطلاق ہونے تک حدود غرناطہ میں داخل ہوجانے والے مسلمان جنگی قیدیوں کو آزاد سمجھا جائے گا۔ ان جنگی قیدیوں کے سرداروں کو حدود غرناطہ میں اپنے اختیارات استعمال کرنے پر پابندی ہوگی۔
- ہمارے دشمنوں اور خدمت گاروں کو ہم پر ایسے اختیارات نہیں دیئے جائیں گے کہ وہ ہمارا انصاف کریں اس معاہدے کے تحت ہمیں ایسے تحفظات حاصل ہوں گے کہ ہم انہیں قتل کرنے پر محفوظ ہوں گے۔
- اس معاہدہ کے اطلاق کے 30 دنوں کے اندر اندر اس میں شامل ہو جانے سے احتراز کرنے والوں سے عیسائی بادشاہ جو بھی سلوک کرے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔
- وہ یہودی جو اس معاہدے میں ہمارے ساتھ ہیں یا وہ عیسائی جو یہودی ہو گئے ہیں انہیں 60 دنوں سے زیادہ مدت تک نقل و حمل کے لیے اجازت نامے دیئے جاتے رہیں گے۔
- غرناطہ کے مضافات میں ہر چھوٹی بڑی آبادی پر وہی ضابطے نافذ رہیں گے جو مسلمان حکومت کے دور میں نافذ تھے۔

یہ شرائط جو اس دستاویزات میں لکھی گئیں ہیں ان کا معاہدے میں شامل ہونا لازمی ہے۔ عالی قدر بادشاہ، شہزادگان اور ان کے اقرباء کارڈینیلز اور عیسائی مذہبی رہنما ہمیں اس بات کی ضمانت دیں کہ ان شرائط پر لفظ بہ لفظ عمل کیا جائے گا جو کہ یہاں تحریر کردی گئی ہیں۔ آپ لوگوں کو یہ شرائط نامہ ہمیشہ اپنے پاس رکھنا ہوگا۔ اس پر اپنی مہر ثبت کرنی ہوگی اور اپنے ہاتھ سے دستخط کرنے ہوں گے۔ بڑے پادری کو اس پر ہم سے کوئی معاوضہ طلب کیئے بغیر اس پر دستخط کرنے ہوں گے اور اس پر اعلیٰ ترین عہدیدار کی مہر اور تصدیق ثبت ہونی چاہئے۔ یہی اعلیٰ ترین (شاہی) مہر اس وقت بھی لگانے کے لیے موجود ہو جب اس معاہدے پر باہمی

دستخط کیے جائیں گے۔   20۔(ڈی زافرا' آرکائیو' غرناطہ1485)

بادشاہ فرڈی نینڈ کو امیر ابو عبداللہ کی تجویز کردہ شرائط کی وصولی کے بعد گورنر غرناطہ ابوالقاسم عبدالملک کی یاد داشت موصول ہوئی جس میں انہوں نے لکھا کہ یہ نئی شرائط نہیں ہیں بلکہ انہیں امیر ابوعبداللہ کی طرف سے پیش کردہ شرائط سے ملا کر پڑھا جائے۔ یہ ان شرائط کا خلاصہ ہے جو پیش کی جاچکی ہیں یا وہ شرائط جو پیش کرنے سے رہ گئی تھیں۔ بادشاہ غرناطہ امیر ابو عبداللہ مطالبہ کرتے ہیں کہ:

- کوئی شخص مسلم یا غیر مسلم کسی بھی قانون پسند' امن پسند مسلمان شہری کے گھر بلا اجازت داخل نہیں ہوگا۔ نہ ہی اس کے کاروبار میں مداخلت کرے گا اور نہ ہی اُس کے گھر میں توقف کیا جا سکے گا۔ اس ضابطے کو توڑنے والوں کو کڑی سزا دی جائے گی۔
- مسلمانوں کو اسلحہ سمیت نقل وحمل کی اجازت حاصل ہوگی۔
- مسلمان امتیازی نشانات پہنے بغیر سفر کر سکتے ہیں۔
- عیسائی افراد کو فروخت کرنے والوں یا مال کے عوض عیسائی افراد کا تبادلہ کرنے والوں کو سزا دی جائے نہ کہ ان افراد کو جن کے قبضے سے یہ عیسائی مال فروختنی برآمد ہو۔
- جو لوگ غرناطہ آنا چاہیں انہیں پانچ 5 سال تک آنے کی اجازت ہو اگر لوگ اس معاہدے کے ثمرات سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو انہیں اس سے محروم نہیں کیا جانا چاہیے۔
- بادشاہ غرناطہ نے اپنے عہد حکومت میں جو اثاثے بنائے ہیں مسلمان یا عیسائی ان کی واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتے ۔یہی اصول بادشاہ غرناطہ کے حواریوں پر بھی نافذ ہوگا کہ ان سے مال' اسباب اور اشیاء کی واپسی کا تقاضا نہیں کیا جائے گا نہ ہی اس ضمن میں مسلم یا عیسائی قوانین کا نفاذ کیا جائے گا۔
- غرناطہ کی منڈیوں اور قرب و جوار کی منڈیوں میں مسلم تاجروں کو مال

بیچنے کی حسب دستور آزادی ہوگی۔ وہ بار برداری کے مسلم یا عیسائی طریقوں میں سے جو بھی مناسب خیال کریں اپنا مال فروخت کرنے لے جاسکتے ہیں۔ اس شرط کا اطلاق ہر اس علاقے پر ہوگا جو اس معاہدے کی حدود میں شامل ہوگا۔

- ہر وہ شخص جو اپنا مال تجارت اور مصنوعات کہیں بھی لے جا کر بیچنا چاہے اسے قسمت آزمائی کا آزادانہ موقع دیا جائے اور اس پر اتنا ہی محصول عاید ہو جتنا کہ عیسائیوں پر عاید ہے۔
- عیسائیوں کو وہ تمام مرد و زن لوٹانا ہوں گے جو انہوں نے پکڑ لیے ہوں وہ ان کو سزا و ایذا دینے کے مجاز نہیں ہوں گے نہ ہی وہ ان کی تحقیر کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی غیر اخلاقی حرکت۔
- یہ اصول ہمیشہ کے لیے مان لیا جانا چاہیے کہ وہ عیسائی بچے جن کے باپ مسلمان تھے باپوں کو ملنے چاہئیں۔ اسی طرح مسلمان عورتیں جنہوں نے عیسائی مردوں سے بچے پیدا کیے وہ بچے ان عورتوں کو ملنے چاہئیں۔ تبدیلی مذہب کے لیے کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔
- کوئی بھی مسلمان عورت جو شادی شدہ ہو یا اس کی شادی ہونے والی ہو اور وہ عیسائی ہو جانے کی نیت رکھتی ہو تو اس کے قبضے میں موجود مال اسباب، اثاثہ اس کے باپ یا شوہر کو دے دیا جائے۔ اور وہ اس وقت تک مسلمانوں میں ہی رہے گی جب تک مذہبی علماء کی کمیٹی اس کا فیصلہ نہ کر دے۔
- دوران جنگ مسلمانوں نے جو عیسائیوں سے مال غنیمت (ہتھیار، گھوڑے، کاٹھیاں) وغیرہ حاصل کر لیے ہیں ان کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔
- بادشاہ عالی قدر سے امیر غرناطہ مطالبہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے قبضے میں ان کے مال مویشیوں کو ان کے ہمراہ پانچ ہزار منزل تک لے جانے

> کی اجازت ہو۔ انہیں ان کے منقولہ اثاثوں کیساتھ آزادانہ ورضا کارانہ نقل وحمل پر پابندی نہ لگائی جائے۔ وہ جب بھی عالی قدر بادشاہ فرڈی نینڈ کے دربار میں عرض گزارنے آئیں تو انہیں ہتھیاروں سے غیر مسلح نہ کیا جائے اور ان کی عرض داشت پر ہمدردانہ غور کیا جائے جبکہ امیر غرناطہ یہودیوں پر بھی اپنی شرائط کے اطلاق کی توقع رکھتے ہیں۔ جیسا کہ مجھے ماضی میں بادشاہ کا ہاتھ چومنے کا موقع دیا گیا تھا اور ایک مراعات یافتہ خط دیا گیا تھا میں اب بھی اسی طرح کی توقع لگائے ہوئے ہوں کہ مجھے ایک بار پھر اس عنایت کا مستحق سمجھا جائے گا۔
>
> ابوالقاسم عبدالملک گورنر غرناطہ مملکت اسلامیہ الاندلس۔

21۔ (ڈی زافرا' آرکائیو غرناطہ: 1485)

ابوالقاسم کی طرف سے اس خط کے بھیجے جانے کے فوراً بعد بادشاہ فرڈی نینڈ کو ایک اور مشترکہ مگر خفیہ تجویز بھیجی گئی اس تجویز کو ذاتی مفادات کی مشترکہ تجویز کے نام سے بھیجا گیا اور اس کے محرکین میں امیر ابوعبداللہ' ابوالقاسم عبدالملک (گورنر غرناطہ) اور یوسف ابن ابوالقاسم (معتمد خاص) شامل ہیں اس مطالبہ نما تجویز میں تحریر ہے:

> ''جیسا کہ یہ زیر غور ہے کہ ہم غرناطہ آپ کے حوالے کر دیں اور بادشاہ غرناطہ وہاں سے کچھ بھی ساتھ نہ لے جائیں یعنی ہر چیز اسی طرح چھوڑ دی جائے تو ہماری طرف سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کے سقوط غرناطہ کے موقع پر امیر ابوعبداللہ کو تین لاکھ ماراویدا ادا کیے جائیں۔
>
> - ملکہ بادشاہ کے قبضے میں نوعمر یرغمالی شہزادے کو بھی اس موقع پر رہا کر دیا جائے۔
> - جن لوگوں کے اثاثہ جات غرناطہ میں موجود ہیں وہ ان کے مالکان کو لوٹا دیئے جائیں خواہ وہ اس وقت غرناطہ میں نہ بھی ہوں یا وہ غرناطہ کی رہائش ترک کر چکے ہوں۔
> - پرچینا وادی (المیریا) میں دریائے المنظورہ کے اطراف میں زرخیز

زرعی قطعات کے (ذوالقدر جنگ نے 'خلافت اندلس' مطبوعہ 1904 میں اس علاقے کو پرشینا لکھا ہے مصنف) علاقے میں زمینی اثاثوں پر ہماری ملکیت ہوگی۔ بادشاہ امیر ابو عبداللہ کی مرضی کے بغیر نہ تو کوئی وہاں آ سکتا ہے نہ ہی وہاں سے کچھ لے جاسکتا ہے۔ اس دوران پرچینا میں فروخت کیئے گئے قطعات اراضی ماہِ مارچ کے آخر تک امیر ابو عبداللہ کو لوٹانا ہوں گے اور یہ ان کی صوابدید پر ہوگا کہ اگر وہ مستقبل میں پرچینا کی اراضی کو فروخت کرنا چاہیں تو انہیں اس کا اختیار حاصل ہوگا۔

- وہ تمام اراضی جو سقوط غرناطہ کے سودے میں عیسائی عالی قدر بادشاہ قبول نہ کریں وہ امیر ابو عبداللہ اور ابو القاسم عبدالملک کو دے دی جائے تا کہ ہم اسے اپنے شرائط نامے میں شامل کر کے اسے غیر فروختنی قرار دے کر اپنے ورثاء کے لیے محفوظ کرسکیں۔
- ہماری خواتین کو زیورات خوشبویات' ہارسنگھار' تیل روغن اور آرائشی سامان فروخت کرنے کی اجازت ہوگی۔ اگر عالی قدر بادشاہ فرڈی نینڈ کا گھرانہ ان اشیاء کی خریداری میں دلچسپی رکھتا ہے تو وہ نسبتاً کم قیمت پر یہ اشیاء خریدنے کا مجاز ہوگا۔
- وادی البشارہ اور اس سے ملحقہ زمینوں پر سقوط کی حد نافذ نہیں ہوگی۔
- قصر الحمراء کو عیسائی بادشاہ کے تصرف میں دینے یا سقوط غرناطہ کی تکمیل ہونے تک یعنی سقوط کی شرائط کے نفاذ سے پہلے جو زمین' اثاثے یا اشیاء لے لی جائیں گی وہ سقوط کے وقت بنا کسی حیلہ گری کے لوٹانا ہوں گی۔
- بادشاہ غرناطہ اور ان کے امراء سے وہ مال اسباب واپس نہیں لیا جائے گا جو سقوط سے پہلے اور قصر الحمراء کی حوالگی سے پہلے وہ لے چکے ہیں۔
- امیر قادسیہ یا امیر غرناطہ سے اس مال متاع' زر نقد یا اثاثوں کی جواب طلبی یا واپسی کا تقاضا یا باز پرس نہیں ہوگی جو سقوط کے رونما ہونے تک ان کی ملکیت اور قبضے میں شمار ہوتا ہے۔ اس طرح کا مطالبہ کرنے

والے عیسائی حکام کے لیے بادشاہ فرڈیننڈ کی طرف سے سزاؤں کا اعلان کیا جائے۔

- ہر وہ شخص جو حدود غرناطہ سے نکلنا چاہے وہ اپنے اہل و عیال، منقولہ جائیداد اور مال و اسباب بغیر کسی تاوان کی ادائیگی کے، لے جانے کا اہل ہوگا جس میں ہتھیار، ذاتی استعمال کی اشیاء مال مویشی اور ملبوسات وغیرہ شامل ہوں گے۔
- امیر ابوعبداللہ کو اس امر کی اجازت ہوگی کہ وہ اپنی جائیداد و اثاثہ جات حسب منشاء فروخت کرسکیں تو بادشاہ عالی قدر فرڈی نینڈ کا شاہی خاندان یہ اثاثے خریدنے کا مجاز ہوگا لیکن انہیں پوری قیمت ادا کرنا ہوگی۔
- بادشاہ ابوعبداللہ اور ان کے حکام کو عیسائی حکومت کی طرف سے کسی جنگ میں شریک ہونے پر مجبور نہیں کیا جائے گا وہ فوجی مہمات کی مدد کرنے سے مستثنیٰ ہوں گے حتیٰ کہ وہ خود رضا کارانہ طور پر کسی قسم کی مدد کرنا چاہیں۔
- مسلمان جنگی قیدی اور عام قیدی جو زیر حراست ہیں ان کو رہا کردیا جائے گا اور وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہیں قیام پذیر ہوسکتے ہیں۔
- عرصہ پانچ سال کے لیے مسلمانوں کو حقوق راہداری حاصل رہیں گے اور وہ اس دوران نقل و حمل کے مجاز ہوں گے۔
- عرصہ پانچ سال کی مدت کے بعد بھی انہیں بدستور حقوق راہداری حاصل رہیں گے لیکن انہیں عیسائیوں کے برابر زرراہداری ادا کرنا ہوگا۔
- معاہدہ سقوط کی یہ شرائط میرے ابو عبداللہ (باب دل)، ابوالقاسم عبدالملک، یوسف ابن القاسم اور ہمارے بچوں کے لیے ہیں اب تم جیسا بھی مناسب سمجھو اور اسے جس طرح بھی دیکھو لیکن بذریعہ تحریر ان کی تصدیق کردی جائے کہ یہ شرائط جیسا کہ ہم محسوس کرتے ہیں ہماری باہمی دوستی اور تعلقات کے تناظر میں حتمی تسلیم ہوں گی کہ الحمراء پر قبضہ دیتے

وقت ابوالقاسم عبدالملک کو دس ہزار سکے زر نقد اور مجھے (ابو عبداللہ) کو اضافی دس ہزار سکے زر نقد ادا کیے جائیں گے۔

- والیوز کے مقام پر کیمپ میں جو مسلمان کسان مقیم ہیں وہ ہمارے لیے موسم سرما میں اناج فراہم کرتے رہے ہیں۔ ان کا تعلق ابن الحاج، ابن الیاء اور ابن زید سے ہے اب وہ میری تحویل میں آچکے ہیں لہٰذا انہیں بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ عالی قدر بادشاہ انہیں مراعات سے سرفراز کریں۔
- عالی قدر عیسائی بادشاہ ہمیں یقین دہانی کرائیں، وعدہ کریں کہ ذاتی مفادات کی یہ تجاویز جناب کی منظوری سے بہرہ مند ہوں گی۔

دستخط: امیر ابوعبداللہ

ابوالقاسم عبدالملک

یوسف ابن القاسم

22۔ (ڈی زافرا' آرکائیو۔ غرناطہ)

ان تجاویز کو ارسال کرتے ہی یوسف ابن القاسم اور ابوالقاسم عبدالملک کی طرف سے ایک اور یادداشت بھیجی گئی جس میں یاد دلایا گیا ہے کہ تجاویز جو فرنینڈو ڈی کا فرا کے حوالے کردی گئی تھیں کہ وہ بادشاہ عالی قدر کے ملاحظے کے لیے پیش کردے ان پر ردعمل ظاہر کیا جائے ور فرنینڈو ڈی کافرا کو حتمی دستاویز کی تیاری کے لیے کہہ دیا جائے حتمی دستاویز کو دیکھنے کے بعد ہم سب مزید اس پر غور وخوض کے لیے اکٹھے ہو سکتے ہیں۔

23۔ (ڈی زافر' آرکائیو' غرناطہ)

گورنر غرناطہ ابو القاسم عبدالملک اپنے طور پر بھی ملکہ ازابیلا و بادشاہ فرڈی نینڈ سے ذاتی معاہدے میں سرگرم رہے فرڈی نینڈ زافر امعتمد خاص سے ان کی ایک خفیہ خط وکتابت بھی پہلو بہ پہلو چلتی رہی اس یادداشت کے بھیجنے کے بعد گورنر غرناطہ نے فرنیڈو ڈی زافرا کو لکھا:

> ابوالقاسم عبدالمالک کی طرف سے فرنیڈو ڈی زافرا کے لیے:
>
> ابھی تک کچھ شرائط غیر حتمی ہیں اس سے پہلے کہ غرناطہ آپ کے حوالے کیا جائے قیدیوں کی رہائی ضروری ہے عزت ماب کو یہ بات بادشاہ کے عرض گزار کرنی چاہیے کہ مارچ کے آخر تک عیسائی افواج بدستور اپنے فرائض انجام دیتی رہیں گی اس دوران امیر غرناطہ کو تحفظ فراہم کرنے کا

> فریضہ انجام دیا جاتا رہے ہم اس بارے میں خط لکھ رہے ہیں کہ کیا کیا جانا چاہیے میری خواہش ہے کہ عیسائی شاہی خاندان کے دروازے مجھ پر کھلے رہیں اور مجھے ان کا خدمت گار تصور کیا جائے مجھے اپنی مرضی سے جانے کی اجازت ہو یہ تمام بات خفیہ رکھی جائے اور کسی کو اس خط کے مندرجات سے آگاہ نہ کیا جائے۔ 24۔ (ڈی زافرا' آرکائیو' غرناطہ: 1491)

ان پے درپے تجاویز' خطوط اور یادداشتوں کے جواب میں عیسائی بادشاہ فرڈی نینڈ کا خط امیر ابوعبداللہ (باب دل) کے نام موصول ہوا جس میں فرڈی نینڈ لکھتے ہیں:

> ہمیں آپ کے تمام خطوط مل چکے ہیں ہمیں یہ توقع نہیں تھی تم اس سے زیادہ کا مطالبہ کرو گے جس پر پہلے اتفاق رائے ہو چکا ہے۔ اس سے تاخیر ہو رہی ہے ۔ جو کچھ تمہیں لکھا گیا تھا تم نے اس کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور کسی غلط فہمی کا شکار ہو چکے ہو اور اس پر عمل درآمد کرنے سے قاصر رہے ہو تم نے مزید مہلت کا تقاضا کیا ہے اس سے زیادہ وقت مانگتے ہو جس پر ہم متفق ہو چکے تھے تمہیں ہر اس شرط پر عمل درآمد کرنا ہوگا جس پر باہمی اتفاق ہو چکا ہے اور جس کی حتمی تصدیق تمہیں ارسال کی جا چکی ہے۔ اگر تم ان شرائط پر عمل درآمد نہیں کرو گے جو طے پا چکی ہیں اور جو ہم تحریری طور پر باضابطہ لکھ کر منظور کر چکے ہیں تو ہم پر بھی ان شرائط کو ماننے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جو ہم نے قبول کی تھیں ۔ تحریری طور پر یہ موجود ہے کہ غرناطہ کی حوالگی ایک معینہ مدت میں ہونا تھی اب جبکہ غرناطہ سے تمہاری دست برداری میں تاخیر ہو چکی ہے تو ایسے میں متعلقہ شرائط ساقط ہو چکی ہیں خواہ وہ تحریری ہی تھیں ۔
>
> عیسائی بادشاہ (رائل کورٹ)
>
> فرڈی نینڈ 25۔ (ڈی زافرا آرکائیو غرناطہ: 1491)

کھیل بگڑتے مضمون کے اس خط نے امیر ابوعبداللہ اور اس کے حواریوں کو سخت دباؤ میں مبتلا کر دیا۔ سقوط کے ابتدائی مذاکرات کے دوران بادشاہ فرڈی نینڈو نے خصوصی اہمیت والے

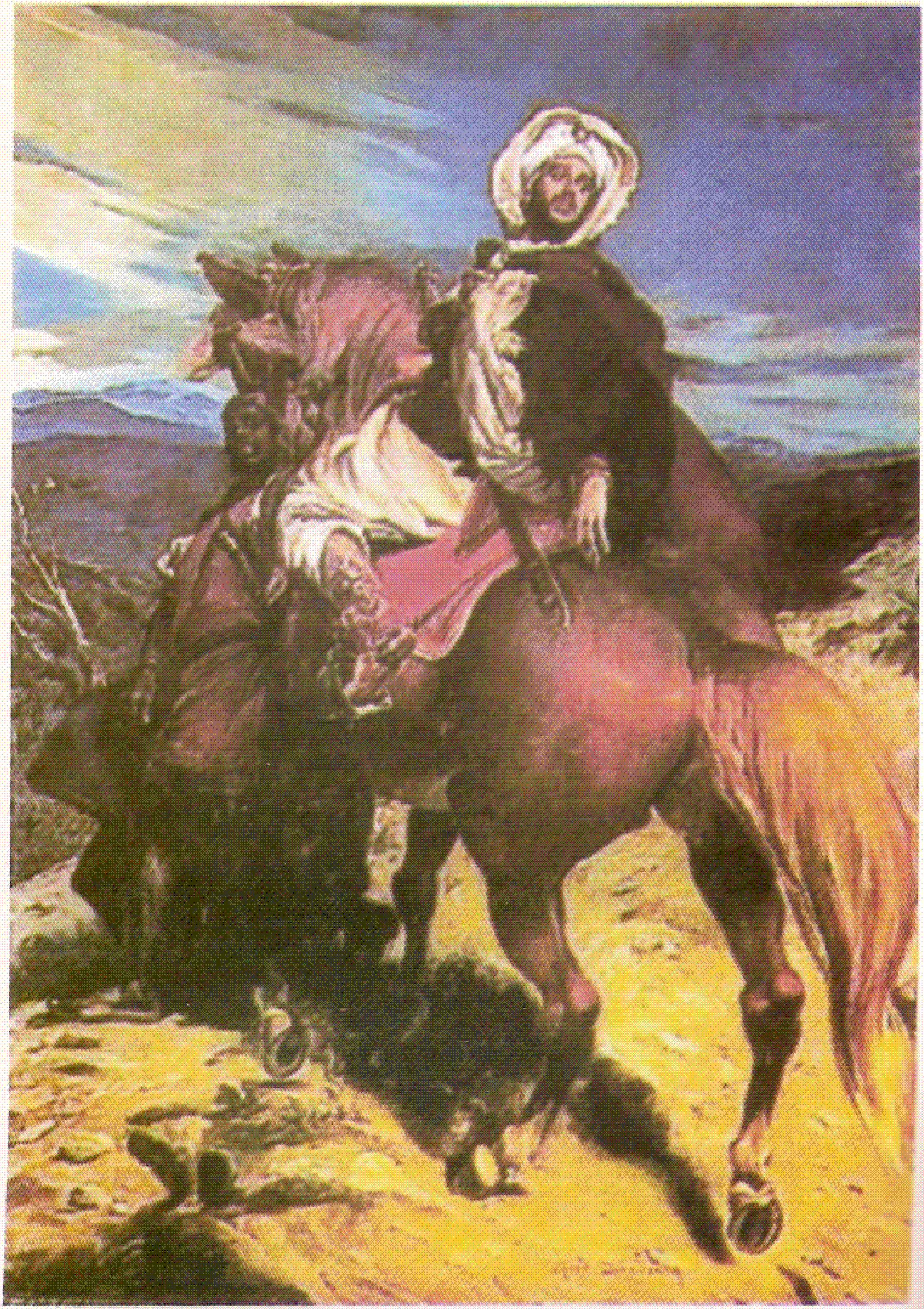

’’میرے اللہ نے میری تقصیر میرے سر پر رکھ دی ہے‘‘۔ امیر ابو عبداللہ

وادئ بشارہ سے غرناطہ پر آخری نظر 2 جنوری 1492

آرٹسٹ: ایف پاڈیلا

مسلمان امراء کے کسی بیٹے کو سقوط غرناطہ کی تکمیل ہونے تک بطور ضمانت اپنے پاس یرغمال رکھنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس خط کے وصول ہوتے ہی ابو القاسم عبدالمالک نے فرنینڈ و وزافرا کو خط لکھا:

> ”میں بروز ہفتہ ابن القاسم کو وہاں چھوڑنے کے لیے ساتھ لے کر تمہارے پاس آؤں گا اور اسی رات واپس آجاؤں گا سقوط کی شرائط تیار رکھی جائیں تاکہ انہیں حتمی دستاویز میں شامل کیا جاسکے۔“ ابوالقاسم عبدالمالک

26۔ (ڈی زافرا آرکائیو غرناطہ: 1491)

فرنینڈ وزافرا نے اس خط کے جواب میں ابو القاسم کو مطلع کرتے ہوئے لکھا:

> ” شاہی خاندان نے اس امر کی اجازت دے دی ہے کہ تم ابن القاسم کے بیٹے کو لے آؤ جیسا کہ تم نے درخواست کی ہے تمہارے آنے پر کچھ شرائط پر تبادلہ خیال کیا جاسکتا ہے“

27۔ (ڈی زافرا' آرکائیو۔ غیرناطہ: 1491)

اندلس کے مسلمانوں پر عجب وقت پڑا تھا' ادھر قیامت اپنی چال چل رہی تھی ادھر مسلمان حکمران اندر خانے عیسائی حکمرانوں سے اپنے لیے جس قدر بٹور سکتے تھے' اس کے حصول میں سرگرداں تھے۔ ڈوبتے جہاز سے وہ جو کچھ بچا سکتے تھے جہاز بچانے سے زیادہ انہیں اس کی فکر تھی۔ ادھر ملکہ ازابیلا و بادشاہ فرڈی نینڈ' ہر گزرتے دن کے ساتھ مسلمانوں کی کمزور ہوتی مدافعت کے ساتھ ساتھ شرائط سقوط کو سخت سے سخت تر بناتے جاتے تھے۔ 1491ء کے شروع ہوتے ہی امیر ابو عبداللہ یقینی طور پر نوشتہ دیوار پڑھ چکے تھے۔ اب ان کی ساری جدوجہد اس نکتے پر مرکوز ہو چکی تھی کہ غرناطہ کے بدلے انہیں ذاتی طور پر کیا مل سکتا ہے۔ وہ خفیہ طور پر عیسائی حکمرانوں سے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ پر محو مذاکرات تھے اور ان کی معاونت گورنر غرناطہ ابوالقاسم عبدالمالک' یوسف ابن ابوالقاسم اور حمد النفیس وغیرہ کر رہے تھے۔ جبکہ یہ معاونین اپنے اپنے طور پر بھی عیسائی دربار سے ذاتی مفادات کے لیے مذاکرات میں مصروف تھے۔ غرناطہ بیک وقت سورۃ التکویر کی تفسیر اور وہاں کے مسلمان حکمران سورۃ البقرہ کی شہادت بنے ہوئے تھے۔ اندلس کی زمین پر سجدے اور فضا میں اذانوں کی صدا تمام ہو رہی تھی۔ وہاں سورج لپٹ رہا تھا اور ستارے بکھر رہے تھے' حاملہ عورتیں بچہ جننے کے لیے محفوظ مقام ڈھونڈتی تھیں۔ دریا خون اور آگ سے بھرے تھے۔ جہنم بھڑک رہا تھا۔ سب وحشی جانور یک جا ہو چکے

تھے۔ اور لوگ اپنے نامہ اعمال لیے قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ ارشاد ربانی ہے:

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ○

جب سورج لپیٹ دیا جائے۔

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ○

اور جب ستارے بکھر جائیں۔

وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ○

اور جب پہاڑ اکھیڑ دیئے جائیں۔

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ○

اور جب گابھن اونٹنیاں چھوٹی پھریں۔

وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ○

اور جب وحشی جانور یک جا کر دیئے جائیں۔

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ○

اور جب سمندر بھڑکائے جائیں۔

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ○

اور جب جانیں جسموں سے جوڑی جائیں۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ○

اور جب زندہ درگور کی ہوئی بچی سے پوچھا جائے کہ وہ کس خطا پر ماری گئی۔

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ○

اور جب نامہ اعمال کھولے جائیں۔

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ○

اور جب آسمان کی کھال ادھیڑ لی جائے۔

وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ○

اور جب جہنم بھڑکایا جائے۔ (سورۃ التکویر)

قہر زدہ غرناطہ میں یہ مسلمانوں کے آخری ایام تھے۔

دوسری طرف مسلم حکمران تھے جو غرناطہ کے بدلے میں اپنے اور اپنے اہل خانہ کا مستقبل سنوارنے میں لگے تھے، وہ اپنی بے حمیتی، سازشی ذہنیت، طمع اور ہوس جاہ کے ہاتھوں مسلمانوں کے آٹھ سو دس سالہ اقتدار کے سورج کو پہر دو پہر اور پل دو پل کی ڈوبتی شام تک لے آئے تھے، جیسے وہ سب ڈوبنے سے پہلے آخری ہچکی کے انتظار میں ہوں۔ آخری محل، آخری گھر، کچھ اراضی، کچھ نقد، کچھ جنس، کوئی مال مویشی، کوئی راہداری، کوئی مقام مرتبہ، کچھ نام نمود، کچھ مال متاع یوں جیسے اندھیرے میں تیر چلا رہے ہوں، وہ اپنے پتے، پینترے چالیں چل گزرے اور سارے چکمے دے بیٹھے۔ مگر ایک چال بہترین چال چلنے والے کی بھی ہوتی ہے:

وَ یَمْکُرُوْنَ وَ یَمْکُرُ اللّٰہُ ؕ وَ اللّٰہُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ ○

ادھر تو وہ چال چل رہے تھے اور ادھر خدا چال چل رہا تھا۔ اور خدا سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔ (سوۃ الانفال)

رب ذوالجلال نے ایسی چال چلی کہ انہیں دیکھتے ہی دیکھتے سورۃ البقرہ پر گواہ کردیا ارشاد ہوا:

یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ج وَ مَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَہُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ○ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ لا فَزَادَہُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ج وَلَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ لا ○ بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ ○

یہ اپنے (زعم میں) خدا اور مومنوں کو چکمہ دیتے ہیں۔ مگر (حقیقت) میں اپنے سوا کسی کو چکمہ نہیں دیتے اور اس سے بے خبر ہیں (سورۃ البقرہ)

یا اللہ خیر۔

ہمیں چال چلنے والوں اور چکمہ دینے والوں، دونوں سے پناہ دے اِدھر وانا، باجوڑ، وزیرستان، میران شاہ، افغانستان اور عراق میں بھی سورج لپٹ رہا ہے اور ستارے بکھر رہے ہیں سب وحشی جانور وہاں اکٹھے ہو چکے ہیں۔ عورتیں تو عورتیں، گابھن اونٹنیاں بھی بے سمت، بے مہار بھاگتی پھرتی ہیں اس ڈر سے کہ جانے وہ کس کا نام لے دیں زندہ درگور بچیوں سے کوئی یہ پوچھنے

والا نہیں ہے کہ وہ کس خطا پر ماری گئیں اور نامہ اعمال کھلنے کو ہے ادھر عیسائی حکمران بھی وہی آزمودہ وآل ازابیلا ہیں اولا دفرڈی نینڈ اور زافرا و کافرا ہیں۔ دلوں میں دھڑ کا لگا ہے کہ یا اللہ ایسے میں ہمارے حاکم بھی حاکمان اندلس جیسے نہ نکل آئیں، اندر خانے عیسائیوں سے ملے ہوئے اور مسلمانوں کے خلاف چالیں چلنے والے اور باریش مسلمانوں کو چکمے دینے والے، کلمہ گو بیبیوں کو نامحرم مردوں سے اختلاط پر ابھارنے والے، ان کی نیم ستر پوشی پر تالیاں بجانے والے، انہیں برہنگی پر آمادہ کرنے والے، ہماری مخبری کرنے والے، گھیر گھیر کر پکڑنے والے، اہل حق کے گھروں پر نشان لگانے والے، ذاتی مفادات کے معاہدے کرنے والے، ہمیں نیچا دکھانے والے، سؤر کے سودے اور آیتوں پر مذاکرات کرنے والے، امہ کی دینی حمیت پر مول تول کرنے والے۔

یا اللہ ہم پر رحم کر، ہم پر اپنی پناہ دراز کردے۔

ہمیں یقین ہے کہ انشاء اللہ ہمارے حکمران ایسے نہیں ہوں گے مگر اس کا کیا کیجئے کہ اہل غرناطہ بھی اسی گمان میں مارے گئے کہ ان کے حاکم ایسے نہیں ہوں گے جیسا کہ ان کے دلوں میں دھڑکا ہے......دھڑکا تو ادھر بھی انہیں جیسا ہے، مگر اس یکساں دھڑکے کے باوجود ہمارا زور انشاء اللہ پر اور امید آل ازابیلا سے ہی لگی ہے۔

* * *

ہمارے قتل نامے پر آج پھر وہی مُہر ثبت ہے، جو پانچ صدیاں پہلے بھی ثبت کی جا چکی ہے۔ سقوطِ اندلس کے اجزائے ترکیبی میں مسلمانوں کی ہزیمت، عیسائی انتہا پسندی اور صیہونی سازش شامل تھی ....امریکہ کے اجزائے ترکیبی میں مسلمانوں کی ہزیمت، عیسائی انتہا پسندی اور صیہونی سازش شامل ہے۔ پانچ صدیاں بھی ان اساسی عناصر میں تبدیلی نہیں لا سکیں ...... اسے ترقی اور روشن خیالی نہیں جمود کہا جاتا ہے .....ذہنی جمود، نظریاتی جمود، شعوری جمود، جمود اندر جمود ......

مُہرِ سرِ محضر

6 جنوری **1492** کو جب ملکہ ازا بیلا اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ باب العدل سے قصر الحمراء میں داخل ہوئی اور جشنِ فتح کی تقریبات کا آغاز ہوا تو ' اس دوران کرسٹوفر کولمبس غمزدہ اور بے زار' الگ تھلگ بیٹھا رہا' ابھی جشن فتح جاری ہی تھا کہ وہ وہاں سے چل دیا۔ کولمبس کی اس دل زدگی کی وجہ یہ تھی کہ ایک روز قبل ہی ملکہ و بادشاہ کی طرف سے نامزد کردہ جغرافیائی کونسل جسے کولمبس کی بحری مہم کا منصوبہ جانچنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی' اس کونسل نے نئی دنیا کی دریافت کے لیے کولمبس کی بحری مہم کا منصوبہ مسترد کر دیا تھا۔ کونسل کا کہنا تھا کہ کولمبس کا منصوبہ اس کی ناقص معلومات پر استوار ہے اور اس میں سرمایہ کاری خسارے کا سودا ہوگا۔ کولمبس جو' ایک طویل عرصے سے شنوائی کی امید پر غرناطہ' المیرا' مالغا اور قرطبہ میں مقیم رہا تھا' کونسل کے فیصلے سے دل برداشتہ ہوا' اور پرتگال واپسی کے ارادے سے غرناطہ سے چل پڑا۔ سیاسی طور پر اس وقت سپین کی صورت حال ایسی تھی کہ عیسائی انتہا پسندی کے ہاتھوں ہسپانیہ کے یہودی زیر عتاب آچکے تھے' مسلمانوں پر عتاب کا آغاز ہو چکا تھا اور ہر دونوں پر عیسائیت کی فتح کے جشن شروع ہو چکے تھے۔ یہودی النسل ہونے کی وجہ سے کولمبس اندلس میں روز اول سے ہی یہودیوں کا مہمان' آنکھ کا تارا اور رازدان بنا رہا تھا۔

جوزف ایڈلر اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں کہ:

> ” یہ بات غیر متنازع اور شک وشبے سے بالا ہے کہ کولمبس کی بحری مہم کو ممکن بنانے میں یہودیوں' مارانوس (پوشیدہ طور پر راسخ العقیدہ یہودی) اور کنورسوس (جو یہودیت سے عیسائیت قبول کر چکے تھے) کا گہرا ہاتھ

> ہے ۔ ان یہودی عناصر کی خفیہ و اعلانیہ مدد و حمایت کے بغیر کولمبس کی بحری مہم تشنہء رہ جاتی ۔” 1۔(جوزف ایڈلر: 1962)

سپین میں یہودیوں کے زوال کے بعد یہودیوں کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ وہ اب کہاں جائیں چونکہ یہ طے ہو چکا تھا کہ ترک یہودیت کے باوجود بھی وہ اب ہسپانیہ میں محفوظ نہیں رہے تھے ۔ اس اثناء میں جبکہ کولمبس ملکہ ازابیلا سے نئی دنیا کی دریافت کی سرپرستی کا خواہاں تھا تو اندر خانے یہودی کولمبس کی حمایت پر کمربستہ ہو چکے تھے ۔ یہودیوں کو نئی دنیا کی دریافت میں وہ ملک نظر آنا شروع ہو گیا تھا کہ وہ جہاں سپین میں ہزیمت کے بعد پھر سر اٹھا سکتے تھے۔ سو سپین میں یہودی اشرافیہ جو ملکہ و بادشاہ کے حلقہ خاص میں شامل تھی، ہر قیمت پر ملکہ ازابیلا سے کرسٹو فر کولمبس کی بحری مہم کی منظوری حاصل کرنے میں سینہ سپر ہو گئی۔ اس راہ میں سب سے پہلا پتھر جامعہ سلیمانکا کے یہودی پروفیسر اور سائنسدان اوراہام زکیتیو (1450-1515) کو ہٹانے کی ہدایت کی گئی جنھوں نے کولمبس کے منصوبے سے اتفاق کرتے ہوئے اس کے حق میں ملکہ و بادشاہ کو سب سے پہلا خط لکھا ۔ اسی دوران کولمبس، لوئیس کریڈو سے مدد کا خواستگار ہوا جسے شاہی دربار کے امراء میں امتیازی مقام حاصل تھا، لوئیس کریڈو نے کولمبس کا تعارف اپنے عم زاد کارڈینیل پیڈرو منڈوزا جو کہ ٹولیڈو کا اسقف اعظم تھا، سے کرایا ۔ ان دونوں کی باہمی قرابت داری اپنے یہودی دودھیال کی وجہ سے کولمبس کے لیے نیک شگون ثابت ہوئی۔ بظاہر تو یہ دونوں امراء ملکہ ازابیلا کی خوشنودی کی خاطر عیسائی ہو چکے تھے لیکن عیسائی انتہا پسند انہیں مارانوس (خفیہ یہودی) سمجھتے اور ان کے قتل کے درپے تھے۔ لوئیس کریڈو نے شاہی دربار میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے کارڈینیل پیڈرو منڈوزا کو اسی جغرافیائی کونسل کا سربراہ مقرر کرادیا جس کے پاس کولمبس کا کیس نظر ثانی کے لیے آنے والا تھا ۔ ادھر لوئیس کریڈو نے ملکہ و بادشاہ کو نئی دنیا کی دریافت کے منصوبے کے حق میں استوار کرنا شروع کردیا حتیٰ کہ وہ اس بات میں کامیاب ہو گیا کہ ملکہ ازابیلا کم ازکم کولمبس کو شرف ملاقات ضرور بخشیں۔

کولمبس کے منصوبے کے حق میں یہ ساری پیش قدمی اس قدر سرعت اور پر اسرار طریقے سے انجام دی گئی کہ ملکہ و بادشاہ کے حضور کولمبس کی پیشی سے پہلے ہی ملکہ کو کارڈینیل پیڈرو منڈوزا کا خط موصول ہو چکا تھا جس میں جغرافیائی کونسل نے کولمبس کی بحری مہم کی حمایت

کردی تھی۔ کولمبس سے ملاقات کے بعد بھی بادشاہ فرڈی نینڈ اور ملکہ ازا بیلا کولمبس کی بحری مہم پر تحفظات سے بالا نہیں تھے انہوں نے منصوبے کی مزید چھان بین، تحقیق اور افادیت پرکھنے کے لیے سکالرز کمیشن قائم کردیا اور اس کی سربراہی ملکہ ازا بیلا نے اپنے مذہبی مشیر اعلیٰ ہرنینڈو ٹالا ویرا (1428 - 1507) کو سونپ دی۔ ہرنینڈو ٹالا ویرا جو کہ ایک یہودی خاتون کا پوتا تھا اور مارانوس (خفیہ وراسخ العقیدہ یہودی) شمار ہوتا تھا، برس ہابرس ادارہ احتساب کے زیر عتاب رہا تھا جہاں اس پر یہ ثابت کرنے کے لیے مقدمہ قائم تھا کہ وہ اب یہودی نہیں رہا بلکہ حقیقتاً عیسائی ہوچکا ہے۔ ہرنینڈو ٹالا ویرا کا مقدمہ قرطبہ کے محتسب اعلیٰ راڈریگوز لیو کیمو کی عدالت میں عرصہ دراز تک چلتا رہا جس سے ٹالا ویرا خجالت، ندامت اور دباؤ میں مبتلا رہا۔ اسی اثنا میں ملکہ کا معتمد خاص اور بااثر یہودی ابراہام سینیئر اور بادشاہ فرڈی نینڈ کا مشیر مالیات (ایک اور بااثر یہودی) آئزک بن یہودا ابراوانل کولمبس کی حمایت پر کمربستہ ہوگئے۔ ہسپانیہ کے خفیہ، اعلانیہ، راسخ اور مرتد ہر قسم کے یہودی کولمبس کی مہم جوئی کے حق میں یک زبان ہوچکے تھے۔ واضح رہے کہ یہ وہی یہودی ابراہام سینیئر ہے جس نے محاصرہ غرناطہ کے آخری دنوں میں جبکہ عیسائی افواج شدید مالی دباؤ کی وجہ سے مشکلات کا شکار تھیں تو اسی یہودی نے ملکہ و بادشاہ کے لیے اپنے قارونی خزانوں کے منہ کھول کر سقوط غرناطہ کی تکمیل میں کلیدی کردار ادا کیا تھا جبکہ بادشاہ فرڈی نینڈ کا مشیر خاص ہونے کی وجہ سے یہی آئزک بن یہودا، سقوط غرناطہ کی شرائط طے کرنے میں پیش پیش رہا تھا۔

ضحاک بائیر لکھتے ہیں کہ

> ”سقوط مالقا کے فوراً بعد جب وہاں سے مسلمان اور یہودی دونوں نابود ہوگئے تو ابراہام سینیئر اور آئزک بن یہودا، اپنے یہودی رفقاء کی معیت میں مالقا میں کولمبس سے ملے جس میں کولمبس کی بحری مہم کی تفصیلات طے کی گئیں۔“
>
> 2۔(ضحاک بائیر: 1961)

ان دونوں ممتاز یہودیوں پر ملکہ و بادشاہ کا عیسائیت قبول کرلینے کا شدید دباؤ تھا لیکن پنی امتیازی حیثیت کی وجہ سے ان دونوں نے ترک یہودیت سے صاف انکار کر رکھا تھا اور کامیابی سے ان کوششوں کے خلاف مزاحمت جاری رکھی جو انہیں عیسائی بنانے کے سلسلے میں کی ج رہی تھیں لیکن سقوط غرناطہ کے بعد جب ملکہ ازا بیلا کو ان دونوں کی ضرورت نہ رہی تو یہ دونوں

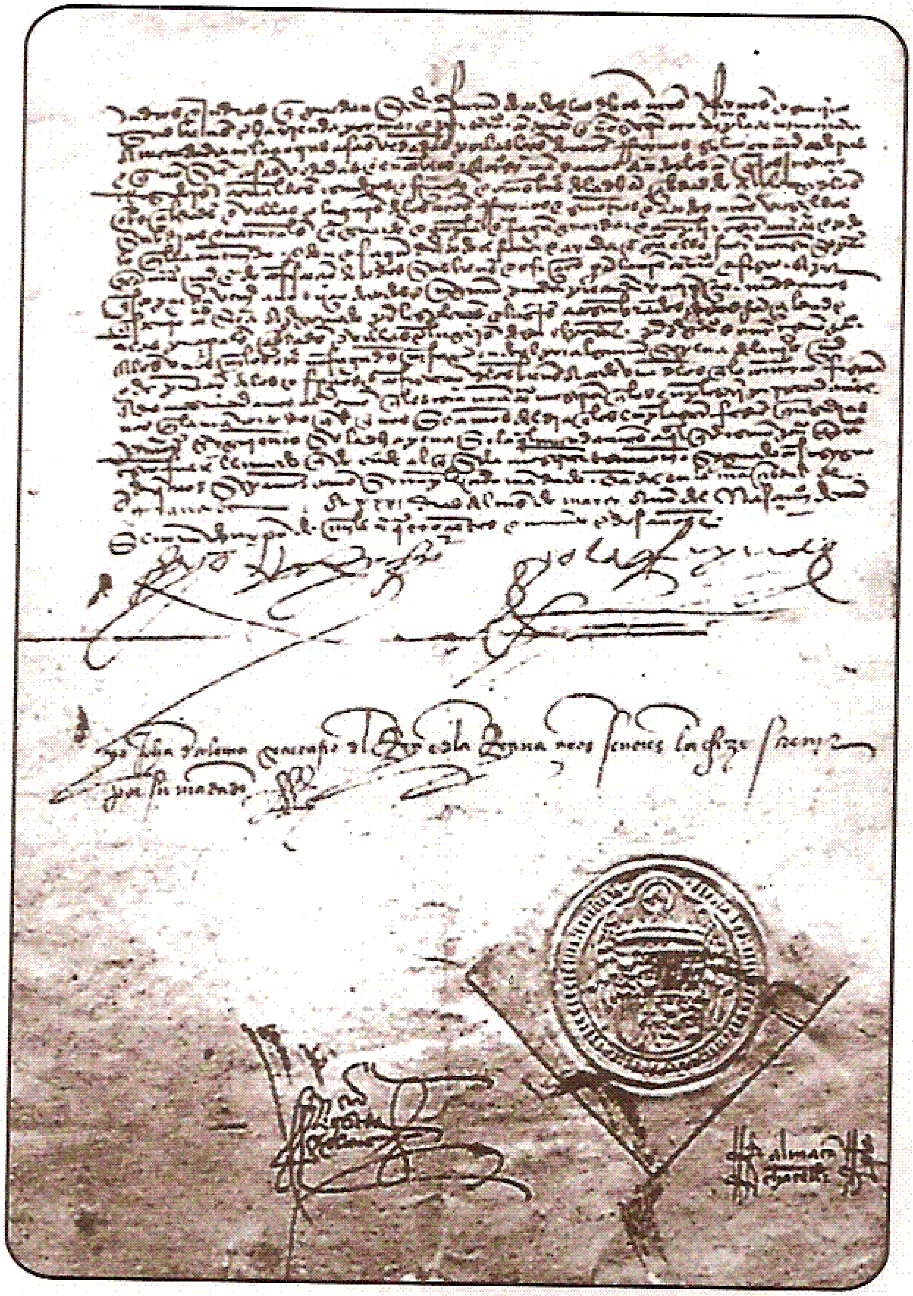

Yo Iohan de Coloma secretario del Rey e dela Reyna nros señores la fize screuir por su mandado

31 مارچ 1492 : بحکم ملکہ ازابیلا و بادشاہ فرڈی نینڈ

'یہودی سپین سے نکل جائیں'

یہودیوں کی جبری بے دخلی کے حکمنامے کا مصدقہ عکس

بھی ترک یہودیت یا ترک ہسپانیہ' والے قانون تلے آ گئے۔ آئزک بن یہودا' اٹلی چلا گیا جبکہ ابراہام سینیئر نے عیسائیت قبول کر لی' یہ الگ بات کہ اسے عیسائیت راس نہ آئی اور عیسائیت قبول کرتے ہی وہ 1493 میں انتقال کر گیا۔ کولمبس کے یہودی سرپرستوں میں لوئیس سنٹا جل بھی شامل تھا جو 1481 سے کاسٹائل میں عیسائی حکومت کا منتظم مالیات چلا آ رہا تھا۔ اس یہودی پر بادشاہ فرڈی نینڈ ہمیشہ مہربان رہا تھا' جولائی 1491 میں جب ادارہ احتساب نے لوئیس سنٹا جل کو مارانوس قرار دے کر اسے موت کی سزا سنائی تو بادشاہ فرڈی نینڈ نے اپنے خصوصی اختیارات کے تحت ادارہ احتساب سے اس کی جان بخشی کرائی۔ 6 جنوری 1492 کو جب کولمبس قصر الحمراء سے جشن فتح کو ادھورا چھوڑ کر وہاں سے پرتگال کے لیے روانہ ہوا تو یہ لوئیس سنٹا جل ہی تھا جس نے ملکہ سے فوراً ملاقات کر کے اسے اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ ایک بار پھر کولمبس سے مل کر نئی دنیا کی دریافت کے بارے میں اس کی مہم جوئی کے منصوبے پر ہمدردانہ غور کرے گی۔ شاہی دربار میں جب کولمبس کی مہم پر خطیر اخراجات کی فراہمی کا معاملہ زیر بحث آیا تو اس وقت بھی لوئیس سنٹا جل نے کولمبس کے منصوبے میں ذاتی سرمایہ کاری کی حد میں خطیر رقم کی پیشکش کرتے ہوئے کولمبس کی بحری مہم کو ناکامی سے بچا لیا تھا۔ لوئیس سنٹا جل نے اپنے یہودی رفقاء کو بھی کولمبس کی بحری مہم میں سرمایہ کاری پر راغب کر لیا تھا۔ خفیہ طور پر یہ طے کیا جا چکا تھا کہ اگر ملکہ و بادشاہ کولمبس کی بحری مہم میں سرمایہ کاری و سرپرستی سے انکار کر دیں تو لوئیس سنٹا جل اور اس کے یہودی رفقاء بہر حال کولمبس کے منصوبے کو ذاتی سرمایہ کاری سے کامیاب بنائیں گے۔

کولمبس نے اپنے یہودی سرپرستوں کے احسانات یاد رکھے' نئی دنیا کی دریافت کی کامیابی پر پہلا خط کولمبس نے لوئیس سنٹا جل کو ہی لکھا جس نے ملکہ و بادشاہ کو اس کامیابی کی اطلاع دی۔ کسی پراسرار اور خفیہ ترغیب کی بدولت کولمبس کے حامیوں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی نادیدہ قوت ہر' اس بااثر یہودی کو جو ملکہ و بادشاہ کی رائے پر اثر انداز ہو سکتا تھا' کولمبس کے حق میں استوار کر رہی تھی۔ الفانسو کیبلیریا' ایک بہت بڑے یہودی خاندان کا فرد تھا گو کہ یہ خاندان پندرہویں صدی کے آخر میں یہودیت ترک کر چکا تھا لیکن الفانسو کی ماں اور بھائی احتساب کی عدالت میں مارانوس ہونے کا دفاع نہ کر سکے اور موت کی سزا پائی۔

الفانسو نے اپنی دولت اور اثر و رسوخ کو کولمبس کے حق میں بے خوفی سے استعمال کیا۔ وان کبریرو جسے بادشاہ فرڈی نینڈ کا دست راست کہا جاتا تھا اور جس نے مسلمانوں کے خلاف کئی جنگوں میں فرڈی نینڈ کے سپہ سالار کی حیثیت سے شرکت کی تھی، کولمبس کے منصوبے میں دلچسپی کا اظہار کرتا رہتا تھا جس سے بادشاہ فرڈی نینڈ یقیناً متاثر ہوا تھا چونکہ مشیر اعلیٰ کی حیثیت سے وان کبریرو کے کہے کو ملکہ و بادشاہ قدر سے دیکھتے تھے۔ جن دنوں وان کبریرو کولمبس کے لیے راستہ صاف کر رہا تھا انہی دنوں اس کا دادا سانچو پٹنائے احتساب کی عدالت میں یہودی نہ ہونے پر صفائیاں پیش کر رہا تھا، لیکن اس کی ایک نہ چلی اور سانچو پٹنائے کو سزائے موت سنا دی گئی جسے وان کبریرو نے بہ مشکل تمام سزائے قید میں تبدیل کرایا۔ فادر مرچینا مویا جسے ملکہ ازا بیلا کی خصوصی قربت حاصل تھی وہ کولمبس پر اس حد تک مہربان تھا کہ اس نے سالہا سال اندلس میں کولمبس کی مالی سر پرستی کی تھی۔ اگرچہ فادر مرچینا پر یہودی ہونے کا کوئی الزام نہیں تھا لیکن عدالت احتساب میں فادر مرچینا کو یہودیوں کا پشت پناہ کہا جاتا تھا چونکہ فادر مرچینا نے کئی یہودیوں کے حق میں صفائی پیش کر کے انہیں موت کی سزا سے بچایا تھا کچھ دوسرے مورخ اسے فادر مرچینا کی بھلائی اور انسان نوازی کہتے ہیں جب کہ کچھ دوسرے مورخ فادر مرچینا کو اعلیٰ درجے کا ماسٹر پلانر کہتے ہیں کہ جس نے اپنی یہودیت کو ایسی ہنر مندی سے چھپا رکھا تھا کہ جس سے دوسرے یہودیوں کو خاطر خواہ فائدہ ہوا اور وہ ادارہ احتساب کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب رہے۔ وان کولوما جو بادشاہ فرڈی نینڈ کا چیف سیکریٹری تھا اور جس نے ملکہ و بادشاہ کی طرف سے کولمبس سے معاہدے کی شرائط طے کی تھیں وہ بھی کولمبس کا پر جوش حمایتی رہا تھا وان کولو ما نے اپنی یہودی بیوی کو صرف اس وجہ سے طلاق دے دی تھی کہ وہ احتساب عدالت کے شکنجے سے محفوظ رہے لیکن عیسائی خاتون سے شادی کر لینے کے باوجود اسے احتساب عدالت کا سامنا کرنا پڑا۔ وان کولو ما اپنے اثاثوں کا بڑا حصہ لوئیس سنٹا جل کے تصرف میں دینے کا اعلان کر چکا تھا جسے وہ کولمبس کی بحری مہم پر خرچ کر سکے۔ 3۔ (ایمر فرانس: 1991)، 4۔ (جیکب منکن: 1938)

محققین اور مورخین نے اس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں خاصی جانکاری کی ہے کہ آخر ہسپانیہ کے یہودی اشراف کولمبس کی مہم میں سرمایہ کاری کا خطرہ کیوں مول لینا چاہتے تھے

جبکہ یہ یہودی نکتہ نظر اور یہودی کاروباری اصول کے سراسر منافی ہے کہ ایک ایسے پراجیکٹ میں سرمایہ کاری کی جائے جس میں ناکامی کی شرح اس کی کامیابی سے کہیں زیادہ ہو۔ اس سوال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں جن میں مشہور مورخ جان بائنڈ تھچیر کے جواب کو مستند مانا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''کولمبس کی فتح دراصل (مارانوس) لوئیس سنٹاجل کی فتح ہے جس کی بے مثال دوراندیشی نے تاریخ میں گم شدہ یہودی موقف کا احیاء نئی دنیا میں ہوتے دیکھ لیا تھا۔ زیادہ توانا' بے لچک اور جدید یہودی موقف۔''

5۔ (جان بائنڈ تھچیر: 1903)

جبکہ ایک اور تاریخ دان اور محقق سائمن وائزنتھل اس معاملے کو ایک اور رخ سے دیکھتے ہیں۔ سائمن لکھتے ہیں:

> ''یہ عین ممکن ہے کہ کولمبس بذات خود ہسپانوی یہودیوں (مارانوس' کنورسس) کو نئی دنیا میں آباد ہوتے دیکھنا چاہتا ہو کہ جہاں انہیں (یہودیوں) کو پناہ مل سکے اور از سرنو یہودیت کا احیاء کیا جا سکے چونکہ وہ ایک طویل عرصے سے ہسپانیہ میں یہودیوں کی ہزیمت کا عینی شاہد تھا''

6۔ (سائمن وائز' نتھل: 1973)

اس سوال کے جوابات میں ایک جواب ہمارا بھی ہے' ہم سمجھتے ہیں کہ اندلس کے یہودی اشراف کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا کہ وہ کولمبس کے منصوبے سے صرف نظر کر سکتے۔ اس کی دو واضح وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ اندلس کے یہودی امراء نے یہ نوشتہ دیوار پڑھنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی کہ سقوط غرناطہ کے ساتھ ہی ان کے اثاثے' مال متاع' اراضی' جاہ وحشم' محلات اور امارت سب کچھ ڈوب جائے گا سو جس مال کا چھن جانا یقینی تھا اسے کولمبس کی کامیابی کی مبہم ترین امید پر بھی لگا دینے میں خسارہ بہر حال نہیں تھا...... دوئم' ملکہ ازابیلا و بادشاہ فرڈی نینڈ کے حلقہ مصاحبین میں شامل یہ یہودی امراء یقیناً ہسپانیہ میں عام یہودیوں کی حالت زار اچھی طرح جانتے تھے کہ انہیں کس طرح نابود کیا جارہا ہے۔ قیاس اغلب ہے کہ انہوں نے کولمبس کی کامیابی کی صورت میں نابود ہوتے ہوئے یہودیوں کو ہسپانیہ سے

نکال کر نئی دنیا میں آباد کر دینے کا خفیہ منصوبہ باندھ رکھا ہو۔

اس سے قطع نظر کہ وجہ کچھ بھی رہی ہو اور جواب جتنے بھی ہوں بہرحال یہودیت نے امریکہ پہنچنے میں دیر نہ لگائی۔ وہ جس سازش کے تحت بھی یہاں پہنچی وہ اب اہم نہیں رہا، اب اہم یہ ہے کہ یہودیت ہسپانیہ میں اپنی ہزیمت کا اقوام عالم سے عموماً اور مسلم اُمہ سے خصوصاً انتقام کیسے لے رہی ہے۔

⌑ ⌑ ⌑

ملکوں ملکوں جمہوریت، انسانی حقوق اور آزادی کا بپتسما دینے والے امریکہ میں انسانی حقوق اور آزادی ہی کڑی آزمائش سے گزری ہے اقوام عالم کی تاریخ میں انسانی حقوق کی بدترین خلاف ورزی یہیں ہوئی اور انسانی آزادی پر سب سے بڑا ڈاکہ بھی یہیں پڑا۔ امریکی زمین کی زرخیزی میں سو ملین ریڈ انڈینز کے خون ناحق کے ساتھ ساتھ امریکی معیشت کی آبیاری میں پندرہ ملین افریقی غلاموں کی ابتلا اور نوحہ بھی شامل ہے۔ کیا عجب کہ اسی کارن نہ کسی کو مریکی جمہوریت راس آتی ہے کہ یہ قتل آمادہ اور قہر زدہ ہے نہ امریکی امداد و اسباب کہ یہ بد دعائے اور ملکیتِ ملک الموت ہیں۔

جُوعُ الاَرض وجاہ

> یہ لوگ (ریڈ انڈینیز) انتہائی آسانی سے زیرِ دام آجانے والے اتنے امن پسند لوگ ہیں کہ میں آپ کی شہنشاہیت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ دنیا میں ان سے بہتر کوئی قوم نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنے ہمسایوں سے اپنوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ گفتگو میں نرم و شیریں اور مسکراہٹ سے آراستہ رہتے ہیں۔ گو کہ یہ حقیقت ہے کہ یہ لوگ برہنہ ہیں لیکن ان کے طور طریقے شائستہ اور قابلِ تعریف ہیں۔ 1۔ (کرسٹوفر کولمبس: 1493)

12 اکتوبر 1492 کو کولمبس اپنے قیافے کے مطابق ایشیاء کے مشرقی ساحل پر لنگر انداز ہوا جبکہ حقیقتاً وہ شمالی امریکہ کے جزائر بہاماس (غرب الہند) میں آنکلا تھا۔ اس کا بد قیافہ' لاعلمی اور خوش بختی بیک وقت رنگ لائی اور وہ شمالی امریکہ کی وسعتوں کو ملکہ ازابیلا کی ہسپانوی شاہی حکومت سے منسوب کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ مشرقی ایشیاء پہنچنے کے لیے مغرب کی سمت میں سفر نے اس کے قیافے کے برعکس اسے قبلائی خان کے چین یا' سی پانگو (جاپان) کی بجائے شمالی امریکہ میں جزائر غرب الہند میں پہنچا دیا تھا۔ کیوبا' بہاماس اور جمیکا کو وہ قبلائی خان کی سلطنت کے علاقے سمجھتا رہا اور اپنے عمر کے آخری حصے تک وہ اسی مغالطے میں مبتلا رہا۔ کولمبس جزائر غرب الہند میں گوانا ہانی جزیرے پر لنگر انداز ہوا جو کہ آج کل ڈومینیکن ری پبلک اور ہیٹی پر مشتمل ہے۔ گوانا ہانی میں ساحل پر قدم رکھتے ہی کولمبس کو جو چیز سب سے پہلے نظر آئی وہ وہاں کے مقامی باشندے آراواک قبائل کے امریکن انڈین تھے جو ریڈ انڈین کہلائے گئے۔ (گوانا ہانی اور اس کے قرب و جوار کے جزائر اب سان سالویڈور کے نام سے

جانے جاتے ہیں)اراواک قبائل کے ان ریڈ انڈینیز کا رویہ دوستانہ اور طور طریقے مختلف تھے۔ کولمبس نے اس امر کے باوجود کہ ان جزیروں میں پہلے سے ہی لوگ آباد ہیں اور وہ اپنے قاعدے قانون، رسم رواج، مذہب اور ثقافت کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں ان جزیروں پر سپین کی شاہی حکومت کی ملکیت کا دعویٰ کردیا۔ اس علاقے کو سان سالویڈور کے نئے نام سے منسوب کیا اور مقامی آبادی کو ''انڈیز'' کہا گیا۔ مقامی لوگوں سے اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں کولمبس نے اپنے روزنامچے میں لکھا:

> وہ ہمارے لیئے رنگ برنگ پرندے، روئی کے گچھے، کمانیں اور دوسری اشیاء لے کر آئے اور ہم سے بدلے میں بیلوں کی گردن میں ڈالنے والی گھنٹیاں اور شیشے کی لڑیاں لے گئے۔ یہ لوگ اشیاء کے بدلے اشیاء پر ہمہ وقت تیار، رہتے ہیں۔ ان کے جسم مضبوط اور صحت مند ہیں۔ یہ لوگ سادہ، جفاکش اور بے ضرر نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کو نہ تو ہتھیاروں کے استعمال کا علم ہے نہ ہی یہ کسی ہتھیار سے مسلح ہوتے ہیں جب میں نے اپنی تلوار ان لوگوں کو دکھائی تو بیشتر نے اپنی انگلیوں اور ہاتھوں کو تیز دھار تلوار سے زخمی کرلیا۔ یہاں پر ابھی تک لوہے کا استعمال شروع نہیں ہوا ہے ان کے تیر کمان لکڑی، گنا اور بانس سے بنے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں یہ لوگ بہترین خدمت گار اور اچھے غلام ثابت ہوں گے۔ ہم صرف پچاس لوگوں کی مدد سے تمام مقامی آبادی پر غلبہ حاصل کرکے انہیں با آسانی غلام بنا سکتے ہیں۔ 2۔ (کرسٹوفر کولمبس:1492)

ریڈ انڈینیز کے بارے میں یہ پہلی تحریر تھی جسے ضبط تحریر میں لایا گیا اور تاریخ نے حیات انسانی کے بدترین المیے اور ہولناک نسل کشی پر اپنے صفحے سیاہ، اور دامن سرخ کرلیا۔ اس مختصر سی تحریر نے آنے والی پانچ صدیوں کو جتنا متاثر کیا اور انسانی لہو کا جس قدر خراج لیا، تاریخ عالم میں شاید ہی کوئی اور تحریر اتنے بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری کی بناء بنی ہو۔ بہترین خدمت گاروں اور اچھے غلاموں کے حصول نے زور باندھا اور پچاس لوگوں کی مدد سے غلبہ حاصل کرلینے کے یقین نے ملکوں ملکوں قسمت آزمائی کی لیکن نہ غلام ہاتھ آئے نہ آسانی سے غلبہ ملا، جو ملا تو اس کی بھاری قیمت دینی پڑی۔ جن کو غلام بنانا مقصود تھا وہ غلامی کے طوق بردار

کی بجائے کفن برداشتہ نکلے اور کچھ کفن بر دوش۔ کسی کسی نے رہینِ کفن ہونا بھی گوارا نہ کیا اور خودکش کہلائے۔ اس تحریر کا تحریر کنندہ بیک وقت غضب کا پر اعتماد، سادہ و پر کار اور ہوس منصب و زر میں ایسا مبتلا نکلا کہ ایک طرف تو وہ ریڈ انڈینیز کو دیکھتے ہی انہیں قتل کر دینے اور مغلوب کر لینے کے خبط میں مبتلا ہو گیا تو دوسری طرف وہ اس خبط کے اظہار پر نہ شرمندہ ہوا نہ بے یقین اور نہ ہی اسے چھپایا۔ یوں جیسے وہ جانتا تھا، پر یقین تھا کہ بہر حال وہ انہیں قتل کر دے گا، انہیں غلام بنا لے گا، اور ان کی زمینوں پر قابض ہو جائے گا۔

کولمبس کی طمع پوری تو ہوئی مگر اس کے اختیار سے دور نکل گئی بے ضرر اور سادہ نظر آنے والے قتل تو ہوئے مگر اتنی آسانی سے نہیں کہ جس قدر کولمبس نے ملکہ ازابیلا کو یقین دہانی کرائی تھی۔ قتل ہونے والوں نے لکڑی کے تیروں اور بانس کی کمانوں سے ہی سہی مگر قدم قدم پر اپنی آزادی، حرمت اور آبرو کا دفاع جرأت و جوانمردی سے کیا، اور خوب کیا۔ یہ الگ بات کہ وہ قتل ہوتے چلے گئے لیکن انہوں نے نہ سودا کیا نہ سپر ڈالی نہ مصلحت آمیز نکلے نہ امداد طلب کی نہ کسی بحری بیڑے کے منتظر رہے

سمندروں کو بھی حیرت ہوئی کہ ڈوبتے وقت
کسی کو ہم نے مدد کے لیئے پکارا نہیں

یوں اپنی آزادی اور اپنی زمین پر غاصبانہ قبضے کے خلاف وہ اپنی سی کر گزرے اور ایک کے بعد ایک، گروہ در گروہ، ہجوم بہ ہجوم اور بستی تا بستی ثابت قدمی سے قتل ہوتے رہے مگر نہ سبک سر ہوئے نہ سبک سار نہ سرنگوں

دل نے وفا کے نام پر کار وفا نہیں کیا
خود کو ہلاک کر لیا خود کو فدا نہیں کیا

امریکن آرمی کے جنرل نیلسن مائلز ریڈ انڈینیز کی شجاعت اور جوانمردی پر گواہی دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”تاریخ میں ہیرو ازم اور قربانی کے لئے ذہنی یک سوئی کی کوئی ایسی مثال نہیں ہے جیسی ریڈ انڈینیز نے دو سو سالہ جنگ کے دوران اپنے ملک پر غاصبانہ قبضے کے خلاف ایک ایک انچ پر مزاحمت سے پیش کی۔ ایک ایسے دشمن کے خلاف مزاحمت جو لا محدود حد تک بہترین طریقے سے مسلح،

> ختم نہ ہونے والے وسائل سے لیس اور تعداد میں لا تعداد تھا۔ اگر وہ تعداد ہی میں برابر ہوتے تو آج کی تاریخ ایک بالکل ہی مختلف کہانی بیان کرتی۔”
>
> 3۔(جنرل نیلسن مائلز: 1912)

ملکہ ازا بیلا اور کولمبس کی توقع کے برعکس جو بات دور نکل گئی تھی وہ وقت اور فاصلے دونوں میں دور نکلی ۔ وقت پانچ صدیوں پر پھیل گیا اور دوری بارہ ہزار میل پر ۔ حق دریافت کا عفریت اغلام' غلبے اور منفعت کی تلاش میں ملکوں ملکوں لہو چاٹتا ہوا' افغانستان کے چٹیل پہاڑوں اور عراق کے صحراؤں تک آن پہنچا ہے اور ادھر کے مکین بھی اگر لکڑی کے تیر اور بانس کی کمانوں سے مزاحم نہیں تو اس سے کچھ زیادہ کے بھی متحمل نہیں ۔ کولمبس کا لاطینی امریکہ میں غلبہ ایک ایسے نظریاتی غلبے کی بنیاد ثابت ہوا کہ جو پورا ہونے میں ہی نہیں آتا۔ ملکہ ازا بیلا نے امریکہ میں زبردستی کا جو بیج بویا تھا اس کی بنیاد مذہبی تنگ نظری' پاپائیت اور دہشت گردی پر اور یافت زمین' غلبے' جبر اور دھاندلی پر رکھی ہوئی تھی سو' ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظریے کی عمر طویل تر' اس کا اطلاق اکثر و بیشتر اور اس کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا جارہا ہے ۔سولہویں اور سترہویں صدی میں ریڈانڈینیز اس کا سب سے پہلا شکار بنے اور انسانی تاریخ کی بدترین نسل کشی کا شکار ہوئے۔ ان کی وجہ قتل ان کا 'غیر مہذب' ہونا قرار دی گئی ۔ اٹھارہویں صدی میں براعظم افریقہ کے لوگ اس کی زد میں آئے پورے امریکہ پر بازار مصر کا گمان گزرتا اور یوسف فروخت ہوتے رہے ۔ چاہ یوسف سے صدائیں بلند تو ہوئیں مگر اپنے نہ سنے جانے کی روایت میں ڈوب گئیں۔غلاموں کی ایک نئی انڈسٹری وجود میں آئی اور کاروبار کو چار چاند لگ گئے ۔افریقوں کے قتل عام اور انہیں غلام بنانے کی وجہ ان کی 'جانوریت' قرار دی گئی ۔ انیسویں صدی سے یہ عفریت چہار سمت اور بے مہار ہوا اور ارجنٹائن' چلی' ہیٹی' چین' کوریا' پانامہ' نکاراگوا' فلپائن' کیوبا اور میکسیکو اس کے خونی جبڑوں میں جکڑے گئے ۔ بیسویں صدی میں یوگوسلاویہ' ہنڈورس' لاؤس' کمبوڈیا' ویت نام' لبنان' گرینیڈا' لیبیا' ایران' عراق' کوریا' صومالیہ' ہیٹی' سوڈان اور وسطی امریکہ کے علاقے اس کا شکار بنے۔

اکیسویں صدی کے آغاز سے ہی افغانستان اور عراق اس کی آہنی گرفت میں ہیں ۔ قرائن کہتے ہیں کہ اس صدی میں مسلم امہ اس کا سب سے بڑا شکار ہوگی اور شواہد کی رو سے دہشت گردی کی آخری جنگ' آخری معرکہ پاکستان میں ہوگا ۔ مشہور دانشور اور مورخ بیری

لوپیز ملکہ ازا بیلا کے ایزاد کردہ اور کولمبس کے کاشت کردہ اس لوٹ کھسوٹ کے جبریہ نظریے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”ہوس زر کے ظالمانہ اور غیر انسانی نظریئے نے امریکہ میں شروع سے ہی یہ بنیاد رکھ دی تھی کہ غیر ذمہ دارانہ جارحیت اور جرائم بھرے حملوں سے غلام‘ لکڑی‘ موتی‘ فر‘ کوئلہ‘ ہیرے‘ جواہرات‘ زرخیز زمین‘ فولاد اور تیل حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جس کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔“

4۔ (پیری لوپیز: 1990)

ہم دیکھتے ہیں کہ لکڑی‘ زمین اور موتیوں کی تو امریکہ میں بھی کچھ کمی نہیں ہے لیکن تیل کی ضرورت اور ہوس جاہ کی شاید کوئی حد اور حساب نہ ہو۔ ہوس اور حصول زر کی تلاش میں کولمبس کے جارح اور جرائم بھرے تسلسل کے مشاہدے اور نشان دہی پر پیری لوپیز کا لکھا مستند مانا جاتا ہے۔

15 مارچ 1493 کو‘ کولمبس جب واپس سپین پہنچا تو اس کی کایا پلٹ چکی تھی اور قسمت کی دیوی ملکہ ازا بیلا کی طرح کولمبس پر بھی مہربان ہوچکی تھی‘ وہ سرخ رو اور کامران لوٹا تھا۔ جس امید اور وعدے پر ملکہ ازا بیلا نے کولمبس کی سرپرستی کی اور اس کی بحری مہم میں سرمایہ کاری کی تھی وہ پورا ہوا۔ واپسی پر کولمبس کے رخت سفر میں سونے کی ڈلیاں‘ چاندی کے ڈلے‘ سفوف کی شکل میں کچھ سونا‘ مکئی‘ تمباکو اور شمالی امریکہ میں پائے جانے والے پرندوں کے علاوہ وہ دس بدنصیب ریڈ انڈین بھی شامل تھے جنہیں ملکہ کو دکھانے کی غرض سے وہ اغواء کر لایا تھا۔ بحری مہم سے واپسی پر کولمبس کا رائل ایڈمرل کے طور پر استقبال ہوا اور اسے عزت و تکریم کے ساتھ بارسلونا کے شاہی محل میں ملکہ ازا بیلا اور بادشاہ فرڈی ننڈ کے مہمان کے طور پر ٹھہرایا گیا۔ وہی کولمبس جو معاہدے کی بات چیت کے دوران تمام وقت ملکہ ازا بیلا کے سامنے دست بستہ کھڑا رہا تھا اب ملکہ اور بادشاہ کے درمیان بیٹھا روسٹ کی ہوئی رانیں اڑا رہا تھا‘ طرح طرح کی شرابیں اس کے سامنے رکھی تھیں اور نیم برہنہ خوبرو خادمائیں اس کی جنبش ابرو کی منتظر تھیں۔ کولمبس دریافت کردہ نئی دنیا کے بارے میں اپنے تجربات‘ معلومات‘ سفر کی صعوبتوں اور آئندہ منصوبوں کے بیان سے سماں باندھے ہوئے تھا۔ اس موقع پر کولمبس نے ایک تحریری رپورٹ ملکہ ازا بیلا کو پیش کی جسے وائسرائے کی طرف سے شاہی حکومت کی خدمت میں پیش کردہ سرکاری

دستاویز کی حیثیت حاصل ہے اس رپورٹ میں کولمبس نے لکھا:

> ”ریڈ انڈ ینیز اپنے دفاع کے قابل نہیں ہیں ان کے رسم و رواج میں ذاتی ملکیت کا تصور ناپید ہے۔ یہ لوگ سادہ اور بے ضرر ہیں ان کو دیکھے بغیر ان کی سادگی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ ان سے جب بھی کچھ طلب کیا جائے تو وہ دینے سے انکار نہیں کر سکتے۔ زمین اور وسائل کسی کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ مشترکہ استعمال اور اجتماعی ملکیت کا قانون رائج ہے جبکہ استعمال کرنے والے بدلتے رہتے ہیں۔ موت اور نقل مکانی کی صورت میں نئے استعمال کرنے والے آجاتے ہیں لیکن متعلقہ لواحقین کسی اثاثے پر خاندانی ملکیت کا دعویٰ نہیں کرتے۔ اگر ملکہ اور بادشاہ میری مدد کریں تو میں ان کے لیے اس نئی دریافت کردہ دنیا سے اتنا سونا لا سکتا ہوں کہ جو ضرورت سے سوا ہو اور اتنے غلام لادوں گا کہ جتنے کا حکم دیا جائے گا۔“
>
> 5(کرسٹوفر کولمبس: 1493)

تہذیب یافتہ اور عیسائیت پھیلانے والوں کی نیّات کا یہ حال تھا۔

جس کی نیت ظلم، انسانی حقوق و حرمت کی پامالی اور حرص و ہوس سے آلودہ تھی آج وہی شخصیت امریکی ہیرو ہے۔ جو شخص سادہ، بے ضرر اور نا قابل دفاع لوگوں کو غلام بنانے کے منصوبے باندھتا رہتا تھا اور ان کی زمینیں ہتھیانے اور آزادی سلب کر لینے کی چالیں سوچتا رہتا تھا آج امریکہ بھر میں اس کے یادگاری مجسمے ایستادہ اور ستائشی کتبے آویزاں ہیں۔ امریکہ کے طول و عرض میں کولمبس کی یاد اور اظہار تشکر میں اس کے 105 مجسمے، 140 ستائشی کتبے اور 20 تعویزی سلیں آویزاں ہیں۔ کولمبس کے یادگاری مجسموں کا یہ سلسلہ سپین سے شروع ہوا اور قرطبہ، غرناطہ، مانعا، زاراغونہ اور سلیمانکا کو مشرف بہ مجسمہ کرتے ہوئے اٹلی، جزائر غرب الہند لاطینی امریکہ، یورپ اور شمالی امریکہ تک پھیل گیا۔ اب ان ممالک میں کولمبس کے قریب پانچ صد مجسمے گڑے ہیں اور دو ہزار سے زیادہ دوسری یادگاریں کولمبس کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں مگر کہیں خراج کم پڑ جاتا ہے اور کہیں عقیدت۔

کولمبس کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے جب اس کی یادگاروں کے پہلو بہ پہلو، نمونے کے طور پر بچائی جانے والی قوم کے اعداد و شمار پر نظر پڑتی ہے تو خراج سوال میں اور

عقیدت بے زاری میں بدل جاتی ہے۔ بحری قزاقوں، غاصبوں اور زور آوروں کی تعریف و تشریح دنیا بھر کی تاریخ اور زبانوں میں کم و بیش ایک ہی طرح سے کی گئی ہے لیکن امریکہ میں یہ تعریف و تشریح عموماً امریکی مفادات کے مطابق کی جاتی ہے۔ ریڈ انڈینیز کے بارے میں کولمبس کے خیالات، منصوبے اور اقدامات کو بدترین دہشت گردی تو قرار دیا جاسکتا ہے مگر اس کے اعمال کو امن، آزادی، جمہوریت اور انسانی حقوق کے حق میں قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کولمبس کو ہیرو بنانے کی امریکی مصلحت اپنی جگہ لیکن پانچ صدیوں میں سو ملین افراد کا محض ڈھائی لاکھ رہ جانا انسانی المیے کی ایک ایسی حنوط زدہ بے گور و کفن لاش ہے کہ جسے امریکی ہیرو ازم، جمہوریت، آزادی، انسانی حقوق اور مواقع کی چادر سے نہیں ڈھانپا جاسکتا۔ پاؤں ڈھکو تو ستر برہنہ ہوجاتا ہے اور ستر ڈھانپو تو سر۔

1492ء میں جب کولمبس براعظم امریکہ میں لنگر انداز ہوا تو اس وقت یہاں ریڈ انڈینیز کی آبادی کا تخمینہ بیسویں صدی کے وسط تک مختلف ماہرین آبادی و شماریات کے حساب سے مختلف رہا۔ ریڈ انڈینیز کی نسل کشی کو حتمی اعداد و شمار کے آئینے میں دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ قتل کیئے جانے والوں کی اصل تعداد معلوم ہو۔ بیسویں صدی میں مختلف ڈیما گرافرز نے براعظم امریکہ میں کولمبس کی آمد پر مقامی آبادی کے مختلف اعداد و شمار پیش کیئے جو حیران کن حد تک تیزی سے تبدیل ہوتے رہے:

ڈیما گرافر	سال	تخمینہ آبادی 1500	بحوالہ نمبر
پال ریورٹ	1924	40-50 ملین	6
کارل سیپر	1924	40-50 ملین	7
ایچ سپن ڈن	1928	50-75 ملین	8
جولیان سٹیورڈ	1945	16 ملین	9
وڈرو بوراہ	1964	100 ملین	10
ہنری ڈوبنز	1966	90-112 ملین	11
ڈیوڈ سٹینرڈ	1992	100 ملین	12

ریڈ انڈینیز کی تعداد کے بارے میں تخمینہ ہائے مختلف کے پیش نظر 1960 کی دہائی

میں برکلے یونیورسٹی میں ایک تحقیقی منصوبے کا آغاز کیا گیا جس کا مقصد سائنٹیفک طریق تحقیق سے پندرہویں صدی کے اختتام پر ریڈ انڈینیز کی اصل تعداد کا تعین کرنا تھا۔ یہ منصوبہ برکلے یونیورسٹی کے ماہرین اور نامور سکالرز کو سونپا گیا جن میں کارل سائیر، شربرن کک، وڈرو بوراہ اور ہنری ڈوبنز جیسے ماہرین شامل تھے۔ ماہرین کے اس گروپ نے کئی سال کی عمیق تحقیق سے اس تمام مواد کا تنقیدی جائزہ لیا جس کو جزوی طور پر 1950 سے پہلے کے ماہرین استعمال کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ ان ماہرین نے چرچ، شادی بیاہ اور اموات کے ریکارڈ، ورجینیا کمپنی آف لنڈن، ورجینیا کمپنی آف پلے متھ کے حساب کتاب اور اس وقت کے زیر کاشت رقبے پر مطلوبہ عمال اور پیداواری اکائی کے تناسب سے کولمبس کی آمد پر ریڈ انڈینیز کی تعداد کو سو ملین قرار دیا۔ اب یہ تحقیق کردہ تعداد ہی ریڈ انڈینیز کی اصل تعداد تسلیم کی جاتی ہے اور انہی اعداد و شمار پر ماہرین کی اکثریت متفق ہے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق براعظم امریکہ میں پندرہویں صدی کے آخر میں آبادی کی علاقائی تقسیم درج ذیل ہے:

علاقہ	آبادی (ملین)
شمالی امریکہ	9.8 - 12.25
میکسیکن تہذیب	30 - 37.5
وسطی امریکہ	10.8 - 13.5
جزائر غرب الہند	4 - 5
اینڈین تہذیب	30 - 37.5
جنوبی امریکہ	9 - 11.2

13۔ (ہنری ڈوبونز : 1966)

اب جب کہ یہ معلوم کیا جا چکا ہے کہ کولمبس کی آمد پر ریڈ انڈ اینیز کی تعداد سو ملین نفوس پر مشتمل تھی تو اب اس منطقی سوال کا جواب دیا جانا چاہیے کہ اگر ریڈ ٹڈینیز، نسل کشی کا شکار نہ ہو جاتے تو آج ان کی تعداد کیا ہوتی اور اقوام عالم میں ن کا تناسب اور کردار کیا ہوتا۔ کیا موجودہ دنیا ان کی عدم موجودگی سے محفوظ اور بہتر ہے یا ان کے ہونے سے محفوظ اور بہتر ہوتی۔ ہمارے خیال میں یہ جاننے کے لیے کہ آج ریڈ انڈینیز کی تعداد کیا ہوتی، پندر ہویں صدی میں اقوام عالم کی آبادی کا ان

کی موجودہ آبادی کے موازنے سے نتائج اخذ کیئے جاسکتے ہیں:

ملک	آبادی 1500 (ملین)
چین	100 - 150
ہندوستان (بشمول پاکستان وبنگلہ دیش)	75 - 150
جاپان	15 - 20
روس	10 - 18
اٹلی	10
سپین	6.5 - 10
برطانیہ	5
فرانس	15

14۔ (جان ڈیورینڈ: 1977)

سن 1500 سے سن 2000 کی پانچ صدیوں میں ان ممالک کی آبادی میں شرح اضافہ:

ملک	آبادی (ملین) سن 1500	آبادی (ملین) سن 2000	شرح اضافہ
چین	100 - 150	1,300	940فیصد
ہندوستان (بشمول پاکستان وبنگلہ دیش)	75 - 150	1,387	1,132فیصد
جاپان	15 - 20	128	631فیصد
روس	10 - 18	145	935فیصد
اٹلی	10	57	470فیصد
سپین	6.5 - 10	40	387فیصد
برطانیہ	5	60	1,100فیصد
فرانس	15	60	300فیصد

15۔ (پاپولیشن ریفرنس بیورو: 2004ورلڈ پاپولیشن ڈیٹا شیٹ)

درج بالا ممالک میں آبادی کی اوسط شرح افزائش کے حساب سے ریڈ انڈینیز کی تعداد سن 1500 سے سن 2000 تک 737 فیصد شرح اضافہ کے حساب سے آج 737 ملین نفوس ہوتی یعنی چین اور ہندوستان کے بعد ریڈ انڈینیز آج تیسری بڑی قوم ہوتے۔

افزائش آبادی کے عالمی پیمانے کے مطابق پانچ صدیوں پہلے سو ملین نفوس کی جس قوم کو آج 737 ملین نفوس ہونا چاہیے تھا اب وہ صرف ڈھائی لاکھ رہ گئے ہیں۔ اس سے بدترین نسل کشی کی مثال تاریخ عالم میں موجود نہیں ہے۔ ظلم' ہوس اور غارت گری ناپنے کے لیے آبادیوں کے گھٹتے بڑھتے تناسب پر بھی نظر ڈالتے رہنا چاہیے۔ عظیم الشان اور پائیدار مجسموں کے پس منظر پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ امریکہ میں کولمبس کے مجسموں کے علاوہ ملکہ ازابیلا کے مجسمے بھی ایستادہ ہیں۔ لاکھوں مسلمانوں اور ریڈ انڈینیز کا خون ناحق ازابیلا کی گردن پر ہونے کے باوجود اسے امریکی دریافت کا سپانسر ہونے کی وجہ سے امریکی تاریخ میں امتیاز حاصل ہے۔ ملکہ کا امتیاز مالی ہونے کی وجہ سے خصوصی سمجھا جاتا ہے غالباً اسی مالیاتی ناطے سے ملکہ ازابیلا کا ایک عظیم الشان مجسمہ واشنگٹن ڈی سی میں امریکی مالیات کے سب سے بڑے ادارے فیڈرل ریزرو بورڈ کے پہلو میں گڑا ہے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

کولمبس کی دلائی گئی ترغیب' تحریص اور پیشکش سے ملکہ اور بادشاہ انکار کر ہی نہیں سکتے تھے سو کولمبس کو دریافت کردہ نئی دنیا کے دوسرے سفر پر جانے کے لیے ضروری وسائل اور پروانہ جاری کر دیا گیا۔ 25 ستمبر 1493 کو جب کولمبس شمالی امریکہ کی طرف اپنے دوسرے سفر پر روانہ ہوا تو یہ اس کی زندگی کا یادگار لمحہ اور عروج تھا۔ بحیثیت رائل ایڈمرل اس کی کمان میں 17 جہاز دے دیے گئے جن میں بارہ سو افراد بھرے ہوئے تھے اس سفر کا واضح مقصد تسخیر' آبادکاری' غلبہ اور نئی دنیا میں ہسپانوی کالونی کا آغاز کرنا تھا غالباً اسی وجہ سے بارہ سو افراد میں سے بیشتر جہاں دیدہ جنگجو' ماہر تلوار باز اور تجربہ کار تیر انداز تھے۔ جنگجوؤں کے علاوہ جہازوں میں گھوڑے' مال مویشی' بکریاں' کتے' سور' مرغیاں' اناج' بیج' عماراتی سامان اور اسلحہ بھرا ہوا تھا۔

چار ہفتوں کے سفر کے بعد کولمبس جب دوبارہ جزائر غرب الہند میں اسی جگہ پہنچا جہاں وہ پہلے آچکا تھا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اب وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ مقامی آبادی کولمبس کے آدمیوں کے ہاتھوں جنہیں وہ آبادکاری کی غرض سے پیچھے چھوڑ گیا تھا' ماری جا چکی

تھی یا نقل مکانی کر چکی تھی، کولمبس نے اسی جگہ کے قریب نسبتاً محفوظ جگہ پر پہلی ہسپانوی کالونی کی داغ بیل ڈالی اور اس نئے شہر کا نام لاازا بیلا رکھا گیا۔ آباد کاروں کو لا ازابیلا میں کالونی قائم کرنے پر لگا کر وہ خود سونے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا لیکن اس میں اسے ناکامی ہوئی اور سونے کی وہ کثیر مقدار اس کے ہاتھ نہ لگ سکی جس کا وعدہ وہ سپین کے حکمرانوں سے کر چکا تھا۔ سونے کے حصول میں ناکامی کے خسارے کو پورا کرنے کے لیے اس نے جبری مشقت کے لیے مقامی لوگوں کو غلام بنا کر سپین لے جانے کا فیصلہ کیا۔ کولمبس کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ مضبوط کاٹھ کے صحت مند ریڈ انڈینیز سپین میں اچھی قیمت پر بکیں گے اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوں گے۔ اس طرح سونے کی بجائے متبادل ذریعہ آمدنی اسے ملکہ اور بادشاہ کے عتاب سے محفوظ رکھے گا۔

کولمبس کے اس فیصلے نے ریڈ انڈینیز کی قسمت پر موت' مصائب' لاچارگی' تباہی و بربادی اور نسل کشی کی ایک ایسی سرخ لکیر کھینچ دی جو پانچ سو سال گزر جانے کے بعد بھی نہ اپنی سرخی میں ماند پڑی نہ بدبختی میں کم ہوئی۔ امریکہ کے قیام کی خشتِ اول ہی ناانصافی' جبر' ظلم اور ناحق انسانی خون پر رکھی گئی۔ انسانی تذلیل اور انسانی حقوق کی پامالی کے جو مناظر امریکی سرزمین میں رونما ہوئے چشم فلک نے ایسے انسانی المیے کم ہی دیکھے ہوں گے۔ ملکہ ازابیلا کا عیسائیت پھیلانے کا جنون' فرڈی ینڈ کی ہوس ملک گیری اور کولمبس کا طمع' پسماندہ' بے ضرر اور دنیا سے قطع تعلق ریڈ انڈینیز پر ایک ایسی تباہی لے کر آیا کہ انسانی تاریخ میں ایسی خون آشامی' ایسی بربادی اور ایسی نسل کشی کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ مشہور مورخ ہاورڈ زین لکھتے ہیں کہ:

> ”بہاماس کے ساحل پر جب کولمبس کا جہاز لنگر انداز ہوا تو اس ساحلی علاقے میں تیانو اور آراواک قبیلے آباد تھے جو ریڈ انڈینیز کے بڑے قبیلوں میں شمار ہوتے تھے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان قبائل کے افراد ناپید ہو گئے وہ یا تو پابہ زنجیر ہوئے اور غلام بنا کر سپین کی طرف روانہ کر دیئے گئے یا قتل ہو گئے۔ ہسپانوی آباد کاروں کے ہاتھوں بہاماس اور ہیٹی کے جزائر میں ایک لاکھ سے زیادہ آراواک انڈینیز تہ تیغ کیئے گئے۔ کولمبس کے لشکری ایک کے بعد ایک جزیرے میں تلواریں لہراتے ہوئے جاتے' عورتوں کی آبرو ریزی' بچوں اور بوڑھوں کو قتل اور جوان مردوں کو

> زنجیریں پہنا کر کھینچتے ہوئے ساتھ لے جاتے ۔ جو مزاحمت کرتا قتل ہوجاتا چونکہ ہسپانوی حملہ آور لٹیروں کی قتل و غارت کی صلاحیت اور ریڈ انڈینیز کی مدافعت کا آپس میں کوئی جوڑ' کوئی تناسب کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔"
>
> 16۔ (ہاورڈ ڈزین : 1980)

1494 سے 1508 تک کے درمیانی عرصے میں صرف جزائر غرب الہند میں 40 لاکھ سے زیادہ ریڈ انڈینیز قتل کیئے گئے۔ کولمبس پیپرز کے ایڈیٹر اور مورخ لاس کیسس نے ایسے کئی دہشت ناک واقعات کا ذکر کیا ہے جن سے اس ظلم و جور کا اندازہ ہوتا ہے جو ریڈ انڈینیز پر روا رکھا گیا۔ لاس کیسس لکھتا ہے کہ:

> "ہسپانوی آباد کاروں نے ریڈ انڈینیز کی اجتماعی پھانسیوں کا طریق کار جاری کیا جبکہ بچوں کو قتل کر کے ان کی لاشوں کو کتوں کے سامنے بطور خوراک پھینک دیا جاتا ۔ نوجوان عورتوں کی اکثریت اس وقت تک جنسی تشدد کا شکار ہوتی رہتی جب تک مر نہ جاتی ۔ ملکیت سے بے نیاز' ان لوگوں کی معمولی قدر و قیمت کی اشیاء تک لوٹ لی جاتیں' گھروں کو آگ لگا دی جاتی اور ریوڑ کی صورت بھاگتے ہوئے غیر مسلح اور نا قابل دفاع لوگوں کا تیز رفتار گھوڑوں سے تعاقب کیا جاتا اور انہیں تیر اندازی کی مشق کے لیے استعمال کیا جاتا ۔ چند ہی گھنٹوں میں شہر کا شہر زندگی سے عاری ہوجاتا اور آبادی نابود ہوجاتی یوں ہسپانوی آباد کار' ریڈ انڈینیز کی وسیع زمینوں پر غلبہ حاصل کرتے چلے گئے ۔
>
> 17۔ (لاس کیسس : 1552)

یہ امریکہ کے قیام' پھیلاؤ اور فروغ کی ابتدا تھی۔ یورپی آباد کاروں اور بعد میں امریکی حکومت کے ہاتھوں جو ظلم بے ضرر' ریڈ انڈینیز پر ہوا' انسانی تاریخ اس پر ہمیشہ شرمسار' رہے گی۔ کولمبس نے جو سلوک جزائر عرب الہند میں آراواک اور تیانو قبائل سے روا رکھا' کورٹیز نے وہی سلوک میکسیکو میں آزٹک تہذیب سے' پزارو نے پیرو میں انکس قبائل سے اور برطانوی آباد کاروں نے ورجینیا اور میسا چوسٹس میں ریڈانڈینیز کے دوسرے بڑے قبیلے پوٹا ہانز سے کیا۔

نتیجتاً شمالی اور جنوبی امریکہ میں کروڑوں بے گناہ مقامی لوگ یورپی اقوام کی طمع، ہوس، سرمایہ داری، ہوس ملکیت، قبضہ زمین، سونے کے حصول اور ہوس ملک گیری کے کارن مارے گئے۔

کارل مارکس نے براعظم امریکہ میں ان پرتشدد نو آبادتی اقدامات کو سرمایہ دارانہ نظام کے تسلسل کا قدیمی حربہ قرار دیا اور شدید مذمت کی۔ اسی طرح دوسرے دانشوروں اور مورخین نے بھی براعظم امریکہ میں رونما ہونے والے ان واقعات کو جبری سرمایہ دارانہ نظام قائم کرنے کی سعی قرار دیا جبکہ کئی دانشوروں کی یہ پیشن گوئی بھی سچ ثابت ہوئی کہ براعظم امریکہ میں لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت اور ظلم و ناانصافی کی بنیاد پر جس نو آبادیاتی طرز معیشیت و معاشرت کو پروان چڑھایا گیا ہے اس کا لازمی نتیجہ ایک ایسے سرمایہ دارانہ نظام کا قیام ہوگا کہ جس میں دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں نہیں بلکہ بہت ہی چند ہاتھوں تک محدود ہوگا۔ وکٹر گیلا گوس کی اس پیشین گوئی کو پورا ہونے میں دیر نہ لگی اور انیسویں صدی کے وسط سے ہی امریکی سرمایہ دارانہ نظام کا کردار عالمی معیشیت پر اثر انداز ہونا شروع ہو چکا تھا۔ وکٹر گیلا گوس کی پیشین گوئی کے عین مطابق امریکہ میں فتنہ ارتکاز سرمایہ کا یہ عالم ہوچکا ہے کہ تین سو امریکی ارب پتی افراد کے اثاثوں کی مالیت دنیا کی آدھی آبادی کے مجموعی اثاثوں سے متجاوز ہے یعنی دنیا بھر کے سوا تین ارب افراد کے مجموعی اثاثوں کی مالیت صرف تین سو امریکی افراد کے اثاثوں کی مالیت کے لگ بھگ ہے جبکہ مجموعی طور پر امریکہ دنیا بھر میں کل میسر وسائل کے 62 فیصد پر قابض ہے۔

لاس کیسس، وکٹر گیلا گوس، کارل مارکس اور مارک ٹوئن اپنے اپنے عہد میں سرمایہ دارانہ نظام کے جس عفریت کو جوان ہوتا دیکھ رہے تھے اور اس سے خبردار کرتے رہتے تھے، جب جوان ہوا تو ان کے خدشات اور قیافوں سے کہیں بڑھ کر خون آشام ثابت ہوا۔ مفت زمین، مفت لیبر، وافر پانی اور زرخیز زمینوں نے دیکھتے ہی دیکھتے امریکی معیشیت کو ساری دنیا کی مجموعی معیشیت پر حاوی کردیا۔ امریکی معیشیت کا حجم وسط انیسویں صدی سے ہی اس وقت کے ترقی یافتہ اور معاشی طور پر مضبوط ملکوں کی مجموعی معیشیت سے کئی گناہ زیادہ ہوچکا تھا۔ امریکہ کی اس استحصالی معیشیت کا واضح اظہار انیسویں صدی میں امریکی برآمدات کے اس گوشوارے سے ہوتا ہے:

سال	امریکی برآمدات
1830	72ملین ڈالر
1840	124ملین ڈالر
1850	144ملین ڈالر
1860	334ملین ڈالر
1870	350ملین ڈالر
1880	1.1بلین ڈالر
1890	1.33بلین ڈالر
1900	1.79بلین ڈالر
1910	2.67بلین ڈالر

18۔ (ڈگلس نارتھ: 1966)

1880 میں جب امریکی برآمدات بلین ڈالر سالانہ سے تجاوز کر گئیں تو عالمی معیشیت کے اس لمحہ فکریہ پر مشہور جرمن معاشی فلاسفر وارنر سومبارٹ نے اپنے ایک تحقیقی مقالے میں لکھا کہ:

> ”انیسویں صدی تک ہر طرح کی دولت کی بنیاد یقینی طور پر زمین سے وابستہ تھی سو' امریکہ میں با افراط زرخیز زمین پر چند افراد کے قبضے سے ایک ایسے سرمایہ دارانہ نظام نے جنم لیا کہ جس کی توقع تو کی جارہی تھی لیکن اس کی ہولناکیوں کا ادراک نہیں کیا جاسکتا تھا۔“

19۔ (وارنر سومبارٹ: 1906)

ئبل کے مطابق جس طرح کنعان کی زمین کا حضرت ابراہیمؑ کو دیئے جانے کا وعدہ پورا' اسی ترح امریکی زمینوں سے سرمایہ داری کا وعدہ پورا ہوا۔ امریکی سرمایہ دارانہ نظام کے پھیلاؤ پر مریکی ماہر معاشیات ولیم پارکر نے یہ لکھتے ہوئے اس کی سنگینی کو پوری طرح بے نقاب کردیا کہ:

> ”یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام کے رجحانات اپنی بدترین اور بے لگام شکل میں امریکہ میں پورے ہوگئے۔“

20۔ (ولیم پارکر: 1980)

امریکہ میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں بلاشبہ ایسی معاشی ترقی رونما ہوئی کہ جس کی اقتصاد عالم میں کوئی اور مثال نہیں ہے۔ ذرائع نقل وحمل، ٹیکسٹائل، سٹیل، اجناس، کاٹن اور دوسری زرعی مصنوعات کی بے تحاشا پیدا وار نے کاروبار کو چار چاند لگا دیئے اور مختلف معاشی نظریے متعارف ہوئے فری اکانومی، مارکیٹ اکانومی، پراڈکٹ اکانومی، نیچرل اکانومی ...... اکانومی ہی اکانومی لیکن سودوں کا یہ ابھار اور معیشیت کا یہ عروج ظلم، نا انصافی اور انسانی خون سے وابستہ تھا۔ زمین کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ریڈ انڈینیز کو قتل کیا گیا اور لیبر کا تقاضا افریقیوں کو غلام بنا کر پورا کیا گیا، یوں ریڈ انڈینیز، معیشیت کے عروج اور افریقی سودوں کے ابھار کی نظر ہو گئے۔ کارل مارکس نے اس صورت حال کی پرزور مذمت کرتے ہوئے لکھا:

> "امریکی سرمایہ داروں نے طبقاتی کشمکش کے دوران بدترین تشدد کو روا رکھا ہے اور کسی بھی دوسری سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی سوسائٹی نے طبقاتی جدوجہد میں محروم طبقوں کو اس طرح تشدد کا نشانہ نہیں بنایا ہے۔"

21۔ (کارل مارکس: 1844)

سرمائے کی نفسیات اور اس سے جنم لینے والی خونی معیشیت کی سائیکی پر پولینڈ کی مشہور فلاسفر اور انقلابی رہنما روسا لکسمبرگ (جنہیں 1919 میں جرمنی میں پھانسی دی گئی) اپنے ایک مقالے میں رقم طراز ہیں:

> سرمایہ، فطری معیشیت کے روپ میں معاشروں کے خلاف اپنی جدوجہد میں درج ذیل نتائج کے حصول پر منتج ہوتا ہے:
>
> 1۔ اہم ترین پیداواری ذرائع پر فوری قبضہ مثلاً زمین۔
> 2۔ افرادی قوت کو پیداواری مشقت میں الجھائے رکھنا۔
> 3۔ زرعی مصنوعات کی معیشیت پر اصرار۔
> 4۔ تجارت سے زراعت کی علیحدگی۔

22۔ (روسا لکسمبرگ: 1913)

ہم دیکھتے ہیں کہ سرمائے کی سائیکی اور سرمایہ دار کی طمع امریکہ میں اپنے بدترین روپ میں ظاہر ہوئی یوں روسا کا لکھا حرف بہ حرف امریکہ میں سچ ثابت ہو کے رہا یہ الگ بات کہ انہیں اپنے اشتراکی و انقلابی نظریات اور باغیانہ اقدامات پر پھانسی ہو کے رہی۔

1492 میں جب کولمبس نے براعظیم امریکہ پر اپنے حق دریافت کے پنجے گاڑے تو ایسا

کرتے ہوئے اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ کم و بیش دنیا کی ایک تہائی زمین پر دعویٰ دائر کر رہا ہے' یہ ایک تہائی زمین جس میں شمالی اور جنوبی امریکہ شامل ہیں دنیا کے کل رقبے کے 28 فیصد پر مشتمل ہے۔ یہ 28 فیصد شمالی امریکہ' جس میں امریکہ' کینیڈا اور میکسیکو شامل ہیں 16 فیصد' اور لاطینی وسطی امریکہ 12 فیصد پر منقسم ہے۔ ریڈ انڈینیز 1492 تک ان تمام زمینی وسعتوں پر حق ملکیت کی ہر تعریف کی رو سے قانونی' سیاسی اور اخلاقی تصرف رکھتے تھے جو محض تین سو سالوں میں ختم ہو کر رہ گیا اور ان کے ہاتھوں سے دنیا کا 28 فیصد رقبہ جاتا رہا لیکن روسا لکسمبرگ کے نظریے کے مطابق اہم ترین پیداواری عنصر یعنی زمین پر فوری قبضے کے اطلاق کا بدترین مظاہرہ امریکہ میں وقوع پذیر ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے امریکہ کی ساڑھے پینتیس لاکھ مربع میل زمین انہی پر تنگ ہوگئی جو اس کے مکین اور اصل وارث تھے۔ زمین پر غاصبانہ قبضے کے لیئے توڑے جانے والے معاہدوں' غیر انسانی سلوک اور وعدہ خلافی کی یہ تاریخ ہی امریکہ کی اصل تاریخ ہے یہ الگ بات کہ اس تاریخ میں انسانی حقوق کی بجائے انسانی قتل' رواداری کی بجائے طمع اور تنگ نظری اور جمہوریت کی بجائے اخلاقی قدروں کا قتل عام شامل ہے۔

امریکی تاریخ کا صفحہ صفحہ دہشت گردی' انسانی لہو اور ہوس و حیوانیت سے آلودہ ہے خصوصاً شمالی امریکہ میں ریڈ انڈینیز کا تعداد میں کم ہونا بھی ان کی غارت گری کا سبب بنا۔ شمالی امریکہ کی 94 لاکھ مربع میل زمین پر ڈیما گرافر ہنری ڈوبنز کے مطابق کم و بیش اتنے ہی ریڈ انڈینیز آباد تھے یعنی اوسطاً ایک مربع میل زمین پر ایک فرد آباد تھا۔

یہ ضروری ہے کہ زمین اور اس کی اہمیت کے بارے میں ریڈ انڈینیز اور غاصبین دونوں کے نکتہ نظر سے آگاہی ہو۔ ایک کے قبضے اور دوسرے کی بے دخلی کا' کارن ادراک میں رہے۔ اس خون آشامی کے پس منظر میں پوشیدہ اسرار کے ادراک کی گرفت میں آتے ہی اس خون آشامی کا تسلسل بھی نظر آنے لگتا ہے جو آج بھی انسانی حقوق' جمہوریت' آزادی اور روشن خیالی کے لبادے میں ملکوں ملکوں محو قتل ہے۔ ریڈ انڈینیز کی آنکھ زمین کو سودا' پراپرٹی یا منافع کی نظر سے نہیں دیکھتی تھی بلکہ ان کے نزدیک زمین ایک وسیلہ حیات' ایک ضابطہ اور ایک مشترکہ ثہ تھی جس پر ذاتی ملکیت کی بجائے مشترکہ ملکیت کا قانون رائج تھا۔ اسی وجہ سے کسی فرد حد کے پاس زمین بیچنے کا نہ اختیار تھا نہ کوئی مختار نامہ اور نہ ہی کوئی زمین بیچنے کے فن سے آشنا تہ۔ ریڈ انڈین فلسفہ حیات میں زمین اور زمینی ماحول کو دوسرے عناصر زندگی پر فوقیت اور احترام

روسا لکسمبرگ 1919ء-1870ء

حاصل تھا اسی احترام کی بدولت شمالی امریکہ انیسویں صدی تک ماحولیاتی آلودگی سے محفوظ اور متوازن رہا۔ زمین' دریا' جنگل' پانی' درخت' جانور اور دوسرے مظاہر فطرت سے قربت ریڈانڈینیز کی سائیکی اور ثقافت میں نمایاں تھی اور اس کا اظہار' ریڈ انڈین تحریروں میں بکثرت ملتا ہے۔ جواں سال ریڈ انڈین مصنفہ اور سماجی کارکن میری برڈ لکھتی ہیں:

''زمین مقدس ہے''
یہ الفاظ ہمارے ہونے کی ضمانت ہیں
زمین ہماری ماں اور دریا ہمارا خون ہیں
زمین چھن جانا ہماری موت ہے
زمین چھن جانے سے
ہمارے اندر کا انڈین مر جاتا ہے 23۔ (میری برڈ: 1990)

اپچی قبائل کے چیف اور مشہور ریڈ انڈین فلسفی چیف جرونومو لکھتے ہیں:

مجھے سورج نے تمازت بخشی
تیز ہواؤں نے ٹھہرنا سکھایا
اور درختوں کی چھاؤں نے پناہ دی
میں ہر جگہ برتر احساس کے ساتھ موجود ہوں

''ہمیں اپنے بچوں اور وہ بچے جو ابھی پیدا نہیں ہوئے ان کے لیے جنگلات کو بچانا ہوگا ہمیں ان کے لیے جنگلات محفوظ رکھنے ہوں گے جو اس کے اظہار پر قادر نہیں ہیں جیسے بچے' پرندے' جانور اور درخت۔''

(نکسالکس قبائلی سردار: چیف ایڈورڈ موڈی' فلسفی چیف جرونومو 1829-1909)

''ہماری زمین ہی ہمارے لیئے سب کچھ ہے میں آپ کو اپنی زمین کی ایک حقیقت سے آگاہ کیئے دیتا ہوں کہ ہمیں یاد ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے اپنی جان کے نذرانے کے عوض اسے حاصل کیا تھا۔''

(سچے نئی قبائل: جان ووڈن لیگز)

''اس زمین میں عظیم روحانی طاقت قانون کا ماخذ ہے نہ کہ انسان۔''

(ہوپی قبائل: دانشور اور فلسفی تھامس بانیا کا)

میں اپنی شوریدہ پانیوں کی زمین سے ساری دنیا سے زیادہ محبت کرتا ہوں‘‘

(تزپرس قبائلی سردار: چیف جوزف)

’’کیا تم کبھی اپنے پاؤں کے نیچے زمین کا مطلب سمجھ سکو گے۔ ریت کے ایک ذرے سے لے کر ایک عظیم الشان پہاڑ تک سب کچھ مقدس ہے۔ گزرا کل اور آنے والا کل اس براعظم میں ایک حتمی حقیقت ہے اور ہم مقامی لوگ اس مقدس زمین کے وارث ہیں۔

(چیف موھاک قبائل: پیٹر بلیو کلاوڈ)

ایک طرف زمین زندگی اور ہونے کا حوالہ تھی اور اس کی آزادی کے دفاع میں مر جانا قابل تحسین تھا اور دوسری طرف ایک پیداواری اکائی جس پر مزید پیداوار کے لیے فوری قبضہ ضروری تھا۔ ریڈ انڈینیز زمینی ماحول سے ہم آہنگ ہوجانے پر یقین رکھتے تھے جبکہ سفید فام زمینی ماحول کو مالی منفعت کے حوالے سے دیکھتے تھے اور اسے بدل دینے پر کمربستہ تھے اس صورت حال پر سیاکس چیف ریڈ کلاوڈ کا وہ تاریخی جملہ ریڈ انڈین سوچ کی بہترین غمازی کرتا ہے جب انیسویں صدی کے وسط میں امریکہ کے طول و عرض میں ریلوے لائن بچھانے پر تبصرہ کرتے ہوئے چیف ریڈ کلاوڈ نے کہا:

’’ ریلوے لائن بچھاتے بچھاتے جنگلی بھینسوں کو اس علاقے میں خوف زدہ کر دیا گیا ہے‘‘ (چیف ریڈ کلاوڈ)

یوں امریکہ کی زمین دو متضاد نظریات اور مختلف مفادات کی رزم گاہ میں بدل گئی۔ ایک طرف ہر قیمت پر زمین‘ ماحولیات اور اس کی آزادی کا دفاع مقصود تھا اور دوسری طرف ہر قیمت پر زمین کا حصول اور اس پر قبضہ۔

زمین کے حصول اور قبضے کی دوڑ میں سپین کے ساتھ ساتھ دوسری یورپی اقوام بھی شامل ہوتی رہیں اور شمالی امریکہ میں مال غنیمت کا دروازہ کھلتا چلا گیا لیکن 1620 میں برطانوی زائرین کی مستقل آمد اور آبادکاری سے پہلے شمالی امریکہ کی حیثیت یورپی اقوام کی نظروں میں ’فوراً لوٹ لو‘ سے زیادہ نہیں تھی ایک ایسا مال غنیمت جسے کسی اور کے لوٹنے سے پہلے لوٹ لینا ضروری ہو۔ لوٹ مار کے اس یورپی نظریے کے تحت مختلف یورپی اقوام شمالی امریکہ پر حملہ آور ہوتی رہیں اور عارضی کالونیز قائم ہوتی اور مٹتی رہیں۔ 1562 سے 1565 تک جین ریبالٹ کی

اوگلا سیاکس چیف ریڈ کلاوڈ

(1822-1909)

چیف ریڈ کلاوڈ 1857ء میں وہائٹ ہاؤس

سے مذاکرات کے دوران

سربراہی میں فلوریڈا اور جنوبی کیرولائنا میں فرنچ کالونی کا قیام عمل میں آیا۔ 1585 سے 1590 کے دوران والٹر ریلے نے شمالی کیرولائنا میں برطانوی کالونی قائم کی۔ 1607 میں پورٹ رائل (کینیڈا) میں پھر دوبارہ فرنچ کالونی آباد ہوئی جبکہ 1607 میں ہی جان سمتھ نے جیمز ٹاؤن ورجینیا میں ایک اور برطانوی کالونی قائم کی۔

1609 میں سپین نے موجودہ امریکی ریاست نیو میکسیکو میں سانٹا فے میں ہسپانوی کالونی قائم کی اور ولندیزیوں نے 1620 میں نیو ایمسٹرڈیم (نیو یارک) میں ڈچ کالونی قائم کی۔ امریکہ میں مختلف اقوام کی ان آبادکاریوں سے ریڈ انڈینز کی زمینیں متاثر ہونا اور ان کے قبضے سے نکلنا شروع ہوئیں اور یہ سلسلہ 1776 تک انفرادی اور ریاستی سطح پر جاری رہا۔

1776 میں برطانیہ سے امریکہ کی آزادی تک سفید فام آٹھ لاکھ مربع میل زمین پر قابض ہو چکے تھے۔ 4 جولائی 1776 کو جب امریکہ میں اعلان آزادی ہوا تو اس وقت آزادی کا یہ اعلان اسی آٹھ لاکھ مربع میل زمین پر محیط تھا لیکن اس کے بعد معاملات کے امریکی حکومت کے ہاتھوں میں آتے ہی صورت حال سرعت سے بدلنے لگی اور ریڈ انڈینز اپنی نسل کشی کے منطقی انجام کو پہنچنے لگے۔ درج ذیل گوشوارے کے مطابق نوز آئیدہ امریکی حکومت کے زیر اہتمام زمین میں اضافے سے زمین کی اہم ترین پیداواری اکائی کی حیثیت سے فوری قبضے کی شرط پوری ہو کے رہی۔

سال	زمین (مربع میل)
1776	800,000
1800	864,746
1810	1,681,828
1820	1,749,462
1830	1,749,462
1840	1,749,462
1850	2,940,042
1860	2,969,640

1870	3,540,705
1880	3,540,705
1890	3,540,705
1900	3.547,314
1910	3,547,845
1920	3,546,931
1930	3,551,608
1940	3,554,608
1950	3,552,206
1960	3,540,911
1970	3,536,855
1980	3,539,285
1990	3,536,338
2000	3,537,438

24۔ (یو ایس سینس بیورو ریکارڈ: 1790-2000)

یوں 1620 میں سو برطانوی زائرین جو اپنے مذہبی عقیدے کی بناء پر جلا وطن کیے گئے تھے اور جنھیں اپنی عبادات اور مذہبی تقاضا پورا کرنے کے لیے محض ایک گوشہ عبادت درکار تھا' ڈھائی سو سالوں میں 35 لاکھ مربع میل زمین سے زیادہ پر قابض ہو چکے تھے۔ امریکہ دنیا میں واحد ایسا ملک ہے کہ جس کی وسعت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یوں تو پھیلاؤ اور وسعت کو اللہ تعالیٰ نے کائنات کا وصف قرار دیا کہ اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کائنات نظریہ اضافیت کی رو سے وسیع تر ہوتی جاتی ہے' پھیلتی جاتی ہے۔ اس امر پر کلام الٰہی کی شہادت موجود ہے' ارشاد ہوا: وَ السَّمَآءَ بَنَیۡنٰهَا بِاَیۡىدٍ وَّاِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ (47:51)

ترجمہ: ''ہم نے آسمانوں کو اپنے دست قدرت سے بنایا اور ہم انہیں وسیع کر رہے ہیں۔''

لیکن امریکی رقبے کا پھیلتے جانا باعث تشویش ہونا چاہیے اس پھیلاؤ میں نظریہ اضافیت کی

بجائے نظریہ دریافت کارفرما ہے۔ وسعت دینے کے جس عمل کو رب نے اپنی عفت سے وابستہ رکھا اس میں شریک ہونے کی امریکی جسارت پر درازی رسی کا عندیہ تو موجود ہے مگر اسرار و حکمت والے رب اب تو بے گناہ خلق خون و خون ہوچکی' بوٹی بوٹی ہوگئی اب تو درازی رسی کا اسرار عیاں ہو' رسی لگام میں اور پھیلتا رقبہ ٹھہراؤ میں بدلے۔

امریکی رقبے میں وسعت کی تاریخ ایک ایسا جادۂ گریہ ہے کہ جس کے انچ انچ پھیلاؤ پر کہیں خون بکھرا ہے اور کہیں آنسو۔ ہوس اور حصول زمین کے لیے اس جادہ گریہ پر جمہوری اصول اور انسانی حقوق سنگسار ہوئے اور انسانیت کا درس دینے والے سنگ بار۔ 1776 میں آٹھ لاکھ مربع میل پر محیط ریاست ہائے متحدہ امریکہ ربع صدی میں ہی اپنے رقبے میں دو گنا ہو کر سولہ لاکھ مربع میل سے زیادہ پر پھیل چکا تھا۔ 30 اپریل 1803 کو امریکہ اور فرانس کے درمیان لوئز یانا کی خریداری کے سودے پر دستخط ہوتے ہی امریکہ کا سامراجی اور سرمایہ دارانہ کردار کھل کر سامنے آ گیا۔ لوئز یانا کی اس خرید سے امریکہ کو آٹھ لاکھ اٹھائیس ہزار مربع میل اضافی زمین حاصل ہوئی۔ یہ پھیلاؤ اپنی وسعت میں برطانیہ' فرانس' جرمنی' اٹلی اور سپین کے مشترکہ رقبے سے زیادہ وسیع تھا۔ اس سودے نے 1776 میں امریکہ کی اولین تیرہ ریاستوں میں مزید تیرہ کا اضافہ کرکے مغرب کی سمت میں امریکی کی پیش قدمی کا راستہ کھول دیا۔

لوئز یانا کا علاقہ 1682 سے امریکہ میں اولین فرنچ کالونی کی حیثیت سے تجارتی سرگرمیوں کا مرکز رہا تھا۔ نپولین بونا پارٹ یورپ میں اپنی فوجی مہم جوئی کی وجہ سے امریکہ میں فرانسیسی مفادات سے دست بردار ہونا چاہتا تھا جبکہ صدر تھامس جیفرسن لوئز یانا کو طمع آلود کن انکھیوں سے دیکھتے رہتے تھے۔ نپولین بونا پارٹ اور تھامس جیفرسن کے درمیان طویل دوستانہ تعلقات بھی اس سودے میں کارفرما رہے۔ بالآخر طویل مذاکرات کے بعد ریاست لوئز یانا اور دریائے مسی پی کے مغرب میں واقع یہ علاقہ امریکی حکومت نے 15 ملین ڈالر میں قریب چار سینٹ فی ایکڑ کے حساب سے حاصل کرلیا۔ امریکی پھیلاؤ میں اس سودے کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

لوئیز یانا کی خرید سے ہمیں کشمیر کی فروخت یاد آجاتی ہے۔ 1846 میں ہونے والے معاہدہ امرتسر کے تحت اس سودے میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے 75 لاکھ روپے نانک شاہی کے

عوض 86 ہزار مربع میل پر محیط ریاست کشمیر خرید کر اپنی عمل داری قائم کر لی تھی بعینہٖ اسی طرح خرید لوئز یانا میں بھی ہوا ۔ اس دفعہ گلاب سنگھ کا کردار صدر تھامس جیفرسن نے اور برطانوی حکومت کا کردار نپولین بونا پارٹ نے ادا کیا۔ ان دونوں سودوں میں گہری مماثلت ہے دونوں طرف فروخت کنندہ غاصب تمن دار اور خریدار قابض طمع کار تھے ۔ ان سودوں میں فریقین یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ زمین جو بیچی اور خریدی جا رہی ہے دونوں میں سے کسی کی بھی نہیں ہے ۔ جن کی زمین تھی وہ اشیائے فروختنی میں شمار کیئے گئے ۔ صدر تھامس جیفرسن نے جمہوری اور انسانی نظریات کے سب سے بڑے امریکی پرچارک ہونے کے باوجود لوئز یانا کا سودا بالآخر فرانسیسی حکومت سے براہ راست طے کر لیا حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ یہ زمین کس کی ہے اور یہ سودا کس سے طے کرنا چاہیے۔ اس کے وارث کون ہیں اور حق ملکیت کس کا ہے۔

1812 سے 1817 کے دوران انتہائی مشرق میں امریکی ریاست مین جو کینیڈا کی سرحد سے ملحق ہے، امریکہ اور کینیڈا کے درمیان وجہ تنازعہ بنی۔ ہالینڈ کے بادشاہ نے ثالثی کے فرائض انجام دیتے ہوئے فریقین کے درمیان تنازع طے کر دیا لیکن ریاست مین کے حکام نے اسے ماننے سے انکار کر دیا حتیٰ کہ امریکہ نے تنازعے کو ”اپنے“ طور پر حل کر لیا اور اس ”حل“ سے مزید 6 ہزار مربع میل زمین امریکی وسعت میں شامل ہوگئی۔

1818 میں صدر جیمز مونرو کے حکم پر جنرل اینڈریو جیکسن ہسپانوی عمل داری کے علاقے فلوریڈا پر حملہ آور ہوئے لیکن امریکہ کی بڑھتی ہوئی قوت اور جنرل اینڈریو جیکسن کی ’شجاعت‘ کے پیش نظر سپین نے فلوریڈا کے چھن جانے کے خوف سے اس کے دام کھرے کر لیئے۔ جنرل جیکسن کی فلوریڈا میں تیز رفتار کامیابی ہمیشہ یاد رکھی گئی جو مستقبل میں ان کے بہت کام آئی ۔ جنرل جیکسن فلوریڈا میں ہسپانوی قلعے فتح کرنے کے بعد کھلی کچہری منعقد کرتے اور مشتبہ حضرات کو موقع پر ہی سزائے موت کا حکم جاری کر دیتے ۔ موت کی سزا پانے والے انہی مخبروں میں کچھ برطانوی آبادی کار بھی شامل تھے جنہیں ریڈ انڈینز کو امریکی فوج کی نقل وحمل کی اطلاعات دینے کے الزام میں پھانسی دی گئی ۔ جنرل اینڈریو جیکسن کی اس دلیری نے ہسپانوی اور برطانوی حکومتوں کو ہراساں کر دیا اور انہوں نے فلوریڈا کے سقوط پر رضا مندی ظاہر کر دی یوں 5 ملین ڈالر کے عوض مزید 66 ہزار مربع میل زمین امریکی دسترس میں آ گئی۔

1836 سے 1845 تک ٹیکساس' کالو ریڈو اور نیو میکسیکو کی ریاستوں پر قبضے کے لیے امریکہ اور میکسیکو کے درمیان کار زار گرم رہا اور میکسیکن آرمی مزاحمت کرتی رہی ۔ 1845 کے آخر میں صدر جیمز پوک نے میکسیکو سے 30 ملین ڈالر کے عوض کیلئے فورنیا اور نیو میکسیکو خریدنے کی پیشکش کی جسے میکسیکو نے قبول نہ کیا ۔ اس قبول نہ کرنے پر وہی ہوا جو امریکہ کی پیشکش قبول نہ کرنے پر ہوتا ہے یعنی امریکہ اور میکسیکو کے درمیان حتمی جنگ کا آغاز ہوا جس میں میکسیکو کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور ہزیمت بھی ایسی کہ تین لاکھ نوے ہزار مربع میل زمین ہاتھ سے جاتی رہی ۔ ٹیکساس اور' ریاست نیو میکسیکو پر امریکہ کا قبضہ ہوگیا اور تنازع طے ہوا۔

1846 میں برطانیہ اور امریکہ کے درمیان ریاست اوریگن' واشنگٹن اور مونٹینا کے مغربی حصے پر دونوں ملکوں کے مشترکہ کنٹرول کا طویل تنازع اوریگن معاہدے کے تحت طے ہوا ۔ اس معاہدے کی رو سے برطانیہ کو مشترکہ کنٹرول سے دست بردار ہونا پڑا اور ان ریاستوں کا دو لاکھ پچاسی ہزار مربع میل رقبہ امریکی حکومت کے زیر انتظام آ گیا۔

1848 میں امریکہ اور میکسیکو کے درمیان طویل محاذ آرائی کے بعد معاہدہ گاڈالوپے عمل میں آیا اس معاہدے کے تحت میکسیکو' ریاست کیلیفورنیا' ایری زونا' نواڈا' یوٹاہ اور کالوریڈو کے مغربی حصے سے دست بر دار ہوگیا اس معاہدے سے امریکہ کو 5 لاکھ 29 ہزار مربع میل پر مشتمل خطیر رقبے پر اقتدار حاصل ہوا۔ اس رقبے کے حاصل ہوجانے سے امریکہ جو اپنے آغاز کی اولین ریاستوں کے مشرق میں بحیرہ قلزم پر رسائی رکھتا تھا' اس معاہدے کے بعد بحیرہ الکاہل تک پھیل گیا یوں دونوں سمندروں پر امریکہ کو یکساں رسائی حاصل ہوگئی اور امریکی زراعت کے ساتھ ساتھ تجارت کو بھی شاندار فروغ حاصل ہوا ۔

1853 میں ریاست ایری زونا اور نیو میکسیکو کے جنوبی علاقے جو میکسیکو کی سرحد سے ملے ہوئے تھے معاہدہ گیڈسن کے تحت میکسیکو سے دس ملین ڈالر میں خریدے گئے۔ معاہدہ گیڈسن سے امریکہ کو 30 ہزار مربع میل زمین حاصل ہوئی۔ اس خریداری کی تکمیل پر 13 ریاستوں اور 8 لاکھ مربع میل سے شروع ہونے والا امریکہ صرف تین چوتھائی صدی میں 48 ریاستوں اور قریب تیس لاکھ مربع میل زمین پر پھیل چکا تھا ۔ اگر ان امریکی 75 سالوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لیے کسی تجزیاتی جینئیس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ہے کہ:

1۔ اہم ترین پیداواری ذریعہ یعنی زمین فوری قبضے کی زد میں آ گئی۔

2۔ افرادی قوت پیداواری معیشیت میں پوری طرح جذب ہوگئی۔

3۔ زرعی مصنوعات کی معیشیت کو فروغ حاصل ہوا جس سے زمین پر قابضین مستفید ہوئے۔

4۔ تجارت سے زرعی شعبے کی علیحدگی عمل میں آئی اور زرعی شعبہ بجائے خود تجارت اور انڈسٹری میں بدل گیا یعنی قابضین اب یافت سمیٹنے کے ہر مرحلے پر خود کفیل ہوگئے۔

18 اکتوبر 1867 کو الاسکا کے چھوٹے سے ساحلی شہر سٹکا میں روسی امریکہ پر آخری سورج غروب ہوا۔ غروب سے ذرا پہلے توپوں کی سلامی میں براعظم امریکہ سے روس کا جھنڈا اتار کر روسی جرنیل کے ہاتھ میں تھما دیا گیا اور امریکی جھنڈے نے روسی جھنڈے کی جگہ لے لی۔ امریکہ کے سترہویں صدر اینڈریو جانسن کی زندگی میں یہ سب سے بڑی کامیابی تھی کہ وہ براعظم امریکہ سے روس کو رخصت کر چکے تھے۔ انتہائی شمال میں الاسکا کا سردزار 1867 تک روسی قلمرو میں شامل رہا۔ جغرافیائی لحاظ سے الاسکا ایشیاء کی بجائے شمالی امریکہ میں شامل ہے۔ شمالاً جنوباً 170 ڈگری پر بحیرہ بیرنگ براعظم ایشیاء کو براعظم امریکہ سے جدا کر کے بین البراعظمی حد بندی کی تشکیل کرتے ہوئے الاسکا کو شمالی امریکہ کی حد میں شامل کرتا ہے۔ یوں الاسکا' کا روسی قلمرو میں شامل ہونا شمالی امریکہ میں روس کی موجودگی کی علامت تھا اور اس علامت سے بوئے مخاصمت واشنگٹن تک مار کرتی تھی۔ شمالی امریکہ کو روسی وجود سے 'پاک' رکھنے کے لیے الاسکا کو روسی گرفت سے نکالنا ضروری تھا۔ یہ ضروری کام بہت آسانی سے ہوگیا۔ زار روس الیگزینڈر دوئم (1855-1881) سات ملین ڈالر کی مالیت کے برابر سونے کے بدلے میں الاسکا کی 5 لاکھ 86 ہزار مربع میل زمین سے امریکہ کے حق میں دست بردار ہوگیا۔ اس طرح الاسکا اپنے وسیع رقبے اور قیمتی معدنی وسائل کے ساتھ انچاسویں ریاست کی حیثیت سے مشرف بہ امریکہ ہوا۔ 1898 میں پچاسویں ریاست کے طور پر جزیرہ ہوائی امریکہ میں شامل ہوا' اس شمولیت سے 11 ہزار مربع میل کا مزید رقبہ امریکی پھیلاؤ کی زد میں آ گیا۔

یوں امریکہ کی زمینی وسعت تو پھیلتی گئی مگر قلبی وسعت سمٹتی گئی یا وہ شروع سے تھی ہی نہیں امریکہ میں جب آسانی' کشادگی' آسائش اور رزق کی فراوانی کا دور آیا تو ریڈ انڈینز اور

افریقی مسلمان یہ دور دیکھنے کو موجود ہی نہیں تھے۔ جن کی یہ زمین تھی وہی اس زمین کو بھاگ لگے دیکھنے سے محروم رہ گئے۔ ان کی زمینوں پر ہریالی' بار اور دار کا موسم ایک ساتھ آیا سو وہ نخل نخل جھول گئے۔ ادھر امریکی زمین میں وسعت آتی جاتی تھی ادھر ریڈ انڈینیز کی قبور میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ایک طرف جمہوریت پھیل رہی تھی تو ایک طرف موت کے سائے دراز ہوتے جاتے تھے۔ کہیں اجتماعی قبریں تھیں اور کہیں بے نام ونشان دفن کیئے جارہے تھے۔ کچھ مرنے والوں پر گریہ وزاری تھمنے میں نہیں آتی تھی اور کسی کو' کوئی گریہ مند ہی میسر نہیں تھا۔ ایک طرف ڈالر گنے جارہے تھے اور ایک طرف مقتول۔ ادھر کانگریس میں انسانی حقوق کے بل پہ بل پاس ہورہے تھے امریکی انسان کو احترام مرحمت ہو رہا تھا' جمہوریت کی لٹ پڑی تھی شخصی حقوق کے بخیے لوٹے جارہے تھے ادھر انسانیت درندگی کا شکار ہورہی تھی اس کی کھال کھینچی جارہی تھی اور اسے زندہ جلایا جارہا تھا۔ امریکی وسعت' مالی استحکام' معاشی ترقی' انسانی حقوق' آزادی اور جمہوریت سے ریڈ انڈینیز کو کچھ بھی نہ مل سکا۔ امریکی زمین میں ان کا حصہ قبروں تک اور حقوق میں حق مرگ تک محدود ہوگیا۔ ان کے لیے نوشتہ دیوار پر صرف ایک ہی لفظ' ایک ہی حکم لکھا تھا:

موت

ہر قیمت پر موت

ہر ایک کے لیے موت

ریڈ انڈینیز کے اس اجل بار انجام پر سینیکا قبائل کے چیف ساگوا تھا ریڈ جیکٹ کا تبصرہ اور ونسٹن چرچل کی شہادت تاریخ میں انشاء اللہ محفوظ رہے گی:

> ''وہ تعداد میں کم تھے اور انہیں دشمنوں کی بجائے دوست ملے تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ اپنے مذہب کی خاطر بدمعاش، قاتلوں سے بچ کر یہاں پناہ لینے آئے ہیں لیکن وہ آتے ہی چلے گئے حتیٰ کہ وہ تعداد میں بڑھتے گئے اور ہم کم ہوتے گئے اور ہمارا ہی ملک ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا۔''

(سینیکا چیف ساگوا تھا۔ ریڈ جیکٹ: 1830 - 1750)

1943 میں وائٹ ہاؤس میں برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل' ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے شدید مخالف اخبار شکاگو ٹریبیون کی مالکہ ہیلن اوگڈن ریڈ کی ہندوستان میں برطانوی

پالیسی پر تنقید کے جواب میں کہتے ہیں:

> ’’اس سے پہلے کہ ہم مزید بات کریں ہمیں یہ بات واضح کرنی چاہیے کہ کیا ہم ہندوستان کے گندمی انڈینز کی بات کر رہے ہیں جن کی تعداد فراخ دل برطانوی اقتدار میں تشویشناک حد تک بڑھی ہے یا امریکہ کے ریڈ انڈینز کی جو میرے خیال میں قریباً نابود کیے جا چکے ہیں۔ ‘‘

(سر ونسٹن چرچل: 1874 - 1965)

* * *

الا مان الحفیظ

> میرے آقا اور بادشاہ:
>
> یہ بات سچ ہے کہ نا معلوم لوگ آن پہنچے ہیں۔ یہ لوگ عظیم سمندر کے ساحل پر اتر چکے ہیں۔ ان لوگوں کے ہتھیار اور آلات لوہے کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کا جسم کپڑوں میں چھپا ہوا ہے اور صرف ان کے چہرے دیکھے جاسکتے ہیں یہ لوگ بہت ہی سفید ہیں ایسے سفید کہ جیسے چونے سے بنے ہوں۔ (از طرف پیغام رساں خصوصی)

1519ء کے موسم خزاں میں خصوصی پیغام رساں کی طرف سے بھیجا ہوا یہ پیغام میکسیکو کے آخری ایزٹک بادشاہ ماہتوزوما کو موصول ہوا تو وہ بے یقینی اور آنے والے مصائب کا اندازہ کر کے خوف سے کانپنے لگا۔ ماہتوزوما کو ایزٹک قبائل کی وہ لوک کہانی یاد آ گئی جس میں وقتاً فوقتاً بادشاہوں کی سرکوبی کے لیے روحانی طاقتیں مختلف روپ دھار کر بادشاہوں سے سزا کے طور پر اقتدار چھین کر انہیں نابود کر دیتی تھیں۔ اس لوک حکایت کے پیش نظر وہ ان سفید فام لیٹروں کو ایسی خدائی اور روحانی قوت سمجھا جو اس کے اعمال سے ناراض ہو کر اس کی بادشاہت چھیننے آ چکی ہے۔ ماہتوزوما کا اندازہ اور حکایت درست مگر اس کی تعبیر غلط نکلی۔ یہ سفید فام لوگ خدائی اور روحانی طاقت کی بجائے ہسپانوی جنگجو ہرنن کورٹیز اور اس کے حملہ آور تھے جو ماہتوزوما کی بادشاہت ختم کرنے کی بجائے پورے ملک پر ہی قبضہ کرنے آ چکے تھے۔ سولہویں صدی کے آغاز سے ہی جنوبی امریکہ اور خصوصاً میکسیکو میں عظیم ایزٹک سلطنت اپنے زوال تک آن پہنچی تھی۔ ماہتوزوما آخری مغل بادشاہ سراج الدین ظفر کے مانند عہد رفتہ کی عظیم سلطنت کا

ایسا علامتی حکمران ثابت ہوا کہ جس کے پاس اپنی سلطنت کے دفاع کے لیے خوش گمانی، جھاڑ پھونک، تحفے تحائف، گفت وشنید اور عظمت رفتہ کے حوالے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ سو، ماہتوزوما نے بیش قیمت تحائف، جی آیا نوں اور ڈھیر ساری خیر سگالی کے ہمراہ اپنے قاصدوں کو ہرنن کورٹیز سے ملاقات کے لیے روانہ کیا لیکن ہسپانوی لٹیروں کی نظر میں تحائف کم قیمت، خیر سگالی بلا جواز، گفت وشنید غیر ضروری اور عظمت رفتہ کا حوالہ بے اثر ثابت ہوا نتیجتاً قاصد قید ہوئے، خیر سگالی کی دھند چھٹی اور گفت وشنید کی حاجت جاتی رہی۔ ہرنن کورٹیز نے ایک قاصد کو اس پیغام کے ساتھ واپس روانہ کیا کہ ''میں اور میرے ساتھی دل کی ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہیں جس کا علاج صرف سونے چاندی سے ہو سکتا ہے۔''

ماہتوزوما اور اہل میکسیکو کو خوفزدہ کرنے کے لیے اس ''روحانی طاقت'' نے پہلے کرتب کے طور پر خلیج میکسیکو کے ساحل سے توپ کے گولے داغنے شروع کر دیئے جس سے اہل میکسیکو لرز کر رہ گئے۔ خوفزدہ ماہتوزوما نے آخری چارے کے طور پر ہرنن کورٹیز کو اپنے محل میں مدعو کیا اور اس کے سامنے سونے چاندی کے ڈھیر لگا دیئے لیکن کورٹیز کو دل کی بیماری سے پھر بھی شفا نہ ہوئی اور اس نے مزید علاج کی امید میں ماہتوزوما کو اسی کے محل میں قید کر کے میکسیکو کو بھی سپین کی شاہی حکومت کی قلمرو میں شامل کر دینے کا اعلان کر دیا۔ ایزٹک قبائل کے بیشتر سرداروں نے اپنے اپنے علاقوں میں ہسپانوی لٹیروں کی مزاحمت کی لیکن بیل کی ہڈیوں کے تیر اور گوپھیہ پھینکنے میں مہارت کا سپین کے توپ خانے، بندوقوں، بارود، سازشوں اور چالوں سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ اس کے باوجود بھی نہتے مقامیوں نے دو سال تک مزاحمت جاری رکھی۔ بالآخر اگست **1521** میں یہ مزاحمت دم توڑ گئی اور کورٹیز فاتح میکسیکو قرار پایا، اس کے دل کی بیماری کو شفا ہوئی، سپین کی قلمرو میکسیکو تک پھیل گئی اور عظیم ایزٹک تہذیب تاریخ کے صفحوں تک محدود رہ گئی۔ کورٹیز نے فتح میکسیکو کے بعد ایک نیا شہری دارالخلافہ بنانے کا حکم جاری کیا اور اس کا نام میکسیکو سٹی رکھا یہی میکسکو سٹی آج دنیا کے گنجان ترین شہروں میں شامل ہے۔

ہرنن کورٹیز کی میکسیکو میں کامیابی سے کئی دوسرے ہسپانوی لٹیروں، قزاقوں اور مہم جوؤں کی ہمت بڑھی اور ان کی رال جنوبی امریکہ کے دوسرے ملکوں پر ٹپکنے لگی۔ طمع اور لالچ کی ہوس میں لتھڑے ایک اور ہسپانوی طالع آزما فرانسسکو پزارو نے **1531** میں پیرو پر حملہ کر دیا۔ پیرو میں انکاز قبائل کی حکمرانی تھی۔ انکاز سلطنت کی طویل تاریخی اور تہذیبی حیثیت جنوبی امریکہ

میں ممتاز تھی اور اس وقت کے انکاز حکمران آہتو والپا کی سلطنت پانامہ، پیرو اور جنوبی امریکہ کے دور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ میکسیکو کے ایزٹک بادشاہ کے برعکس پیرو کے بادشاہ آہتو والپا کو عوام کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ انکاز حکمران بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی پیشوا بھی ہوتے تھے۔ ہر دلعزیز آہتو والپا سات سو سال سے حکمران خاندان کا آخری بادشاہ ثابت ہوا۔ پزارو نے کورٹیز کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پیرو پر قبضے کے لیے وہی حربے استعمال کیے جو کورٹیز میکسیکو میں کر چکا تھا۔ آہتو والپا سے ملاقات کے دوران پزارو نے اسے یرغمال بنا لیا اور جس کمرے میں یہ ملاقات ہو رہی تھی اسے سونے سے بھر دینے کے عوض آہتو والپا کی رہائی کی پیشکش کی۔ پیرو کے عوام نے اپنے بادشاہ اور مذہبی پیشوا کی بازیابی کے لیے کمرہ سونے سے بھر دیا لیکن اس کے باوجود آہتو والپا کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ اس وعدہ خلافی پر انکاز قبائل نے آخری دم تک ہسپانوی مزاحمت کا عہد باندھا جو چالیس برس تک جاری رہی۔

ان فاتحین وسطی و جنوبی امریکہ اور وہاں کی عظیم الشان قدیم تہذیبوں کے بارے میں شیخ منظور الٰہی 'نیرنگ اندلس' میں رقم طراز ہیں:

> ”مسلمانوں کے خلاف فتح مندی کے نشے میں سرشار پزارو' کورٹیز اور بلبوا مجسم قہر کی شکل میں وسطی اور جنوبی امریکہ میں وارد ہوئے۔ ان کے ایک ہاتھ میں انجیل اور دوسرے میں تلوار تھی۔ وہ بجلی کی سرعت کے ساتھ مقامی آبادی پر چڑھ دوڑے۔ ان ہسپانوی فاتحین نے ازٹیک مایا اور انکاز کی صدیوں پرانی تہذیبیں تہ و بالا کر دیں جو میکسیکو سے جنوبی امریکہ کے سرے تک محیط تھیں۔ وہ اپنے جلو میں زنا بالجبر' لوٹ کھسوٹ اور آتشزدگی کی ہولناک داستانیں چھوڑ گئے۔ انہوں نے مقامی باشندوں کی زبان' تمدن اور عزت نفس کو خاک میں ملا دیا' لوگ حواس باختہ ہو گئے' ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے' وہ اپنے ملکوں میں تیسرے درجے کے شہری بن گئے۔ ان کے مسمار شدہ معبدوں کا ملبہ کلیساؤں کی بنیادیں پر کرنے کے کام آیا' ”آئین نو' کسی ایسے استعارے کا ہی مقتضی تھا۔

نئی دنیا کے دو تہائی رقبے میں دین عیسٰی علیہ السلام کے مبلغ خوفناک تفتیش و احتساب کے داعی بھی تھے ۔ یہ ان لوگوں کی زمین ہے جنہوں نے سولہویں صدی کے آغاز میں میکسیکو' وسطی امریکہ اور پیرو کی درخشاں تہذیبیں غارت کیں' وہ لٹیرے جنہوں نے ہسپانوی نو آبادیوں میں وہ ظلم ڈھائے اور لوٹ مار مچائی جس کی مثال مغربی استعماریت کے خونیں باب میں بھی نہیں ملتی۔ صدیوں تک جنوبی میکسیکو اور وسطی امریکہ کے بارانی جنگلوں میں مدفون رہنے کے بعد قدیم مایا کی ترقی یافتہ تہذیب کے دیرینہ آثار آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہے ہیں' مایا کی تاریخ 1500 قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے ۔ 1500 تا 1000 (ق م) یورپ قرون مظلمہ کے دور سے گزر رہا تھا' وہ زمانہ مایا تہذیب کے عروج کا تھا' خوشحال شہروں اور تجارتی مراکز کا جال بچھا ہوا تھا اور موجودہ دور کے کولمبیا تک لوگوں کو ایک رشتے میں مربوط کیے ہوئے تھا۔

تمام جزیرہ نما اور ساحلی جزیرے عظیم الجثہ مایا اہرام اور سنگین عبادت گاہوں سے پٹے پڑے ہیں۔ فن تعمیر کے حیرت انگیز آثار شاہد ہیں کہ موجودہ دور کی تہذیب سے بہت پہلے مایا نے اپنی انجینئرنگ عبقریت سے فطرت کو مسخر کر لیا تھا حالانکہ وہ پہیے ایسی ابتدائی ایجاد سے بے خبر تھے اور بار برداری کے لیے جانوروں کا استعمال نہیں جانتے تھے۔ ایسے اہرام بھی ہیں جن کی چوٹی تک پہنچنے کے لیے ایک سو بیس مدارج طے کرنے پڑتے ہیں۔

مایا نے ریاضی کا ترقی یافتہ نظام دریافت کر لیا تھا۔ وہ باقی اقوام سے صدیوں پیشتر صفر کا استعمال جانتے تھے اور علوم فلکیات کے ماہر تھے۔ علم نجوم میں مہارت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ انہوں نے صحیح تقویم (Calendar) ایجاد کر لیا تھا' اور حیران کن تفصیل کے ساتھ اجرام فلکی کی رفتار کا اندازہ لگایا تھا۔ بیسویں صدی کی رصد گاہوں سے مایا کی رصد

گاہوں کی مماثلت حیرت انگیز ہے۔ مشینی آلات کی مدد کے بغیر سائنس اور انجینئرنگ کے یہ کمالات مغربی تہذیب کی تکنیکی مہارت سے کسی طور کم نہ تھے۔"

1۔ (شیخ منظور الہی: 1996)

1533ء میں سپین نے اپنی امریکی نو آبادی کو دو انتظامی خطوں میں تقسیم کر دیا‘ جنوبی خطے کو پیرو اور شمالی خطے کو نیو سپین کا نام دیا گیا۔ نیو سپین میں جزائر غرب الہند‘ کیوبا‘ وسطی امریکہ‘ میکسیکو اور خلیج میکسیکو کے علاقے شامل تھے۔ 1500 کے آغاز سے ہی ہسپانوی حکومت کی طرف سے امریکہ میں ہسپانوی وائسرائے اس واضح حکم نامے کے ساتھ تعینات ہونا شروع ہو چکے تھے کہ سپین کے لیے ہر قیمت پر زیادہ سے زیادہ امریکی دولت حاصل کریں۔ امریکہ میں انسانیت‘ اخلاقیات‘ اور انسانی حقوق اس شاہی حکم نامے کا سب سے پہلا شکار بنے۔ مقامی باشندوں سے زرعی زمینوں پر جبری بیگار لینے کا آغاز ہوا جو دیکھتے ہی دیکھتے بدترین غلامی میں بدل گیا۔ آہستہ آہستہ مفت کی بیگار‘ جبری مشقت اور صحت مند غلام امریکی زرعی معیشت کا اہم اور لازمی حصہ بن گئے۔ زرعی زمینوں کی فروخت میں غلام بھی زمین کے حصے کے طور پر فروخت ہونے لگے۔ غلاموں کی تعداد‘ زمین کی قیمت پر اثر انداز ہونے والی موثر اکائی کے طور پر متعارف ہوئی اور سودے اس طرح طے ہونے لگے:

زمین	100 ایکڑ
بکریاں	30
بیل	8
گھوڑے	6
سور	200
گائیں	12
غلام	20

اس مفت بیگار اور مفت زمین نے سپین کی معیشت کو یورپی معیشت میں ممتاز اور مضبوط بنا دیا تھا۔ سپین کے یوں پو بارہ اور سر کڑاہی میں دیکھ کر یورپ کے دوسرے ممالک بھی

مال غنیمت میں اپنے حصے کے حصول کی منصوبہ بندی میں مصروف ہوگئے۔ سولہویں صدی کے وسط میں نیو سپین سے پرانے سپین کی طرف جانے والے جہاز سونے کے سکوں' سونے' چاندی' پیتل اور تانبے کی اینٹوں سے بھرے جاتے۔ سپین میں مال غنیمت سے لدے پھندے جہازوں کی آمد کی خبر دیگر اقوام یورپ پر بجلی کی طرح گرتی۔ امریکی مال غنیمت نے یورپ میں حسد' طمع اور مسابقت کا ایسا بازار گرم کردیا کہ یورپی حکومتیں' یورپ تو یورپ امریکی سرزمین میں بھی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوگئیں۔ یوں مجموعی یورپی سرمایہ داری کی بدترین کشید' اقوام یورپ کے غیر اخلاقی وغیر انسانی مفادات' طمع' کینہ اور پاپائیت کی تنگ نظری سے امریکہ کی وسعتوں میں ایک ایسے سرمایہ دارانہ خون آشام آکٹوپس نے جنم لیا کہ جس نے جوان ہوتے ہی اپنے تخلیق کاروں سمیت دیگر اقوام عالم کی گردنوں کو بھی اپنے خونی پنجے میں جکڑ لیا۔ فروغ عیسائیت کے نام پر شروع ہونے والی مہم جوئی سے اس قدر عظیم الشان مالی و معاشی منفعت پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور مذہبی فلسفی ایلڈرج کین لکھتے ہیں:

''عیسائیت مذہب نہیں بلکہ ایک صنعت ہے۔''

1534 میں فرانسیسی مہم جو' جیکیوز کارٹیز مشرقی کینیڈا میں آنکلا اور دریائے سینٹ لارنس کے ساتھ ساتھ اطراف کے علاقوں پر فرانس کی ملکیت کا دعویٰ کر کے کیوبک کو فرانسیسی اقتدار کا صدر مقام قرار دے دیا۔ امریکہ کی طرح کینیڈا میں بھی ریڈ انڈینز کی زمین ان پر ہی تنگ ہونے لگی لیکن فرانسیسی آباد کاروں نے جلد ہی ان غلطیوں سے سبق سیکھنے کی پالیسی اپنائی جو ہسپانوی آباد کار امریکہ میں کر چکے تھے۔ اس نئی پالیسی کے تحت مقامی آبادی کو نابود اور ان کی ثقافت کو برباد کرنے کی بجائے اسے تحفظ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ جارحانہ کی بجائے مصالحانہ رویے کے تحت ریڈ انڈینز کی زبان سیکھی جانے لگی اور انہیں چرچ کی طرف سے مراعات اور تحفظ دیا گیا۔ ریڈ انڈینز پر فرانسیسی اقتدار کو مسلط کرنے کی بجائے بقائے باہمی کی پالیسی نے بیشتر ریڈ انڈین قبائل کو فرانسیسیوں کا حلیف بنا دیا۔ فرانسیسیوں اور' ریڈ انڈینز کے اس اشتراک نے نیو سپین کے مقابلے میں نیو فرانس کو جنم دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کینیڈا کا بیشتر حصہ فرانس کی قلمرو میں شامل ہو کر نیو فرانس کہلانے لگا۔ نیو فرانس کی معیشیت زراعت کی بجائے تجارت پر استوار ہوئی۔ نیو فرانس کا چمڑہ' کھالیں اور فر یورپ میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتیں۔

1682 میں رابرٹ لسال نے دریائے مسی سپی کے منبع سے اس ارادے کے ساتھ دریا

میں سفر کا آغاز کیا کہ وہ دریا کے آخر تک سفر کرے گا۔ دریائے مسی سپی میں بہتے بہتے وہ خلیج میکسیکو تک آن پہنچا جہاں مسی سپی خلیج میکسیکو میں مدغم ہو جاتا ہے۔ رابرٹ لسال نے خلیج میکسیکو اور دریائے مسی سپی کے سنگم پر ایک پتھر گاڑ دیا جس پر وادی مسی سپی کے تمام علاقے کو نیو فرانس کی حد قرار دیا اور فرانس کے بادشاہ لوئیس کے نام پر اس علاقے کو لوئزیانا کا نام دیا۔ امریکہ کے شمال وسطی علاقے میں جھیل اٹاسکا سے نکلنے والا 2300 میل لمبا دریا مسی سپی، ریاست منی سوٹا، وسکانسن، آئیوا، الی نائس، مسوری، آرکنساس اور لوئزیانا کی ریاستوں سے گزرتا ہوا خلیج میکسیکو تک اس طرح بہتا ہے کہ شمال مغربی، وسطی اور جنوب مغربی ریاستوں کو مشرقی ریاستوں سے کاٹ دیتا ہے اور ان کے درمیان قدرتی حدِ فاصل کی طرح حائل ہے۔ فرانسیسیوں نے اس قدرتی حدِ فاصل کے دونوں اطراف کے علاقوں کو فرانس کی ملکیت قرار دے کر سپین، ہالینڈ اور برطانیہ کو امریکہ کے وسیع تر زرعی میدانی خطے پر قبضے سے باز رکھا جس سے وقتی طور پر ان ممالک کی پیش قدمی دریائے مسی سپی کے مشرقی سمت میں ہی ٹھہر گئی۔ بعد میں اسی دریائے مسی سپی نے امریکہ کے باقاعدہ وجود میں آ جانے کے بعد سو سال تک امریکی معیشیت میں ریڑھ کی ہڈی کا کام دیا۔ ان سو سالوں (1776-1876) میں امریکی معیشت دریائے مسی سپی کے بہاؤ سے وابستہ رہی۔

نیو فرانس جس قدر وسیع رقبے پر مشتمل تھا فرانسیسی آبادکار اسی قدر کم تعداد میں تھے۔ سترہویں صدی کے وسط تک نیو فرانس میں ان کی آبادی ڈھائی ہزار فرانسیسی نفوس سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ اس کی ایک وجہ فرانس کے زیر تسلط علاقوں میں مقامی آبادی کا فرانسیسی آبادکاروں سے اشتراک اور نیو فرانس کی حکومتی ذمہ داریوں میں شریک ہونا تھا یوں نیو فرانس میں مقامی آبادی نیو سپین کی مقامی آبادی کی نسبت مصائب سے محفوظ رہی۔ دریائے مسی سپی کے آغاز سے انتہا تک اطراف کے علاقوں اور وادی پر فرانسیسی قبضے سے امریکہ میں دریافت کردہ بیشتر زمین فرانسیسی ملکیت میں آ چکی تھی جبکہ سپین کا قبضہ امریکہ کی موجودہ ریاست فلوریڈا تک محدود تھا لیکن جنوبی علاقے میں وسیع علاقے اور جزیرے سپین کی قلمرو میں شامل کیے جا چکے تھے۔

سپین، فرانس، پرتگال اور برطانیہ کو نئی دنیا سے حاصل ہونے والی دولت، زمین، جاہ اور مال غنیمت کے حجم نے ھالینڈ کو بھی امریکہ کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے اور لوٹ مار میں اپنے حصے کے حصول پر بے قابو کر دیا۔ 1609ء میں ہالینڈ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ حکومتی

سرکردگی میں ڈچ تاجروں کا ایک گروہ ہنری ہڈسن کی زیر قیادت عازم امریکہ ہوا۔ ہنری ہڈسن عین اس جگہ لنگر انداز ہوا جہاں آج کل آزادی کا مجسمہ ایستادہ ہے۔ مین ہیٹن میں اترتے ہی ہنری ہڈسن نے اس علاقے کو ہالینڈ کا زیر نگین علاقہ قرار دے کر اسے نیو ایمسٹرڈیم کا نام دیا۔ انتہائی پراسرار سرعت سے ولندیزیوں نے نیو یارک' نیو جرسی' کنکٹی کٹ اور ڈیلا ویر کے علاقوں پر قبضہ کر لیا لیکن ولندیزیوں نے اپنی توجہ تجارت اور فوری فائدے پر مرکوز رکھی۔ تجارت کو فروغ دینے کی خاطر ان ریاستوں میں ولندیزی تجارتی کوٹھیاں قائم کی گئیں جس سے تجارت کے ساتھ ساتھ مقامی آبادی کو بھی فائدہ پہنچا۔

یوں تو امریکہ میں کئی ملکوں کی کالونیاں قائم ہو چکی تھیں مگر بستیاں برطانیہ کی ہی بسیں۔ انگریزوں کی امریکہ میں کامیابی کی وجوہات میں کئی ایسے عناصر شامل تھے جن سے دوسرے قابضین ممالک تہی دامن تھے۔ ان وجوہات میں سرفہرست برطانیہ کے طویل استعماری تجربے کے علاوہ اولین برطانوی آبادکاروں کی امریکہ میں آباد ہو جانے کی انتہائی خواہش اور ضرورت بھی کارفرما تھی۔ ان لوگوں نے امریکی ساحل پر پہنچ کر واپسی کی کشتیاں نہیں جلائی تھیں بلکہ برطانیہ سے روانگی پر ہی ان کی واپسی کی کشتیاں سوراخ زدہ' جلی ہوئی اور ناقابل واپسی تھیں۔ غیر برطانوی یورپینز کی امریکہ میں دلچسپی فوری لوٹ مار' طالع آزمائی اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لینے پر مشتمل تھی جب کہ برطانوی آبادکاروں کی وجوہات مختلف تھیں۔

سترہویں صدی کے آغاز میں ہی برطانیہ کا استعماری اور استحصالی عفریت اپنے پاؤں پسار چکا تھا۔ 1608ء میں ہندوستان میں سورات کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے والے ایسٹ انڈیا کمپنی کے پہلے پہل جہاز کے برطانوی حکاّم کے تجربات' مشاہدات اور سفارشات نے برطانیہ کو اگلے سو سال کے لیے سفارت کے پردے میں ایک ایسا تجارتی لائحہ عمل مہیا کر دیا تھا کہ جس میں منافع ہی منافع تھا' ایک ایسا سودا کہ جس کے طے ہوتے ہی استعمار' استحصال اور اجارہ داری کی آکاس بیل جڑ پکڑ لیتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نمائندہ سر تھامس روؔ جس نے مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر سے سورات میں پہلی تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حاصل کی تھی' برطانوی حکومت کے لیے ایک ایسا سفارتی مگر غیر انسانی فارمولا اور مذاکراتی مگر سازشی ماڈل چھوڑ گیا تھا جس کے امریکہ میں براہ راست اطلاق سے برطانیہ دیگر ممالک کی نسبت امریکہ میں زیادہ کامیاب ہوا۔ جو کام ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے سرانجام دیا یہی کام

امریکہ میں ورجینیا کمپنی آف لندن اور ورجینا کمپنی آف پلے متھ نے کیا۔ دونوں کمپنیوں کو برطانیہ کے بادشاہ جیمز اوّل کی طرف سے امریکہ میں آبادکاری، زمینوں کی خرید و فروخت اور تجارت کا چارٹر تفویض ہوا بعینہٖ ایسا ہی چارٹر ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی دیا گیا تھا۔

1620ء میں برطانوی آبادکاروں کا جہاز امریکہ میں پلے متھ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ اس کے 102 مسافروں میں سے بیشتر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ کیمبرج اور آکسفورڈ کے فارغ التحصیل ہونے کے ناطے سے اگر ایک طرف یہ لوگ میگنا کارٹا میں تسلیم کیے گئے انسانی حقوق، جمہوریت اور عوامی حاکمیت کے نظریے سے متعارف تھے تو دوسری طرف سر تھامس رو کی سفارشات، ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان میں سیاسی اور اقتصادی پیش قدمی کا احوال بھی ان کے پیش نظر تھا۔ ان اولین برطانوی آبادکاروں (جو بعد میں زائرین کہلائے گئے) کے پیش نظر وقتی فائدہ، لوٹ مار اور قتل و غارت کے ایجنڈے کی بجائے امریکہ میں مستقلاً آباد ہوجانے کی شدید خواہش اور ضرورت کارفرما تھی کیونکہ یہ لوگ برطانوی چرچ اور بادشاہ ہر دونوں کے معتوب تھے اور عرصہ دراز سے ہالینڈ میں دیس نکالا کاٹ رہے تھے۔ ورجینیا کمپنی آف لندن کے حکام نے ان جلا وطنوں، مذہبی انتہا پسندوں اور علیحدگی پسندوں کو بادشاہ جیمز اوّل سے اس شرط پر معافی لے دی تھی کہ یہ لوگ برطانیہ میں رہنے کی بجائے نئے دریافت کردہ براعظم امریکہ میں برطانوی شہریوں کی حیثیت سے آبادکاری کا آغاز کریں گے۔

11 نومبر 1620 کو ان برطانوی جلا وطنوں اور علیحدگی پسندوں سے لدا پھندا مئے فلاور نامی جہاز امریکی ساحل کیپ کوڈ پر لنگر انداز ہوا تو ایک نئے مسئلے نے سر اٹھا لیا۔ کیپ کوڈ (نیو انگلینڈ) کا ساحلی علاقہ موسم کی شدت اور جغرافیائی ساخت کی وجہ سے آبادکاری کے لیے موزوں نہیں تھا۔ مئے فلاور کے آدھے مسافروں کی رائے تھی کہ قرب و جوار میں کوئی دوسری موزوں جگہ تلاش کی جائے جہاں کالونی کا قیام ممکن اور آسان ہو جبکہ آدھے مسافر فوری طور پر جہاز سے اتر جانے کے حق میں تھے۔ جہاز سے اتر جانے اور نہ اترنے پر مشترکہ موقف کے نہ ہونے سے بحث مباحثہ تنازع میں بدل گیا اور تنازعہ نے شدت اختیار کرلی۔ آمادہ پیکار صورت حال پر قابو پانے کے لیے پیوریٹنز چرچ لیڈن (ہالینڈ) کے سربراہ جان رابنسن کے ہدایت نامے سے رہنمائی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ہدایت نامہ ایک خط کی صورت میں جان رابنسن نے ان مذہبی علیحدگی پسندوں کو دیا تھا جو تجرباتی طور پر امریکہ میں آبادکاری پر رضا مند

تھے۔ اس ہدایت نامے میں جان رابنسن کی نصیحت درج تھی کہ:

> ”آخر کار تمہیں ایک سیاسی ڈھانچہ تشکیل دینا ہوگا اور تمہیں اپنے لوگوں پر مشتمل شہری حکومت بنانا ہوگی جو ایسے لوگوں کی تشکیل کردہ نہیں ہونی چاہیے کہ جن کی دوسروں کے مقابلے میں خصوصی اہمیت ہو۔ اپنے نمائندوں کو منتخب کرنے میں نہ صرف عقل مندی اور اچھائی کو اجاگر ہونے کا موقع دینا بلکہ اجتماعی مفاد کو فروغ دینے کی کوشش کرنا اور جن کو منتخب کر لو ان کی عزت اور ان کے قانونی اختیارات کا احترام کرتے رہنا۔“
>
> 2۔ (ورنن ہیٹن : 1980)

جان رابنسن کا ہدایت نامہ پڑھے جاتے سے تنے ہوئے اعصاب اور مشتعل جذبات پر مفاہمت غالب آ گئی۔ ایک معاہدہ عمل میں لایا گیا اور مئے فلاور پیکٹ کے نام سے ایک جمہوری دستاویز وجود میں آئی۔ اتفاق رائے سے اس دستاویز پر دستخط ہوئے۔ جہاز پر سوار اکتالیس بالغ مردوں نے مختلف نمائندہ حیثیتوں میں اس پر دستخط کیئے۔ یوں امریکہ کے ساحل پر اترنے سے پہلے ہی انگریزوں کی سول باڈی پالیٹک کا قیام وجود میں آ چکا تھا جس کی اساس میں بنیادی انسانی حقوق اور جس کے مزاج میں جمہوریت اور انسانی احترام نمایاں تھا۔ یہ الگ بات کہ یہ احترام، حقوق اور انصاف سفید چمڑی تک محدود رہا اور جمہوریت کی ریوڑیاں اپنوں اپنوں میں بٹتی رہیں۔ مختصر سے مئے فلاور پیکٹ میں امکانات کا ایک عالم آباد تھا۔ اس معاہدے کی اساس بائبل میں دیئے گئے قوم اسرائیل اور خدا کے درمیان معاہدے پر رکھی گئی جبکہ سترہویں صدی کی مقبول عام ”سوشل کنٹریکٹ تھیوری“ کا عکس بھی اس معاہدے میں نمایاں نظر آتا ہے۔ آج کی امریکی جمہوریت، آئین، انسانی حقوق، انصاف، داد رسی اور امریکہ کی معاشی ترقی کے برگ و بار کی جڑیں اسی معاہدے سے پیوستہ ہیں۔

مئے فلاور معاہدہ اپنے جواز اور نوعیت میں میثاق مدینہ سے مشابہ ہے۔ ان دونوں معاہدوں کا رویہ اور پس منظر یکساں ہے۔ دونوں معاہدے رضا کارانہ طور پر متفق خیالات کے لوگوں نے اپنے مذہبی عقیدے کو بروئے کار لانے کے لیے انجام دیئے۔ دونوں معاہدوں میں معاہدہ کرنے والے افراد کو اپنے مذہبی عقائد کی بنا پر سماجی بائیکاٹ، ظلم و تشدد اور تحقیر کا نشانہ بنایا گیا اور انہیں مجبوراً ہجرت کرنی پڑی لیکن مئے فلاور معاہدہ، میثاق مدینہ کی طرح محمود و ایاز کو

ایک ہی صف میں جگہ دینے سے قاصر رہا بلکہ حیران کن اور غیر متوقع طور پر سرمایہ دارانہ نظام کے پھیلاؤ، نسلی و طبقاتی تفریق کے فروغ اور رنگ و نسل کی بنیاد پر امتیازی سلوک کے سامنے میثاق مدینہ کی طرح بند باندھنے کا متحمل نہ ہو سکا۔

مئے فلاور پیکٹ

> خدا کے نام سے (آمین) ہم جن کے نام نیچے لکھے ہیں وفاداران فرماں روا و حاکم اعلیٰ و مطلق، بادشاہ جیمز جو خدا کی مہربانی سے برطانیہ عظمیٰ، فرانس اور آئر لینڈ کا بادشاہ اور ہمارے عقیدے کا محافظ ہے، یہ عہد باندھتے ہیں کہ خدا کی عبادت کرنے کے لیے عیسائیت کے عقیدے کو فروغ دینے کے لیے اور ہمارے ملک کے بادشاہ کا اعزاز قائم رکھنے کے لیے ورجینیا کے شمالی حصوں میں پہلی کالونی کے قیام پر موجودہ لوگ بہ رضا و رغبت، خدا کی موجودگی میں ایک دوسرے کے ساتھ مشترکہ طور پر رسمی معاہدہ کرتے ہوئے بہتر تنظیم، تحفظ اور بقا کے لیے سول باڈی پالیٹک تشکیل دیتے ہیں تاکہ اعلیٰ ترین اقتدار، اخلاقیات، اوصاف و انصاف کے حصول میں سب کے لیے یکساں قانون، ادارے اور احکامات تشکیل دیے جا سکیں۔ کالونی کی بھلائی اور بہتری کے لیے ہم معاہدے کی پاسداری و اطاعت کا عہد کرتے ہیں۔ اس معاہدے کی شہادت میں ہم جن کے نام نیچے لکھے ہیں کیپ کوڈ میں نومبر کی گیارہ تاریخ کو حاکم اعلیٰ لارڈ جیمز بادشاہ برطانیہ، فرانس اور آئر لینڈ کے عہد میں اپنے دستخط ثبت کرتے ہیں۔ بمطابق سال عیسائیت 1620

امریکہ کی پہلی سول باڈی پالیٹک قائم ہوتے ہی مئے فلاور کے مسافروں نے جان کارور کو اپنا گورنر منتخب کر کے فیصلہ اور قیادت کے اختیارات اسے تفویض کر دیے۔ گورنر کارور کے فیصلے کے مطابق کسی دوسرے موزوں مقام کی تلاش میں مئے فلاور کا لنگر ایک بار پھر اٹھا لیا گیا۔ بالاخر خلیج پلے متھ کے ساحل پر مناسب اور موزوں جگہ تلاش کی گئی 11 دسمبر 1620 کو برطانوی مذہبی علیحدگی پسندوں کا یہ سفر اختتام پذیر ہوا، اور امریکہ کے

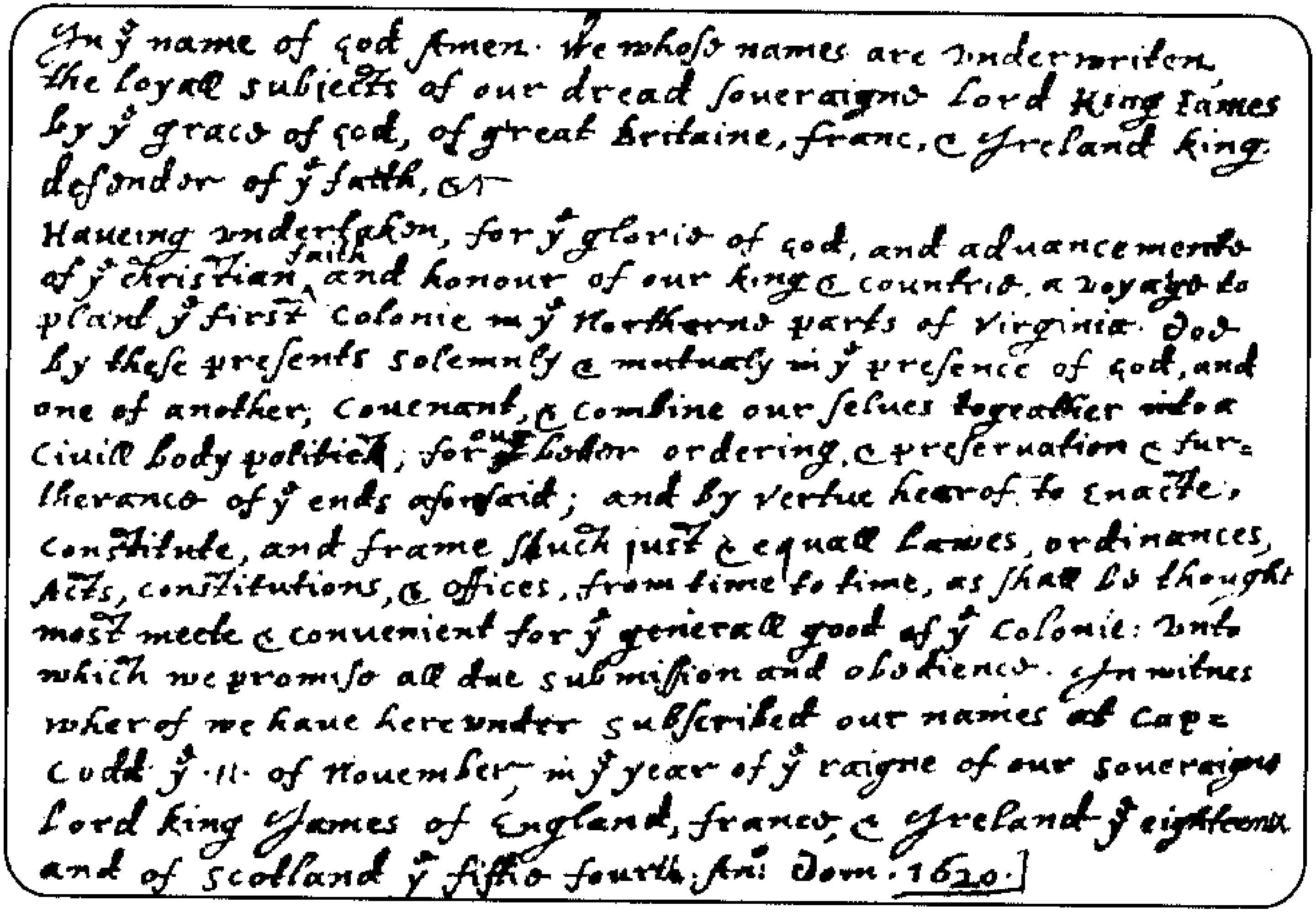

In ye name of God Amen. We whose names are vnderwriten,
the loyall subiects of our dread soueraigne Lord King James
by ye grace of God, of great Britaine, Franc, & Ireland king,
defender of ye faith, &c
Haueing vndertaken, for ye glorie of God, and aduancemente
of ye Christian faith, and honour of our king & countrie, a voyage to
plant ye first Colonie in ye Northerne parts of Virginia. Doe
by these presents solemnly & mutualy in ye presence of God, and
one of another, Couenant, & combine our selues togeather into a
Ciuill body politick; for our better ordering, & preseruation & fur-
therance of ye ends aforesaid; and by vertue hearof to enacte,
constitute, and frame shuch just & equall Lawes, ordinances,
Acts, constitutions, & offices, from time to time, as shall be thought
most meete & conuenient for ye generall good of ye Colonie: vnto
which we promise all due submission and obedience. In witnes
wherof we haue hereunder subscribed our names at Cape
Codd ye .11. of Nouember, in ye year of ye raigne of our soueraigne
Lord King James of England, France, & Ireland ye eighteenth
and of Scotland ye fiftie fourth. Ano: Dom. 1620.

معاہدہ مے فلاور کا عکس (1620)

براعظم میں باقاعدہ اور پہلی برطانوی کالونی کا قیام جیمز ٹاؤن میں عمل میں آیا۔ امریکہ میں کئی ملکوں کی کالونیاں تو قائم ہوئیں مگر آباد نہ ہوسکیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کالونیز میں کسی معاہدہ مئے فلاور کی عدم موجودگی اور آباد کاروں کا کسی واضح اور مشترکہ موقف پر متفق نہ ہونا بھی تھا۔

امریکہ میں بھانت بھانت کے لوگ، گھاٹ گھاٹ کے آباد کار، تجارتی کوٹھیاں، ذرائع نقل و حمل، لوٹ مار، قحبہ خانے، سلاٹر ہاؤس، جمہوریت، مصنوعات، اسلحہ خانے، رنڈی گھر، سستے سودے، مفادات، کاروبار، سود سماج اور حرص و ہوس تو خوب پھلی پھولی مگر ریڈ انڈینز کی ایک پوری قوم اور سیاہ فاموں کی کئی نسلیں پیدائش امریکہ کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

اس جبریہ پیدائش کے ہوتے ہی طمع، ہوس، مفادات اور سرمایہ داری کی ڈائن نے شمالی اور جنوبی امریکہ میں صدیوں سے بسنے والوں کا لہو چاٹ لیا۔ پاؤں پر کھڑی ہوئی تو اقوام عالم کے سروں پر موت فگن ہوگئی۔ میکسیکو، کیوبا، گوئٹے مالا، پانامہ، گرینیڈا، کوریا، کمبوڈیا، ویت نام، چین، جاپان، کانگو، سوڈان، صومالیہ، انڈونیشیا، لیبیا، لبنان، مشرقی تیمور، یوگوسلاویہ، لاؤس افغانستان اور عراق ...... عین عالم جوانی میں اب مسلم اُمہ اسی ڈائن کے خونی جبڑوں میں ہے۔ مسلمان اس کا سب سے بڑا اور سب سے آسان شکار ہیں۔ حکیم الامت کا یک جہتی کی افادیت کے لیے تجویز کردہ ''نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر'' تک کا سارا علاقہ یک جہت ہونے کی بجائے اس ڈائن کے پنجے میں مقید، چھینٹوں چھینٹ اور لہولہان ہو چکا ہے۔ امریکہ کی مختصر مگر تشدد آمیز اور جارحیت بھری تاریخ سے عبرت نہ لینے اور سبق نہ سیکھنے کی مسلمان حکمرانوں کی جو بھی وجوہات ہوں مگر تاریخ کی شہادت، قرائن اور آثار کہتے ہیں کہ عراق کے بعد اگلا ہدف ایران اور پاکستان ہوں گے۔ افغانستان اور عراق میں بیک وقت امریکی جارحیت کی طرح مزید اسلامی ممالک امریکی جارحیت کا نشانہ بن جائیں گے۔ خصوصاً پاکستان مستقلاً بھنور کی آنکھ میں ہے ہمارا قصور ایران اور ہر کسی سے زیادہ سمجھا جاتا ہے۔

ہماری فرد جرم کے دو حصے ہیں ایک داخلی اور دوسرا خارجی، خارجی تعزیر میں رادھا کو نچانے کے لیے نومن تیل کی موجودگی سرفہرست ہے جس ایٹم بم کو ملک بچانے

کے لیے بنایا گیا تھا اب اسی سے سبکدوشی ملک کی بقا سے مشروط ہے۔ ہمارا خاصہ ہے کہ ہم مزید برے وقت کے منتظر رہتے ہیں اور اس کی ٹوہ میں اور توڑ میں لگے رہتے ہیں لیکن لمحہ موجودہ کی سنگینی اور برے وقت سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں جیسے مشرقی پاکستان میں نوے ہزار لشکریوں کے استعمال کو موخر کر کے انہیں مزید کسی اور بدتر وقت کے لیے محفوظ کر لیا گیا تھا' یوں جیسے قوموں کے لیے ریاست کی جغرافیائی حد ٹوٹنے سے بھی زیادہ کوئی اور برا وقت ہوتا ہو۔ اگر اس سے بھی زیادہ کوئی برا وقت ہوتا ہے تو وہ آن پہنچا ہے۔ لشکری بھی ہیں' نو من تیل بھی اور' ناچنے کا موسم بھی لیکن متذبذب اور معتدل اوصاف و بدترین وقت کے منتظر خاصے کے سبب ہماری رادھا کا آمادہ رقص ہونا عبث ہے۔ یوں بھی ایمان' تقویٰ اور جہاد پہ پرچائے فوجیوں کو جہاد سے ہی دست برداری کا مرحلہ درپیش ہے سو ایسے میں فوجیوں سے بھل صفائی' واپڈا' سمگلنگ کی روک تھام اور زلزلہ زدگان کی امدادی کارروائیوں سے زیادہ کی توقع رکھنا نامناسب ہے۔ احتیاط اور مصلحت کی ایسی افراط لگی ہے کہ خواہ ملک جائے یا جان' ایمان جائے یا آبرو' اصول قربان ہو یا نظریہ مگر ہماری درمیانہ روی اور مصلحت کے حصار میں شگاف نہ پڑے۔ لگتا ہے کہ ہم پر کسی بھی طرح کی انتہا پسندی کا الزام محض الزام کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ سچ پوچھیے تو مذہب' نظریہ' اصول' ایمان اور حب الوطنی میں عدم انتہا پسندی نے ہی ہمیں خون آشام ڈائن کا لقمہ تر بنا رکھا ہے۔ جس طرح انتہا پسندی حساسیت سے پیوستہ ہے اسی طرح غیر انتہا پسندی بے حسی سے وابستہ ہے اور افراد و اقوام کی بے حسی جانچنے کے لیے کسی عالمانہ قیافے اور سائنسی فارمولے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ہے۔ عورتوں کی بھاگ دوڑ' نیم برہنگی' میرا کچھے' جنسی ہیجان اور بے حیائی کو روشن خیالی کے پردے میں پیش کرنے سے بھی ہمارا بھلا نہیں ہوگا۔ اس طرح کی روشن خیالی ہمیں امریکہ کے قریب نہیں لا سکتی لیکن یہ ہمیں اپنے آپ سے دور ضرور کر دے گی۔ اگر روشن خیالی کا مطلب انسانی' نسوانی' جمہوری اور معاشرتی حقوق کی ضمانت ہے تو ہمیں مزید روشن خیالی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری روشن خیالی کی شہادت میں پندرہ سو سال سے تاریخ کے صفحے پر یہ امر ثبت ہے کہ بنت رسول حضرت زینب رضی اللہ عنہا مسجد نبوی میں تشریف لاتی ہیں وہاں صحابہ موجود ہیں رسول ﷺ تشریف فرما ہیں اور حضرت زینبؓ اپنے غیر مسلم شوہر ابو العاص کے حق میں

اپنا حق جوار استعمال کرنے کا مطالبہ کرتی ہیں جو انہیں صرف اس وجہ سے دے دیا جاتا ہے کہ خاتون ہونے کے ناطے سے ان کے ترجیحی حق جوار (کسی کو پناہ دینے، حفاظت میں لینے) سے صرف نظر ممکن نہیں تھا۔ ہمیں خدشہ ہے کہ نسوانی و انسانی حقوق کے ضمن میں پندرہ سو سال سے اس قدر روشن خیالوں کو مزید روشن خیال بنانے کی اس یکا یک ضرورت کے پردے میں کہیں اسی طرح کی روشن خیالی کار فرما نہ ہو جس کا دلوں میں دھڑکا ہے۔ کیا عجب کہ تماش بینی، مخلوط میرا تھان، مجرے اور میل ملاقات کے لیکچے کو روشن خیالی قرار دے کر ہم غیر روشن خیالی کے مرتکب ہو رہے ہوں۔ کلمہ گو بیبیوں کی نیم برہنگی کو روشن خیالی کے پردے میں فروغ دینے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا—نہ ہی خالص برہنگی نہ ہی روشن خیالی، ہمیں خدشہ ہے کہ یوں تو یہ روشن خیال مطلق مارے جائیں گے۔

ہماری داخلی تعزیر خارجی تعزیر سے بھی زیادہ سنگین اور سنجیدہ ہے۔ دو قومی نظریے سے دست برداری نے ہمیں قوم سے ہجوم میں بدل دیا ہے اور پاکستان کی اساس کو سیکولر قرار دینے کے خبث نے راندہ درگاہ۔ غیر ملکی قرضوں، فوجی نقب زنوں، جعلی ماہرین، بے ضمیر سیاستدانوں، بے روزگاری ناخواندگی، تنگ دستی، مجروں اور اغوا برائے تاوان کے پہلو بہ پہلو پاکستان بہرحال قائم رہا ہے لیکن نظریے کے بغیر اس کا قائم رہنا سوالیہ ہے۔ جس طرح قیامِ پاکستان میں نظریاتی قوت نے کلیدی کردار ادا کیا تھا اسی طرح اس کے قائم رہنے میں نظریاتی قوت کلیدی ہے نہ کہ روشن خیالی۔

* * *

صفِ مشقِ ستم

جب تم پہلی دفعہ یہاں آئے تھے ہم (تعداد میں) بہت زیادہ تھے اور تم صرف چند ایک تھے۔ (سیاکس سردار۔ چیف ریڈ کلاوڈ 1909۔1822)

ہم جہاں بھی گئے سپاہی ہمیں قتل کرنے کے لیے آن پہنچے حالانکہ ہم اپنے ہی ملک میں تھے۔ (فلسفی اور مذہبی پیشوا۔ بلیک ایلک 1950-1863)

سفید فام کہتے ہیں کہ آزادی اور انصاف سب کے لیے۔ ہمیں یہ آزادی اور انصاف میسر تھا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اسی (آزادی اور انصاف) کی وجہ سے ہمارا خاتمہ کردیا گیا ہے۔

1۔ (ریڈ انڈینیز امریکن گرینڈ کونسل اعلامیہ: 1927)

سفید فام آباد کاروں نے جن میں برطانوی پیش پیش تھے براعظم امریکہ کی زمین پر قبضے کے لیے وہی چالیں چلیں جو وہ برصغیر میں چل چکے تھے اور اسی میں تجربہ کار تھے۔ مقامی لوگوں، نمائندوں اور قبائلی و خاندانی سربراہوں سے معاہدوں کے ذریعے زمین ہتھیانے کے مکروہ کاروبار کو انہوں نے امریکہ میں بھی کامیابی سے چلایا مگر برصغیر کی نسبت یہاں اس کے سنگین نتائج مرتب ہوئے دانشوروں، شاعروں، علما اور رہنماؤں سے محروم اور کوٹھے کی ثقافت سے بے نیاز، ریڈ انڈین عوام نہ تو خوشامدی، نمائشی، خود سپرد، فروتنی اور تماش بین نکلے نہ ہی حمیت کے قحط کا شکار۔ دربار سے بلاوے کی ریجھ میں مبتلاؤں، خواجہ سراؤں اور جانثاروں کے برعکس نہ یہاں خطاب یافتہ تھے نہ مراعات یافتہ، نہ فدویان تھے نہ خاکساران۔ ادھر سرکشیدہ خلق کی ایک ہی نوع پائی جاتی تھی اور قسمِ ثانی کو حیرت اور اچنبھے سے دیکھا جاتا تھا جبکہ برصغیر میں

دیدہ خلق بے حمیتی کے ایک ہی منظر سے دو چار رہی تھی

تمام صوفی و سالک سبھی شیوخ و امام
امید لطف پہ ایوان کجکلاہ میں ہیں
معززین عدالت حلف اٹھانے کو
مثالِ سائلِ مبرم نشستہ راہ میں ہیں (احمد فراز)

نتیجتاً سفید فاموں کا جبر، چیرہ دستی اور سنگینی سرکشیدہ ریڈ انڈینیز پر تمام ہوگئی۔ 1776 سے پہلے کے آباد کاروں کے نمائندے ریڈ انڈین قبائل سے معاہدے کر کے ان کو زمینوں سے بے دخل کرتے رہے لیکن جب 1776 میں امریکہ آئینی طور پر وجود میں آ گیا تو امریکی حکومت براہ راست اس کار بد میں ایک فریق بن گئی۔ 1778 سے 1871 تک کے درمیانی وقفے میں امریکی حکومت اور ریڈ انڈین قبائل کے درمیان 370 ایسے شرمناک معاہدے عمل میں آئے جن کا لازمی نتیجہ ریڈ انڈینیز کی زمینوں سے جبری بے دخلی، بربادی اور مکمل تباہی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ان 370 معاہدوں میں سے ایک معاہدہ بھی ایسا ثابت نہ ہوسکا جسے امریکی حکومت نے توڑا نہ ہو، یا معاہدے پر پورا عمل درآمد کیا گیا ہو البتہ ان معاہدوں کی ان تمام شقوں پر بڑی سرگرمی سے عمل درآمد ہوتا رہا جن کی زد ریڈ انڈینیز اور ان کی زمینوں پر پڑتی تھی۔

2۔(ایگریمنٹس گائیڈ، ہارورڈ یونیورسٹی:2004)

ریڈ انڈینیز کی نسل کشی تو ان ہسپانیوں کے ہاتھوں شروع ہوئی تھی جو ملکہ ازبیلا کے نمائندے اور خیر سگال بن کر آئے تھے مگر ان کی زمینوں کو ہتھیانے کا، کاربد ولندیزیوں نے شروع کیا اور ہر دو کی انتہا امریکہ کے ہاتھوں انجام پائی۔ 1621 میں ہالینڈ کی حکومت کے ایک شاہی فرمان سے ڈچ ویسٹ انڈیا کمپنی نے جنم لیا جس کے بظاہر مقاصد میں براعظم امریکہ کے ممالک سے تجارت کو بڑھانا، نو دریافت امریکہ کے شمال مشرق میں موجود ولندیزی تجارتی کوٹھیوں کو ترقی دینا اور امریکہ میں ڈچ آباد کاروں کا تحفظ مقصود تھا۔ ولندیزیوں کی یہ تجارتی کوٹھیاں اور کالونیز موجودہ ریاست نیو یارک اور اس کے قرب و جوار میں قائم تھیں۔ ڈچ ویسٹ انڈیا کمپنی نے براعظم امریکہ میں بعینہٖ وہی استعماری اور استحصالی کردار ادا کیا جو ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مشرق بعید کے جزائر انڈونیشیا، ملایا، اور سیلون (سری لنکا) میں انجام دیا تھا۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ہالینڈ کی حکومت کے شاہی فرمان سے قائم کی گئی تھی جو

1602 میں جاری کیا گیا تھا۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی اور ڈچ ویسٹ انڈیا کمپنی کی فریب کاریوں کی ام الخبائث بہر حال ایسٹ انڈیا کمپنی ہی تھی جسے برطانوی ملکہ الزبتھ نے پندرہویں صدی کے آخر میں اجارا دارانہ مراعات تفویض کرتے ہوئے ہندوستان سے تجارت کرنے کا خصوصی اختیار دیا تھا جو رفتہ رفتہ تجارت سے سازش میں اور مکر وتحریص سے غاصبانہ قبضے میں بدل گیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحصالی حربوں اور فریب کاریوں کو حسب توفیق مشرق بعید سے شمالی مریکہ تک ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی اور ڈچ ویسٹ انڈیا کمپنی نے کامیابی سے استعمال کیا۔ سترہویں صدی کی استعماریت اور عالمی معاشی استحصال میں ان کمپنیز کا گہرا ہاتھ رہا ہے خصوصاً سترہویں اور اٹھارویں صدی کی سیاست' معیشت' مسائل اور انسانی حقوق انہی کمپنیز کے محور پر گھومتے تھے۔ بعد میں قائم ہونے والی کمپنیز کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ماڈل' بنیاد' طریق کار ور' رہنمائی فراہم کی ہے یوں تو 1858 میں ایسٹ انڈیا کمپنی ختم کردی گئی تھی لیکن یہ بعید از قیاس ہرگز نہیں ہے کہ کمپنی کی بدروح آج کل کی ملٹی نیشنل کمپنیز میں حلول کر چکی ہو چونکہ یہ ملٹی نیشنل کمپنیز کام تو ایسٹ انڈیا کمپنی والا ہی کر رہی ہیں لیکن ذرا مہذب طریقے سے' خفیہ خفیہ' اندر خانے ور رکھے۔

1626 میں ڈچ ویسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر جنرل اور ڈچ کالونیز نیو ایمسٹرڈیم موجودہ نیو یارک) کے گورنر پیٹر منیوٹ نے مقامی ریڈ انڈین قبائل موہاکس اور لیپیز سے ستائیس مربع میل پر مشتمل جزیرہ مین ہیٹن (نیو یارک) خرید لینے کا قصد کیا مگر ریڈ انڈین زمین بیچنے کے تصور سے نا آشنا اور زمین کا مول لگانے کے فن سے بے بہرہ نکلے اور وہ گورنر پیٹر منیوٹ کی زمین خریدنے کی پیشکش کے مضمرات کا ادراک نہ کر سکے چونکہ ریڈ انڈینز کا تجربہ مین کو بیچنے یا اس پر مالکانہ حقوق رکھنے کی بجائے زمین پر مشترکہ ملکیت اور ضرورت کے مطابق مین کے استعمال تک محدود تھا۔ زمین پر مالکانہ حقوق سے بے نیاز ریڈ انڈینز نے اپنے تئیں مین ہیٹن کو محض ساٹھ گلڈر (چوبیس ڈالر) کے عوض عارضی طور پر استعمال کے لیے گورنر کے حوالے کردیا جسے ولندیزیوں نے مین ہیٹن کے خرید لینے پر محمول کیا یوں ایک طرف سے غلط فہمی ر نا تجربہ کاری اور دوسری طرف سے بد نیتی اور فریب کاری کے نتیجے میں صرف چوبیس ڈالر میں ہتھیا یا گیا مین ہیٹن کا ستائیس مربع میل کا جزیرہ ریڈ انڈینز کے ہاتھوں سے نکلنے والا وہ یہ قطعہ زمین ثابت ہوا جو رفتہ رفتہ 35 لاکھ مربع میل سے زیادہ زمین سے دست برداری پر منتج

ہوا۔ بعد ازاں چوبیس ڈالر میں ہتھیایا گیا یہی مین ہیٹن امریکہ کے مرکزی اور سب سے بڑے کمرشل ڈسٹرکٹ میں بدل گیا۔ محض چوبیس ڈالر میں ہتھیائے گئے اس قطعہ زمین اور اس پر اثاثوں کی مالیت کا موجودہ تخمینہ پانچ ٹریلین ڈالر سے تجاوز ہو چکا ہے۔

3۔(جیمز لووین: 1999)

مین ہیٹن کے بعد ایک اور اہم اور منافع بھرا سودا' 17 دسمبر 1682 میں برطانوی آباد کاروں کے نمائندے ولیم پین اور ریڈ انڈین قبائل ڈیلا ویر کے درمیان ہوا۔ ولیم پین جسے برطانوی بادشاہ چارلس دوئم کی حمایت اور معاہدہ کرنے کا خصوصی اختیار حاصل تھا' ریڈ انڈینیز کے ڈیلا ویر قبائل سے بارہ سو پونڈ کے عوض دو ہزار مربع میل زمین پر سفید فاموں کے لیے مالکانہ حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس معاہدے کو معاہدہ ڈیلا ویر کا نام دیا گیا۔ ڈیلا ویر قبائل جنہوں نے سفید فام تسلط کے خلاف اپنے علاقوں میں کامیاب مزاحمت کی تھی وہ اس معاہدے سے مار کھا گئے یوں شمال مشرق میں (موجودہ ریاست ڈیلا ویر) کے اہم علاقوں سے شروع ہونے والا سفید فام تسلط ایک صدی اور 35 لاکھ مربع میل پر پھیل گیا۔ اسے ولیم پین کا شاطر پن کہا جائے یا ریڈ انڈینیز کی سادہ لوحی کہ وہی ڈیلا ویر قبائل جنہوں نے اپنی زمین کی مدافعت میں سویڈش اور ولندیزیوں کو ہزیمت سے دو چار کیا تھا برطانویوں کے ہاتھوں کاغذ کے ایک پرزے سے مارے گئے۔ ولیم پین سے معاہدہ کرتے ہی وہ ان تمام زمینوں سے محروم ہو گئے جس کا دفاع انہوں نے اپنے خون سے کیا تھا۔ امریکی سرزمین پر برطانوی سیاست اور سازشی ذہنیت کا یہ بھرپور مظاہرہ تھا جس کے بعد برطانوی آباد کاروں اور بعد ازاں امریکی حکومت اور ریڈ انڈینیز کے درمیان معاہدوں کا سلسلہ دراز تر اور تیز ترین ہوتا گیا اور پوری ایک صدی پر پھیل گیا۔ ان معاہدوں کی تاریخ عبرت آمیزی' جبر اور وعدہ شکنی سے عبارت ہے۔

ریڈ انڈینیز سے زمین ہتھیانے کے یہ نام نہاد معاہدے اپنی نوعیت میں ان اسرائیلی فلسطینی معاہدوں کے مانند تھے جن کے تحت فلسطینی اپنی زمین یہودیوں کو دیتے رہے پھر یہی زمینیں 1948 میں اسرائیل کی اساس میں بدل گئیں۔ ان معاہدوں کے پس منظر میں مماثل طریق کار اور یکساں بدنیتی کارفرما ہے۔ اس شر آمیز طریق کار کے مطابق پہلے

زمین پر مالکانہ حقوق رکھنے والوں کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی جاتی ہے' پھر ان پر عرصہ حیات تنگ کیا جاتا ہے جب وہ ہراساں' لاچار' بددل اور کمزور ہوجائیں تو انہیں زمین بیچنے کا عندیہ دیا جاتا ہے۔ دباؤ' ہراس اور بے یقینی میں مبتلاؤں سے کوڑیوں کے مول زمین خرید لی جاتی ہے پھر اس پر چاہے اسرائیل قائم کرو کہ امریکہ بناؤ یا اسمعیلستان' سازش' جبر اور استعمار کا عفریت جب ایک بار اپنے پنجے گاڑ لیتا ہے تو ان پنجوں سے گردن چھڑانے کے لیے کئی نسلوں کی قربانی درکار ہوتی ہے لیکن ریڈ انڈینیز ایسے سیاہ بخت نکلے کہ ان کی مسلسل پانچ نسلوں کی قربانی بھی ان کی گردنیں نہ چھڑا سکی نتیجتاً نسل بھی مٹ گئی اور زمین بھی ہاتھ سے جاتی رہی۔

یہ حقیقت ناانصافی کی بدترین مثال کے طور پر ہمیشہ کے لیے تاریخ میں محفوظ رہے گی کہ ریڈ انڈینیز اور امریکی حکومت کے درمیان تین سو ستر معاہدوں میں سے ایک معاہدہ بھی ایسا نہ نکلا جس سے ریڈ انڈنیز کو بھی کوئی فائدہ پہنچ سکتا۔ ان تمام معاہدوں سے ہمیشہ امریکی حکومت' سفید فام آبادکار اور اثر و رسوخ رکھنے والے سیاستدان اور سرمایہ دار ہی مستفید ہوتے رہے۔ ان معاہدوں میں دو تہائی معاہدے ایسے تھے جو درحقیقت ریڈ انڈینیز کے لیے زمینوں سے دستبرداری کے احکامات تھے۔ ان معاہدوں کی نوعیت' نتائج' اثرات اور سنگینی کے سبب ان معاہدوں کو جبری احکامات قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔ یہ معاہدے مجموعی طور پر ریڈ انڈینیز کے لیے چار سو پچاس ملین ایکڑ زمین سے دستبرداری کا باعث بنے۔ ان تین سو ستر معاہدوں میں سے کم ازکم 250 معاہدوں پر آج بھی قانونی تلوار لٹکی ہوئی ہے۔ جبکہ کئی معاہدے عشروں سے امریکی عدالتوں میں زیر سماعت ہیں۔ معاہدوں کی یک طرفہ منسوخی اور معاہدوں پر صرف ایک فریق کے عمل درآمد کی بنیاد پر قائم کیئے جانے والے زیر سماعت مقدمات میں ریڈ انڈینیز کی قانونی اور اخلاقی پوزیشن کی مضبوطی کے پیش نظر قانونی ماہرین کہتے ہیں کہ ان معاہدوں پر عدم عمل درآمد کی وجہ سے یہ معاہدے کالعدم ہوچکے ہیں اور امریکی حکومت کے سر پر یقینی طور سے ریڈ انڈینیز کی زمینوں پر ان کے مالکانہ حقوق بحال ہوجانے کی تلوار لٹکی ہوئی ہے۔ ان مقدمات میں متاخر فیصلے اور مسلسل تاخیری حربے انصاف اور انسانی حقوق کے امریکی دعویٰ کی نفی کرتے ہیں۔ کیا عجب کہ اندرخانے لٹکتی تلوار بھی تاخیر کا باعث بنی ہوئی ہو۔

یہاں مناسب ہوگا کہ ان معاہدوں کی ایک نمائندہ مثال کے ذریعے ریڈ انڈینیز پر ٹوٹنے والے ظلم کے مقابلے میں امریکی حکومت کی بدعہدی، بربریت، ہوس اور انسانی حقوق کی پائمالی کا تجزیہ اور ادراک کیا جاسکے اس ایک ہی مثال سے امریکی حکومتوں کا معاہدوں کی ناموس نبھانے، احترام کرنے یا معاہدوں کو توڑنے اور وعدے کی بے حرمتی کا رویہ عین عریاں اور الف آشکارا ہو جاتا ہے۔ ان معاہدوں کی مثال کے طور پر اگر اس ''معاہدہ ہوپ ویل 1785'' کو دیکھا جائے جو ریاست ورجینیا میں مقیم چیروکی قبائل اور امریکی حکومتوں کے درمیان ترمیم و اضافے کے ساتھ مزید پندرہ معاہدوں کی بنیاد بنا تو ان معاہدوں کی نوعیت، سنگینی اور اثرات کو انسانی تاریخ میں ایک مزید سیاہ باب کا اضافہ تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ان معاہدوں کے مابعد اثرات میں کسی فلاح، بھلائی، خیر، رحم، انسانی حقوق اور انسانیت کی رمق ڈھونڈ نکالنا ناممکن العمل ہے۔ ریاست ورجینیا اور اس کے اطراف میں لگ بھگ بیس ہزار، ریڈ انڈین افراد چیروکی قوم سے متعلق اور صدیوں سے اس علاقے کے رہائشی تھے۔ بنیادی طور پر چیروکی قبائل کئی شاخوں اور خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے مگر انتظامی کونسل میں تمام خاندانوں کی مساوی نمائندگی اور اشتراک سے انتظامی اور سیاسی امور انجام دیئے جاتے تھے جس سے یہ اخذ کرلینا زیادہ دشوار نہیں ہے کہ چیروکیز اپنے تقاضوں، زمینی حقائق اور مخصوص طرز معاشرت کے مطابق کسی نہ کسی طرح کے جمہوری ضابطوں اور عمرانیات کے اصولوں پر عمل پیرا تھے جس سے ان کی خودمختارانہ آئینی حیثیت اور مقتدر اعلیٰ قوم کا تاثر ابھرتا ہے، سو چیروکی قوم سے معاہدہ دو مقتدر اعلیٰ اقوام کے درمیان ایسے معاہدے کی حیثیت رکھتا تھا جس پر عمل درآمد کے بین الاقوامی تحفظات نافذ تھے لیکن عملاً جو کچھ ہوا وہ اس سے بالکل مختلف نکلا کہ جو ہونا چاہیے تھا۔

1785 میں ہوپ ویل کے مقام پر امریکی حکومت کے نمائندے پولیٹیکل انڈین ایجنٹ، سینیٹر بنجمن ہاکنز اور چیروکی قبائل کی کونسل کے درمیان درج ذیل شرائط پر، معاہدہ ہوپ ویل پر فریقین کے دستخط ہوئے:

- چیروکی قبائل امریکی حکومت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کریں گے۔
- چیروکی قبائل امریکی حکومت کی پناہ میں آجائیں گے اور امریکی تحفظ کو تسلیم کریں گے۔

- چیرو کی قبائل ان تمام زمینوں کے مالکانہ حقوق سے بہ رضا و رغبت دستبردار ہوجائیں گے جن پر سفید فام قابض ہیں یا ان کے تصرف میں آچکی ہیں۔
- امریکی حکومت چیرو کی قبائل کے زیر استعمال زمینوں پر نئی حد بندی کرے گی۔
- امریکی حکومت اس نئی حد بندی کا سختی سے احترام کرے گی اور عدم مداخلت کی پابند ہوگی۔
- کوئی امریکی شہری چیرو کی قبائل کی زمینوں پر آبادکاری یا قبضے کا مجاز نہیں ہوگا۔
- امریکی حکومت تجارتی ضابطے بنانے اور تجارتی سرگرمیوں کو مانیٹر کرنے کی مجاز ہوگی۔
- چیرو کی قبائل کو اپنی نمائندگی کے لیے کانگریس میں اپنا نمائندہ بھیجنے کا حق دیا جائے گا۔
- فریقین ایک دوسرے کے قیدیوں کو واپس کریں گے۔
- چیرو کی قبائل مجرموں اور مفروروں کو پکڑنے میں امریکی حکومت کی مدد کریں گے اور انہیں پکڑ کر امریکی حکومت کے حوالے کرتے رہیں گے (مفروروں سے مراد سیاہ فام ہیں جو' ان دنوں ایک منظم تحریک کے زیر اثر اپنے سفید فام آقاؤں سے مفرور ہوجاتے تھے)
- ریڈ انڈینز کے خلاف جرائم میں ملوث امریکی شہریوں کو قانون کے مطابق سزا دی جاسکے گی۔
- فریقین انتقامی کارروائیوں سے باز رہیں گے۔
- فریقین مستقل بنیادوں پر دوستی اور امن کو فروغ دیں گے۔

4۔ (کے۔ ایل سمتھ : 1975)

اصول اور انسانیت کے مقام سے دیکھا جائے تو اس معاہدے میں چیرو کی قبائل کے لیے حق خود اداریت' زمین' آزادی' بنیادی حقوق اور قومی اقتدار اعلیٰ سے دستبرداری کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اول تو اس معاہدے میں ان کے لیے کچھ تھا ہی نہیں دوئم یہ کہ اس معاہدے کی صرف ان دفعات پر ہی عمل ہوسکا جن کا تعلق چیرو کیز کی ہزیمت سے تھا۔ اگر اس معاہدے کے

شق ورشق انجام کو دیکھا جائے تو امریکی حکومت کی بدعہدی اور اگر اثرات کو پرکھا جائے تو اس معاہدے کے خونی اور سنگین نتائج واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ معاہدے کی شرائط کے مطابق چیروکی قبائل نے امریکی حکومت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا اور اپنی لاکھوں ایکڑ آبائی زمینوں سے جن پر سفید فام قابض ہو چکے تھے خاموشی اور دکھ سے دستبردار ہو گئے جبکہ شرائط کے مطابق چیروکی قبائل کے لیے مخصوص کردہ زمینوں کی نہ حد مقرر کی گئی نہ حد بندی کے احترام کی نوبت آئی جبکہ وفاقی اور، ریاستی حکومتوں کی مسلسل مداخلت نے چیروکیز کی زندگی اجیرن، زمین تنگ اور جینا مشکل کر کے رکھ دیا۔ معاہدے کے مطابق چیروکیز کو نہ تو کانگریس میں اپنا نمائندہ بھیجنے کا موقع دیا گیا نہ کسی شنوائی کا۔ معاہدے کے برعکس امریکی شہری، دھونس، دھاندلی، فریب اور سازش سے چیروکی قبائل کی زمینوں پر قابض ہوتے رہے لیکن حکام معاہدے اور قانون کی اس خلاف ورزی پر آنکھیں بند کیے رہے۔ تجارتی سرگرمیوں کے ضابطے اور قوانین وفاقی حکومت نے اپنے اختیارات میں لے لیئے اور محصولات پر ریاست کی گرفت ہو گئی۔ ان اقدامات نے چیروکیز کو بے دست و پا کر کے رکھ دیا۔

امریکی حکومتیں حسب ضرورت معاہدوں میں یک طرفہ ترمیم، تنسیخ اور عدم عمل در آمد پر کار بند رہی ہیں۔ معاہدہ ہوپ ویل صرف ایک مثال ہے کم و بیش تمام 370 معاہدوں کا انجام یکساں ہوا۔ امریکی حکومتوں کے دوسو سالہ معاہدوں کی تاریخ بدعہدی اور وعدوں کی ناموس نبھانے کی بجائے اسے توڑنے سے عبارت ہے۔ سو معاہدوں کا احترام کرنے یا وعدہ نبھانے کے بارے میں امریکی کردار پر کسی کو غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے۔ انسانی حقوق کے قحط اور پامالی کے موجودہ امریکی محاصرے میں گھرے ہونے کے باوجود کہیں نہ کہیں سے آواز بلند ہوتی رہتی ہے۔ انہی آوازوں میں ایک آواز ان قانونی ماہرین کی بھی ہے جو یہ یاد، دلاتے رہتے ہیں کہ معاہدوں پر یک طرفہ عمل در آمد نے امریکی حکومتوں اور، ریڈ انڈینز کے درمیان معاہدوں پر خط تنسیخ کھینچ دیا ہے اور یہ کالعدم ہو چکے ہیں۔

معاہدہ ہوپ ویل چیروکی قبائل کی ہزیمت و ابتلا کی انتہا نہیں بلکہ نقطہ آغاز تھا۔ اس معاہدے کے بعد امریکی حکومتوں اور چیروکی قبائل کے درمیان ایک کے بعد دوسرا معاہدہ عمل میں آتا رہا لیکن نہ سفید فام مفادات ختم ہوتے تھے نہ چیروکیز کی ضبط و برداشت حتیٰ کہ 1830 میں امریکی کانگریس نے ایک ایسا سیاہ مسودہ قانون منظور کر لیا کہ جس کی رو سے چیروکی

قبائل اور دوسرے تمام ریڈ انڈین قبائل کو ان کے علاقوں سے بے دخل کر کے دریائے مسی سپی کے مغرب میں موجودہ ریاست اوکلوہاما میں مخصوص کردہ انڈین علاقے میں محدود کر دینے کا حکم موجود تھا۔ یہ بدنام زمانہ کالا قانون ''ریڈ انڈین نقل مکانی ایکٹ 1830'' کے نام سے مشہور ہوا' اور امریکی انصاف' انسانی حقوق' شہری آزادیوں اور امریکی حکومت کے جمہوری چہرے پر ہمیشہ کے لیے کالک مل گیا۔ 1830 کے اس ایکٹ کو امریکی کانگریس میں پاس کیئے جانے والے سیاہ ترین قانون کی حیثیت حاصل ہے چونکہ اس قانون کے محرکات سے لے کر نفاذ تک' بد دیانتی' جبر' فریب' ہوس اور ظلم اس قدر واضح طریقے سے کارفرما ہے کہ پونے دو صدیوں کی مسلسل تاویلوں اور لاکھ حیلوں کے باوجود کنواں پاک نہیں کیا جاسکا اور نہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں کتا پڑا ہوا ہے۔ 5۔ (ریڈ انڈین نقل مکانی ایکٹ: حکومت امریکہ 1830)

26 مئی 1830 کو اکیسویں امریکی کانگریس میں ریڈ انڈینز کی نقل مکانی کے بارے میں اس بل کے پاس ہو جانے سے مشرقی امریکہ میں آباد ریڈ انڈینز عموماً اور' ریاست جارجیا اور اس کے نواح میں صدیوں سے مقیم چیروکی قبائل خصوصاً جبری نقل مکانی کی زد میں آ گئے۔ اس ایکٹ کے تحت اس وقت کے امریکی صدر' اینڈریو جیکسن کو امریکی کانگریس نے یہ صوابدیدی اختیار تفویض کر دیا کہ اگر صدر امریکہ چاہیں تو وہ دریائے مسی سپی کے مشرقی اطراف میں آباد ریڈ انڈین قبائل کو دریا کے اس پار مغرب میں منتقل کر سکتے ہیں۔ صدر اینڈریو جیکسن سفید فام مفادات کے تحفظ کی مخصوص ذہنیت' اشتعال انگیزی اور ریڈ انڈینز کے خلاف جارحانہ روّیے میں ہمیشہ سے مشہور تھے۔ گو کہ اس ایکٹ میں ریڈ انڈینز کے نقل مکانی ان کی رضا و رغبت سے منسلک تھی لیکن ان کے انکار پر امریکی حکومت زبردستی اور تشدد پر اتر آئی اور انسانی تاریخ کے المناک سانحے پر منتج ہوئی۔ یہ سانحہ امریکی تاریخ میں ''آنسوؤں کی شاہراہ'' سے منسوب ہوا۔

1814ء میں اینڈ ریوجیکسن امریکن آرمی کے جنرل کی حیثیت سے ریاست جارجیا کے کریک قبائل کی بغاوت انتہائی بے رحمی سے کچل چکے تھے۔ کیا عجب کہ پاکستان آرمی کے جنرل ٹکا خان نے مشرقی پاکستان میں بغاوت کو کچلنے کے لیے جنرل اینڈریوجیکسن والے غیر انسانی فارمولے پر ہی عمل روا رکھا ہو چونکہ جنرل ٹکا خان بھی بیس تیس ہزار کو ''گھیں'' کر دینے پر آزردہ ہوئے نہ اس کے اظہار پر شرمندہ۔ جنرل ٹکا خان مشرقی پاکستان میں اپنی ذمہ داریوں

کے ضمن میں لب کشا ہوتے ہوئے بائیں آنکھ دباتے، راز دارانہ ماحول پیدا کرتے، منہ سے کڑچ کرتے اور ہاتھ سے بیس تیس ہزار کو ''گھیں'' کر دیتے لیکن یوں سر عام ''گھیں'' کرتے رہنے کے باوجود جنرل ٹکا خان بغاوت کو فرو کرنے میں ناکام رہے جبکہ جنرل اینڈ ریو جیکسن نے کریک قبائل کی کمر توڑ دینے اور بغاوت سمیت باغیوں کو بھی ''گھیں'' کر دینے میں بہت شہرت پائی۔ کریک قبائل کی شکست کے نتیجے میں جارجیا، الباما اور کیرولائنا کی ریاستوں میں بائیس لاکھ ایکڑ زمین ریڈ انڈینیز کے قبضے سے نکل گئی۔ اس وسیع قطعہ زمین پر قبضے نے جنرل اینڈ ریو جیکسن کو ریڈ انڈینیز کی زمینوں پر قبضے کے دائمی شر اور ہوس کے خلجان میں مبتلا کر دیا اور وہ اپنی موت تک اس کار بد پر کمر بستہ رہے۔

ریڈ انڈین نقل مکانی 1830 کے ایکٹ پر صدر اینڈ ریو جیکسن کے دستخط ثبت ہونے کے علاوہ 1814 سے 1824 کے درمیانی عرصے میں ریڈ انڈین قبائل سے کیئے گئے کئی پر فریب معاہدے بھی اینڈ ریو جیکسن کی ایما اور کاوشوں سے ظہور پذیر ہوئے یوں 1837 تک اینڈریو جیکسن، ممبر کانگریس، سینیٹر، جنرل اور صدر امریکہ کی حیثیت سے ریڈ انڈ ینیز کی 47لاکھ ایکڑ زمین اور کئی محضر ناموں پر مہر لگا چکے تھے۔ اینڈریو جیکسن ریڈ انڈینیز کے لیے عموماً اور چیرو کیز کے لیے خصوصاً فریب، غصب، خون آشامی، در بدری، نسل کشی اور موت کا حوالہ بن گئے حالانکہ یہی اینڈ ریو جیکسن تحریری طور پر ریڈ انڈین اقوام سے یہ وعدہ کر چکے تھے کہ:

> ''تمہارے سفید فام برادران تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے، نہ ہی
> تمہاری زمینوں پر کسی ملکیت کا دعویٰ کریں گے۔ تم اور تمہارے بچے اس
> وعدے پر اس وقت تک یقین رکھ سکتے ہو جب تک گھاس اگتی رہے یا
> پانی امن اور افراط سے بہتا رہے۔'' 6۔ (اینڈریو جیکسن: 1826)

لیکن جب اپنے قول کو نبھانے کا وقت آیا تو صدر اینڈریو جیکسن کے اندر کا خونخوار اور مطلب برار سفید فام عریاں ہو گیا اور وہ اپنے کیئے ہوئے وعدے کے برعکس ریڈ انڈین زمینوں پر قبضے کے سب سے بڑے چیمپیئن اور ان کی نسل کشی میں حصہ دار بن گئے۔ ان کے زیر اہتمام بہتا پانی ریڈ انڈین لہو سے سرخ ہو گیا اور وہ مسکراتے رہے۔ اس چیمپیئن شپ اور حصہ داری میں وہ تنہا نہیں تھے اور نہ ہی اینڈریو جیکسن نے غارت گری، موت اور غیر انسانی کھیل کی ابتدا کی تھی بلکہ ان کے سامنے بابائے امریکی قوم جارج واشنگٹن کا رول ماڈل موجود تھا۔ جارج واشنگٹن

امریکہ کے پہلے صدر کی حیثیت سے ریڈ انڈینز رہنماؤں کو ایک ضمانتی تحریر کے ذریعے یقین دھانی کرا چکے تھے کہ:

> ”تمہاری بچی کھچی زمینوں کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ کوئی ریاست یا فرد تمہاری زمین نہیں خرید سکے گا جب تک کہ امریکی حکومت کے زیر نگرانی ایسا معاہدہ طے نہ ہو جائے۔ امریکی حکومت ریڈ انڈینز سے فریب دہی کے کسی معاہدے میں فریق نہیں بنے گی۔“ 7۔ (جارج واشنگٹن: 1790)

بابائے قوم جارج واشنگٹن کے بعد امریکی تاریخ میں سب سے اہم نام تھامس جیفرسن کا ہے۔ تھامس جیفرسن سیاسی دانشور جارج واشنگٹن کے دست راست' امریکہ میں انسانی حقوق و جمہوریت کی سب سے موثر آواز' اعلان آزادی امریکہ کی دستاویز کے خالق اور صدر امریکہ رہے۔ ریڈ انڈینز کے حقوق کے تحفظ کی یقین دھانی میں وہ بھی نہ تو کسی سے پیچھے رہے نہ اس یقین دھانی کی دھجیاں اڑانے میں کسی سے کمتر۔ آرکنساس ہسٹری کمیشن کے محقق چارلس رسل لوگن نے اپنے تحقیقی مقالے میں تھامس جیفرسن کی اس یقین دھانی کو قلمبند کیا ہے:

> ”اس بات کو یقینی سمجھنا چاہیے کہ ریڈ انڈینز سے ایک فٹ زمین بھی ان کی رضا مندی کے بغیر نہیں لی جائے گی۔ ان کے حقوق کی تقدیس کو امریکہ اور یورپ میں ہر سوچنے سمجھنے والا محسوس کرتا ہے۔“ تھامس جیفرسن
>
> 8۔ (چارلس لوگن: 1995)

ابھی بابائے امریکہ کے تحریری وعدے کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ریاست نیویارک کے حکام وسطی نیویارک میں آباد انوڈگا قبائل سے ان کی سو مربع میل زمین ہتھیانے کے مذاکرات کر رہے تھے جو بالآخر کوڑیوں کے مول خرید لی گئی۔ آج کل اسی زمین پر سارا کیوز کا شہر اور اس کی مضافاتی بستیاں آباد ہیں۔ صدر جارج واشنگٹن کی اس واضح یقین دھانی کے باوجود کہ کوئی ریاست یا فرد وفاقی حکومت کی رضا مندی کے بغیر ریڈ انڈینز کی زمین نہیں خرید سکے گا' وفاقی حکومت کی عین آنکھوں کے سامنے نیویارک کے ریاستی حکام ریڈ انڈینز کی مزید سو مربع میل زمین پر قابض ہو چکے تھے لیکن صدر جارج واشنگٹن سمیت امریکی حکومت اس کھلی وعدہ خلافی پر صرف لب بستہ ہی نہیں بلکہ چشم بستہ بھی رہی۔ سارا کیوز کے اس پر فریب سودے پر قریب دو سو پندرہ سال سے ایک ایسی قانونی تلوار لٹکی ہوئی ہے کہ جس کی کاٹ وائٹ ہاؤس

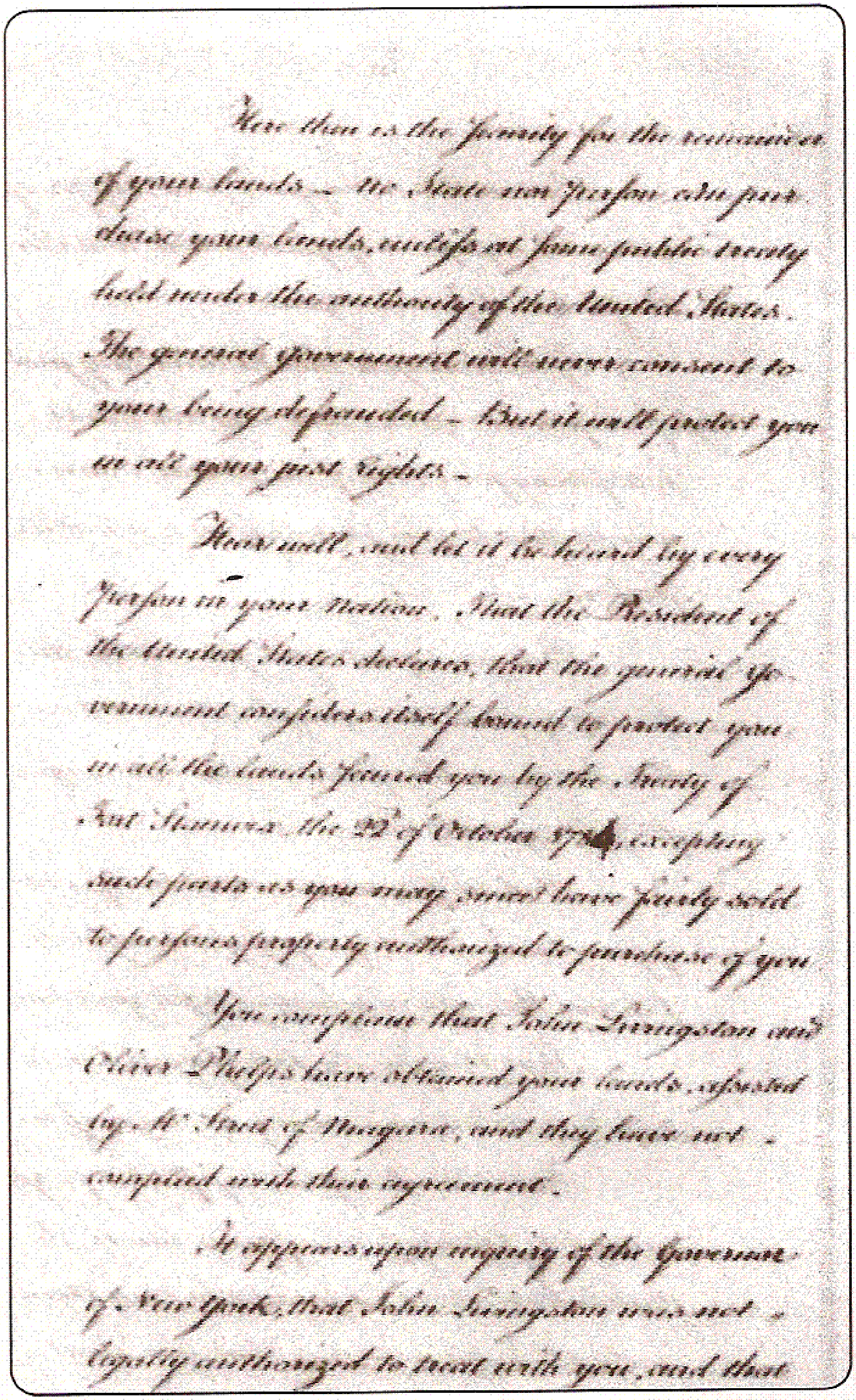

Here then is the security for the remainder of your lands. No State nor person can purchase your lands, unless at some public treaty held under the authority of the United States. The general government will never consent to your being defrauded. But it will protect you in all your just rights.

Hear well, and let it be heard by every person in your Nation, That the President of the United States declares, that the general government considers itself bound to protect you in all the lands secured you by the Treaty of Fort Stanwix the 22d of October 17[illegible], excepting such parts as you may since have fairly sold to persons properly authorized to purchase of you.

You complain that John Livingston and Oliver Phelps have obtained your lands, assisted by Mr Street of Niagara, and they have not complied with their agreement.

It appears upon enquiry of the Governor of New York, that John Livingston was not legally authorized to treat with you, and that

’ریڈ انڈینز کی زمینوں کو تحفظ دیا جاتا ہے‘

جارج واشنگٹن کی تحریر کا عکس (1790ء)

سے مارا کیوز تک دشت امکاں پر پھیلی ہوئی سیاہی کو کاٹتی چلی جاتی ہے۔ نیو یارک کی وفاقی عدالت میں انوڈ گا قبائل کے موجودہ چیف لیون شین کا دائر کردہ مقدمہ کئی طرح سے دلچسپی اور تجسس کا باعث بنا ہوا ہے۔ لیون شین کے وکلاء نے مقدمے کی بنیاد 1790 کے اس ٹریڈ ایکٹ پر استوار کی ہے جس کے مطابق امریکی ریاستیں ریڈ انڈینز کی زمینوں کی خرید و فروخت نہیں کر سکتی تھیں اور صدر امریکہ' کانگریس اور وفاقی حکومت کے اس بارے میں واضح احکامات موجود تھے۔ قانونی ماہرین کی اکثریتی رائے کے مطابق دو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی 1790 کا یہ ٹریڈ ایکٹ موثر ہے۔ مہ و سال نے اس ایکٹ اور اس سے متعلقہ قوانین کو غیر مؤثر نہیں کیا ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ اس طرح کے مقدموں کا ایک ہی فیصلہ ایسی قانونی نظیر مہیا کر سکتا ہے جس سے بہت سارے مبنی بر فریب معاہدوں اور سودوں کو کالعدم اور غیر مؤثر قرار دیا جاسکتا ہے یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ انصاف کا بول بالا ہونے پر لاکھوں مربع میل غصب زدہ زمین پر اس کے اصل مالکوں کے ملکیت بحال ہو جائے۔ 9۔ (سین کرسٹ: 1991)

امریکہ کے بابائے قوم جارج واشنگٹن ریڈ انڈینز کے بارے میں بظاہر تو خیر سگالی' ہمدردی اور بقائے باہمی کا تاثر دیتے لیکن حقیقتاً وہ اس سے بالکل متضاد اور انتہا پسند رویہ رکھتے تھے جو' ان جیسے منصب دار' عہدہ اور اعزاز کے حامل فرد کو کسی صورت زیب نہیں دیتا۔ مشہور محقق رچرڈ ڈرنن اپنی کتاب میں جارج واشنگٹن کے ایک خط کے اقتباس سے لکھتے ہیں:

> "ہماری آبادکاری کا تسلسل یقینی طور پر جانوروں (ایڈ انڈینز) کو اسی طرح ختم کر دے گا جس طرح بھیڑیوں کو بالآخر موت آگھیرتی ہے۔ شکل صورت میں مختلف ہونے کے باوجود' دونوں کا انجام یکساں ہے۔"
>
> جارج واشنگٹن۔ 10۔ (رچرڈ ڈرنن: 1990)

رچرڈ ڈرنن کے علاوہ بھی مورخوں اور محققوں نے جارج واشنگٹن کے ریڈ انڈین مخالف نظریات پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈیوڈ سٹیزڈ' جارج واشنگٹن کے ایک اور حوالے سے لکھتے ہیں:

> "انڈینز بھیڑیے اور خونخوار تھے جو سفید فاموں سے کسی مراعات کے حقدار نہیں تھے بجز مکمل طور پر تباہ کر دیے جانے کے"۔ جارج واشنگٹن۔

11۔ (ڈیوڈ سٹیزڈ: 1992)

> "1778 میں اراکس قبائل پر غلبے کے بعد جنرل جارج واشنگٹن ریڈ

> انڈینیز کے مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کے لیے انہیں مکمل طور پر نابود کر دینے کا عہد کر چکے تھے۔ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے انہوں نے جنرل جان سلے وِن کو احکامات جاری کرتے ہوئے لکھا کہ ”ریڈ انڈین قبائل پر محض غلبے کی بجائے انہیں مکمل طور پر نابود کر دیا جائے۔“ احکامات کی تکمیل میں جنرل سلے وِن نے پلک جھپکتے میں ریڈ انڈینیز کی چالیس بستیاں ویران کردیں‘ پانچ سو گھر نذر آتش کر دیئے۔ کچھ فوجیوں نے قبریں کھود کر وہاں سے لاشوں کے ساتھ دفنائی جانے والی اشیاء لوٹ لیں جبکہ کچھ اور فوجی قتل ہو جانے والے ریڈ انڈینیز کے مردہ اجسام سے کھال اتارنے میں مصروف ہوگئے تاکہ ان سے ٹانگوں پر پہننے والی پٹیاں بنا سکیں۔“ 12۔(ڈورس سیل : 1998)

1790 میں صدر جارج واشنگٹن ایک طرف ریڈ انڈین سرداروں کو خیر سگالی کے خطوط لکھ رہے تھے اور تحفظ دینے کا وعدہ کر رہے تھے لیکن دوسری طرف وہ انہیں حقارت اور دشمنی کی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ 1790ء میں ہی خیر سگالی کے پہلو بہ پہلو صدر جارج واشنگٹن ریڈ انڈینیز کی مذمت میں لب کشا ہوئے:

> ”ریڈ انڈینیز میں انسانی صورت کے علاوہ کچھ اور انسانی نہیں ہے۔“
> جارج واشنگٹن۔ 13۔(فرانس جیننگو : 1990)

یہ امریکہ کے بابائے قوم کا حال تھا جس طرح کے بابائے قوم تھے اسی طرح کی قوم بھی وجود میں آ گئی۔ دو رخی‘ دوہرا معیار‘ مفادات کے تابع متضاد اعمال‘ دہشت گردی اور زبردستی پر مبنی قیادت کی جو صفات اور رول ماڈل جارج واشنگٹن چھوڑ گئے تھے‘ امریکی حکومتوں نے اسے اصول کے طور پر اپنایا‘ نظریئے کے طور پر اس کا تحفظ کیا اور معیار کے طور پر اسے فروغ دیا‘ سو اس بات پر کسی کو اچنبھا نہیں ہونا چاہیے کہ ازبکستان کے اسلام کریموف امریکی آنکھ کا تارا اور صدام حسین راندہ درگاہ کیوں ہیں۔ عراق میں جمہوریت اور آزادی کی ضرورت کیوں ہے اور کویت و قطر میں کیوں نہیں۔ اب امریکی حکومتیں جمہوریت اور انسانی حقوق کے اسی ماڈل کا ساری دنیا میں اطلاق کرنے پر کمر بستہ ہیں۔ نیو ورلڈ آرڈر کا نظریہ ہو یا حفظ ما تقدم کی آڑ میں پہلے حملہ‘ خلق خدا کی آنکھ ان خرافات کو کن انکھیوں اور تمسخر سے اور عالمی ضمیر حقارت اور تضحیک

سے دیکھتا ہے۔

پاکستان میں اکثر لکھاری اور بیشتر ادیب قائد اعظم محمد علی جناح کا موازنہ جارج واشنگٹن سے کرتے ہیں۔ اپنے واجبی علم کی جھونک میں ایسے موازنے سے حصول اور یافت کا حساب تو وہ خود ہی جانیں لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ قائد اعظم محمد علی جناح کی توہین کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ محمد علی جناح آنے والے زمانوں میں بابائے قوم ہونے والوں کے لیے کڑا معیار اور کڑی کسوٹی چھوڑ گئے ہیں۔ دیانت، قوت فیصلہ، راست بازی، کردار، ظاہر و باطن میں یکسانیت اور اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے مقابلے میں دو رخی، آئی چلائی، دوہرا معیار اور مفادات کی سیاست کے حامل افراد کو بابائے قوم کے منصب پر سرفراز کر دینا اب اس قدر سہل نہیں رہا۔ ہمارے خیال میں آنے والے زمانوں میں اس مسند پر بٹھائے جانے والوں کو شاہراہ قائد اعظم کی پرخار مسافت اور محمد علی جناح فارمولے کی کڑی کسوٹی پر پرکھا جایا کرے گا۔

بابائے امریکی قوم جارج واشنگٹن کا ریڈ انڈینیز سے دورخا معاملہ اور معاندانہ رویہ کوئی پوشیدہ بات نہیں تھی۔ بابائے قوم کی ریجھ اور پیروی میں ان کے بعد آنے والے دوسرے امریکی صدور نے بھی ریڈ اینڈینیز کے خون ناحق سے دامن بچائے رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ جارج واشنگٹن کی پالیسیز اور، رہنما اصولوں کو ہی مدنظر رکھا گیا۔ یوں جارج واشنگٹن ریڈ انڈینیز کے قتل عام اور ان کی زمینوں پر سفید فام غاصبانہ قبضے کے لیے نظیر، اصول اور حوالے کے طور پر امریکہ کے بہت کام آئے۔ جارج واشنگٹن کے بعد امریکی تاریخ کے آزادی، برابری اور انسانی حقوق کے سب سے بڑے دعویٰ دار امریکہ کے تیسرے صدر تھامس جیفرسن بھی ریڈ انڈینیز کے حق میں دو، دھاری تلوار ہی ثابت ہوئے حالانکہ ان کی آئینی دانشوری اور انسانی حقوق و آزادی کی راہ میں ان کی علمی و قلمی کاوشوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اغلباً ریڈ انڈینیز قہر، ظلم اور سیاہ بختی کی ایسی شب سیاہ کی زد میں تھے کہ جس کی کوئی سحر تھی ہی نہیں۔ جارج واشنگٹن کے بعد تھامس جیفرسن امریکی تاریخ کے ایسے فرد، واحد تھے جو ریڈ انڈینیز پر آئی موت اور بربادی کے بار کو ٹال سکتے تھے چونکہ اعلان آزادی، امریکی آئین، ریاست ورجینیا کا آئین، جمہوری رہنما اصول جو بعد میں وفاقی آئین کا حصہ بنے اور ابتدائی مگر بنیادی آئین و قانون سازی میں تھامس جیفرسن کا حصہ سب سے بڑھ کر تھا اور وہ اپنی متاثر کن حیثیت کو ریڈ انڈینیز کے حق میں استعمال کر سکتے تھے، ان سے توقع بھی یہی تھی چونکہ امریکی اعلان آزادی میں انسانی

حقوق کے خوش رنگ الفاظ اور متاثر کرنے والے خیالات کے خالق سے یہی توقع کی جاسکتی تھی لیکن جب ان توقعات پر پورا اترنے کا وقت آیا تو تھامس جیفرسن اپنے ترقی پسندانہ جمہوری خیالات کے برعکس اپنے پیش رو سے بھی دو ہاتھ آگے ہی ثابت ہوئے اور ریڈ اینڈ ینیز پر مسلط موت اور بربادی کا بار نہ ٹل سکا۔ مشہور مورخ اور' ریڈ انڈ ینیز کے معاملات کے ماہر ایڈورڈ ریگن اپنے تحقیقی مقالے میں رقم طراز ہیں:

> ''ریاست ورجینیا کے جارج واشنگٹن اور تھامس جیفرسن نے اپنے عہد صدارت میں ریڈ اینڈ ینیز کو ختم کرنے اور ان کی زمینوں پر قبضے کی پالیسی کی حمایت جاری رکھی۔ اس پالیسی کی بنیادیں ریاست ورجینیا کے سترہویں صدی کے قوانین سے اٹھائی گئیں۔''

14۔ (ایڈورڈ ریگن ۔نومبر 2000)

ٹائم میگزین کے سابق نائب صدر اور ریڈ انڈ ین تاریخ کے مشہور مورّخ لان ڈن جونز اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''تھامس جیفرسن کی سلطنت آزادی میں ریڈ انڈ ینیز کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔''

15۔(لان ڈن جونز: 2000)

لا ڈن جونز مزید لکھتے ہیں کہ تھامس جیفرسن تسلسل سے ایسے خیالات کا اظہار کرتے رہتے تھے جنہیں آج ہم نسل کشی کہتے ہیں۔ ریڈ انڈ ینیز کے مستقبل کے بارے میں تھامس جیفرسن کا کہنا ہے کہ:

> ''یہ فیصلہ عوام پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ ریڈ انڈ ینیز کو سرے سے نابود کردینا چاہتے ہیں یا وہ انہیں نقل مکانی کی اجازت دیتے ہیں۔''

16۔ (جوناتھن کرش: 2004)

ڈاکٹر ڈیوڈ رائنڈر ایک تحقیقی مقالے (Indians and Animals) میں تھامس جیفرسن کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ آزادی اور جمہوریت کے امریکی مبلغ (تھامس جیفرسن) ریڈانڈ ینیز کے بارے میں اس طرز استدلال کے حامی تھے کہ:

> ''انڈ ینیز کو ہمیشہ کے لیے نابود کردینے یا انہیں ہماری پہنچ سے بہت دور تک دھکیل دینے کی ترغیب دینا حکومت امریکہ کی ذمہ داری ہے۔''

تھامس جیفرسن۔ صدر امریکہ 17۔ (ڈیوڈ رائڈر: 2000)

اینڈریو جیکسن، تھامس جیفرسن کے بعد سب سے اہم صدر تھے اور انہیں اپنے عہد صدارت میں بہت اہم فیصلے کرنے پڑے۔ امریکی تاریخ میں ان کی حیثیت مسلمہ ہے اسی اہمیت اور ہر دلعزیزی کے سبب امریکی بیس ڈالر کے نوٹ کو ان کی تصویر سے آراستہ کیا گیا ہے لیکن ریڈ انڈینز کی تاریخ صدر اینڈریو جیکسن کے انتہا پسند اقدامات، دہشت گرد رویہ اور غیر انسانی سلوک سے لہولہان، چھینٹوں چھینٹ اور خونچکاں ہے۔ ریڈ انڈینز کی بربادی، ہزیمت اور نسل کشی میں اینڈریو جیکسن کے کردار کو کلیدی سمجھا جاتا ہے اور، ریڈ انڈینز سے ان کا ''حسن سلوک'' تاریخ کے صفحوں اور، ریڈ انڈینز کے دلوں میں، ہر دو جگہ محفوظ ہے۔ جدید ڈیموکریٹک پارٹی کے تخلیق کار اور امریکہ کے ساتویں صدر جنرل اینڈریو جیکسن اس شدت پسندی کے اظہار میں نہ کبھی متامل ہوئے نہ اس پر، پردہ ڈالا، جو وہ ریڈ انڈینز سے روا رکھتے تھے۔ امریکی فوجیوں کو حکم دیتے ہوئے جنرل اینڈریو جیکسن انسانیت اور اخلاقیات کی وہ تمام حدود پار کر گئے جنھیں خونخوار تر اور بدنام ترین ہلاکو اور چنگیز نے بھی پار نہیں کیا ہوگا۔ اینڈریو جیکسن کا یہ حکم تاریخ نے اپنی لوح سیاہ پر جلی حروف میں لکھ رکھا ہے:

> ''انڈینز کو ان کی پناہ گاہوں سے نکال کر ختم کردو اور ان کی عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا جائے۔'' اینڈریو جیکسن 18۔ (ڈیوڈ سٹینرڈ: 1992)

آرنلڈ ٹاکاکی اپنی کتاب ''تہذیب کی مابعدالطبعیات'' میں رقم طراز ہیں:

> ''اینڈریو جیکسن، ریڈ انڈین عورتوں اور بچوں کو ان کی خفیہ پناہ گاہوں سے باہر نکالنے میں مہارت رکھتا تھا۔ وہ اپنے ستم زدگان کی ناک کاٹ لیتا جن سے وہ اپنی فتح کی یادگاری ٹرافیوں کا، کام لیتا تھا۔ اینڈریو جیکسن اپنے شکار کی کھال اتارنے کا شوقین تھا جن سے وہ اپنے خچروں کی لگامیں بناتا۔ کریک انڈین قبائل میں اس نے ''تیز دھار خنجر'' کے نام سے بہت شہرت پائی۔'' 19۔ (رونلڈ ٹاکاکی: 1994)

صدر اینڈریو جیکسن کے جانشین مارٹن وان بیورن جو امریکہ کے آٹھویں صدر (1837-1841) بنے وہ بھی ریڈ انڈینز سے اپنی نفرت وحقارت کو چھپانے میں ناکام رہے۔ انہی کے عہد میں 1830 کے ریڈ انڈین نقل مکانی ایکٹ پر عمل درآمد ہوا۔ اس ایکٹ پر عمل

درآمد کو امریکی تاریخ کا سرخ تر اور سیاہ ترین صفحہ کہا جاسکتا ہے۔ صدر وان بیورن انڈینیز کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''کوئی ریاست اس وقت تک مناسب ثقافت' تہذیب اور تمدنی ترقی حاصل نہیں کرسکتی جب تک کہ ریڈ انڈینیز کو زندہ رہنے کی اجازت ہے۔''

20۔ (صدر مارٹن وان بیورن: 1837)

گویا صدر وان بیورن نے امریکی ثقافت اور تمدنی ترقی کو ریڈ انڈینیز کی ہلاکت سے مشروط کردیا تھا۔ اب جبکہ دنیا دیکھتی ہے کہ امریکہ نے ترقی کی اور خوب کی تو اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھا جانا چاہیے کہ امریکہ کی یہ ترقی ریڈ انڈینیز کی ہلاکت سے مشروط تھی۔ ترقی جس قدر عظیم الشان ہے ہلاکت بھی اسی قدر بڑے پیمانے پر ہوئی ہے۔ اس امریکی ترقی کے عناصر میں اندلس کے مسلمانوں کا لہو سیاہ فاموں کی غلامی اور' ریڈ انڈینیز کا خون شامل ہے۔ اگر ایک طرف امریکی ترقی کا انچ انچ امریکہ کی عظمت اور بڑائی کا سبب بنا ہے تو دوسری طرف امریکی زمین کے چپے چپے پر ریڈ انڈینیز اور افریقی مسلمانوں کا خون ناحق بھی بہا ہے۔

خون بہا ہے تو یہ ہریالی آئی ہے۔

قوت شامہ کے وہ ماہرین جنہیں اسلام آباد کی سڑکوں سے پٹ سن کی خوشبو آتی تھی کیا عجب کہ ایسی شامہ اور حس سوا رکھنے والوں کو امریکی زمین' ہریالی' ہوا اور پانی سے کبھی ریڈ انڈینیز کے لہو کی خوشبو بھی آئی ہو' لیکن یہ قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ پاکستان غیر جمہوری' لاوارث اور نہتا ٹھہرا جبکہ امریکہ جمہوری' مضبوط اور توانا ملک ہے یہاں پر نہ صرف اس قسم کی خوشبو کا پایا جانا عبث ہے بلکہ اس کے سونگھنے پر بھی پابندی عائد ہے۔

صدر ابراہام لنکن کے قتل کے بعد اینڈریو جانسن (1865-1869) امریکہ کے سترہویں صدر بنے وہ نہ صرف نام کی مماثلت سے اینڈریو جیکسن کے مماثل نکلے بلکہ ریڈ انڈینیز کے بارے میں اپنے خیالات کی شدت اور انتہا میں بھی وہ اینڈریو جیکسن کے ہم پلّہ ہی نکلے۔ دونوں میں نہ صرف ریڈ انڈینیز کے فوری خاتمے کی قدر مشترک رہی تھی بلکہ دونوں کی عہد صدارت کے نتائج وعواقب بھی یکساں نکلے۔ اینڈریو جانسن کانگریس کے نام اپنے پیغام میں کہتے ہیں:

> ''اگر غیر مہذب (ریڈ اینڈینیز) مدافعت کریں تو تہذیب ایک ہاتھ میں

> بائبل کے دس احکامات اور دوسرے میں تلوار کے ساتھ ان کے فوری قتل
> کا تقاضا کرتی ہے۔"
> 21۔ (صدر اینڈریو جانسن : 1867)

جانے صدر اینڈریو جانسن کا پنڈا زیادہ چکنا تھا یا سماعت سوالیہ کہ وہ جس عیسائیت، تہذیب اور بائبل کے مذہبی احکامات کے اطلاق میں غیر مہذبوں کے فوری قتل پر آمادہ تھے یورپ میں ان دنوں سان پر لگی اسی عیسائیت اور تہذیب کے خلاف جو شور و غوغا بلند تھا اس کی آواز ان تک نہ پہنچ سکی اور اگر پہنچی تو رینگ نہ سکی یعنی ان کے کان پر جوں تک نہ رینگ سکی بلکہ پھسل پھسل گئی عیسائیت کے نام پر ریڈ انڈینز کے قتل عام پر یورپ میں شدید ردعمل ہوا۔ جرمنی میں بائیں بزو کے رہنما اور فلسفی آگسٹ ببیل اور برطانیہ کے مشہور قلمکار سیموئیل بٹلر نے اپنی تحریر و تقریر میں یسی خون آشام عیسائیت پر شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ آگسٹ ببیل نے اس بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ:

> "عیسائیت آزادی اور تہذیب کی دشمن ہے۔" (آگسٹ ببیل 1840-1913)

جنی اینڈ ریو جانسن جس مذہب اور تہذیب کے لیے غیر مہذبوں کے قتل عام کا تقاضا کر رہے تھے آگسٹ ببیل اسی کو آزادی اور تہذیب کی دشمن قرار دے رہے تھے جبکہ سیموئیل بٹلر اپنے مخصوص ادبی انداز میں رقم طراز ہوئے:

> "عیسائیت پر شکوک و شبہات اور اس پر عمل درآمد ہوتا دیکھ کر لوگ اس
> سے یکساں طور پر خوف زدہ ہیں۔"
> (سیموئیل بٹلر : 1835-1902)

کم و بیش ہر ملک و معاشرے میں نا انصافی، ظلم اور جبر کے علم برداروں کے ساتھ تھ کلمۂ حق با آواز بلند پڑھتے رہنے والے بھی سامنے آتے رہتے ہیں یوں کسی حد تک توازن ئم رہتا ہے یا کم از کم توازن قائم ہوجانے کی امید بہر حال موجود رہتی ہے۔ ہر عہد اپنے اپنے بر حکمرانوں، نا انصاف حکومتوں اور ریا کار سیاستدانوں کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے حق گو بھی یہ کرتا رہتا ہے حق کی یہ آوازیں ظلم مٹا سکیں یا نہ بھی مٹا سکیں لیکن جبر کے ایوانوں میں تعاش ضرور پیدا کرتی ہیں۔ کلمۂ حق بلند کرنا کسی کی میراث نہیں ہے لیکن عموماً دیکھا یہ گیا ہے کہ یب' معاشرے کا ضمیر' اہل قلم معاشرے کی آبرو اور منصف معاشرے کے محافظ کا کام کرتے تے آئے ہیں۔ امام ابو حنیفہ نے جرأت اظہار اور امام حنبل نے اظہار حق کی جو بنا ڈالی اور ر اٹھائی تھی اسے نبھانے والوں کی فہرست طویل ہے۔ اس فہرست میں جارڈینو برونو' لیو ڈو

شیلے‘ والٹیئر‘ روسو‘ آگسٹ بیبل‘ سیموئیل بٹلر‘ جارج برنارڈ شا‘ برٹرینڈ رسل‘ سارتر‘ ابو الاعلیٰ مودودی‘ علی شریعتی‘ امام خمینی‘ پابلو نرودا‘ حبیب جالب اور ایڈ ورڈ سعید شامل ہیں لیکن امریکہ میں ریڈ انڈینیز کے حق میں کوئی ایسی توانا آواز بلند نہ ہوسکی جو کہیں بھی ارتعاش پیدا کرسکتی‘ شگاف ڈال سکتی یا اس عہد بلا خیز کو ٹال سکتی جس سے ریڈ انڈینیز دو چار تھے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں امریکی انصاف اور ضمیر کی ایک آنکھ ریڈ انڈینیز کی تین چار سینٹ فی ایکڑ کے حساب سے دستیاب اس کروڑوں ایکڑ زمین پر جمی تھی جس کے مالکان اپنے حق ملکیت سے بھی آشنا نہیں تھے اور دوسری آنکھ نسل کشی کا شکار ہونے والوں پر لگی تھی کہ قتل کرنے کو مزید کتنے رہ گئے ہیں۔

ریڈ انڈینیز کو نفرت اور حقارت سے دیکھنے والوں اور ان کے نسلی خاتمے کے منتظرین میں ہرمن میلول بھی شامل تھے۔ ہرمن میلول قریب ڈیڑھ صدی سے امریکی ادب کا سب سے بڑا‘ سب سے معتبر نام ہیں اور بیسویں صدی کے امریکی ادب پر ان کی چھاپ سب سے گہری اور نقش انمٹ ہے۔ ہرمن میلول 1819 میں نیو یارک کے ایک متمول بیوپاری خاندان میں پیدا ہوئے اور کم عمری میں ہی مستند ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ہوگئے۔ 1846ء میں ان کے ناول ’’ٹائے پی‘‘ نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ان کے لکھے کو سنجیدگی اور فکر سے پڑھا جاتا اور کہے پر تالیاں بجائی جاتیں۔ 1891 میں انتقال تک وہ سولہ ناول لکھ چکے تھے جن میں ’موبی ڈک‘ جو 1851 میں شائع ہوا‘ اسے امریکی اور عالمی ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہوا۔ اسی ناول پر انہیں 1950 میں ادب کا نوبل پرائز بھی عطا کیا گیا۔ ادیب اور‘ دانشور ہونے کے باوجود وہ ریڈ انڈینیز کو بہ نظر دگر دیکھتے اور ان کے حق میں کلمہ حق کہنے سے قاصر رہے۔ حیران کن حد تک ہرمن میلول بھی ریڈ انڈینیز کی نجات ان کی نسل کشی میں ہی دیکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ’’ریڈ انڈینیز سے نفرت موجود ہے اور اس وقت تک موجود رہے گی جب
> تک انڈینیز موجود رہیں گے۔‘‘ 22۔ (ہرمن میلول: 1857)

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں یہ سب سے بڑے ادیب کا حال تھا۔

ادیب جو معاشرے کا ضمیر‘ آئینہ اور عکس ہوتا ہے‘ ریڈ انڈینیز کے حق میں وہ بھی سرنگوں اور ان کے قتل پر آمادہ ہی نکلا۔ ہرمن میلول کا قیافہ معتبر اور عندیہ بامراد ٹھہرا اور ان کا

لکھا حرف‘ حرف سر چڑھ کے بولا۔ اب امریکی ریڈ انڈینیز سے نفرت میں مبتلا نہیں رہے انہیں نفرت کرنے سے نجات مل گئی ہے چونکہ ریڈ انڈینیز بھی نہیں رہے۔ ہرمن میلول کی شرط پوری ہو کے رہی جو ریڈ انڈینیز نمونے کے طور پر بچا کر رکھے گئے ہیں وہ عین اسی حالت احتیاط و حفاظت میں ہیں جس میں معدوم ہوتی ہوئی کسی بھی جاندار مخلوق (Spicies) کو رکھا جاتا ہے کہ نمونہ‘ حوالہ اور حیاتیاتی شمار باقی رہے جیسے کالی چتریوں والے بنگالی چیتے‘ نارنجی چونچ والے سفید آسٹریلوی طوطے یا عاجزانہ اطوار اور ایشیائی خدوخال والے امریکی ریڈ انڈینیز۔ ریڈ انڈینیز کے حق میں بددعا کے بعد کالی زبانی والے ہرمن میلول باقی دنیا کی طرف متوجہ ہوئے اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ”امریکی خون کا ایک قطرہ بھی اس وقت تک نہیں بہایا جاسکتا جب تک ساری دنیا کا خون نہ بہہ جائے چونکہ ہم ایک قوم نہیں‘ ایک دنیا ہیں۔“
>
> 23۔ (ہرمن میلول: 1849)

ہرمن میلول کی یہ بات بھی پوری ہو کر رہی۔ امریکی لہو کا ایک قطرہ بہا تو اس کا خراج ساری دنیا کو دینا پڑا‘ اور ابھی مزید دینا ہوگا‘ یہ الگ بات کہ اس خراج کا سارا بوجھ‘ قرض کا سارا بار مسلم اُمّۃ پر آن پڑا۔ 1950ء میں جب ہرمن میلول کو ادب کے نوبل پرائز سے سرفرازا گیا تو ایک عالم حیرت میں ڈوب گیا یا تو نصف صدی پہلے نوبل پرائز کے حقداروں کو انسانی حقوق سے متعلق نظریات سے مستثنیٰ سمجھا جاتا ہوگا یا نوبل پرائز دینے والے ہرمن میلول کے اس خیال سے متفق رہے ہوں گے:

> ”ریڈ انڈینیز سے نفرت موجود ہے اور اس وقت تک موجود رہے گی جب تک ریڈ انڈینیز موجود رہیں گے۔“ (ہرمن میلول: 1819-1891)

جس طرح ہرمن میلول انیسویں صدی کے سب سے بڑے امریکی ادیب تھے اسی طرح ہوریس گریلی انیسویں صدی کے سب سے بڑے امریکی قلمکار‘ رائے ساز‘ قلمی محاذ اور میڈیا کے چیمپئن تھے۔ ہوریس گریلی نے 1841 میں نیو یارک ٹریبیون اخبار جاری کیا اور تیس برس تک اس کے ایڈیٹر اور کالم نگار رہے۔ 1852 میں ہوریس گریلی نے کارل مارکس کو غیر ملکی نامہ نگار کی حیثیت سے نیو یارک ٹریبیون سے منسلک کرلیا یوں کارل مارکس لنڈن میں بیٹھے بیٹھے ہوریس گریلی کی ملازمت میں آ گئے اور نو سال تک نیو یارک ٹریبیون کے لیے خدمات

انجام دیتے رہے ۔ کارل مارکس کی سیاسی مضمون نگاری کا یہ وہی دور تھا جس میں انہوں نے ہندوستان کی بغاوت 1857 اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظلم و تشدد اور سازشوں کے بارے میں بصیرت افروز مضامین لکھے جو باقاعدگی سے نیو یارک ٹریبیون میں شائع ہوتے رہے ۔ انہی مضامین میں کارل مارکس کا وہ خصوصی مضمون بھی شامل ہے جس میں ہندوستان کے 1857 کی بغاوت کے اسباب پر بحث کی گئی ہے ۔ کارل مارکس کا یہ مضمون 14 اگست 1857ء کو نیو یارک ٹریبیون میں شائع ہوا جس میں غدر کے حوالے سے اس بنیادی نکتے پر بحث کی گئی ہے کہ آیا ہندوستان میں فوجی بغاوت :

- سیاسی ابتری کا نتیجہ تھی ۔
- کیا یہ منظّم قومی بغاوت تھی ۔
- کچھ فوجیوں کے اچانک رویے اور ردِّعمل کا نتیجہ تھی ۔
- کیا یہ بغاوت سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھی ۔ 24 ۔ (کارل مارکس : 14 اگست 1857)

کارل مارکس کے مضامین تو نیو یارک ٹریبیون میں چھپتے رہے لیکن ہوریس گریلی سے ان کا نباہ نہ ہوسکا۔ ہوریس گریلی کی ریڈ انڈینز پالیسی سے اختلاف کرتے ہوئے کارل مارکس نے 1861 میں نیو یارک ٹریبیون سے علیحدگی اختیار کر لی۔

ہوریس گریلی کو امریکہ میں انیسویں صدی کے سب سے بڑے رائے ساز، اصلاح کار اور قلمی چابک دست کی حیثیت حاصل رہی اور اور ان کا قلم مسلسل حرکت میں رہا وہ جب تک زندہ رہے اپنے قلم سے ازار بند ڈالنے کی زحمت سے محفوظ رہے۔ امریکہ میں انیسویں صدی کے آخری نصف پر وہ شدت سے اثر انداز ہوئے اور اس دوران معاشرتی و اصلاحاتی عوامل کو متاثر کرتے رہے۔ نیو یارک ٹریبیون ہوریس گریلی کی زیر ادارت مؤثر ترین اخبار اور طاقتور آواز ثابت ہوا، اور کانگریس، وائٹ ہاؤس، پالیسی سازوں اور عوامی رائے کو متاثر کرتا رہا اور اس اثر پذیری کے پیچھے ہوریس گریلی کا طاقتور قلم کارفرما رہا ۔ قلمکار جو معاشرے کی آبرو کی علامت ہوتا ہے اور جس سے معاشرتی ناہمواری اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرتے رہنے کی توقع کی جاتی ہے، ریڈ انڈینز کے حق میں مزید بے آبروئی کا سبب بن گیا ۔ ہوریس گریلی افتادگان بلا وجہ کے بارے میں رقم طراز ہیں :

”حقیقت پسندانہ مشاہدے کی رو سے جنگلوں اور گھاٹیوں کا پروردہ اوسط

> ریڈ انڈین ایسی مخلوق ہے جو انسانی فطرت پر کم ہی پورا اتر تا ہے۔ محض پیٹ کا غلام اور نباتات پر زندہ رہنے والے جانور کی طرح جو اپنے سے طاقت ور اور زیادہ کھانے کے شوقین جانور کی حاکمیت کے دباؤ سے کبھی آزاد نہیں ہو پاتا۔‘‘ 25۔ (ہوریس گریلی: 1859)

ہوریس گریلی نے ریڈ انڈینز کو کمتر‘ غیر انسانی مخلوق‘ خبیث اور جانور قرار دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس ’’خراج عقیدت‘‘ کے بعد وہ اپنے اصل نکتے اور مسئلے کے حل میں رقم طراز ہیں:

> ’’ان لوگوں (ریڈ انڈینز) کو مر جانا چاہیے ان کے لیے کوئی مدد نہیں ہے۔ خدا نے یہ زمین ان لوگوں کو عنایت کی ہے جو اس پر غلبہ حاصل کرلیں اور اسے کاشت کریں اور خدا کے منصفانہ نظام کے خلاف جدوجہد کرنا بے سود ہے۔‘‘ 26۔ (ہوریس گریلی:1859)

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں یہ سب سے بڑے قلمکار کا حال تھا۔

اپنے ان غیر انسانی انتہا پسند خیالات اور دہشت گردی کی کھلم کھلا تبلیغ سے ہوریس گریلی عوام اور سیاستدانوں میں اس قدر ہر دلعزیز ہوئے کہ 1872 کے صدارتی انتخابات میں دونوں سیاسی پارٹیوں (ڈیموکریٹک اور ری پبلکن) کی طرف سے بیک وقت صدارتی امیدوار نامزد کیئے گئے لیکن جنرل گرانٹ کی بھاری بھرکم شخصیت کے آگے ان کی ایک نہ چلی اور وہ صدارتی انتخاب کے ساتھ جان بھی ہار گئے۔ صدارتی انتخاب میں شکست نے ان کے اعصاب پر‘ برا اثر ڈالا اور وہ انتخابات کے فوراً بعد مخبوط الحواسی کی کیفیت میں فوت ہوئے۔

انیسویں صدی کے امریکہ میں انسانیت‘ انسانی حقوق‘ روا داری اور انصاف کی ایک بھی آواز ایسی نہیں تھی جو ریڈ انڈینز اور ان کی موت کے درمیان حائل ہوسکتی۔ قتل گہ کوفہ میں دو ہی آوازیں سنائی دیتی تھیں‘ قتل ہونے والوں کی فغاں اور قتل کرنے والوں کے ہنکارے قہقہے اور احکامات۔ ایسے ہی احکامات میں ریاست ایری زونا کے گورنر جان بیلر کا یہ حکم بھی شامل ہے جو انہوں نے فوجی کمانڈروں کو جاری کیا:

> ’’کنفیڈریٹ ریاستوں کی کانگریس نے غیر دوستانہ رویہ رکھنے والے تمام ریڈ انڈینز کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا قانون پاس کردیا ہے اس

لیے تم ہر ممکن طریقے سے ریڈ انڈین قبائل کو صلح کے بہانے جمع کرو گے اور جب وہ اکٹھے ہو جائیں تو بالغ ریڈ انڈینیز کو قتل کر دیا جائے اور بچوں کو قید کر کے فروخت کر دیا جائے جس سے ریڈ انڈینیز کو قتل کرنے کے اخراجات پورے کیئے جائیں ۔ فوجیوں کی وافر نفری موجود ہونی چاہیے تا کہ کوئی ریڈ انڈین فرار نہ ہو سکے ۔ میں ان لعنت زدہ کیڑے مکوڑوں کے خلاف تمہاری کامیابی کا منتظر ہوں۔" 27۔ (گورنر جان بیلر: 1862)

جو بات اعلیٰ امریکی قیادت زرا ڈھکے چھپے لفظوں میں کہتی آئی تھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ڈھکی چھپی نہ رہی اب اس کا اظہار ہر سطح پر انتہا پسندی تک آن پہنچا تھا:

"یہ بات بین الاقوامی طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ زمین کو ترقی دینے اور کاشت کاری کے لیے بنایا گیا تھا۔ مہذب معاشروں کو قانون فطرت اور عالمی قانون یہ حق دیتا ہے کہ وہ غیر کاشت کار، وحشیوں کی زمین میں داخل ہو جائیں اور اسے ارفع مقاصد کے لیے استعمال میں لائیں۔"

28۔ (گورنر نوح نوبل: 1832)

"تم جب اور جہاں بھی ریڈ انڈین مردوں کو دیکھو انہیں قتل کر دیا جائے عورتوں اور بچوں کو نقصان پہنچائے بغیر قیدی بنا لیا جائے ۔ اگر وہ صلح کا پرچم لہراتے ہوئے پسپائی اختیار کریں تو انہیں بتا دیا جائے کہ انہوں نے معاہدہ امن کی خلاف ورزی کی ہے اور معصوم (سفید فام) لوگوں کا قتل کیا ہے اور ان کی املاک تباہ کی ہیں اور اب انہیں اس کی سزا دی جائے گی۔ تمہارا کام انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنا ہے ۔ ہم اتنے (ریڈ انڈینیز) مارنا چاہتے ہیں جو انہیں سبق سکھانے کو کافی ہوں۔"

29۔ (جنرل جیمز کارلٹن: 1864)

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں یہ سرکاری حکام کا حال تھا۔

جب سارے امریکہ میں ایک ہی آواز گونجتی تھی اور بلا امتیاز امریکی صدور سے لے کر سرکاری حکام تک اور اہل قلم سے لے کر اہل دانش تک یک زبان ریڈ انڈینیز کے قتل پر آمادہ

تھے تو ایسے میں ریڈ انڈینیز کے لیے امریکہ کی عدالت عظمیٰ ہی وہ آخری بارگاہ رہ گئی تھی کہ جہاں سے انصاف کی امید وابستہ تھی لیکن یہ امید ٹوٹتے بھی دیر نہ لگی۔ امریکی سپریم کورٹ نے مشہور زمانہ ''جانسن بہ مقابلہ میکن ٹوش'' مقدمے کے فیصلے میں لکھا:

> ''حق دریافت کو ریڈ انڈینیز کے زمینوں پر قابض ہونے کے حق پر ترجیح حاصل ہے جو کہ ان کی زمینوں کو خرید لینے یا اسے فتح کر لینے سے حاصل کیا گیا ہے۔ وحشی' خبیث ریڈ انڈینیز جن کے عناصر زندگی جنگل سے اخذ کیئے گئے ہیں ان کے قبضے میں ان کے ملک کو چھوڑ دینا ایسے ہی ہے کہ جیسے ملک کو ویرانے کے حوالے کر دینا ہو۔ ریڈ انڈینیز پر مختلف لوگوں کی طرح حکومت کرنا' ناممکن تھا چونکہ وہ بہادر اور روحانی بھی اسی قدر تھے جتنا کہ وحشی اور جارح۔ وہ اپنی آزادی کے تحفظ میں مسلح جدوجہد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔''

30۔ (سپریم کورٹ آف امریکہ: جانسن بمقابلہ میکن ٹوش 1823)

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں یہ انصاف کے اعلیٰ ترین ادارے کا حال تھا۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے وہ آخری امید بھی دم توڑ گئی جو جاں بہ لب ریڈ انڈینیز نے انصاف کے اس اعلیٰ ترین امریکی ادارے سے باندھ رکھی تھی آگے چل کر سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ امریکی تاریخ کا ایسا فیصلہ ثابت ہوا جس نے ریڈ انڈینیز اور امریکی تاریخ ہر دونوں پر دور رس نتائج مرتب کیئے۔ چیف جسٹس جان مارشل نے اس فیصلے کی تشریح میں لکھا کہ:

> ''ریڈ انڈینیز امریکہ میں زمینوں پر قابض تو ہو سکتے ہیں لیکن ان زمینوں پر حق ملکیت کا دعویٰ نہیں کر سکتے چونکہ امریکہ کا 'حق دریافت' ریڈ انڈینیز کے حق قبضہ پر فوقیت رکھتا ہے۔ اور اس صورت حال سے ایک بڑے خطرے کی نشان دہی ہوتی ہے چونکہ اس مقدمے کے اپیل کنندگان' کریک' چکاسا اور چیروکی قبائل ایسی پالیسیز بنا چکے ہیں جن کی رو سے زمینوں کو حکومت امریکہ کے ہاتھوں فروخت نہیں کیا جا سکے گا اس سے پہلے کہ مزید تاخیر ہو وہ اپنی بچی کھچی زمینوں کا تحفظ چاہتے تھے۔''

31۔ (جان مارشل: چیف جسٹس سپریم کورٹ آف امریکہ:1823)

چیف جسٹس جان مارشل نے یک جنبشِ قلم ریڈ انڈینز کو اسی تحفظ سے محروم کردیا جس کے وہ طلب گار تھے۔ ریڈ انڈینز کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کی زمینوں پر حق ملکیت سے محروم کرتے ہوئے جسٹس جان مارشل جیسے اعلیٰ قانون دان کو رومن ضابطہ قوانین کی وہ نظیر بھی یاد نہ رہی جس کے مطابق:

”وقت کے تناظر میں پہلے کا حق مضبوط تر ہوتا ہے۔“

32۔ (رومن پینل کوڈ: 627، میکسم آف رومن لاء)

جسٹس جان مارشل جس برطانوی قانون پر رواں تھے، اس قانونی ڈھانچے کی بنیاد قدیم رومن قوانین پر رکھی ہے، یہی رومن ڈھانچہ براستہ برطانیہ جب امریکہ پہنچا تو معمولی ردو بدل کے بعد مشرف بہ امریکہ ہوگیا۔ جسٹس مارشل کے اس قدیمی مگر بنیادی ضابطہ قانون سے صرفِ نظر نے ایک عالم کو حیرت زدہ کردیا مگر ہماری حیرت مختلف وجہ سے ہے اور اس میں ہماری تشویش بھی شامل ہے۔ جسٹس مارشل کے اس فیصلے سے ہمیں بے اختیار قانون کی نظیر رفتہ کے رتجھے ہوئے پاکستانی منصفین یاد آنے لگتے ہیں کہ کل کلاں اگر وہ بھی جسٹس مارشل کے اس فیصلے کے حوالے سے پاکستان کی قبضہ مافیا کو 'حق دریافت' سے فیضیاب کرتے ہوئے حق ملکیت عطا کردیں تو مملکت خداداد کی صرف ایک تہائی زمین جو فوجیوں، ڈاکوؤں اور قبضہ مافیا کی 'دریافت' سے تاحال بچی ہوئی ہے تو وہ بھی جاتی رہے گی۔

* * *

اے روزگار کیوں تیری گردش نہ تھم گئی

”وہ ہمیں آہستگی سے مار رہے ہیں جبکہ ہم نہ لڑ سکتے ہیں نہ بھاگ سکتے ہیں“

(کیووا قبائلی سردار۔ چیف سیٹن ٹنٹا‘ 1820-1878)

”واشنگٹن میں اسے ثقافتی مدغم کہا جاتا ہے اوٹاوہ میں انڈینز کی ترقی اور کیوبک میں ہمارا مشرف بہ فرانسیسیت ہونا لیکن ہم جو‘ ان سب کا شکار ہیں ہم اسے نسل کشی کہتے ہیں۔“

(اوٹاوہ قبائلی سردار۔ چیف پونٹیاک 1720-1769)

”جو کچھ ہمارے ملک میں کیا گیا ہے نہ ہم ایسا چاہتے تھے‘ نہ ہم نے ایسا کرنے کے لیے کہا تھا۔ سفید فام جب بھی ہمارے ملک میں آئے ہیں اپنے پیچھے خونی لکیر چھوڑ گئے ہیں۔ سفید فاموں نے ہم سے بہت سے وعدے کیئے تھے جتنے مجھے یاد ہیں اس سے بھی زیادہ‘ لیکن انہوں نے صرف ایک ہی وعدہ نبھایا اور وہ یہ کہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہماری زمین حاصل کرلیں گے جو انہوں نے کرلی ہے۔“

(سیاکس قبائلی سردار۔ چیف ریڈ کلاوڈ 1822-1909)

”میں غریب اور برہنہ سہی لیکن اپنی قوم کا سردار ہوں۔ ہم امارت کی بجائے اپنے بچوں کو صحیح تربیت دینا چاہتے ہیں۔ امارت سے ہمیں کچھ نہیں ملے گا ہم اسے اپنے ساتھ دوسری دنیا میں نہیں لے جاسکتے۔ ہمیں امارت نہیں امن اور محبت چاہیے۔“

(نزپرس قبائلی سردار۔ چیف جوزف 1840-1904)

> ”اس جنگ نے ہماری سر زمین سے جنم نہیں لیا ہے بلکہ عظیم باپ کے بچوں نے اسے ہم پر مسلط کیا ہے جو ہمارے ملک میں ہماری زمین حاصل کرنے آئے ہیں .... بلا معاوضہ اور بلا وجہ۔“
>
> (برولس سیاکس قبائلی سردار۔ چیف سپاٹڈ ٹیل 1823-1889)

> ”میں نہیں جانتا تھا کہ کیا کچھ ختم کیا جا چکا ہے مجھے اپنے بوڑھاپے کی بلندی سے زبح کیئے ہوئے بچے اور عورتوں کے کٹے پھٹے اجسام کے ڈھیر اسی طرح نظر آتے ہیں جیسا کہ میں نوجوانی میں دیکھتا تھا۔ مجھے اس خون ملی مٹی میں ایک اور مردہ چیز بھی نظر آتی ہے اور وہ ہیں لوگوں کے خواب، یہ بہت خوبصورت خواب تھے۔“
>
> (فلسفی اور دانشور۔ بلیک ایلک۔ لاکوٹا قبائل 1863-1950)

درد، دانش، حب الوطنی اور بے کسی سے لبریز یہ اقوال اور بیانات ریڈ انڈین رہنماؤں کے ہیں وہی ریڈ انڈین جنہیں امریکیوں اور سفید فاموں نے غیر مہذب، وحشی اور نا قابل اصلاح قرار دے کر شکار کے جانوروں کی طرح ہلاک کیا، بے رحمی سے لوٹا، عورتوں کی آبرو ریزی کی اور سنگدلی سے یورپ کے بازاروں میں فروخت کیا۔ یہ الگ بات کہ عینی شاہدین اور تاریخ کا فیصلہ اپنے آپ کو مہذب، اصلاح کار اور ترقی یافتہ سمجھنے والوں کے خلاف اور غیر مہذب قرار دیئے جانے والوں کے حق میں قرار پایا۔ مشہور ہسپانوی مشنری اور مورّخ لاس کیسس نے امریکہ سے سپین واپسی پر 1552 میں یورپی تاریخ دانوں اور اہل قلم کے اصرار پر اپنی یاد داشت عینی شاہد اور مُبصر کی حیثیت سے قلم بند کی۔ لاس کیسس ان اولین ہسپانویوں میں شامل تھے جو کولمبس کے ساتھ پہلے جہاز پر امریکہ پہنچے تھے۔ لاس کیسس کو مشنری اور عیسائی مبلغ کی حیثیت سے براعظم امریکہ بھیجا گیا تھا لیکن تاریخ اور علم و ادب میں ذاتی دلچسپی کی وجہ سے وہ کولمبس کے وقائع نگار بن گئے اور کولمبس کی یاد داشتوں کو مرتب کرنے کی خدمات انجام دیں۔ لاس کیسس کی یاد، داشت سولہویں صدی کے وسط میں ہی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر چہار سو پھیل چکی تھی۔ لاس کیسس نے سفید فاموں کے غیر انسانی سلوک، ظلم و تشدد، بربریت اور دہشت گردی کے آنکھوں دیکھے واقعات اپنی اس تحریر میں قلم بند کیئے ہیں۔ ان واقعات کی سفاکی اور بربریت اپنی نوعیت میں چنگیز اور ہلاکو کی کارگزاریوں کو شرماتی ہے۔ لاس کیسس رقم

برولس سیاکس پونکا چیف

طراز ہیں:

> ’’ہسپانویوں نے ان بچوں کی ٹانگیں کاٹ دیں جو ان سے ڈر کر بھاگ رہے تھے‘ انہوں نے لوگوں پر کھولتا ہوا صابون انڈیلا پھر وہ شرطیں لگا کر تلوار کے ایک ہی وار میں انسانی جسم کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا کھیل کھیلنے میں مصروف ہوگئے۔ خونخوار کتوں کو سراسیمہ لوگوں پر چھوڑ دیا گیا جنہوں نے چشم زدن میں انہیں چیر پھاڑ کے رکھ دیا۔ کتوں کی کارگزاری پر انعامی خوراک کے طور پر نومولود بچوں کو ان کے سامنے پھینک دیا گیا۔‘‘
>
> 1۔ (لاس کیسس: 1552)

اسی طرح کے ایک اور واقعے میں بیری لوپیز‘ لاس کیسس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ’’ایک دن لاس کیسس کی موجودگی میں تین ہزار مرد وزن قتل کیے گئے‘ جوان عورتوں کی اجتماعی آبروریزی کی گئی۔ ہسپانویوں کے ہاتھوں ریڈ انڈینیز کا قتل عام ایک مسلسل تفریحی قتل کے مترادف تھا۔ اس قتل عام کے محرکات میں لالچ‘ مذہبی جنون‘ جنسی آوارگی اور بے بنیاد احساس تفاخر شامل ہے۔‘‘
>
> 2۔ (بیری لوپیز: 1990)

ریڈ انڈینیز کے قتل عام کے نفسیاتی عوامل اور محرکات پر بحث کرتے ہوئے فرانسیسی فلاسفر اور تنقید نگار ٹوڈورو اپنے تجزیے میں لکھتا ہے کہ:

> ’’نئی دنیا (امریکہ) میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں یہ ہسپانویوں کی حاکمیت کا اظہار ہے۔ یہ ایک ایسا جارحانہ قبضہ ہے جس میں تجاویز اور بقائے باہمی کی خواہش شامل نہیں ہے ہسپانویوں نے صرف حکم دیا جس میں تجاویز شامل نہیں تھیں۔ ہسپانوی جب نئے براعظم میں وارد ہوئے تو وہ سننے کے وصف سے عاری مگر کہنے کے فن میں یکتا تھے۔‘‘

ٹوڈورو کے اس تجزیے سے ہمیں قدرے اختلاف ہے۔ ہمارے خیال میں ہسپانوی بربریت کے نفسیاتی عوامل کے پس منظر میں مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی مسلسل آٹھ سو سالہ ہزیمت بھی کارفرما ہے۔ ہسپانیہ میں مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ اقتدار اور حاکمیت سے غیر مسلم

ہسپانوی اکثریت جس شکست خوردگی، مایوسی اور مذہبی گھٹن سے دو چار رہی تھی موقع ملتے ہی یہ ہسپانوی ہزیمت اپنے ردعمل میں شدید اور نوعیت میں شدید ترین بن کر ابھری جس کا اظہار اندلس میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد امریکہ میں ریڈ انڈینز کے قتل عام سے ہوا۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے طویل اقتدار کے خاتمے پر ہندو اکثریت کی ہزار سالہ ہزیمت اور شکست خوردگی مسلمانوں کے قتل عام پر منتج ہوئی تھی۔ قیام پاکستان پر لاکھوں مسلمانوں کا تہہ تیغ کیا جانا اس طویل ہندو ہزیمت کا سوچا سمجھا اور یکساں ردعمل تھا جس سے مسلمان اندلس میں دوچار ہو چکے تھے۔ وسطی ایشیاء کی ریاستوں میں بھی بعینہٖ اسی طرح ہوا۔ ان دوہرائے جانے والے تاریخی واقعات سے یہ اخذ کرنا مشکل امر نہیں ہے کہ جب بھی کہیں مسلم اقتدار مغلوب ہوا اور غالب اکثریت حاکم بنی تو وہ اپنے اعمال و افعال میں شائستگی رکھ سکی نہ رواداری۔ مسلم اقتدار کا دبدبہ ختم ہوتے ہی وہی مذہبی جنون اور حیوانی جبلّت جوان ہوتی رہی ہے جسے اعتدال میں رکھنے کے لیے مسلم حاکیت عمل میں آتی رہی ہے۔

یہ تو مسلمان علماء کی کوتاہ نظری اور مسلمان حکمرانوں کی کوتاہ قامتی ہے کہ آج مسلم اُمہ مذہبی انتہا پسندی کے حوالے سے دہشت گردی کے الزام سے دو چار ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں بھی اور جب بھی مسلم حاکیت قائم ہوئی وہاں روا دار معاشرہ وجود میں آیا اور جب بھی اس روادار معاشرے پر شگاف پڑا مذہبی انتہا پسندی سے آلودہ تلواریں میان سے باہر آ گئیں یوں ہسپانویوں اور ہندوؤں میں انتقام کی شدت، خون آشامی اور غیر انسانی سلوک کا اپنی انتہا پر پہنچ جانا اس مذہبی جنون کی طرف کھلا اشارہ ہے جسے ٹوڈورو نے ہسپانوی بربریت کے نفسیاتی عوامل کی نشان دہی میں یا تو قصداً شامل نہیں کیا یا کوئی تجزیاتی کج اس کے آڑے آ گیا۔

ہسپانوی فطرت کا ناشکرا پن 'حرص' ہوس اور مذہبی انتہا پسندی امریکہ پہنچتے ہی اپنی بدترین صورت میں عریاں ہوگئی۔ نئے براعظم میں لنگر انداز ہوتے ہی ہسپانویوں نے وافر زرعی زمینوں، پانی کی بہتات، جنگلات اور وسائل کی افراط پر کلمہ شکر ادا کرنے کی بجائے زیادہ سے زیادہ سونا، چاندی جواہرات، غلام، سفلی خواہشات کی تکمیل، حق ملکیت اور مال منعفت کے حصول پر قتل و غارت کا بازار گرم کرکے ناشکری کی انتہا کردی۔ امریکی سرزمین میں ہسپانویوں کے ہاتھوں کاشت کی گئی زبردستی، جنسی بے راہروی، استحصال اور مادّیت کی افراط نے ایسے سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد رکھی جو محض دو سو سالوں میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ موجودہ امریکی

معاشرت اور معیشت کی اساس عین انہی عناصر پر استوار ہوئی جو ہسپانوی غاصب اس زمین میں کاشت کر گئے تھے۔

اگر ایک طرف استحصال، زبردستی اور خون ناحق سے امریکہ کی تعمیر میں خرابی کی اک صورت مضمر رہی تو دوسری طرف امریکہ کی دریافت بھی بد دیانتی، بد نیتی، لالچ اور جبر سے غیر آلودہ نہیں تھی اور اس کا آغاز امریکی ساحل کے نظر آتے ہی ہو چکا تھا۔ اولین امریکی ہیرو کرسٹوفر کولمبس کے کردار کا تشہیری رخ خواہ جیسا بھی مثبت تاثر مرتب کرتا ہو لیکن تاریخی حقائق اس کے برعکس ہیں جو تاریخ میں محفوظ مگر مائل بہ معدوم ہیں۔ اصل حقائق جو بالآخر تاریخ کے صفحات میں مدھم پڑ جائیں گے کولمبس کو بہ طرز دگر پیش کرتے ہیں۔ کولمبس کے بد دیانت کردار اور ساخت کی کجی پر تاریخ کی مہر ثبت اور اس کے خلاف فیصلہ محفوظ ہے۔ حقائق کے مطابق جب کولمبس کا جہاز امریکہ کے ساحل کے قریب پہنچا تو 12 اکتوبر 1492ء کی صبح سینار بریمو نامی ایک مسلمان ملاح نے فجر کے جھٹپٹے میں امریکی زمین کی نشان دہی کی اور خوشی سے چلایا کہ اس نے ساحل دیکھ لیا ہے چونکہ سب سے پہلے زمین کی نشان دہی کرنے والے خوش خبر پر ملکہ ازابیلا کی طرف سے خطیر رقم اور عمر بھر کی پنشن کا انعام مقرر تھا۔ کولمبس نے اپنے ماتحت ملاح سینار بریمو کے زمین کی نشان دہی کے دعویٰ کو یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ ”وہ خود گزشتہ شام زمین شناخت کر چکا تھا“ یوں کولمبس نے بھاری انعامی رقم اور عمر بھر کی پنشن تو اپنے نام محفوظ کروالی مگر وہ ہمیشہ کی جگ ہنسائی اور بد دیانتی کے بوجھ تلے آ گیا۔

بیری لوپیز کی تحقیق اور تحریر کے مطابق:

> ”یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کولمبس نے سینار بریمو سے پہلے ہی امریکی زمین شناخت کر لی ہو چونکہ بارہ اکتوبر کی گزشتہ شام کولمبس کا جہاز کسی بھی ساحل سے 25 میل کی دوری سے زیادہ دور تھا اتنی دور کہ جہاں سے انسانی آنکھ کسی آلے کی مدد سے بھی زمین شناخت نہیں کر سکتی تھی جبکہ سینار بریمو کا دعویٰ تیکنیکی اور واقعاتی اعتبار سے حقائق سے قریب تر ہے۔“

3۔(بیری لوپیز، 1990)

تاریخ سینار بریمو کے بارے میں خاموش ہے۔ بیری لوپیز ”شمالی امریکہ کی دریافت نو“ میں سینار بریمو کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''وہ تبدیلی مذہب کے ذریعے اسلام میں داخل ہوا جبکہ ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہ پیدائشی مسلمان تھا۔ بہر حال یہ طے ہے کہ کولمبس کے جہاز پر وہ پہلا ملاح تھا جس نے امریکی زمین شناخت کرنے کا اعلان کیا تھا۔ سینار بریمو اگلے سال ہسپانیہ واپس چلا گیا اور وہاں مسلمانوں کے شانہ بہ شانہ لڑتے ہوئے مارا گیا۔'' 4۔ (ہیری لوپیز۔ 1990)

یوں اگر تاریخی انصاف سے کام لیا جائے تو امریکی سرزمین کی اولین شناخت کا اعزاز سینار بریمو کو حاصل ہے لیکن دھونس، دھاندلی، بد دیانتی اور تاریخ کے ہاتھوں مسخ زدہ حقائق کو سچ سمجھنے کے ناطے سے امریکی زمین کی نشان دہی کا سہرا کولمبس کے سر بندھا ہے۔ اب یہ اپنی اپنی ضرورت، مصلحت، تقاضے اور ضمیر پر منحصر ہے کہ فرد تاریخ کے کونسے پہلو پر یقین رکھتا ہے۔

ہیرو ازم کی امریکی ضروریات سے قطع نظر کولمبس کے بارے میں تاریخ کا عمومی رویہ بالکل ایسے ہی ہے جیسا کہ اس کے اعمال تھے۔ وہ ایک پیشہ ور جہاز ران، چاق و چوبند ملاح، سمندری جغرافیے کا ماہر اور خطرہ مول لینے والا مہم جو تو ضرور تھا مگر نہ وہ تو بے لوث مشنری ثابت ہوا نہ اچھا مبلغ نہ اصلاح کار نہ خوش شگون۔ انسانی ہمدردی سے عاری اور آدمیت کے احترام سے مبرا کولمبس رہنمائی، عظمت اور قیادت کے کسی نچلے درجے پر بھی فائز نہیں تھا۔ طمع، ہوس، سازش، وعدہ خلافی، زبردستی اور نسلی امتیاز سے آلودہ کردار کا حامل فرد اپنی میراث میں امریکہ اور نقش میں خون آشامی ہی پیچھے چھوڑ سکتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کولمبس کا یہ اعزاز بہر حال غیر متنازعہ ہے کہ وہ ہر دو میں سرخ رو ٹھہرا۔

اس تاریخی صداقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ موجودہ امریکہ کی اساس مذہبی انتہا پسند اور غیر متوازن شخصیت کی مالکہ ملکہ ازابیلا کی خون آشامی، کولمبس کے افعال ناپسندیدہ، ریڈ انڈینیز کے خون ناحق اور ان سے بزور طاقت چھینی گئی زمینوں پر رکھی گئی ہے۔ جمہوریت، برابری، آزادی، انصاف اور انسانی حقوق کی جو اقدار امریکہ کا امتیاز قرار پائیں ریڈ انڈینیز اور کالے امریکیوں کو 1965 تک ان سے محروم رکھا گیا ہے۔

1492 میں کولمبس کی امریکہ میں آمد کے وقت براعظم امریکہ میں مقامی لوگ یعنی ریڈ انڈینیز چھوٹے بڑے مختلف قبائل کی صورتوں میں آباد تھے۔ ان قبائل میں موہاک، سیاکس، میامی، اوٹاوہ، سان ٹانا، کیووا، چیروکی، لاکوٹا، نزپرس، کاہوکیا، اپیچی، چیانی، شاوَنی اور

وامپانوگ بڑے قبائل تھے جن کی تعداد کروڑوں میں تھی یہ قبیلے اپنے اپنے ثقافتی، معاشرتی، سیاسی، تاریخی اور روایتی تخصص کے ساتھ قبائلی سرداروں کی سربراہی میں اپنے مخصوص علاقوں میں قیام پذیر تھے۔ ان قبائل کے آئین اور ضابطے برطانوی آئین کی طرح رسمی اور غیر تحریری تھے۔ قبیلے کے سربراہ کی حاکمیت کا جواز قانون کی بجائے شخصی صفات سے وابستہ تھا۔ شجاعت، عدل، تدبر، دور اندیشی اور اخلاص کے حامل فرد کو سربراہی کا منصب پیش کیا جاتا اور متعلقہ فرد اس وقت تک یہ ذمہ داری نبھائے رہتا جب تک اہل قبیلہ اس سے بہتر فرد نہ ڈھونڈ لیتے۔ یوں ریڈ انڈینیز نے پسماندہ کہلائے جانے کے باوجود ریشہ دوانیوں، ریاکاری اور شخصی مفادات سے غیر آلودہ جمہوری نظام قائم کر رکھا تھا جو اس وقت کے یورپ میں رائج کلیسائی جبر اور آئینی جمہوریت کی کھینچا تانی سے کہیں زیادہ انسانی نظام تھا۔

کولمبس کی آمد کے ساتھ ہی مقامی امریکیوں پر ابتلاو آزمائش کی ایسی طویل تیرہ شبی طاری ہوئی جو چار صدیوں پر پھیل گئی۔ کولمبس کے جلو میں ہسپانوی آئے جنہوں نے عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا اور مردوں کو یورپ کے بازاروں میں فروخت کرنے کے شرمناک کاروبار کا آغاز کیا۔ ہسپانوی لٹیروں کے بعد انگلش اور ڈچ آبادکار آئے جو ریڈ انڈینیز کے لیے دوہرے مصائب ساتھ لائے ان مصائب میں ماحولیاتی ابتری، بیماریاں، سیاسی وعدے وعید اور سازشیں شامل تھیں۔ میلوں میل فصلیں کاشت کرنے کے لالچ نے تیز ہواؤں کو کاٹنے اور ان کا زور توڑنے والے جنگلات کو نگل لیا اور لاکھوں ایکڑ زرخیز زمینوں کو بنجر زمینوں میں بدل دیا جو زمین مزید فصل دینے کے قابل نہ رہتی سفید فام آبادکار اسے بنجر قرار دے کر آگے کی زمینوں پر قابض ہوجاتے یوں دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں ایکڑ زمین، لاکھوں ایکڑ جنگلات اور لاکھوں ریڈ انڈینیز سب کچھ برباد ہوگیا۔ انگریز اپنے ساتھ چیچک، جنسی بیماریاں، سازشیں اور قبضہ کرنے کا تجربہ لے کر آئے اور ڈچ طاعون، فحاشی، جنسی بے راہروی اور چرب زبانی۔ براعظم امریکہ میں اس سے پہلے نہ یہ بیماریاں موجود تھیں نہ ان کی مدافعت نتیجتاً لاکھوں ریڈانڈینیز چشم زدن میں مارے گئے ان کی بستیاں ویران ہوگئیں اور آبادیوں پر موت کا سناٹا چھا گیا۔ یوں ان کی زمینوں اور لہلہاتی فصلوں پر سفید فام قابض ہوتے چلے گئے۔

1763 میں سفید فام آبادکاروں نے ارادتاً چیچک سے بھرے کمبل ریڈانڈینیز میں بانٹنے شروع کر دیئے یہ کمبل زیادہ تر ان ریڈ انڈین قبائل میں بانٹے گئے جو سفید فاموں سے صلح

اور بقائے باہمی کی بنیاد پر مصالحت پر آمادہ ہو کر سفید فاموں کی نگرانی میں آچکے تھے۔ اس واقع کو انسانی تاریخ میں پہلی جراثیمی و حیاتیاتی جنگ قرار دیا جاسکتا ہے۔ سات ہزار کردوں کو جراثیمی و کیمیائی ہتھیاروں سے ہلاک کرنے پر صدام حسین عالمی انصاف کی نظر میں مجرم ہیں جو وہ ضرور ہوں گے تو کئی لاکھ ریڈ انڈینیز کو چیچک بھرے کمبلوں سے مارنے کی بھی کوئی تعزیر ہوگی۔ ہمارے خیال میں جراثیمی ہتھیار استعمال کرنا یکساں جرم ہونا چاہیے۔ یہ بات قرین انصاف نہیں ہے کہ ایک جیسے جرم پر ایک کو جگ ہنسائی اور موت کا سامنا ہے جبکہ دوسرے کے خلاف فرد جرم بھی عائد نہ کی جاسکی۔ کم و بیش جوہری ہتھیاروں پر بھی ایسا ہی جگاّ آرڈیننس نافذ ہے جو اسے استعمال کرچکے ہیں اور اس سے لاکھوں بے گناہوں کو ہلاک کرچکے ہیں اب وہی اس کے محافظ بنے ہوئے ہیں جبکہ قرائن یہ کہتے ہیں کہ جوہری ہتھیاروں کو دوبارہ استعمال کرنے والا بھی مریکہ ہی ہوگا یا اس کا ناجائز بچہ اور ولد حرام اسرائیل۔

ریڈ انڈینیز اپنے ہی ملک میں یورپینز اور امریکیوں کے ہاتھوں جس ہولناک نسل کشی کا شکار ہوئے جرمنی میں ایڈولف ہٹلر کے ہاتھوں یہودی بھی ایسے مصائب و مظالم کا شکار نہیں ہوئے تھے۔ مشہور عالم 'ہولو کاسٹ' میں یہودی جس طرح کی بربریت کا نشانہ بنے وہ ریڈ ڈینیز پر بیتنے والی ابتلاء کا عشر عشیر بھی نہیں تھی لیکن ریڈ انڈینیز کی نسل کشی پر نہ تو کوئی چشم گریہ ب ر ہوئی نہ کسی پر کیفیت سوگ طاری ہوئی۔ ریڈ انڈینیز کے خون ناحق کا نوحہ پڑھتے رہنے کو وئی یہودی میڈیا میسر نہ آسکا۔ انسانی تاریخ میں اس نوعیت کے المیے کا دوسرا قریب ترین ریق ہسپانوی مسلمانوں کا ہے۔ ہمارے خیال اور تحقیق کے مطابق یہ اس لیے بھی قرین قیاس ہے کہ دونوں المیوں کے پس منظر میں عیسائی انتہا پسندی کارفرما تھی۔ احیائے عیسائیت کے جس خبط نے ہسپانیہ میں غلبہ حاصل کیا تھا' ہسپانیہ سے امریکہ پہنچنے تک اس کی شدت میں مالی منفعت' گروہی مفادات اور انفرادی لوٹ مار بھی شامل ہوچکی تھی۔ ایک قوم کے وجود میں آنے ے لیے ایک قوم کے نابود ہوجانے کا تاریخی المیہ رونما تو ہوا مگر انسانی ضمیر کی آنکھ سے محو ہوگیا۔ جس طرح بے گناہ مقتول کی لاش دفنائے جانے تک سطح آب پر ابھرتی رہتی ہے اور خون بہ کا تقاضہ جاری رہتا ہے عین اسی طرح اس خون بہا کی ادائیگی ہوجانے تک سر' سے بار نہیں تا ہے۔ عدم ادائیگی کی صورت میں اصل زر کے ساتھ ساتھ عند الطلب سود بھی بڑھتا رہتا ہے ے خوں بہا' تقاضے اور خراج کی سمت اور صدا متعین نہیں ہوتی ہے یہ کبھی مشرق بعید کے گھنے

جنگلوں سے آتی ہے، کبھی مشرق وسطیٰ کے صحراؤں سے ابھرتی ہے، کبھی افغانستان کے گیاہ میں گونجتی ہے اور کبھی سرِ وادی سینا سے بلند ہوتی ہے۔ لگتا ہے کہ ویت نام میں جوان جہان اٹھاون ہزار امریکی سپوتوں کا لہو عندلطلب خون بہا کو چکانے میں ناکافی رہا۔ کیا عجب کہ عراق میں یہ بار اور لبنان میں یہ ادائیگی اپنی تکمیل کو پہنچے اور امریکہ کے سر سے یہ قرض، اصل زر اور مع سود کے اتر سکے۔

⌑ ⌑ ⌑

سرِ جادہ گریہ

"آج کے بچوں کو یہ پتہ ہی نہیں کہ ہم اس زمین پر رہتے ہیں جسے سفید فاموں کی طمع کی خاطر ایک کمزور اور ناتواں نسل سے سنگینوں کے زور پر حاصل کیا گیا ہے۔ قتل، قتل ہے اور کسی نہ کسی کو اس کا جواب دینا چاہیے۔ کوئی نہ کوئی تو ریڈ انڈین خون کی بہائی ندیوں کا جواب دے کسی نہ کسی کو آنسوؤں کی شاہراہ پر، چیروکیز قبائل کی ان چار ہزار خاموش قبروں کی وضاحت کرنی چاہیے جو ان کی جبری بے دخلی پر وجود میں آئی ہیں۔"

1۔ (جان برنیٹ: 1890)

6 جون 1838ء کو کیلاہون ریاست ٹینیسی میں سورج طلوع تو ہوا مگر تیرہ شب و شب نظر، سرنگوں و شرمسار، اس دن کے طلوع سے ایسی تیرہ شبی وابستہ تھی کہ جب غروب ہوا تو اپنے پیچھے ڈھیر ساری سیاہی چھوڑ گیا۔ اس قدر سیاہی کہ انسانی و امریکی تاریخ کا یہ بدنما المیہ لکھنے کے لیے کئی صدیاں بھی کم نہیں پڑے گی۔ 26 مئی 1830ء کو امریکہ کی اکیسویں کانگریس صدر اینڈریو جیکسن کے دباؤ میں ریڈ انڈینز کی جبری بے دخلی کے لیے "نقل مکانی ایکٹ" پاس کر چکی تھی اور اس کے اطلاق کا اختیار امریکی صدر کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ مئی 1838ء میں صدر امریکہ وان بیورن اپنے اس صوابدیدی اختیار کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس ایکٹ کے مطابق ریڈ انڈینز کو دریائے مسی سپی کے مشرق سے بے دخل کر کے مسی سپی کے مغرب میں ریڈ انڈینز کے لیے مخصوص کردہ "انڈین علاقے" اوکلوہاما میں منتقل کرنا تھا۔

چیروکی ریڈ انڈین قبائل جو بالعموم اس ایکٹ کی زد میں آئے اور جبری بے دخلی کا شکار

ہوئے کئی صدیوں سے دریائے مسی سپی کی مشرق ریاستوں ٹینیسی، کنٹاکی، الباما، جارجیا، شمالی کیرولائنا، جنوبی کیرولائنا اور ریاست مسی سپی میں آباد تھے۔ چیروکیز ریڈ انڈین پانچ بڑے قبیلوں چکیساؤ، چوکٹاؤ، کریک، سیمی نول اور چیروکی میں بٹے ہوئے تھے اور زمین کے ایک بڑے رقبے پر حق ملکیت رکھتے تھے جو درج ذیل ہے:

کریک	25 ملین ایکڑ
چیروکی	20 ملین ایکڑ
سیمی نول	18 ملین ایکڑ
چوکٹاؤ	10.3 ملین ایکڑ
چکیساؤ	7 ملین ایکڑ

2۔ (ولما ڈوناوے: 1996)

امریکی سفید فاموں نے چیروکی قبائل کو پانچ مہذب قبائل کے نام سے موسوم کر رکھا تھا اور حقیقتاً چیروکیز شمالی امریکہ کے تمام ریڈ انڈینز قبائل میں سب سے زیادہ تعلیمیافتہ اور ترقی یافتہ شمار ہوتے تھے۔ چیروکیز نے سفید فاموں کی پیروی میں معاشی، معاشرتی اور سیاسی اصلاحات نافذ کیں۔ تجارت اور زراعت کو فروغ دیا۔ سکول اور شفاخانے قائم کیے۔ 1821ء میں چیروکی زبان میں حروف تہجی متعارف کرائے گئے، طرز تحریر مقبول عام ہوا، اور 1828ء میں پہلا چیروکی اخبار “چیروکی فینکس” جاری کیا گیا۔ بڑے بڑے زرعی فارم، اجناس کے گودام اور زرعی منڈیاں قائم ہوئیں۔ تحریری آئین کے تحت چیروکی ری پبلکن جمہوریت قائم کی گئی اور گرینڈ کونسل کا قیام عمل میں آیا۔ ان تمام ترقیاتی کاموں کے پس منظر میں چیروکیز کا یہ عزم و ارادہ شامل تھا کہ موقع ملنے اور وقت آنے پر ریڈ انڈینز ترقی کر سکتے ہیں، سیکھ سکتے ہیں۔ غیر مہذب، جاہل اور خبیث ثابت کر کے ان کا قتل عام غیر انسانی اور سراسر غیر فطری عمل ہے۔ چیروکیز سفید فام دنیا پر یہ ثابت کر دینا چاہتے تھے کہ ذہنی اور جسمانی استعداد میں وہ اقوام سفید فام سے ہرگز کمتر نہیں ہیں اور اس میں وہ خاصی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

ادھر تو چیروکیز دن رات اس کوشش میں لگے تھے کہ وہ سفید فاموں پر اپنی برابری ثابت کر دیں ادھر جارجیا کے ریاستی حکام چیروکیز کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لینے کی سازشوں

میں مصروف تھے۔ 1802ء میں ریاست جارجیا اور امریکہ کی وفاقی حکومت کے درمیان ایک معاہدہ عمل میں آیا اس معاہدے کی رُو سے ریاست جارجیا نے مغربی جارجیا کی زمین اس شرط پر وفاقی حکومت کے تسلط میں دے دی کہ وفاقی حکومت ریاست جارجیا سے ریڈ انڈینز کو بے دخل کردے گی۔ اس طرح ریاستی حکام کو وہ وسیع اراضی حاصل ہو جانے کی قوی اُمید ہوگئی جو چیروکیز کی ملکیت میں تھی۔ 1829ء میں جارجیا میں سونے کی دریافت کے ساتھ ہی جارجیا کے ریاستی حکام اور سفید فام بے صبرے اور بے قابو ہوگئے اور وہ ''انڈین مسئلہ'' کے فوری حل پر زور دینے لگے۔ ریڈ انڈینز کے انخلاء کی صورت میں جارجیا کے نو دریافت معدنی علاقے کا سفید فاموں کے قبضے میں آجانے کی اُمید اور شدید خواہش نے انصاف، انسانیت، اصول، امریکی آئین، انسانی حقوق اور امریکی جمہوریت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ موقع ملتے ہی قتل آمادہ، بدطینت او رلالچ بھرا، انکل سام عریاں ہوکر سامنے آگیا۔ (یہیں سے تھامس عیسٹ کی مشہور زمانہ انکل سام ''یو۔ایس'' کی خباثت بھری، بے رحمانہ، کینہ پروری اور حاکمیت کی حامل تصویر مشہورِ زمانہ ہوئی)۔

1829ء میں اینڈریو جیکسن امریکہ کے صدر بن چکے تھے۔ ان کا واضح جھکاؤ جارجیا کے ان پانچ لاکھ سفید فاموں کی طرف تھا جو چیروکیز کی زمینوں پر گدھ کی طرح منڈلا رہے تھے اور چیروکیز کی اراضی، مال اسباب اور اثاثوں پر قبضے کے لیے بے تابی سے اشارے کے منتظر تھے۔ صدر اینڈریو جیکسن نے سپین کے بادشاہ فلپ سوئم کی، جارجیا میں منڈلاتے مردار خوروں نے ہسپانیہ کے عیسائیوں کی اور سراسیمہ ومحصور، ریڈ انڈینز نے اندلس کے مسلمانوں کی یاد تازہ کردی۔ 1609 میں بعینہٖ اسی طرح مسلمانوں کی جبری بے دخلی کے وقت عیسائی لشکری مسلمانوں کو بنوک شمشیر ان کے گھروں سے گھسیٹتے ہوئے نکالتے تھے اور گھیر گھار کر ساحلوں کی طرف لیے جاتے تھے۔ امریکی زمین میں غیر عیسائیوں سے ملکہ ازابیلا کی شقاوت، بادشاہ فرڈی نینڈ کی جاہ پسندی او رفلپ سوئم کی بے رحمی کا جو بیج بویا گیا تھا اسے تناور درخت بننے میں دیر لگی نہ ہی امریکی حکومتیں اور امریکی صدور اس خبث کو ظاہر کرنے میں متامل ہوئے۔ جارجیا میں اندلس کا المیہ دہرائے جانے کے عینی شاہد اور نگران جنرل جان وول کہتے ہیں:

> ''میں جب سے اس علاقے (جارجیا) میں آیا ہوں، سارا منظر دلی زدگی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ سفید فام مردار کھانے والے گدھ کی طرح

> اپنے شکار پر نظریں لگائے بیٹھے ہیں اور ان کی ہر چیز چھین لینے کے لیے
> جھپٹنے پر بے قرار ہیں۔" 3۔(جنرل جان وول:1838)

1831ء میں ریاست جارجیا میں سفید فاموں اور ریاستی حکام کے چیروکیز پر انخلاء کے لیے بڑھتے ہوئے دباؤ کے پیش نظر چیروکیز کی گرینڈ کونسل نے سپریم کورٹ میں ریاست جارجیا کے خلاف مقدمہ دائر کردیا۔ چیروکیز گرینڈ کونسل کے چیف جان راس نے چیروکیز کے مقدمے کی بنیاد چیرو کی قبائل کی مقتدر اعلیٰ حیثیت اور بحیثیت ایک مکمل قوم کے ریاست جارجیا کے 1830 کے اس قانون پر رکھی جس کی رو سے 31 مارچ 1831ء کے بعد سفید فاموں کو ریاست جارجیا کی حدود میں ریڈ انڈینز کی زمینوں پر ریاست کے تحریری اجازت نامے کے بغیر آباد ہونے سے روک دیا گیا تھا جب کہ ریاست جارجیا کا یہ قانون ریڈ انڈینز کے حقوق کے تحفظ کی بجائے اس سازش اور بدنیتی پر مبنی تھا جس کی آڑ میں ریاستی حکام ان سفید فام مشنریوں کو جارجیا سے بے دخل کرنا چاہتے تھے جو چیروکیز کی غیر قانونی بے دخلی کے خلاف ان کے حامی تھے اور انخلاء کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے لیکن ریاست جارجیا کی یہی آئینی بدنیتی چیروکیز کے حق میں اکسیر ثابت ہوئی۔ چیف جسٹس جان مارشل نے چیروکیز کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے لکھا:

> "چیروکیز قبائل خود مختارانہ حیثیت میں خود اپنی حکومت چلانے کا حق
> رکھتے ہیں اور ریاست جارجیا کے قوانین کا چیروکیز پر اطلاق غیر آئینی
> عمل ہے۔" 4۔(چیف جسٹس جان مارشل:1831)

اس حتمی فیصلے کے باوجود ریاست جارجیا نے سپریم کورٹ کے ان فیصلے کو ماننے سے انکار کردیا جب کہ صدر اینڈریو جیکسن نے اس فیصلے کے ردِعمل میں کہا:

> "جسٹس مارشل نے چیروکیز کے حق میں اپنا فیصلہ تو دے دیا ہے اب اس
> کا اطلاق بھی کر کے دکھائے۔" 5۔(صدر اینڈریو جیکسن:1831)

یعنی صدر اینڈریو جیکسن واضح طور پر یہ کہہ رہے تھے کہ میں اس فیصلے کا اطلاق نہیں ہونے دوں گا اور حقیقتاً انہوں نے ایسا ہی کر کے دکھایا یہ صورت حال ہماری تاریخ کے اس سیاہ بخت لمحے سے مماثل تھی جب 26 مئی 1993ء کو سپریم کورٹ آف پاکستان نے محمد نواز شریف کی حکومت اور اسمبلی بحال کردی لیکن صدر پاکستان جن کا دعویٰ یہ تھا کہ پیدائش سے لے کر مبتلائے رعشہ و

جگ ہنسائی ہونے تک انہوں نے ہر کام آئینی اور قانونی دائرے کے اندر اندر ہی کیا ہے بیورو کریسی کے پروردہ، اقرباء پرور، جاہ گزیدہ اور جمہوریت گزندہ غلام اسحاق خان نے سپریم کورٹ کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر کے صدر اینڈر یوجیکسن کی ہمسری تو حاصل کر لی لیکن نقصان اس کا یہ ہوا کہ ان کے حریف جونہی اقتدار میں آئے، ان کے اہل خانہ کی جنسی سرمستیاں زبان زد عام ہو گئیں۔ عاشقی میں عزت سادات کا جاتے رہنا تو دیکھا گیا تھا لیکن ان مذکورہ سرگرمیوں میں آبروئے دعویٰ نیک نامی بھی جاتی رہی۔ اس فیصلے کے ردعمل میں اینڈر یوجیکسن کی طرح انہوں نے جو بھی گل افشانی کی وہ تو ہماری تاریخ کی زینت نہ بن سکی البتہ آٹھ جون 1993ء کو مستعفی ہو جانے سے پہلے دھول جھونکنے، گرد اڑانے اور مخولیہ حرکات کرنے سے وہ ہماری تاریخ کا اسی طرح شرمناک کردار بن گئے جس طرح امریکی تاریخ میں آنسوؤں کی شاہراہ پر اینڈر یوجیکسن مینارِ ملامت پر ایستادہ ہیں۔

محمد نواز شریف حکومت کی بحالی ہماری تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد ایسا فیصلہ تھا جو شریف الدین پیرزادہ کی جمہوریت کش قبیح قانونی مہارت اور ان کے عوام دشمن افکار سے محفوظ رہا تھا۔ نصف صدی میں عدلیہ کی طرف سے پہلی بار خیر کی خبر آئی بھی تو غلام اسحاق خاں اس کے آڑے گئے۔ بحالی اسمبلی کے نتائج کا تھپڑ جو شریف الدین پیرزادہ کے نظریہ ضرورت کے فروغ کار اور رنجھے ہوئے منہ پر پڑنا تھا ادھر تو وہ اس سے بال بال بچے اور دوسری طرف احترام رائے دہندگان کا تیر جو غلام اسحاق خان کے سینے میں ترازو ہونا تھا وہ اس کی سبکی سے محفوظ رہے یوں وقتی طور پر تو خواہ غلام اسحاق خان اینڈر یوجیکسن کی طرح خود کو سرخ رو ہی سمجھتے رہے ہوں لیکن تاریخ نے انصاف کے آگے حیلہ گری کا بند باندھنے کو ہر دور میں حرام قرار دیا ہے۔ چونکہ پیرزادہ کی ضد پر صوتی آہنگ اور لفظی یکسانیت والا لفظ ہمارے ہاں ولد حرام اور ناجائز وغیرہ کے لیے ہی مستعمل ہے سو ہمیں یقین ہے کہ شریف الدین پیرزادہ نے اپنی قانونی شعبدہ بازی، تاویلاتی حیلہ گری اور عوام دشمن کرشمہ سازی کو حد ناجائز تک طول نہیں دیا ہوگا۔ ہمیں ان کی موشگافی دانشوری پر یقین ہے کہ انہوں نے ہر صورت پیرزادہ کی ضد پر ہم وزن لفظ کے گھیرے میں آ جانے کو ملحوظ خاطر رکھا ہوگا۔

یوں تو ہر کسی کو وہی کچھ کاٹنا پڑتا ہے جو اس نے بویا ہو مگر لگتا ہے کہ ہمیں دوسروں کا بویا بھی کاٹنا پڑا۔ میاں نواز شریف نے جس اُمید پر بھی سرکاری خزانے سے مبلغ تین لاکھ روپے

شریف الدین پیرزادہ کو بیرون ملک علاج کے لیے عنایت فرمائے ہوں مگر اس کا دوہرا نقصان ہوا۔ ایک تو سرکاری خزانے سے تین لاکھ خالص حرام مد میں جاتے رہے دوسرا یہ کہ شریف الدین پیرزادہ صحت مند اور بھلے چنگے ہوکر واپس آ گئے۔ واپس آتے ہی انہوں نے وہی کسب اختیار کیا جس کا ان کی بحالی صحت سے خطرہ تھا اور عوام پر وہی وار کیا کہ جس کے لیے مفلوک الحال سرکاری خزانے سے تین لاکھ کی نقد ادائیگی سے ان کی صحت بحال کرائی گئی تھی۔

سپریم کورٹ سے چیروکیز کے حق میں فیصلہ ہو جانے کے بعد بھی ریاست جارجیا اور وفاقی حکومت کے پاس 1830ء کے ''ریڈ انڈین نقل مکانی'' ایکٹ پر عمل درآمد کا راستہ کھلا تھا نقل مکانی ایکٹ کے خلاف ریڈ انڈینز سپریم کورٹ میں اپنی جنگ پہلے ہی ہار چکے تھے اور اس غیر انسانی ایکٹ پر عمل درآمد کو روکنے کے لیے وہ بے دست و پا ہو چکے تھے۔ ریڈ انڈینز کے حق قبضہ پر حق دریافت کے غیر فطری نظریے کی بالادستی نے ریڈ انڈینز کے پاؤں تلے سے ان کی زمین کھینچ لی تھی۔ مردار خور بدصورت گدھ ان کے چاروں اُور منڈلانا شروع ہو چکے تھے اور امریکی و انسانی تاریخ میں ایک اور بدترین وقوعہ کا واقع ہونا قرار پا چکا تھا۔

اس ظلم و ناانصافی کی کالک صدر وان بیورن کی منہ پر ملی جانی تھی سو انہوں نے صدر امریکہ کے اس صوابدیدی حق کو استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا جو 1830ء کے نقل مکانی ایکٹ میں انہیں تفویض ہوا تھا۔ اپریل 1838 میں صدر وان بیورن آرمی ٹروپس کو یہ حکم جاری کر چکے تھے کہ اس ایکٹ کے نفاذ کی تیاریاں شروع کردی جائیں جس کا مطلب یہ تھا کہ نقل مکانی کے اس سیاہ قانون کو بذریعہ طاقت نافذ کیے جانے کی ساعت بد آن پہنچی ہے۔ اس بربریت کا آغاز 6 جون 1838ء کی صبح کیلاہون ریاست ٹینیسی کی بستی سے ہوا۔ چیروکیز کی یہ بستی جو صدیوں سے امن و آشتی کا مرکز رہی تھی چشم زدن میں لہو لہو ہوگئی۔ سات ہزار فوجی سنگینیں تانے کیلاہون پر حملہ آور ہوئے اور مکینوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح مسی سپّی کے مغرب میں ہانکنا شروع کردیا۔ اس افراتفری میں بچے ماؤں سے اور گھر کے افراد ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ نہ کسی کو سامان اٹھانے کی مہلت دی گئی نہ کسی کو الوداع کہنے کی۔ جس نے مزاحمت کی وہ قتل ہوا اور جس پر تاخیر کرنے کا شبہ ہوا وہ گرفتار۔ فوجی لوٹ مار میں اور افتادگان گریہ و زاری میں مصروف ہوگئے۔ ایک ہزار میل لمبے سفر پر روانگی کے لیے نہ کوئی تیاری تھی نہ زاد راہ حکومت کی طرف سے جو بیل گاڑیاں مہیا کی گئیں وہ کم پڑ گئیں اور گھوڑوں پر فوجی خود

چڑھ گئے۔ گرفتار بلا اوسطاً دس میل روزانہ پیدل چلتے۔ چلتے چلتے جب دو ماہ بیت گئے تو بھوک، نقاہت، شدید سردی اور بیماریوں نے آ لیا۔ ہر دو چار قدم پر کوئی ایسا گرتا کہ پھر اٹھ نہ سکتا، ان نہ اٹھنے والوں کو بلا تاخیر وہیں دفنا دیا جاتا یوں مسی سپی سے اوکلو ہاما تک اس طویل راستے پر جگہ جگہ قبریں وجود میں آ گئیں۔ مرنے والوں کے لواحقین پیچھے مڑ کر دیکھتے، انہیں یاد کرتے، روتے محوسفر رہنے پر مجبور تھے۔

اس بے کسی کے سفر نے امریکی تاریخ میں ’آنسوؤں کی شاہراہ‘ کو جنم دیا۔ قدم قدم قبروں اور لمحہ لمحہ گریہ سے ایک ایسا جادہ گریہ وجود میں آیا کہ جس میں آنسو، آہیں، درد و فغاں اور خون کے ساتھ ساتھ امریکی جمہوریت، انسانی حقوق، انصاف، آئینی حرمت اور ذہنی ترقی کے خوش رنگ وعدے بھی مٹی میں مل گئے۔ اس نقل مکانی کے نتیجے میں بننے والی چار ہزار قبور نے اقوام عالم پر امریکی اندرون آشکارا کر کے جمہوریت اور انسانی حقوق کے امریکی ڈھول کی پول کھول کر رکھ دی۔

عالمی کلاسیکی ادب پر اگر تحاریک، ادوار اور شخصیات نے اثر ڈالا ہے تو سانحات نے بھی اسے متاثر کیا ہے شہادت امام حسینؓ، سقوط غرناطہ، یہودیوں کی ہولوکاسٹ، ریڈ انڈینز کی نسل کشی، المیہ ویت نام، ایران میں رضا شاہ پہلوی کے خلاف راہ حق کے شہدا، اور آنسوؤں کی شاہراہ ان سانحات میں سرِ فہرست ہیں جن کے نتائج و عواقب سے بیش بہا کلاسیکی ادب تخلیق ہوا۔ ان سانحات نے ایسے حزنیہ شہ پاروں کو جنم دیا جنہیں عالمی کلاسیکی ادب میں امتیاز حاصل ہے۔ ریڈ انڈینز جن کی نسل کشی اور قتل عام کی وجہ ان کا غیر مہذب ہونا قرار دیا گیا تھا انہی ریڈ انڈینز نے ”آنسوؤں کی شاہراہ“ کے المیہ پر ایسا ادب تخلیق کیا جس سے ادبیات عالیہ کے صفحات نم اور انسانی ضمیر کی آنکھ نمناک ہو گئی۔ مشہور ریڈ انڈین شاعر اور ایکٹر چیف ڈان جارج کی درج ذیل نظم ادبی کلاسیک کے اسی زمرے میں شامل ہے:

”میں دیکھتا ہوں اور، روتا ہوں“

اس یخ بستہ اور ویران راستے پر

جس کے انچ انچ اور قدم قدم پر

بھوک سے بلکتے اور

سردی سے شریانوں میں منجمد خون سے

نیلائے ہوئے جسموں کو گھسیٹتے ہوئے
میرے معصوم بچوں کی چیخیں ایستادہ ہیں
لاغر و لاچار ماؤں کے آنسو بکھرے ہیں
اس راستے پر ایک ایک جھاڑی کے تلے
میری نسل اور قبیلے کے بے گناہ
قتل ہونے والے
بچوں، عورتوں اور مردوں کی
قبریں پوشیدہ ہیں
میں یہ دیکھتا ہوں اور روتا ہوں
کہ میرے اجداد کی وسیع زمینوں میں
ہماری قبروں کے نشان بھی باقی نہیں رہیں گے

6۔ (چیف ڈان جارج:1974)

"میں دیکھتا ہوں اور روتا ہوں" کے سوا بھی آنسوؤں کی شاہراہ کے اس جادہ گریہ سے بعینہٖ اسی پائے کی حزنیہ شاعری تخلیق ہوئی جیسی المیہ سقوط غرناطہ کے ماتم گساروں نے تخلیق کی تھی۔ ان عالمی ادب پاروں میں درج ذیل نظمیہ عنوانات سرِ فہرست ہیں:

- راستہ وہ جس پر روتے گزرے
- راہ جو آنسوؤں سے نم تھی
- **Nuna dual Suny .... cheekokies**
- **Nuna - da - ut - Sunny**
- مائیں اسی شاہراہ پر اشکبار گزریں
- سردی اور بھوک سے بلکتے نڈھال بچے محوِسفر تھے
- آنسوؤں کی راہ گزر پر لہو کے چھینٹے تھے
- کس کی درد بھری فغاں سے کلیجہ کانپتا ہے
- انصاف پکارتی چار ہزار قبریں ____ اَلا اَماں
- ہماری آبائی زمینوں پر ملکیت کا یہ آخری دن تھا

- شاید وہ جانتے تھے کہ انہیں قتل ہونا ہے
- سہمے پرندے بھی ساتھ اڑتے تھے
- چشمِ فلک کے سوا ہمارے قتل کی گواہی بھی کون دے گا

تاریخ کے صفحات میں ایک اور المیہ راہ گزر بھی محفوظ ہے۔ آنسوؤں کی شاہراہ کی طرح ایک اور خونی راہ گزر بھی پیش آئی تھی۔ اس راہ گزر پر لہو کی سرخی آنسوؤں کی نمی سے کہیں زیادہ تھی۔ غرناطہ سے سر ساحل ہسپانیہ کے راستوں پر قبروں کی تعداد نامعلوم ہونے کے باوجود دو لاکھ سے کم نہیں ہے۔ اس راہ گزر کے مسافریوں بھی زیادہ سیاہ بخت تھے کہ ان کے پاس نہ وقت تھا نہ مہلت' مہلت وہ ضائع کر چکے تھے اور وقت ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ ان کے پاس صرف تین دن تھے۔ انہیں اس وادی ہول سے نکلنے اور مملکت موت کا حصار بہتر گھنٹوں میں توڑنا تھا۔ ان کی صعوبت سخت' آزمائش کڑی' ستارہ گردش میں اور چال قیامت کی تھی۔ انہیں ہانکنے والے گر جانے والوں کی تعداد کے مطابق قبریں نہیں کھودتے تھے بلکہ قبریں کھود کر اتنے گرا لیتے تھے۔ لوہے کا آنکڑہ برچھی کے آگے جڑا ہوتا جو پیچھے سے زن زناتا ہوا آتا اور گردن کے آر پار ہوجاتا جسے گردن کاٹے بغیر نکالا نہیں جاسکتا تھا۔ یہ ضرب اتنی شدید اور بے ساختہ ہوتی کہ مرے والے کو کلمہ پڑھنے کی مہلت بھی نہ دیتی۔ قرین قیاس ہے کہ شاعر حزینہ بیان کی توقع پوری ہو اور چشم فلک آمادہ گواہی ہو۔ کیا عجب کہ چشم فلک قتل کے ساتھ ساتھ یہ گواہی بھی دے کہ غرناطہ سے سر ساحل ہسپانیہ اور کیلا ہون سے اوکلو ہاما تک سر جادہ گر یہ قاتل بھی ایک ہی رہا تھا۔

چشمِ فلک کی گواہی کس نے دیکھی اور یہ کب برپا ہوگی؟

غالباً اسی غیر یقینی کے پیش نظر امریکی فوج کے جان برنیٹ نے چشم فلک کی گواہی کا انتظار نہیں جھیلا اور اپنی گواہی پیش کردی۔ جان برنیٹ ان عسکریوں میں شامل تھے جنہیں 6 جون 1838ء کی صبح کیلا ہون کے چیروکیز کو مغرب کی طرف ہانکنے اور جارجیا کی اراضی پر ان کی ملکیت تاراج کرنے کا اذن دیا گیا تھا۔ جان برینٹ 1890ء میں اپنی تفصیلی گواہی میں کہتے ہیں:

> ” میں آج گیارہ دسمبر 1890ء کو اسّی برس کا ہوگیا ہوں میں کنگز آئرن ٹینیسی میں پیدا ہوا تھا اور شکار کھیلتا' مچھلیاں پکڑتا' سیر و تفریح کرتا جوان

ہوگیا۔ جوان ہوا تو آرمی میں چلا گیا۔ شکار کی تلاش میں جنگلوں اور ویرانوں میں مجھے بہت سے چیروکیز سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے دوست بن گئے۔ میں ان کے شکار میں شریک ہو جاتا اور ان کے کیمپ میں ہی رات گزار لیتا۔ میں نے ان کی زبان سیکھی اور انہوں نے مجھے شکار کرنے کے جال، پھندے اور کڑکی بنانا سکھائی۔ 1838ء میں جب چیروکیز کو ان کے آبائی گھروں سے بے دخل کیا گیا تو میں ایک نوجوان فوجی تھا۔ چیرو کی زبان جاننے کی وجہ سے مجھے مئی 1838ء میں ترجمان بنا کر سمو کی ماؤنٹین کے چیروکیز کے علاقے میں تعینات کردیا گیا۔ یہاں میں نے امریکی تاریخ کے بدترین احکامات پر عمل درآمد ہوتے دیکھا۔ وہاں میں نے بے بس چیروکیز کو ان کے گھروں سے گھسیٹتے ہوئے نکالے جانے اور گرفتار ہوتے دیکھا۔ انہیں میرے سامنے بھیڑ بکریوں کی طرح بیل گاڑیوں میں لاد کر مغرب کی سمت ہنکا دیا گیا۔ کوئی بھلا اس دن کی اداس اور نوحہ گر کیفیت کو کیسے بھول سکتا ہے کہ جب لوگوں کو ان کے گھروں سے گھسیٹتے وقت جوتے تک پہننے کی مہلت نہیں دی گئی تھی۔ بچوں کو ایک بیل گاڑی سے، دوسری بیل گاڑی میں اپنے ماں باپ کو الوداع کہتے دیکھنا دل دوز منظر تھا جب کہ وہ جانتے تھے کہ وہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ رہے ہیں۔ 17 نومبر کو درجہ حرارت نقطہ انجماد سے گر چکا تھا اور برفباری شروع ہوچکی تھی۔ شدید سردی کی یہ صعوبت 26 مارچ 1839ء تک جاری رہی حتیٰ کہ چیروکیز اوکلوہاما تک پہنچ ہی گئے۔ شاہراہ جس پر نقل مکانی کے متاثرین محوسفر تھے درحقیقت شاہراہ موت میں بدل چکی تھی زیرحراست افتادگان کھلے آسمان تلے زمین پر سونے پر مجبور تھے۔ میں نے ایک ہی رات میں بائیس افراد کو شدید سردی اور نمونیہ سے مرتے دیکھا۔ مرنے والے انہی افراد میں چیف جان راس کی جواں سالہ، خوبصورت عیسائی بیوی بھی شامل تھی۔ یہ نیک دل

عورت سردی میں اس وجہ سے ہلاک ہوئی کہ اس نے اپنا کمبل ایک بیمار بچے کو سردی سے بچانے کے لیے دے دیا تھا۔ برف کے شدید طوفان میں وہ اس طرح مردہ پائی گئی کہ اس کا سر لیفٹیننٹ گریگ کے گھوڑے کی کاٹھی پر بے حس و حرکت رکھا ہوا تھا۔

میں اس تمام لمبے سفر میں چیروکیز کے ہم رکاب رہا اور ہر ممکن جو ایک سپاہی کے بس میں تھا، میں نے ان کے لیے کیا۔ میں جب بھی رات کے پہرے پر متعین کیا جاتا تو میں آنکھ بچا کر اپنے اوور کوٹ سے بچوں کو گرمائی پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا۔ جس رات مسز جان راس کا انتقال ہوا، اس رات بھی میں پہرے پر متعین تھا۔ مسز راس کی لاش کو صبح سویرے سڑک کے کنارے ایک گڑھے میں دفنا کر ہم عازم سفر ہو گئے۔

نوجوان ہونے کے ناطے سے چیروکیز کی جوان عورتیں میری دوست بن گئی تھیں وہ مجھ سے بے تکلفی سے پیش آتیں۔ میں نے ان خوبصورت عورتوں کو کبھی، اخلاق باختہ یا جسم فروش نہیں پایا گو کہ وہ مہربان، گرم جوش اور دوستانہ اطوار کی مالکہ تھیں۔ چیروکیز پر جو مظالم ڈھائے گئے اس کی بنیاد میں ان کی زمینوں سے سونا ملنے کی توقع کے ساتھ ساتھ ان کی سونا اگلتی زمینوں پر قبضے کی طمع بھی شامل تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان کے گھر جلا دیے گئے۔ جوان مردوں کو قتل کر دیا گیا اور ان کی املاک لوٹ لی گئیں۔

ریڈ انڈینز پر آئے بار کو ٹالنے کی ایک موہوم کوشش میں چیف جان راس نے چیف جونالسکا کو صدر اینڈریو جیکسن سے بات کرنے روانہ کیا۔ چیف جونالسکا جو ایک طویل عرصے سے صدر اینڈریو جیکسن کے قریب رہا تھا اور ہارس شو کی جنگ میں ان کی جان بچانے کا باعث بنا تھا۔ رحم کی درخواست کے ساتھ اینڈریو جیکسن کی خدمت میں پیش ہوا اور مدعا بیان کیا۔ چیف جونالسکا کی تمام بات تحمل سے سن لینے کے بعد اینڈریو جیکسن

نے مختصراً جواب دیا "ہماری ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے میں تمہارے لیئے کچھ بھی نہیں کرسکتا" مئی 1838ء میں واشنگٹن ڈی سی سے براہ راست احکامات کے تحت چار ہزار فوجی اور تین ہزار فوجی رضا کار جنرل ون فیلڈ سکاٹ کی قیادت میں چیرو کیز کے علاقے میں امریکی تاریخ کا بدترین مضمون لکھنے کے لیے حملہ آور ہوئے۔

مرد جو کھیتوں میں کام کررہے تھے انہیں گرفتار کرلیا گیا' عورتیں جو حملہ آوروں کی زبان سمجھنے سے قاصر تھیں انہیں زمین پر گھسیٹتے ہوئے گھروں سے باہر نکالا گیا۔ بچے اپنے ماں باپ سے جدا کردیئے گئے اور انہیں ایک ایسے سفر پر روانہ کردیا گیا جس میں آسمان ان کا کمبل اور زمین ان کا بچھونا تھی۔

میں نے ایک گھر میں یہ دل فگار منظر بھی دیکھا کہ ایک ناتواں عورت جو دل کا دورہ پڑجانے سے حالت نزاع میں تھی' ایک بچہ اس کی پیٹھ پر بندھا تھا جب کہ دو بچوں کو اس نے ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ گری اور گرتے ہی غموں سے آزاد ہوگئی۔ لیکن بچے اس کے مردہ جسم سے چمٹے ہوئے تھے اور اسے چھوڑتے نہیں تھے۔ چیف جونالسکا کی نظر جب اس منظر پر پڑی تو آہستگی سے آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ اس نے اپنی ٹوپی اتاری اور آسمان کی طرف دیکھ کر گویا ہوا "اے میرے خدا' اگر مجھے ہارس شو کی جنگ میں یہ پتہ ہوتا جو میں آج جانتا ہوں تو امریکہ کی تاریخ مختلف طرح سے لکھی جاتی۔"

1890ء میں چیرو کیز کی نقل مکانی ابھی پرانی بات نہیں ہوئی ہے کہ ہمارے بچے ان گھناؤنے جرائم کا ادراک نہ کرسکیں جو ایک ناتواں نسل کے خلاف کیے گئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ آج کے بچوں سے حقائق چھپائے جارہے ہیں۔ آج کے بچوں کو یہ پتہ ہی نہیں ہے کہ ہم اس زمین پر رہتے ہیں جسے سفید فاموں کی طمع کی خاطر ایک کمزور اور ناتواں

نسل سے سنگینوں کے زور پر حاصل کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والی نسلیں یہ پڑھیں گی اور ایسے عمل کی مذمت کریں گی جیسا کہ مجھ جیسے کم حیثیت سپاہی اور چار دوسرے ریڈ انڈین سپاہیوں کو جنرل سکاٹ کے احکامات کے دباؤ میں ایک ریڈ انڈین سردار اوراس کے بچوں کو گولی مارنا پڑی تھی۔ ہمارے پاس اعلیٰ افسران کے احکامات ماننے کے علاوہ دوسرا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

میں انتہائی یقین سے یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے اپنے طور پر چیروکیز کے لیے ہر ممکن وہ سب کچھ کیا جس کی دوستوں سے توقع رکھی جاتی ہے۔ جبری نقل مکانی کے پچاس سال بعد بھی میں ان کے حافظے میں ''سپاہی جو ہم سے حسن سلوک رکھتا تھا'' کے حوالے سے محفوظ ہوں۔ تاہم قتل، قتل ہے چاہے وہ کسی خون آشام سے اندھیرے میں سرزد ہو یا مارشل میوزک کے انتروں پر رقص کرتے ہوئے وردی پہنے فوجیوں سے۔ قتل، قتل ہے اور کسی نہ کسی کو اس کا جواب دینا چاہئے۔ کوئی نہ کوئی تو 1838ء میں ریڈ انڈین خون کی بہائی ندیوں کا جواب دے۔ کسی نہ کسی کو آنسوؤں کی شاہراہ پر چیروکیز قبائل کی ان چار ہزار خاموش قبروں کی وضاحت کرنی چاہئے جو ان کی جبری بے دخلی پر وجود میں آئی ہیں۔

میری خواہش ہے کہ میں سب کچھ بھول جاؤں لیکن یخ بستہ زمین پر 645 بیل گاڑیوں کا قافلہ جس میں انسانیت سسک رہی تھی میرے حافظے پر حاوی ہوچکا ہے۔ مستقبل کے مورّخ کو یہ المناک کہانی مع اس کی دل زدگی و آہوں کے بیان کرنا ہوگی۔ روئے زمین کے عظیم منصفین ہمارے افعال کا جائزہ لے کر ہمیں اسی کے مطابق جزا دیں گے۔'' 7۔(جان برنیٹ:1890)

جان برنیٹ کی آدھی بات تو پوری ہوگئی کہ مورّخ نے اس المناک کہانی کو کھول کھول کر بیان بھی کردیا اور ادیب نے اس المناک کہانی سے وابستہ دل زدگی و آہیں بھی مقدور بھر آشکارا کردیں لیکن آدھی بات پوری ہونا ہنوز باقی ہے۔ ابھی روئے زمین کے منصفوں کا فیصلہ

آنا رہتا ہے۔ فیصلہ آ جائے تو سزا و جزا کا تعین بھی ہو۔ اس میں تاخیر ہوتی جا رہی ہے اور متاخر فیصلہ اہل زمین کے حق میں نہیں ہے۔

کچھ فیصلہ تو ہو کہ کدھر جانا چاہیے
پانی کو اب تو سر سے گزر جانا چاہیے

(پروین شاکر)

انسانی حقوق کی بات جانے دیجئے کہ اس میں حقوق کے ساتھ ساتھ سیاست اور مفادات کا پیچ بھی لگا ہے لیکن امریکہ میں انسانوں کی جس قدر مٹی پلید ہوئی ہے انسانی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس زمین پر سرمایہ داری، کاروبار، منافع، اراضی، موقع، قبضہ، داؤ، اثاثے، ملکیت، فروخت، خوش حالی، سودے، پھیلاؤ اور خالص مالی مفادات کے لیے جس بے دردی سے انسانی خون بہا ہے اور انسانیت کی جس قدر تذلیل ہوئی ہے اس کے پیش نظر انسانی حقوق پر امریکی اصرار اس قدر معتبر ہے کہ جس طرح جاپان میں ایٹم بم سے ڈیڑھ لاکھ افراد قتل کرنے کے بعد ایٹمی ہتھیاروں کو محدود کرنے کا عندیہ۔ پہلا پتھر مارنے والے کے لیے مستقل با وضوع رہنے کی شرط آج بھی اسی قدر موثر ہے جتنی تیرہویں صدی میں سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں تھی۔ اس میں مذہب، رنگ، نسل، عہد اور علاقے کی تخصیص نہیں ہے۔ جس طرح چور، چوروں کے خواجہ قرار نہیں دیئے جا سکتے اور زانیوں کو زانیوں کی سنگساری پر مامور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح بالجبر کے مجرموں کو بالجبر کے مجرموں پر نگران مقرر نہیں کیا جا سکتا۔

* * *

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے

(اقبالؒ)

امریکہ کی اولین سو سالہ آبادکاری میں سپین اور برطانیہ کے علاوہ یورپ کی دوسری اقوام بھی شریک ہوتی گئیں۔ مالِ غنیمت میں اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے فرانس، ہالینڈ اور جرمنی بھی نو دریافت شدہ امریکہ کے مختلف حصوں پر قابض ہوگئے۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز سے وسط اٹھارہویں صدی تک صورت حال ایسی ہوگئی کہ موجودہ ریاستوں ٹیکساس، ایری زونا اور نیومیکسیکو سے ملحقہ زمینوں پر سپین قابض ہوگیا اور یہ علاقہ نیو سپین کہلانے لگا۔ لوزیانہ سے شمال مشرقی علاقے کی ریاستیں فرانس کے زیرِ تسلط آگئیں اور نیو فرانس کہلانے لگیں اور بحرِ اوقیانوس کے ساحل پر نسبتاً چھوٹی ریاستوں پر مشتمل علاقے پر برطانیہ قابض ہوگیا ان یورپی اقوام کا سامراجی رویہ امریکی سرزمین پر مزید سامراجی بن گیا۔ زیادہ سے زیادہ امریکی علاقے پر قبضہ جمانے کے لیے یورپی اقوام ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہیں۔

17 جون 1749ء کو ادھیڑ عمر کا ایک فرانسیسی سروئیر نیو فرانس کے گورنر کے حکم سے وادی وھائیو میں جگہ بہ جگہ ایسی تختیاں گاڑتے ہوئے پایا گیا جن کی رو سے وادی اوھائیو کی زرخیز مین پر فرانس کی ملکیت کا دعویٰ درج تھا اسی دوران برطانوی سرمایہ کاروں پر مشتمل اوھائیو کمپنی کا نمائندہ کرسٹو فرگسٹ بھی اسی علاقے میں ایسی ہی تختیاں لگا رہا تھا جن کی رو سے وادی اوھائیو برطانوی ملکیت ظاہر ہوتی تھی۔ برطانوی سرمایہ کاروں کی اس کمپنی کو برطانوی بادشاہ جارج ئم کے احکامات پر اوھائیو کا یہ علاقہ تفویض کیا جاچکا تھا یوں فرانس اور برطانیہ کے مابین مریکی سرزمین پر اپنے اپنے مفادات کے تحفظ میں فیصلہ کن جنگ کے لیے طبل بجنے ے۔ 1689ء سے 1748ء تک برطانیہ اور فرانس کے درمیان یورپ میں حتمی اقتدار کے لیے تین

جنگیں لڑی جا چکی تھیں جو غیر فیصلہ کن رہی تھیں لیکن امریکی سرزمین پر ان دونوں اقوام کے درمیان وادی اوہائیو سے امریکی اقتدار کے لیے 1754ء سے شروع ہونے والی یہ جنگ 1763ء میں پیرس ٹریٹی پر ختم ہوئی۔ جنگ کے نتیجے میں فرانس اپنے زیر تسلط بیشتر علاقہ امریکہ سے لے کر کینیڈا میں کیوبک اور مانٹریال تک کا علاقہ برطانوی افواج کے آگے ہار گیا۔ 18 ستمبر 1759ء کو کینیڈا میں کیوبک پر برطانوی قبضے نے فرانس کی ہزیمت پر مہر ثبت کردی اور اس طرح شمالی امریکہ سے فرانس مکمل طور پر دست بردار ہوگیا۔ اس آٹھ سالہ برطانوی و فرانسیسی کشمکش میں ان تمام یورپی آباد کاروں نے جن میں اکثریت برطانوی آباد کاروں کی رہی تھی مکمل طور پر برطانیہ کا ساتھ دیا یوں برطانوی افواج کو فرانس پر جنگی وسائل میں برتری حاصل رہی جو فرانس پر برطانوی برتری کی اہم وجہ ثابت ہوئی۔ اکثر مورخین اسی عنصر کو دونوں طاقتوں کے مابین فیصلہ کن قرار دیتے ہیں۔

پیرس ٹریٹی کے تحت فرانس کینیڈا، شمالی امریکہ اور امریکہ کے تمام علاقوں سے برطانیہ کے حق میں دست بردار ہوگیا اس طرح برطانیہ کو کینیڈا میں کلی طور پر اور امریکہ میں ماسوائے دریائے مسی سپّی کے مغربی علاقے کے اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگیا۔ مسی سپّی کے مغرب کا علاقہ پیرس ٹریٹی کے تحت سپین کی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ فرانس سے جنگ کے دوران آباد کاروں کی تیرہ ریاستیں اس اُمید پر برطانیہ کی حلیف بنی رہیں کہ جنگ کے خاتمے پر انہیں برطانوی تسلط سے آزادی حاصل ہو جائے گی۔ لیکن آبادکاروں کی اس اُمید کے برعکس فتح کے بعد برطانیہ نے ایسی پالیسیز کا اطلاق کردیا جو آبادکاروں کے مفادات کے خلاف تھیں۔ آٹھ سالہ جنگی اخراجات جس سے برطانوی معیشیت کو زبردست نقصان پہنچا تھا، برطانوی حکومت نے اس نقصان کو انہی آباد کاروں سے پورا کرنے کی پالیسی پر عمل درآمد شروع کردیا جس سے ایک نیا کارزار سج گیا اوراس کار زار کے دونوں اطراف برطانوی ہی تھے۔ ایک طرف برطانوی آباد کار جو خود کو امریکن کہلاتے تھے اور دوسری طرف برطانوی افواج، حکومت، حکومتی عمال اور کنگ جارج سوئم کا نامزد وائسرائے امریکہ۔

پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں برصغیر کے عوام نے بھی اسی اُمید پر برطانیہ کا ساتھ دیا تھا کہ جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کو برطانوی تسلط سے آزادی حاصل ہو جائے گی۔ لیکن ایسی اُمید باندھنے کی بجائے تاریخ سے یہ سبق سیکھنا زیادہ سود مند تھا کہ برطانیہ نے امریکہ میں فرانس

کی شکست پر کیا رویہ اختیار کیا تھا؟ برطانیہ نے تو قریب ڈیڑھ سو سال بعد برصغیر میں اپنے اس تجربے کو دہرایا جو اسے امریکہ سے حاصل ہوا تھا لیکن برصغیر کے عوام آباد کاروں کے اس تجربے سے کچھ نہ سیکھ سکے جسے سیکھنے کی اشد ضرورت تھی۔ برصغیر میں کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے رکھنے کی ایک وجہ آستین کے وہ سانپ بھی رہے جو عوام اور برطانوی حکومت کے درمیان راجوں، مہاراجوں، نوابین، سردار، خوانین، ٹھاکر، چوہدریوں اور گدی نشینوں کی صورت میں حائل رہے۔ اس طبقے نے دونوں جانب ''سب اچھا'' کی خبروں کی آڑ میں جاگیریں حاصل کیں، پرگنے ہتھیائے اور فائدے سمیٹے مگر آزادی کو متاخر کر دیا۔

فرانس سے جنگ جیتنے کے بعد برطانوی حکومت کی طرف سے آباد کاروں پر پہلا کاری وار ''فرمان 1763'' کی صورت میں کیا گیا۔ اس حکومتی فرمان کی رو سے اپیلیچین پہاڑی علاقے کے مغرب میں آباد کاری ممنوع قرار دے دی گئی۔ بلکہ جو آباد کار پہلے سے وہاں آباد ہو چکے تھے انہیں بھی اس علاقے سے بے دخلی کا حکم دیا گیا اس فرمان نے راتوں رات اس خیر سگالی اور خیر خواہی کو بد خواہی میں بدل دیا جو آباد کاروں اور برطانوی افواج کے دوران فرانس کے خلاف طویل جنگ میں پروان چڑھی تھی۔ امریکہ میں ابھی اس شاہی فرمان پر ہی ملامت جاری تھی کہ 1765ء میں برطانوی وزیراعظم گرن ول نے پارلیمنٹ سے سٹیمپ ایکٹ منظور کرالیا۔ اس ایکٹ کے تحت امریکہ میں تمام قانونی دستاویزات پر بھاری ٹیکس عائد کر دیا گیا۔ اخباروں سے لے کر لین دین کی عام رسیدیں تک اس ایکٹ کی زد میں آ گئیں۔ مزید ستم یہ کہ یہ ٹیکس سونے یا چاندی کی جنس میں واجب الادا قرار دیا گیا اسی طرح 1767ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ٹاؤن شنڈ ایکٹ پاس کیا جس کی رو سے امریکن کالونیز میں کاغذ، شیشہ، رنگ روغن، دھاتیں، چائے اور روز مرہ استعمال کی دوسری ضروریات پر بھاری ٹیکس عائد کر دیا گیا۔ ٹیکسوں کی بڑھتی ہوئی شرح اضافہ اور اقتصادی دباؤ نے آباد کاروں میں شدید بے چینی پیدا کر دی اور انہوں نے ٹیکس وصول کرنے والوں کو ٹیکس ادا کرنے کی بجائے قتل کرنا شروع کر دیا۔ جو ٹیکس وصولی کا ارادہ باندھتا اسے فی الفور قتل کر دیا جاتا۔ شاہی اہل کاروں کا گھیراؤ اور سرکاری عمال کا تعاقب روز کا معمول بن گیا۔ برطانوی مال کے بائیکاٹ نے اشتعال کو نقطہ عروج پر پہنچا دیا اور اسی اشتعال کے بطن سے امریکی انقلاب نے جنم لیا۔

5 مارچ 1770 کی خوشگوار شام کو آباد کاروں کا ایک ہجوم بوسٹن کسٹم ہاؤس کے سامنے

جمع ہوگیا جہاں برطانوی حکومت کے عمال، ٹیکس حکام اور برطانوی فوج مقیم تھی۔ کسٹم ہاؤس کے سامنے مجمع نے ڈیوٹی پر موجود برطانوی فوجیوں پر نعرہ بازی شروع کر دی اس شوروغوغا سے مزید برطانوی فوجی بھی وہاں جمع ہو گئے۔ ادھر ہجوم بھی بڑھتا اور بے قابو ہوتا گیا یکا یک ایک فوجی کی بندوق سے فائر ہوا اور امریکی انقلاب کی راہ میں پہلی لاش زمین پر گری۔ اس راہ میں زمین پر گرنے والی یہ پہلی لاش 27 سالہ کرسپس اٹیکس ایک سیاہ فام ملاح کی تھی جو ''آزادی کے بیٹے'' نامی امریکی حریت پسندوں کی مشہور تنظیم سے وابستہ تھا اس کے بعد امریکہ کا جلیانوالہ باغ رونما ہوا۔ برطانوی فوجیوں کی فائرنگ سے جگہ جگہ لاشے گرنے اور تڑپنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے امریکی خاک وخون میں لوٹ گئے اور زمین سرخ ہوگئی۔ بوسٹن کے اس قتل عام نے آزادی کی امریکی جدوجہد کو رنگین کر دیا اور انقلاب کے لیے مہمیز کا کام دیا۔ انقلاب جسے آگے بڑھنے کے لیے جوان اور تازہ لہو کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے میسر آ چکا تھا۔ بوسٹن کے قتل عام کے بعد امریکی انقلاب کی راہ میں ''بوسٹن ٹی پارٹی'' بھی آزادی میں سنگ میل ثابت ہوئی۔

نومبر 1773ء کو برطانیہ سے دار جلنگ کی خوشبو دار چائے سے بھرے تین جہاز بوسٹن کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوئے۔ یہ جہاز اور چائے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملکیت تھے۔ چائے پر ٹیکس کی نئی شرح کے خلاف آباد کاروں میں غصہ اور احتجاج جاری تھا اور برطانوی مال کے بائیکاٹ میں چائے بھی شامل تھی۔ چائے کو جہازوں سے اتارنے کے موقع پر تحریک آزادی کے سرگرم کارکن مزدوروں کے روپ میں جہازوں پر پہنچ گئے اور چائے کو سمندر میں پھینکنا شروع کر دیا نتیجتاً خون خرابہ ہوا، مزید لاشے گرے تکرار بڑھی اور آزادی قریب تر آتی گئی۔ اس واقع کو بوسٹن ٹی پارٹی کے نام سے یاد رکھا گیا۔

امریکی جلیانوالہ باغ ہمارے جلیانوالہ باغ سے المیہ اور سنگینی میں کہیں کمتر ہونے کے باوجود اثرات اور شدت میں سریع الاثر اور شدید الاثرات نکلا کہ اس واقع کے بعد امریکی آزادی کو تحریک سے حقیقت بننے میں محض چھ سال لگے جب کہ اس سانحہ میں صرف 6 افراد ہی ہلاک ہوئے تھے۔ ہمارے جلیانوالہ باغ میں تین سو اسّی افراد کے مارے جانے کے باوجود آزادی کی صبح آتے آتے مزید 28 سال لگے تھے شاید اس کی بنیادی وجہ یہ رہی ہو کہ مرنے والے اور مارنے والے بہرحال ایک ہی قوم کے افراد تھے۔ دونوں طرف برطانوی قومیت نتائج وعواقب پر اثر انداز رہی تھی واقعہ کچھ بھی ہو لیکن چار جولائی 1776ء کو امریکہ نے برطانیہ سے

علیحدگی اور آزادی کا اعلان کردیا۔ اس اعلان آزادی پر بعینہٖ ایسے ہی ہوا جیسا کہ اس طرح کے یک طرفہ اعلان آزادی پر اکثر ہوا کرتا ہے۔ بادشاہ اور برطانوی حکومت نے اسے بغاوت، دہشت گردی، تخریب اور علیحدگی کی تحریک قرار دے کر طاقت سے کچل دینے کا فیصلہ کیا ادھر امریکن کالونیز کی افواج جنرل جارج واشنگٹن کی زیر قیادت برطانوی افواج کے مقابلے میں صف آراء ہوگئیں یوں ایک طرف سے بغاوت کچلنے، دہشت گردی ختم کرنے اور دوسری طرف سے آزادی حاصل کرنے اور انسانی حقوق کی بحالی کے نام پر میدان سجا، کارزار جما اور رن پڑ کے رہا۔ امریکی بے جگری سے لڑے کچھ وہ تعداد میں زیادہ بھی تھے یوں برطانوی افواج ہر اہم مقابلے میں شکست سے دوچار ہوتی گئیں جو بچ رہیں وہ ریخت کے ہاتھوں ماری گئیں۔

امریکی انقلاب کا آخری اور فیصلہ معرکہ یارک ٹاؤن ورجینا میں لڑا گیا جس میں ہزیمت کے بعد لارڈ کارن والس نے 19 اکتوبر کو ہتھیار پھینک دینے کی دستاویز پر دستخط کردیئے۔ لارڈ کان والس کے جنرل جارج واشنگٹن کے سامنے ہتھیار پھینکتے ہی برطانوی وزیراعظم لارڈ نارتھ مستعفی ہوگئے۔ نئے برطانوی وزیراعظم نے امریکی آزادی کی راہ میں عدم مزاحمت کی پالیسی اپنائی حتیٰ کہ نومبر 1782ء میں پیرس ٹریٹی میں برطانیہ نے امریکہ کو علیحدہ اور آزاد ملک کی حیثیت سے تسلیم کرلیا۔

امریکی افواج کی فتح یابی پر ایک عام خیال یہ تھا کہ جنرل جارج واشنگٹن امریکہ میں شخصی اور ذاتی اقتدار کی بنیاد رکھ دیں گے اور وہاں ایک اور بادشاہت قائم ہو جائے گی لیکن اس کے برعکس برطانوی افواج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد جنرل جارج واشنگٹن نے خود کو امریکی افواج کی قیادت سے علیحدہ کرلیا اور گوشہ نشین ہوگئے۔ جنرل جارج واشنگٹن کے اس تدبر، ایثار اور بے لوثی پر برطانیہ کے بادشاہ جارج سوئم نے جارج واشنگٹن کو عظیم مدبر، محبّ الوطن اور بہترین رہنما قرار دیا۔ بالعموم تو یہی کہا جاتا ہے کہ جنرل جارج واشنگٹن کا یہ اقدام ان کے تدبر اور اخلاص کو ظاہر کرتا ہے جب کہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ انہیں اندازہ ہوچکا تھا کہ امریکی افواج کا قائد ہونا ہی ان کی صدارت کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گا، سو وہ عین وقت پر اس سے علیحدہ ہوگئے۔ بعد ازاں 30 اپریل 1789ء کو نئے امریکی آئین کے تحت جارج واشنگٹن کو ہی امریکہ کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔

نہ ماننے کی بات دوسری ہے لیکن امریکی افواج کے منصب اعلیٰ سے مستعفی ہوکر بھی

صدر منتخب ہو جانے سے جارج واشنگٹن ایسی مثال قائم کر گئے کہ جنہیں اپنی ہر دلعزیزی پر مان اور ”خدمات“ کا زعم لاحق ہو' ان کے لیے فوج سے مستعفی ہو کر منتخب ہو جانے کا راستہ بھی موجود ہوتا ہے۔ اس کے لیے آئین کا حلیہ بگاڑنا' سیاسی جمہوروں کو احتسابی استرے سے مونڈنا' عدلیہ اور پارلیمنٹ پر سرکس کے مسخروں کو مسلط کر دینا ہی ضروری نہیں ہوتا ہے۔

* * *

فریب کاری شب

ہم تو فریب کاری شب کو بیان کر گئے
اب یہ نصیب شہر ہے جاگ اُٹھا ہو یا نہ ہو

(پیرزادہ قاسم)

یورپینز اور امریکنز کا جس طرح ریڈ انڈینز کو ”غیر مہذب“ قرار دینا مبنی بر فریب‘ دانستہ الزام تراشی‘ حقائق کے منافی اور ان کی مالی منفعت سے وابستہ تھا اسی طرح مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینا یورپینز اور امریکنز کے اسی رویے اور تجربے کا اعادہ ہے جو وہ ریڈ انڈینز سے روا رکھ چکے ہیں۔ مسلمانوں کا دہشت گرد ہونا بھی ان کے اسی ”حسن ظن“ کا عکس ہے جس کا مظاہرہ وہ پندرہویں صدی کے آغاز سے انیسویں صدی تک کر چکے ہیں۔ مسلم اُمہ کے انتہا پسند اور دہشت گرد ہونے میں بھی اسی قدر حقیقت ہے جتنا کہ ریڈ انڈینز کا ”غیر مہذب“ ہونا سچ تھا۔

ہمیں دہشت گردی کو دہشت گردی کے تاریخی پس منظر میں ہی دیکھنا ہوگا۔ دہشت گردی کے تاریخی تناظر کی جانکاری ہی مسلم اُمہ کو ان کی موجودہ دفاعی حالت کا حصار توڑنے میں مدد ہو سکتی ہے۔ اس راہ پر خار کا پہلا پتھر ہی دہشت گردی کی تعریف‘ تاریخ اور فروغ کے تعین کا ہے اور یہ تعین یقیناً انہی ہاتھوں میں ہے جو ریڈ انڈینز پر غیر مہذب ہونے کا الزام لگا کر انہیں قتل کر چکے ہیں‘ ان کی تہذیب نسل اور ثقافت مٹا چکے ہیں۔ دہشت گردی کے الزام تلے اب ایک اور نسل‘ تہذیب اور ثقافت کو اپنی بقا کا مرحلہ درپیش ہے۔

انقلاب فرانس (1789-1799) نے موجودہ سیاسی دنیا پر گہرے اثرات مرتب کئے

ہیں۔ جان لوک، والٹیئر، روسو اور مانٹیز کیو کے سیاسی نظریات کے مشترکہ اصول کے مطابق "بہترین جمہوری حکومت کی بنیاد انسان کی اس خواہش میں مضمر ہے کہ وہ اپنی مخصوص قومی ریاست میں اپنی حاکمیت کے لیے خود مقتدر اعلیٰ ہوں" یہ نظریہ صرف انقلاب فرانس تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نظریے نے کئی دوسرے انقلابات کی راہنمائی بھی کی ہے۔ امریکی انقلاب، میکسیکن انقلاب، کیوبن انقلاب اور آزادی ہندوستان جیسی قومی تحریکوں کو فکری اساس مہیا کی ہے۔ نظریاتی طور پر انقلاب فرانس کو موجودہ سیاسی دنیا کی بنیاد مانا جاتا ہے۔ انقلاب فرانس کے نتیجے میں رجعت پسندی اور لبرل ازم کے نظریوں میں ترمیم و اضافے کا عمل شروع ہوا جس سے ان نظام ہائے سیاسی میں اصلاح کا در وا ہو گیا اور جمہوریت و عوامی حاکمیت کی بنیاد پڑی۔ جس سے موجودہ عالمی سیاسی نظام کی تشکیل ہوئی۔ 1۔ (ڈیوڈ اینڈرسن:2005)

انقلاب فرانس کے ثمرات میں اگر ایک طرف بنیادی انسانی حقوق کو تسلیم کیے جانا شامل تھا تو دوسری طرف ان حقوق کو طاقت کے ذریعے حاصل کر لینے کے لیے نظریہ دہشت گردی بھی پہلو بہ پہلو پروان چڑھا۔ انقلاب فرانس کے دوران پہلی بار ٹیرر اور ٹیرر ازم کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ یوں تو دہشت گردی کسی نہ کسی صورت میں ہزار سال سے مستعمل رہی ہے لیکن اس کی حتمی صورت، نام، نظریہ، طریق کار اور موثر استعمال نے انقلاب فرانس کے بطن سے ہی جنم لیا۔ انگریزی کا لفظ ٹیرر ازم انگریزی زبان میں فرانسیسی لفظ **de la terreur** سے اخذ کیا گیا۔ اولاً یہ لفظ فرانس کی اس سیاسی ابتری (**1793-1794**) کو ظاہر کرنے کے لیے مستعمل ہوا جس سے فرانس دوران انقلاب دوچار ہو چکا تھا۔ یہ بات خاصی دلچسپ ہے کہ شروع میں ٹیرر ازم کو ایک مثبت نظریے اور قابل تحسین کاروائی کے طور پر پذیرائی ملی۔ شروع میں ٹیرر ازم کو یورپ میں تحسین سے دیکھا گیا اور اس پر تالیاں بجائی جاتی تھیں۔ انقلاب فرانس کے رہنما میکسی میلین پائرے نے ٹیرر ازم کو متعارف کراتے ہوئے لکھا:

> "ٹیرر ازم، انصاف، فوری ردعمل، شدید اور غیر لچکدار ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ تو مجموعی معاشرتی اخلاقیات کا ردعمل ہے۔ ٹیرر ازم فرانس کی مخصوص صورت حال کے فوری تقاضے کا ردعمل زیادہ ہے نسبتاً کہ اسے خصوصی نظریہ کہا جائے۔" 2۔ (میکسی میلین پائرے:1793)

انقلاب فرانس کے **1793-1794** کے سال کو بجا طور پر موجودہ دہشت گردی کا سال

اوّل کہا جاسکتا ہے۔ انقلابی ٹربیونل کا سربراہ ہونے کے ناطے سے میکسی میلین پاڑے کی جنبش ابرو سے فرانس ایسی بدترین دہشت گردی کی زد میں آ گیا جسے کسی صورت بھی معاشرتی اخلاقیات کا ردِعمل نہیں کہا جاسکتا۔ اس دوران پانچ لاکھ لوگوں کو پکڑا گیا۔ چالیس ہزار کو گلوٹین لگا۔ دو لاکھ ملک بدر ہوئے۔ دو لاکھ جیلوں میں بھوک اور تشدد سے مارے گئے اور بقیہ ساٹھ ہزار پیرس کی گلیوں میں دہشت گردی کی بہترین یا بدترین مثال بن گئے۔ یہ دہشت گردی اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب میکسی میلین پاڑے کو ایک اور باغی گروپ نے پکڑ کر پھانسی دے دی۔ دہشت، بے یقینی اور غیر محفوظیت کی اسی مجموعی کیفیت سے اخذ کردہ اصطلاح ٹیرر ازم کو یورپ میں اخلاقیات کا عمومی ردعمل سمجھ کر تسلیم کیا گیا۔ یہیں سے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے اور خود ہی انصاف کرنے کی ایسی نظیر قائم ہوگئی جس پر کم از کم یورپ میں کسی کو اعتراض نہیں تھا سوائے ایڈمنڈ برک کے ادھورے اعتراض کے سوا سب خاموش، یک زبان و یک رائے رہے۔

اٹھارہویں صدی کے مشہور برطانوی فلسفی ایڈمنڈ برک نے ٹیرر ازم کی اصطلاح کو ضرورت سے زیادہ استعمال کرکے اس کو مقبول عام بنانے میں تو اہم کردار ادا کیا البتہ فرانسیسی انقلابیوں اور ان کی پرتشدد کاروائیوں کی انہوں نے بھرپور مذمت کی۔ ایڈمنڈ برک یورپ میں پہلے دانشور تھے جنہوں نے ٹیرر ازم کو کسی بھی اخلاقیات کا ردعمل ماننے سے انکار کیا۔

انقلاب فرانس کے تھیلے سے جو کچھ برآمد ہوا، اس میں ٹیرر ازم کا لفظ ٹیرر ازم کا بنیادی ڈھانچہ اور ٹیرر ازم کی سریع الاثری کے علاوہ نیشنل ازم او رجدید شہریت کی اصطلاحیں بھی شامل تھیں۔ انقلابیوں کے ایک گروہ نے سیکولر ٹیرر ازم بھی متعارف کرانے کی کوشش کی لیکن اس وقت سیکولر ٹیرر ازم کی گڈی نہ چڑھ کے دی۔ انیسویں صدی کے وسط میں کارل مارکس نے انقلاب فرانس سے اخذ کردہ ٹیرر ازم کو ایک واضح سمت، دو ٹوک نظریہ او رمزید قابل قبول اصطلاحی قالب میں ڈھال دیا۔ کارل مارکس نے انیسویں صدی میں معاشی ناہمواری ختم کرنے اور طبقاتی جمود میں تبدیلی لانے کے لیے ٹیرر ازم کو طریقہ تبدیلی کے طور پر استعمال کرنے کا نظریہ پیش کرکے اس کے آزادانہ استعمال کا میدان ہموار کردیا۔ تبدیلی کے انسٹرومنٹ کے طور پر ٹیرر ازم کا استعمال نسبتاً زیادہ قابل قبول نظریہ تھا۔ تبدیلی کے انسٹرومنٹ سے منسلک ہوتے ہی ٹیرر ازم کو وہ نظریاتی اوراخلاقی قوت بھی میسر آ گئی جو اب تک ٹیرر ازم کی پشت پر نہیں تھی۔

کارل مارکس کے نظریہ ٹیرر ازم کو آگے بڑھاتے ہوئے اٹلی کے انقلابی رہنما کارلو پیاکین

نے 1857ء میں اپنی تھیوری ''احتیاج کی تشہیر'' میں ٹیرر ازم کی مزید وکالت' وضاحت اور اس کے استعمال پر زور دیتے ہوئے لکھا:

> ''ہدف کے علاوہ دور دراز متعلقین تک پیغام پہنچانے اور وسیع پیمانے پر لوگوں کی ہمدردی' حمایت اور توجہ حاصل کرنے کے لیے ٹیرر ازم کو بطور مؤثر ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت موجود ہے۔ میں اس کی غیر مشروط وکالت کرتا ہوں۔'' 3۔(ڈاکومینٹری ہسٹری آف لبرل آئیڈیاز:1880)

کارلو پیاکین کے بعد روسی انقلابی رہنما ولاڈیمیر لینن نے انفرادی سطح پر دہشت گردی کی تو مذمت کی لیکن اجتماعی اور ریاستی دہشت گردی کو انقلابیوں کا اولین ہتھیار قرار دیا۔ 1908ء میں جدید ریاستی دہشت گردی کی بنیاد رکھتے ہوئے لینن نے لکھا:

> ''ہم دہشت گردی کو ٹھکرا نہیں سکتے جیسا کہ ملٹری ایکشن میں دہشت گردی جنگ کی صورت حال کے مطابق بہترین مگر لازمی اقدام ہو سکتی ہے ہماری حالیہ جنگ (طبقاتی جدوجہد) میں اسے ایسے ہی استعمال کیا جانا چاہیے۔'' 4۔(ولاڈیمیر لینن:1908)

لینن نے جس ریاستی دہشت گردی کو متعارف کرایا تھا سٹالن نے اسے عروج پر پہنچا دیا۔ سٹالن نے ریاستی دہشت گردی کو اپنے شخصی اقتدار کے لیے بے دریغ اور بے رحمانہ استعمال کیا۔ 1950ء کے عشرے میں سٹالن کی ایزاد کردہ ریاستی دہشت گردی امریکہ سے ''سرد جنگ'' میں استعمال ہونے لگی یوں ریاستی دہشت گردی امریکہ اور ملکوں ملکوں پہنچ گئی۔ سیاسی رہنماؤں کے قتل اور قاتلانہ حملوں کو سیاسی دہشت گردی کہا جانے لگا لیکن درحقیقت یہ اسی ریاستی دہشت گردی کی ترقی یافتہ اور زیادہ سفاکانہ صورت ہے جسے سرد جنگ کے زمانے میں روس اور امریکہ نے فروغ دیا تھا۔

گویا اب ایک ایسا عفریت پیدا کیا جاچکا تھا جس کی زبان بھی تھی اور ضرورت بھی دانت بھی تھے اور پنجے بھی' نظریہ بھی تھا اور وضاحت بھی۔ اس خونخوار کی پیدائش اور افزائش میں یورپی فلاسفرز' اہل قلم' دانشور اور انقلابی سب برابر کے شریک تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ کیا یہودی اور کیا عیسائی' کیا سیکولر اور کیا کٹر حسب توفیق سب اس میں شریک تھے۔ اس خونخوار کی تخلیق کے بعد اب ضرورت اس امر کی تھی کہ اس عفریت کو کھلے میدان میں چھوڑا جائے۔ اس

میدان کے میسر آنے میں بھی دیر نہ لگی۔ روس میں این وی نامی گروپ نے جو عرف عام میں ”عوامی فیصلہ“ کے نام سے مشہور تھا یکم مارچ 1881ء کو زار روس الیگزینڈر دوئم کو قتل کر کے اسے پیاکین کی تھیوری ”احتیاج کی تشہیر“ سے منسوب کر دیا۔ این وی گروپ کے اس فعل نے ٹیرر ازم کو طریق تبدیلی کے موثر ہتھیار کے طور پر روشناس کرانے میں مرکزی کردار ادا کیا اس سے انتہا پسندوں کو نظریے کے ساتھ ساتھ ہتھیار بھی مل گیا۔ زار روس کا قتل موجودہ ماڈرن ٹیرر ازم کی سمت میں سنگ میل ثابت ہوا۔ اب ٹیرر ازم فرانس، روس یا مخصوص نظریاتی نبرد آزما گروپس کی میراث نہیں رہی تھی۔ والٹر لیکیور لکھتے ہیں:

> ”آئر لینڈ اور بلقان کے قوم پرستوں نے ٹیرر ازم کو تبدیلی کے ہتھیار کے طور پر قبول کر کے ٹیرر ازم کی عالم گیری کے خطرے کا سائرن بجا دیا تھا۔ انیسویں صدی کے خاتمے اور بیسویں صدی کے آغاز میں دہشت گردی اس قدر مقبول عام ہو چکی تھی کہ اس کے حملوں کی مار ہندوستان، جاپان اور سلطنتِ عثمانیہ تک پہنچ چکی تھی۔“ 5۔ (والٹرلیکیوز: 1999)

امریکی زمین پر یوں تو اس کی دریافتِ نو کے پہلے دن سے ہی کولمبس کی صورت میں ٹیرر ازم یہاں پہنچ چکا تھا۔ لیکن 1865ء میں سفید فام امریکیوں کی نسلی امتیاز کی بنیاد پر قائم ہونے والی کیو۔ کلکس ۔کلین (KU KLUX KLAN) نامی دہشت گرد تنظیم کے ہاتھوں ہزاروں سیاہ فام، ایشیائی اور یہودی ہلاک ہوئے۔ تنظیم کے کارکنوں نے جگہ بہ جگہ لوگوں کو درختوں سے لٹکا کر پھانسیاں لگانے کا چلن عام کیا۔ سیاہ فاموں کی فصلیں اور گھروں کو آگ لگائی اور لوگوں کو زندہ جلایا گیا۔ سفید فام امریکیوں پر مشتمل یہ تنظیم انتہا پسندی، دہشت اور قتل و غارت گری کی علامت بن کر اُبھری۔ 1930ء کے عشرے میں ٹیرر ازم نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ اس نئی صورتِ حال کے تحت مختلف ملکوں میں سیاسی قتل ہونا شروع ہوئے، یہ سیاسی دہشت گردی اس قدر بڑھی کہ 1937ء کے لیگ آف نیشنز کے کنونشن مین ٹیرر ازم کی عالمی سطح پر پہلی بار مذمت کی گئی اور اس کی روک تھام پر سوچ بچار شروع ہوئی۔ لیگ آف نیشنز کے اس اجلاس میں سوچ بچار سے زیادہ ضرورت اس امر کی تھی کہ ٹیرر ازم کی واضح اور جامع تعریف، تشریح اور حدود مقرر و متعین کر کے ان افراد، اقوام یا مذاہب کو دہشت گرد قرار دے دیا جاتا جو اس کار بد میں ملوث تھے۔ سوچا جانا چاہئے کہ اگر 1937ء میں ایسا ہو جاتا تو کون کون سے مذاہب یا کون کون سی

اقوام آج مستند دہشت گردوں میں شامل ہوتیں؟ خواہ اس میں کوئی بھی شامل ہوتا لیکن مسلمان اس میں ہرگز شامل نہ ہوتے یہ بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ جو کام 1937ء سے سن 2000ء تک نہ ہوسکا اسے عین اسی وقت پر موضوع سخن بنایا گیا جب مسلمان ہی زد پر تھے اور انہیں دہشت گرد قرار دیا جاسکتا تھا۔

یہ جان کر حیرانی ہوتی ہے کہ آج جن پر دہشت گردی کا الزام لگا کر قابل گردن زدنی قرار دیا جارہا ہے، دہشت گردی کے ارتقائی مدارج میں ان کا کوئی کردار ہی نہیں ہے۔ ٹیررازم کے بتدریجی ارتقاء سے 1960ء کے عشرے تک مسلمان اس کار بد میں کسی طرح بھی شریک نہیں تھے۔ انقلاب فرانس کی بچّہ دانی سے جس طرح ٹیررازم کو کاٹ کر نکالا گیا یہ بذاتِ خود سنسنی خیز اور غیر فطری عمل تھا۔ اس غیر فطری عمل کی نظریاتی آبیاری یورپی دانشوروں نے کی اور اس کی عملی حدود روس اور یورپی انقلابیوں نے متعین کیں۔ فرانس سے اس کا آغاز ہوا اور روس میں اس کے پہلے ٹیسٹ کیس کا مظاہرہ کیا گیا۔ امریکہ نے اس میں تکنیک، جدّت، گہرائی، شدت اور پراسس کا اضافہ کیا۔ انقلاب فرانس سے 1960ء کے عشرے تک ٹیررازم کے ارتقائی دور کے ڈیڑھ سو سالوں میں مسلم امہ بحیثیت مجموعی یا انفرادی کسی بھی حیثیت میں ٹیررازم کے قریب قریب بھی نہیں تھی۔ جو ڈھول بجانے کے لیے ہمارے سر منڈھ دیا گیا ہے نہ تو ہم نے اس کی تندی کھینچی ہے نہ ہی اس کا چمڑا خشک کیا ہے۔

1960ء اور 1970ء کے عشرے میں ٹیررازم کے افق پر مزید نظریاتی اکھاڑ پچھاڑ رونما ہوئی۔ اس نظریاتی کھینچا تانی میں آئیڈیلسٹ، نیشنلسٹ، حریّت پسند، سامراج دشمن، اہل قلم اور تخلیق کار ایک طرف اور رفریق ثانی دوسری طرف صف آرا ہوا۔ الجزائر، انڈو چائنا، کینیا، ملائیشیا قبرص، ویت نام اور فلسطین میں حریت پسندوں کی مزاحمت اوّل الذکر کے لیے حریت پسندی، شجاعت، قربانی اور حب الوطنی تھی اور موخر الذکر کے لیے تشدد، دہشت گردی اور انتہا پسندی۔ 1970ء کے عشرے میں بیک وقت دہشت گردوں کو ہار پہنانے والے اور انہیں پھانسی دینے والے دونوں فریق موجود تھے۔ بیسویں صدی کے وسط سے حریت پسندی کی جو عالمی لہر اُٹھی اس میں عوامی ہمنوائی حریت پسندوں کے حصے میں اور غیض و غضب سامراجیت کے حصے میں آیا۔ منطقی طور پر قلم کار اور تخلیق کار حریّت کے ہمنوا نکلے۔ اس لمحے کا ادراک تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کا حتمی تعین محال ہے کہ کس ساعت حریت پسند دہشت گردوں میں بدل گئے یا حریت

پسندوں کو دہشت گرد کہا جانے لگا۔ تخلیق کاروں کے بہت سے سی پارے اس ساعت پر گواہ اور اس عہد کے امین ہیں۔ شاعر خوش مجز نے جب ''وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' یا

تیرے کوچے سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

جیسا سی پارہ تخلیق کیا تو کون جانے کہ اس کی چشم تخیل نے لیلیٰ خالد سے مقبول بٹ تک کس کس کو راہ تاریک پر دیکھا ہوگا۔ اہلِ قلم کا صف ستم زدہ کا ہمنوا ہونا عوامی حمایت کی سبیل ثابت ہوا' اس صورت حال نے حریت پسندی کی کشاکش کو میڈیا پبلسٹی کی نئی طاقت سے ہمکنار کیا۔ حریت پسند جونہی ٹیررسٹ بنے' یہی کشاکش ٹیرر ازم کاز میں بدل گئی۔ آگے چل کر اسی میڈیا پبلسٹی نے موجودہ ٹیرر ازم کا رخ متعین کرنے میں اہم کردار کیا۔ اس بارے میں بروس ہوفمین لکھتے ہیں:

> ''موجودہ عہد کے دہشت گردوں نے سب سے پہلے میڈیا پبلسٹی کی طاقت کا اندازہ لگایا اور اسے ممکنہ حد تک اپنے حق میں استعمال کیا' وہ ٹیرر ازم کاز کو جغرافیائی حدود سے نکال کر وہاں تک لے گئے جہاں تک ان کے اقدامات پر تحسین کرنے والے موجود تھے۔'' 6۔ (بروس ہوفمین: 1988)

لیلیٰ خالد 1970ء کے عشرے کی میڈیا پبلسٹی یا سن 2000 کے پبلسٹی سٹنٹ کی واضح مثال ہیں۔ 1969ء میں ٹی ڈبلیو اے کے طیارے کے اغوا میں وہ اسلامی دنیا کی مجاہدہ اور ہیروئن کے طور پر سامنے آئیں اور اس سے فلسطینی کاز اقوام عالم کے سامنے ایک سنجیدہ مسئلے کے طور پر سامنے آیا۔ لیلیٰ خالد اگر اسلامی دنیا کی مجاہدہ تھیں تو یورپی میڈیا نے انہیں ''کوئین آف ہائی جیکنگ' اور بیوٹی آف ٹیرر ازم'' قرار دیا۔ حق خود ارادیت کی جدوجہد' حریت پسندی کی کشاکش اور آزادی کی کوشش جونہی دہشت گردی سے ہمکنار ہوئی وہی میڈیا جہاں فلسطینیوں کے انٹرویو چھپتے تھے' تصویریں شائع ہوتی تھیں اور ضمیمے نکلتے تھے اب وہاں فلسطینیوں کی تصویریں شناخت کے لیے شائع ہوتی ہیں۔ وہی اخبار جو ہائی جیکروں کی فیچر سٹوری شائع کر کے اخبار کی زینت بڑھاتے تھے اب ہائی جیکروں کی مذمت چھاپ کر اخبار کا ڈیکلریشن بچاتے ہیں حالانکہ فلسطینی بھی وہی ہیں' کاز بھی وہی ہے اور دہشت گرد بھی ویسے ہی ہیں۔

1970ء کے عشرے تک ٹیرر ازم کو تبدیلی لانے کے موثر ہتھیار کے طور پر شرف قبولیت

حاصل رہی ہے۔ اس شرف قبولیت کو بحال رکھا جاسکتا تھا بشرطیکہ آزادی، عزت نفس اور حریت پسندی کی راہ میں جان دینے والوں اور واقعتاً دہشت گردوں کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا گیا ہوتا۔ اسی عدم امتیاز نے 1950ء سے چلنے والی حریت پسندی کی تحاریک کی سن دو ہزار میں نفی کردی۔ حریت پسندی اور حق پرستی کے موقف پر قائم رہنا تو دور کی بات ٹھہری اب اس کا سر عام تذکرہ بھی دہشت گردی ہے موقف کو متروک اور اصولوں کو تہ تیغ ہونے میں اسی قدر دیر لگی جتنی آگرہ مذاکرات میں ناکامی سے جنرل پرویز مشرف کی سرخ روئی تک اور پھر جنرل پرویز مشرف کی کراس بارڈر ٹیررازم کی روک تھام پر کامیابی سے ہمیشہ کے لیے کالک پھرنے تک دیر لگی۔ جنرل پرویز مشرف آگرہ مذاکرات کی ناکامی سے جس قدر کامیاب ہوئے تھے یا تو انہیں اس کا ادراک نہیں تھا یا اصولی موقف کی راہ حق پر ان کے پاؤں لڑکھڑا گئے اور وہ اس پر چلتے رہنے کی صعوبت نہ جھیل سکے۔ ہمیں اچنبھا ہے کہ جب تاریخ جنرل صاحب سے یہ سوال کرے گی کہ آگرہ مذاکرات کے موقع پر وہ جنہیں دہشت گرد ماننے سے انکاری تھے اور جن کا وجود ہی نہیں تھا یکایک وہ ان کے ہونے اور ان کی روک تھام پر ہی کیسے کمربستہ ہوگئے۔ ہمیں خدشہ ہے کہ جنرل پرویز مشرف فہمیدہ ہونے کے باوجود ایسا جواب نہیں دے پائیں گے جس سے تاریخ کا سوال شرمندہ جواب ہوسکے۔

قریب نصف صدی سے آزادی اور حریت پسندی کی چلنے والی بیشتر عالمی تحاریک کا سن دو ہزار تک وہی حال ہوا جو کشمیر پر ہمارے اصولی موقف کا جنرل پرویز مشرف کے ہاتھوں ہوا۔ آزادی اور اقتدار اعلیٰ کے عین انسانی حق کو غیر مشروط ماننے کے عالمی انکار سے دہشت گردی اور حریّت پسندی کے درمیان خط امتیاز ختم ہوکر رہ گیا۔ پانی کا بہاؤ تیز ہو تو اس کے اخراج کی راہ بھی رکھی جاتی ہے۔ اخراج کی راہ مسدود ہوتے ہی دہشت گردی واضح سمتوں میں بٹ کر ملٹی پلائی ہوئی اور ٹیررازم کی نت نئی اقسام متعارف ہوئیں:

قوم پرستانہ دہشت گردی
مذہبی دہشت گردی
ریاستی دہشت گردی
بائیں بازو کی دہشت گردی
دائیں بازو کی دہشت گردی

فاشسٹ دہشت گردی

انارکسٹ دہشت گردی

دوسری عالمی جنگ کے بعد سے 1970ء کے دورانیے تک عالمی سطح پر جو دہشت گرد تنظیمیں وجود میں آئیں انہی تنظیموں اور ٹیررسٹ گروپس نے 1970ء سے 1990ء تک قائم ہونے والی دہشت گرد تنظیموں کو تربیت، رہنمائی، وسائل، بنیاد، شدت اور سرپرستی مہیا کی۔ فلسطینیوں کے بیشتر دہشت گرد گروپس انہی تنظیموں کی گود میں پلے بڑھے۔ یہ دیکھا جانا بہت ضروری ہے کہ دہشت گردی کے ان رہنما گروپس میں مسلمان کس قدر ملوث تھے یا دہشت گردی کی ان اولین رہنما تنظیموں میں مسلمانوں کی کتنی تنظیمیں، کتنے گروپس شامل تھے اور ان میں مسلم اُمہ کا اشتراک و کردار کتنا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا بھر کے بیشتر علاقوں میں آزادی، علیحدگی اور حریت پسندی کی جو تحاریک شروع ہوئیں ان میں بہت سارے مسلم ممالک کے شریک ہونے کے باوجود دہشت گرد کاروائیوں یا کسی ٹیررسٹ گروپ کی موجودگی ثابت نہیں ہوتی ہے۔ جب کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد پہلے دو عشروں میں غیر مسلم ممالک میں ایسے انتہا پسند اور سفاک دہشت گرد جتھے قائم ہو چکے تھے۔ جنہوں نے دنیا کو لرزہ براندام کر کے رکھ دیا۔ موجودہ ٹیرر ازم کے ان اولین بانی گروپس میں آئرش ری پبلکن آرمی (آئر لینڈ) ریڈ آرمی فیکشن (جرمنی)، ریڈ بریگیڈ (اٹلی)، ریڈ آرمی (جاپان)، کردش ورکرز پارٹی (ترکی اور یورپ) باسک فادر لینڈ اینڈ لبرٹی (سپین)، نیشنل لبریشن آرمی (کولمبیا، جنوبی امریکہ)، پیپلز لبریشن آرمی (پیرو جنوبی امریکہ)، جیوش ڈیفنس لیگ اور کے کے کے (امریکہ) شامل ہیں۔ یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ یہ ٹیررسٹ گروپس حقیقتاً کون تھے اور کن عوامل پر مشتمل تھے۔ ان تنظیموں میں مسلمانوں کی شرکت اور کردار کیا تھا۔

آئرش ری پبلکن آرمی (IRA)

1969ء میں شمالی آئر لینڈ میں آئرش ری پبلکن آرمی کا قیام عمل میں آیا۔ بادی النظر میں تو یہ ٹیررسٹ گروپ آئر لینڈ کو متحد کرنے اور وہاں سے برطانوی افواج کو نکالنے کے ایجنڈے پر متفق خیالات کے لوگوں پر مشتمل تھا لیکن آئر لینڈ میں دہشت گردی کی دوطرفہ اور دو آتشتہ وجوہات میں سیاسی، مذہبی اور قوم پرستانہ عنصر شامل رہا ہے۔ آئر لینڈ میں دہشت گردی کی

بنیاد 1920ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے اس فیصلے پر استوار ہوئی جس کے تحت آئر لینڈ کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا۔ پارلیمنٹ کے فیصلے سے جو آئرش ری پبلک وجود میں آئی اس میں نوے فیصد آبادی رومن کیتھولک عیسائیوں کی تھی جب کہ شمال میں چھ بڑی کاؤنٹیز برطانیہ کا حصہ رہیں ان کاؤنٹیز میں جنہیں السٹر کہا گیا ساٹھ فیصد پروٹسٹنٹ اور چالیس فیصد رومن کیتھولک آباد تھے۔ شمالی آئر لینڈ (السٹر) میں دونوں فرقوں کے سیاسی مقاصد ایک دوسرے سے متضاد ہونے کی وجہ سے مستقل خون خرابے میں بدل گئے۔ السٹر حکومت میں اکثریت کا مفاد برطانیہ کا حصہ بنے رہنے میں تھا جب کہ آئرش ری پبلک السٹر میں اقلیت ہونے کی وجہ سے ایک آئر لینڈ کی حامی تھی۔ ان سیاسی تضادات نے رومن کیتھولک بہ مقابلہ پروٹسٹنٹ مذہبی انتہا پسندی اور سیاسی نفرت کو فروغ دیا اور دونوں اطراف دہشت گردی کا خون آشام عفریت پیدا ہوگیا۔ جسے اپنے اپنے عوام کی ہمدردی اورحمایت حاصل تھی۔ اس مذہبی انتہا پسندی اور سیاسی نفرت نے نصف صدی تک دونوں فرقوں کے درمیان انتقام کی آگ کو بھڑکائے رکھا۔ 1976ء تک آئر لینڈ میں دہشت گردی اپنے عروج پر پہنچ گئی اور برطانوی افواج کو لااینڈ آرڈر بحال کرنے کے لیے مداخلت کرنی پڑی۔ برطانوی افواج نے لا اینڈ آرڈر تو جس قدر بھی بحال کیا ہو البتہ وہ دہشت گردوں کا ترجیحی اور لازمی ہدف ضرور بن گئی۔

1998ء میں آئرش ری پبلکن آرمی اور برطانوی حکومت کے درمیان بلفاسٹ معاہدہ ہو جانے تک برطانیہ اورآئر لینڈ شدید دہشت گردی کا شکار رہے۔ بلفاسٹ معاہدہ حکومتوں کی اس پالیسی کی نفی کرتا ہے جو دہشت گردوں سے مکالمے کا دروازہ بند کرتی ہے۔ آئرش ری پبلکن آرمی اور السٹرفورس کے ایک ہزار دہشت گرد حملوں میں ہزاروں لوگ ہلاک ہوئے۔ ان ہلاک ہونے والوں میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے لے کر عام برطانوی کسبیاں تک یکساں شکار ہوئیں۔ ان آئرش دہشت گردوں کی شقاوت اور مہارت کا یہ عالم تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے قتل کے چند گھنٹے بعد ہی چھ برطانوی فوجی بم دھماکوں سے ہلاک کئے گئے۔ جب فوجیوں میں بھگدڑ مچی اور وہ پناہ گاہوں میں آچھپے تو پناہ گاہ مقتل میں بدل گئی۔ یہاں نصب شدہ بم عین وقت اور ہدف پر پھٹے' اس سے مزید بارہ فوجی مارے گئے۔ برطانوی حکومت نے اسے کلاسیک گوریلا حملہ قرار دیا اور پوپ جان پال نے رومن کیتھولک دہشت گردوں سے قتل و غارت گری روک دینے کی ذاتی اپیل کی۔ اس اپیل کے جواب میں السٹرفورس متحرک ہوگئی اور خون خرابہ دگر

شروع ہوگیا۔ اس بارے میں دو رائے نہیں ہیں کہ یہ سب دہشت گرد قدامت پسند اور کٹر عیسائی عقیدے سے وابستہ تھے لیکن اس کے باوجود دنیا بھر کے میڈیا میں بشمول مسلم میڈیا کے ان دہشت گردوں کو عیسائی دہشت گرد نہیں کہا گیا۔ آئرش ری پبلکن آرمی سے مسلمانوں کا دور پرے کا بھی کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا ہے۔

ریڈ آرمی فیکشن (RAF)

1968ء میں جرمنی کا ریڈ آرمی فیکشن بربریت کی علامت بن کر ابھرا۔ بائیں بازو سے وابستہ اس گروپ کے دہشت گرد ''شہری گوریلے'' کہلاتے تھے۔ 1977ء تک اس گروپ کی دہشت گردی نے جرمنی کو مفلوج کرکے قومی بحران پیدا کردیا۔ امریکی سرمایہ دارانہ نظام کے ردِ عمل میں وجود میں آنے والی اس تنظیم کو دہشت گرد بننے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ جرمن طلباء کے ایک عام مظاہرے سے جنم لینے والی یہ تنظیم ''تیسری دنیا کے مظلوم عوام کی طاقت'' کے نام پر احتجاجی مظاہروں سے ایک خوفناک ٹیررسٹ گروپ میں بدل گئی۔ جرمن اشرافیہ کے بڑے نام ان کا خاص نشانہ بنے اس بے مقصد قتل و غارت گری میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ریڈ آرمی کے دہشت گرد ٹیلیفون ڈائریکٹری سے امتیازی نام اور پتے نوٹ کرتے اور انہیں قتل کرنے چل پڑتے۔ اس تنظیم میں مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں نے بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس گروپ میں اوسطاً پچاس فیصد مرد اور پچاس فیصد عورتوں کا تناسب برقرار رکھا گیا۔ خوب رو اور نوجوان الرک مین ہوف جب اس گروپ کی سربراہ بنی تو گروپ کی متشددانہ سرگرمیاں اپنے عروج پر پہنچ گئیں۔ الرک مین ہوف نے نوجوان دہشت گردوں کو رجھائے رکھنے کے لیے گروپ سیکس کی ترغیب دی اور ٹیرر سیکس متعارف کرایا۔ ستر کے آخری عشرے میں یہ جنسی اصطلاحیں جرمنی سے امریکہ پہنچیں۔ ٹیرر سیکس تو یہاں کامیاب نہ ہوسکا البتہ گروپ سیکس کے یوں بھاگ جاگے کہ وہ یہاں جرمنی سے زیادہ چلا۔ 1970 سے 1979ء کے درمیانی عرصے میں اس گروپ نے مختلف کاروائیوں میں 163 افراد یرغمال بنائے جن میں سے اکثریت قتل ہوئی۔ مغربی جرمنی کے اٹارنی جنرل بھی اس گروپ کے یرغمال رہے۔ بعد ازاں الرک مین ہوف نے بنان میں فلسطینیوں کو تربیت دی اور الفتح، پاپولر فرنٹ اور پی ایل او کی کاروائیاں منظم کیں اور بنان کے ٹریننگ کیمپس میں پرنس آف ٹیررازم کہلائی۔

ریڈ بریگیڈ (اٹلی)

بائیں بازو کا یہ انتہا پسند ٹیررسٹ گروپ 1968ء میں وجود میں آیا۔ میلان کی آٹو فیکٹریز کے ٹریڈ یونین دانشوروں نے یونیورسٹی طلباء کے اشتراک سے ایک ایسی احتجاجی تحریک کھڑی کردی جس کا طریق کار دہشت سے عبارت تھا۔ اس گروپ میں رومن کیتھولک پروٹسٹنٹ اور اشتراکی انتہا پسند شامل تھے۔ ریڈ بریگیڈ نے 1985ء تک دس ہزار حملوں میں سینکڑوں بے گناہ قتل کیے۔ 1978ء میں اٹلی کے پانچ مرتبہ منتخبہ وزیراعظم ایلڈو مورو اسی گروپ کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ 1981ء میں امریکی جنرل جیمز ڈوزیر بھی انہی کے ہاتھوں اغواء ہوئے۔ ریڈ بریگیڈ کے اسٹیبلیشمنٹ مخالف نظریے نے اٹلی کے نوجوانوں کو خاصا متاثر کیا اور انہیں اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔ ''سیاستدان صرف تشدد کی زبان سمجھتے ہیں'' کے نعرے نے اٹلی کے بے روزگار اور محروم طبقے کو ریڈ بریگیڈ کے حامی عنصر میں بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بلیک ستمبر اور پاپولر فرنٹ کے اولین فلسطینی دہشت گردوں کو ریڈ بریگیڈ نے ہی تربیت دی اور 1985ء تک پی ایل او کی ماں بنی رہی۔

ریڈ آرمی جاپان (JRA)

مشرق بعید میں بائیں بازو کا یہ دہشت گرد گروپ 1968ء میں اس وقت وجود میں آیا جب کچھ نوجوان اور جوشیلے کمیونسٹ طلباء ایک طیارہ اغوا کرکے شمالی کوریا لے گئے وہاں شمالی کوریا کی خفیہ سروسز سے تعلقات استوار ہو جانے پر ان لوگوں نے دہشت گردی کو ہی بطور پیشہ اپنا لیا۔ دہشت گردوں کا یہ اولین ایسا گروہ تھا جو دہشت گردی برائے دہشت گردی کی بنیاد بنا۔ کوئی مخصوص نظریاتی دباؤ یا عمرانی اصول ان کی پشت پر نہیں تھا۔ 1971ء میں شیگن نوبوفساکو کی زیر قیادت ریڈ آرمی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ شیگن نازک اندام خاتون ہونے کے باوجود ٹیرررسٹ بڑی جی دار نکلی۔ 1972ء میں شیگن بیروت منتقل ہوگئی یہاں اس نے پی ایل او کے اس گروپ کی قیادت کی جو اسرائیل کو امریکی سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ سمجھ کر اس کے خلاف صف آراء تھا۔ شیگن نے اولین فلسطینی ٹیررسٹ گروپس بلیک ستمبر، پاپولر فرنٹ اور الفتح کو ہائی جیکنگ کے بعد مذاکراتی مزاحمت کی تربیت دی۔ 1974ء میں شیگن کو شام اور شمالی کوریا کی حمایت حاصل ہوگئی اس حمایت سے وہ بائیں بازو کی بین الاقوامی دہشت کی علامت بن گئی۔ ریڈ آرمی (شیگن

گروپ) نے یورپ میں مغربی اور امریکی مفادات کو ہدف بنائے رکھا پھر ایشیاء میں کاروائیاں کیں ایشیاء کے بعد امریکہ کی باری آئی اور ریاست نیو جرسی تشدد کی زد میں آ گئی۔ منیلا اور سنگاپور میں عالمی سرمایہ داری کے خلاف ڈیموکریٹک فرنٹ کے دہشت گردوں کو بھی شیگن نے تربیت، رہنمائی اور وسائل مہیا کیے حتیٰ کہ وہ سن 2000ء میں جاپان میں گرفتار ہوئی۔

کردش ورکرز پارٹی (ترکی، یورپ)

1970ء کے عشرے میں ترکی کی یونیورسٹیز میں دانشوروں، پروفیسرز اور اہل قلم کا ایک فورم مذہب کی مذمت، سیکولر ازم کا فروغ اور ترکی میں منشیات کے بڑھتے ہوئے استعمال کے خلاف منشور پر عمل میں آیا مگر جلد ہی اس کی قیادت کرد دانشوروں کو منتقل ہو گئی جنہوں نے اس کا رخ موڑ کر نیشنل ازم کی طرف کر دیا۔ 1973ء تک یہ فورم لادین عناصر اور اسلام کے مخالفین کے لیے مختص ہو کر رہ گیا۔ کردوں کے لیے علیحدہ وطن کے دل فریب نعرے نے ہزاروں نوجوان کردوں کو اس پارٹی میں جمع کر لیا۔ لبنان میں ان نوجوانوں کی تربیت ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے کردش ورکرز پارٹی، کرد آزادی کے نام پر مصروف کار ہو گئی۔ ترکی اور عراق میں کرد علاقہ اور کرد ایرانی پٹی تشدد کی لپیٹ میں آ گئے۔ جو کردوں کے ساتھ نہیں تھا اسے کردوں کے خلاف سمجھ کر قتل کیا جانے لگا۔

''ثابت ہوتا ہے کہ تم ہمارے ساتھ ہو یا ہمارے خلاف ہو'' والا نظریہ پہلے بھی کچھ کم خون آشام نہیں تھا۔ اسی نظریے کی چھتری تلے بلا امتیاز ترک، عراقی، ایرانی آبادیوں کی آبادیاں قتل ہوئیں۔ کرد دہشت گردوں نے سفاکی کی انتہا کر دی۔ کرد دہشت گردوں نے مخالفین کو گڑھوں میں کھڑا کر کے سیمنٹ سے بھر دینے کا نظریہ متعارف کرایا۔

1989ء تک تین لاکھ افراد اس پارٹی کی دہشت گردی کا شکار ہو چکے تھے۔ 1990ء میں مغرب اور امریکہ مخالف جذبات پروان چڑھے تو یورپی سیاح امریکی کارکن اور چرچ کے ملازمین اغواء اور قتل ہونے شروع ہو گئے۔ کردش ورکرز پارٹی کے دہشت گرد لاکھوں میں بتائے جاتے ہیں اور اس پارٹی کو منظم اور سفاک ترین دہشت گرد گروپ سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان اس پارٹی کا سب سے بڑا شکار بنے۔

باسک فادر لینڈ اینڈ لبرٹی (سپین)

یہ دہشت گرد تنظیم 1955ء میں عمل میں آئی۔ اسے قدیم ترین انتہا پسند گروپ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ سپین اور فرانس کی سرحد پر سو مربع میل پر مشتمل باسک ریجن کو علیحدہ اور خود مختار ریاست بنانے کی غرض سے قدامت پسند عیسائیوں پر مشتمل اس تنظیم نے 1956ء میں ہسپانوی حکام کا قتل عام شروع کیا۔ آہستہ آہستہ جنرل فرانکو کے مخالف عناصر بھی اس میں شامل ہوتے گئے۔ اس سے تنظیم کا دائرہ کار وسیع اور رویہ متشددانہ ہوتا گیا۔ صرف 1968ء میں اس تنظیم کے ہاتھوں آٹھ سو بے گناہ دہشت گردی کی مختلف کارروائیوں میں ہلاک ہوئے۔ 1970ء کے عشرے میں سیاحوں کا اغواء، اغوا برائے تاوان، بنک ڈکیتیاں اور ٹارگٹ کلنگ شروع کی گئی۔ خصوصاً سپین اور فرانس جانے والے سیاح خصوصی نشانہ بنے رہے۔ باسک کے دہشت گردوں نے باسک ریجن میں دہشت زدہ ماحول اور پُر تشدد ثقافت کو بعینہٖ اسی طرح پروان چڑھایا جس طرح آئرش ری پبلکن آرمی نے آئرلینڈ میں یہ کام انجام دیا تھا۔ اس تنظیم کے تربیتی مراکز نکاراگوا، کیوبا اور پیرو میں قائم ہوئے جب کہ وسائل اور سرپرستی جنوبی امریکہ سے مہیا کی جاتی رہی۔

نیشنل لبریشن آرمی (NLA) کولمبیا، جنوبی امریکہ

کیوبا کے انقلابی رہنما فیڈرل کاسترو اور چے گیویرا کے پیروکاروں پر مشتمل دانشوروں کے ایک گروپ نے 1963ء میں جنوبی امریکہ میں مارکسی نظریات کو فروغ دینے کی غرض سے ایک تھنک ٹینک تشکیل دیا جو دو ہی سالوں میں ٹینک سے گرینیڈ میں بدل گیا۔ فکری سرمستیوں کی صف لپیٹ کر عملی جدوجہد شروع کرنے کے فیصلے سے دہشت گردی در آئی، اغوا، تاوان، بم دھماکے، ہائی جیکنگ اور ڈکیتیاں 2004ء تک جاری رہیں۔ سن 2004ء میں کولمبیا کے صدر کی طرف سے مذاکرات کی دعوت کے دوران کچھ عرصہ امن رہا لیکن مذاکرات کی ناکامی سے دہشت گردی دوبارہ شروع ہوچکی ہے۔ اولاً اس تنظیم کی سرگرمیاں کولمبیا کے دور دراز دیہاتی علاقوں میں سماجی انصاف کی فراہمی کے نعرے سے شروع ہوئیں لیکن جلد ہی شہروں میں امریکن اور یورپین کمپنیز کے ملازمین کو اغواء کرکے بھاری تاوان کے بدلے میں رہا کرنے میں بدل گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہائی جیکنگ، تیل کی تنصیبات پر حملہ اور منشیات کی سمگلنگ میں این ایل

اے کے دہشت گردوں نے ہزاروں بے گناہ ہلاک کر دیئے۔ 1980ء سے یہ گروپ خالصتاً منشیات کے کاروبار سے منسلک ہو کر رہ گیا اور امریکن نارکوٹکس کنٹرول کے ملازمین اس کی سفاکی کا سب سے بڑا نشانہ بنے۔ کیوبا' کولمبیا اور وینزویلا کے سرحدی پہاڑی اور دشوار گزار علاقوں میں اس گروپ کی سرگرمیاں طویل عرصے سے جاری ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد جن دہشت گرد تنظیموں نے موجودہ ٹیررازم کی بنیاد فراہم کی' ٹیررازم کو تبدیلی کے ہتھیار کے طور پر متعارف کرایا' اسے فروغ اور وسعت دی ان میں مسلمان انفرادی' اجتماعی یا ریاستی کسی بھی حیثیت میں شریک نہیں تھے۔ دہشت گردوں کی اکثریت کے عیسائی ہونے کے باوجود عیسائیت کو دہشت گردی سے منسلک نہیں کیا گیا جب کہ مسلم اُمہ جو اس کار بد میں کسی طرح بھی شریک نہیں تھی۔ دہشت گردی کے الزام سے دوچار ہوگئی۔ آج کے دہشت گردوں کی اکثریت انہی دہشت گرد تنظیموں کی تربیت یافتہ ہے جو عیسائی عناصر پر مشتمل تھے۔ ریڈ آرمی فیکشن جرمنی' ریڈ بریگیڈ اٹلی' ریڈ آرمی جاپان اور باسک فادر لینڈ اور لبرٹی نے اگر فلسطینیوں کو تربیت اور رہنمائی مہیا کی تھی تو سی آئی اے نے القاعدہ کو۔ رسوائے زمانہ دہشت گرد کارلوس دی جیکال' شیگن نو بوفسا کو اور الرک مین ہوف کے اشتراک' تعاون اور تربیت نے مسلمان دہشت گردوں کو نمایاں اور مسلم دہشت گردی کو مشتہر کرنے میں خصوصی کردار ادا کیا۔ کارلوس دی جیکال کا 1975ء میں آسٹریا میں اوپیک کانفرنس کے شرکاء کو یرغمال بنانے اور کئی سو ملین ڈالر تاوان وصول کر کے کامیابی سے فرار ہو جانے کی کاروائی کو فلسطینیوں کے سر منڈھ دینے سے دہشت گردی میں مسلم مہارت کا ایسا تاثر ابھرا کہ جس سے عیسائی' یہودی اور سیکولر دہشت گردی پسِ پردہ چلی گئی اور مسلم دہشت گرد صفحہ اوّل پر نمایاں ہو گئے ____ جب کہ ادھر یہ پوچھا جارہا تھا کہ ہمیں دھکا کس نے دیا تھا۔

ماڈرن ٹیررازم کی ایزاد' فروغ' وسعت اور پھیلاؤ میں مسلمانوں کا حصہ صفر ہونے کے بعد یہ دیکھا جانا چاہیئے کہ مسلمان مجموعی دہشت گردی کا کتنا فیصد اور مجموعی دہشت گرد تنظیموں کے کتنے فیصد میں ملوث ہیں۔ دوسرے مذاہب کی دہشت گردی کے مقابلے میں مسلمانوں پر دہشت گردی کا الزام زیادہ ہے یا دہشت گردی میں ان کی شرکت کا تناسب:

ٹیررسٹ گروپ	ملک/ علاقہ	مسلم/ غیر مسلم
ناگالینڈ ریبلز	انڈیا	غیر مسلم
نیشنل لبریشن فرنٹ	انڈیا	غیر مسلم
کیو۔ کلکس۔ کلین	امریکہ	غیر مسلم
لارڈز آرمی	سوڈان	غیر مسلم
ببر خالصہ	انڈیا	غیر مسلم
دل خالصہ	انڈیا	غیر مسلم
انٹرنیشنل سکھ یوتھ فیڈریشن	انڈیا	غیر مسلم
بھنڈروالا ٹائیگر فورس	انڈیا	غیر مسلم
شہید خالصہ فورس	انڈیا	غیر مسلم
خالصتان لبریشن فورس	انڈیا	غیر مسلم
خالصتان کمانڈو فورس	انڈیا	غیر مسلم
خالصتان لبریشن فرنٹ	انڈیا	غیر مسلم
خالصہ نیشنل آرمی	انڈیا	غیر مسلم
دیش مَش رجمنٹ	انڈیا	غیر مسلم
شیو سینا	انڈیا	غیر مسلم
بجرنگ دل	انڈیا	غیر مسلم
شام باجی بریگیڈ	انڈیا	غیر مسلم
رن ویر سینا	انڈیا	غیر مسلم
کاچ/ کاہان چائی	اسرائیل	غیر مسلم
ابو سیاف گروپ	فلپائن	مسلم
الجمع السلامیہ	مصر	مسلم
آرمڈ اسلامک گروپ	الجزائر	مسلم

انصار السلام	عراق	مسلم
القاعدہ	افغانستان، یمن، سعودی عرب	مسلم
اثبات الانصار	لبنان	مسلم
جماعت التوحید والجہاد	عراق	مسلم
حرکتہ المجاہدین	پاکستان/کشمیر	مسلم
اسلامک موومنٹ آف ازبکستان	ازبکستان	مسلم
جیش محمد	پاکستان	مسلم
جیش انصار السنہ	عراق	مسلم
جموں اینڈ کشمیر لبریشن فرنٹ	کشمیر/ پاکستان	مسلم
جماع السلامیہ	جنوب مشرقی ایشیاء	مسلم
لشکر جھنگوی	پاکستان	مسلم
لشکر طیبہ	پاکستان	مسلم
مکتب الخدمت	افغانستان	مسلم
مراکو اسلامک گروپ	مراکو، سپین	مسلم
سلافسٹ گروپ	الجزائر	مسلم
سپاہ صحابہ	پاکستان	مسلم
کردش حزب اللہ	ترکی	مسلم
نیشنل ڈویلپمنٹ فرنٹ	انڈیا	مسلم
حماس	فلسطین	مسلم
فلسطینی اسلامی جہاد	فلسطین	مسلم
الاقصیٰ بریگیڈ	فلسطین	مسلم
حزب اللہ	لبنان	مسلم
آئرش ری پبلکن آرمی	آئرلینڈ	غیر مسلم

پرویزنل آئرش ری پبلکن آرمی	آئرلینڈ	غیر مسلم
آئرش نیشنل لبریشن آرمی	آئرلینڈ	غیر مسلم
لبریشن ٹائیگر آف تامل	سری لنکا	غیر مسلم
السٹر فریڈم فائٹر	آئرلینڈ	غیر مسلم
السٹر والنٹیئر فورس	آئرلینڈ	غیر مسلم
السٹر ڈیفنس فورس	آئرلینڈ	غیر مسلم
اورنج والنٹیئر ز	آئرلینڈ	غیر مسلم
لائل والنٹیئر فورس	آئرلینڈ	غیر مسلم
ایسٹ ترکستان اسلامک موومنٹ	وسطی ایشیاء، چین	مسلم
باسک فادر لینڈ اینڈ لبرٹی	سپین، جنوبی فرانس	غیر مسلم
فرنٹ ڈی لبریشن کیوبک	کینیڈا	غیر مسلم
لبریشن سیل	کینیڈا	غیر مسلم
گرے وولف (کرسچین)	ترکی	غیر مسلم
کوسو لبریشن آرمی	کوسوو	غیر مسلم
کردستان ورکرز پارٹی	ترکی	غیر مسلم
لاس ماچی ٹیریوز	پورٹر یکو	غیر مسلم
نیشنل فرنٹ لبریشن کارسیکا	فرانس	غیر مسلم
ایکشن ڈائریکٹ	فرانس	غیر مسلم
آرمینیا سیکرٹ آرمی فار لبریشن	لبنان، آرمینیا	غیر مسلم
چوکا کوہا	جاپان	غیر مسلم
کمیونسٹ پارٹی آف نیپال	نیپال	غیر مسلم
کمبوڈیا نیشنل لبریشن	کمبوڈیا	غیر مسلم
گراپو	سپین	غیر مسلم

جاپان ریڈ آرمی	جاپان	غیر مسلم
میئیول راڈ ری گز فرنٹ	چلی	غیر مسلم
نیشنل سوشلسٹ کونسل آف ناگا لینڈ	انڈیا	غیر مسلم
نلسیلو	انڈیا	غیر مسلم
نیو پیپلز آرمی	فلپائن	غیر مسلم
17-N	یونان	غیر مسلم
پیپلز وار گروپ	انڈیا	غیر مسلم
ریڈ آرمی فیکشن	جرمنی	غیر مسلم
ریڈ بریگیڈ	اٹلی	غیر مسلم
آرمڈ فورسز آف کولمبیا	کولمبیا	غیر مسلم
شائننگ پاتھ	پیرو	غیر مسلم
ٹو پیک امارو موومنٹ	پیرو	غیر مسلم
یونائیٹڈ لبریشن فرنٹ آف آسام	انڈیا	غیر مسلم
روانڈا لبریشن آرمی	روانڈا	غیر مسلم
آرین نیشنز	یورپ	غیر مسلم
بور میگ	جنوبی افریقہ	غیر مسلم
کمبیٹ۔18	برطانیہ	غیر مسلم
کالم۔88	برطانیہ	غیر مسلم
نیشنل سوشلسٹ موومنٹ	برطانیہ	غیر مسلم
الینازا انٹی کمیونسٹ	ارجنٹائن	غیر مسلم
کونٹراز	نکارا گوا	غیر مسلم
کوآرڈی نیشن آف یونائیٹڈ آرگنائزیشن	کیوبا	غیر مسلم
ڈیتھ سکواڈ	السالواڈور	غیر مسلم

اومیگا۔7 (انٹی کاسترو)	کیوبا' امریکہ	غیر مسلم
الفا۔66 (انٹی کاسترو)	کیوبا' امریکہ	غیر مسلم
منگوز گینگ	گرینیڈا	غیر مسلم

7۔ (وکی پیڈیا: 2005)

مصدقہ حوالوں سے مرتب یہ درج بالا فہرست سن 2005ء تک' ان تمام دہشت گرد تنظیموں کا احاطہ کرتی ہے جو پچھلے تین عشروں سے کسی نہ کسی طرح دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ دہشت گرد تنظیموں کی اس عالمی فہرست میں بلا امتیاز' رنگ' نسل' مذہب' علاقہ اور نظریہ چورانوے دہشت گرد گروپس شامل ہیں جن میں مسلمان دہشت گرد تنظیموں کی تعداد پچیس ہے۔ فرد واحد کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل پر محمول کرنے والی اُمہ کے لیے یوں تو مسلم دہشت گردوں کی ایک تنظیم بھی وجہ اضطراب ہے لیکن عالمی دہشت گردی کے افق پر چوانوے ٹیررسٹ گروپس کی موجودگی میں پچیس تنظیموں کے جزو کو کل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ستائیس فیصد کو سو فیصد کیسے کہا جاسکتا ہے؟

دہشت گردی کے لگ بھگ اتنے گروپ تو صرف ایک ملک انڈیا ہی میں پائے جاتے ہیں۔ انڈیا میں تئیس دہشت گرد گروپس کی موجودگی سے یہ اخذ کرنا عین منطقی ہے کہ اگر عالمی دہشت گردی کے ایک چوتھائی میں ملوث صرف ایک ملک کو دہشت گرد قرار نہیں دیا جاسکتا تو چون ملکوں میں پھیلی ہوئی مسلم اُمہ کو دہشت گرد کیسے کہو گے؟ مذہبی بنیادوں پر دہشت گرد ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا جانے لگا تو حقائق کے مطابق درجہ بندی اس طرح ہوگی:

1۔ عیسائی دہشت گردی

2۔ ہندو دہشت گردی

3۔ سیکولر دہشت گردی

4۔ یہودی دہشت گردی

5۔ مسلم دہشت گردی

عالمی دہشت گردوں کی اس فہرست سے مسلم اُمہ کے اس خدشے کی تصدیق ہوتی ہے کہ عالمی دہشت گردی میں ان کا کردار اس قدر نہیں ہے جتنا کہ ان پر الزام ہے۔ یہ ایک سوچی سمجھی اور طے شدہ سازش کے تحت ہے یا ہم اتفاقاً بھنور کی آنکھ میں آچکے ہیں تاریخ اس بارے

میں جو بھی فیصلہ کرے لیکن حقائق اول الذکر کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ہمیں ان حقائق کو جاننا ہوگا' مدِ نظر رکھنا ہوگا اور تاریخ کے فیصلہ کن لمحے میں اپنی بے گناہی کی شہادت میں پیش کرنا ہوگا۔

وکی پیڈیا کے برعکس یو۔ ایس۔ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے عالمی دہشت گردوں کی جو فہرست جاری کر رکھی ہے اس میں نہ تو اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک انڈیا کی دہشت گرد تنظیمیں شامل ہیں نہ دل کے سرور یہودیوں کی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی فہرست نے دہشت گردی اور مسلمانوں کو لازم و ملزوم بنا کر پیش کیا ہے۔ اس فہرست کا عنوان یو۔ ایس سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ٹیررسٹ لسٹ کی بجائے ''مسلمانوں سے ہوشیار رہو'' لگتا ہے۔ یو۔ ایس سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی اس فہرست کے بارے میں شیلا موساجی لکھتی ہیں:

> ''اس طرح کی فہرستوں اور اعداد و شمار سے صرف یہی نتیجہ اخذ کیا جانا چاہئے کہ ہمیں محتاط رہنا ہوگا کہ حتمی رائے کی بنیاد جانبدارانہ اور غلط سمت میں لے جانے والی اطلاعات پر استوار نہ ہو'' 8۔ (شیلا موساجی:2005)

یو۔ایس سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے شانہ بشانہ یو ایس کانگریشنل ریسرچ سروسز کا ہدف بھی مسلمان ہی ہیں۔ کانگریس کی سی آر ایس رپورٹ فروری 2004ء میں جن چھتیس دہشت گرد تنظیموں پر تحقیقی مواد پیش کیا گیا ہے اس میں بھی ساٹھ فیصد تحقیقی کام مسلم دہشت گرد گروپس کے بارے میں ہے جب کہ عالمی دہشت گردی میں ایک چوتھائی تنظیموں کے حامل ملک انڈیا کی ایک تنظیم بھی شامل نہیں ہے۔ شیلا موساجی کے بقول اس طرح کی جانبدارانہ اور غلط سمت میں لے جانے والے حقائق کی بنیاد پر قائم کردہ رائے کو معتبر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

موجودہ ٹیررازم کا آغاز 1969ء میں مسجد اقصیٰ کی آتش زدگی کے سانحے سے ہوا۔ اس واقعے نے آنے والے عشروں میں مسلم دہشت گردی کے کردار کا تعین کردیا تھا۔ 21 اگست 1969ء کو مسجد اقصیٰ کو نذر آتش کیا گیا۔ آگ لگانے کے اس بہیمانہ واقع سے مسجد کا بڑا حصہ جل کر خاکستر ہوگیا اسی آتش زدگی میں سلطان صلاح الدین ابو ایوب کا نذر کردہ ہاتھی دانت اور صندل کا ہزار سالہ نایاب منبر بھی نذر آتش ہوا۔ دو روز بعد ڈینس مائیکل روہن نامی ایک یہودی النسل عیسائی نے عدالت میں اقرار جرم کرتے ہوئے یہ کہہ کر مسلم دہشت گردی کو جواز مہیا کردیا کہ وہ مسجد اقصیٰ کو خاکستر کرکے اس کی جگہ یہودی معبد ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کی راہ ہموار کرنا

چاہتا تھا۔ دہشت گردی کے اس واقع نے مسلم دنیا پر عموماً اور فلسطینیوں پر خصوصاً ایسے گہرے اثرات مرتب کیے جو نصف صدی پر پھیل گئے۔ آگ کی شدت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1970ء میں مسجد اقصیٰ کی مرمت اور بحالی پر دس ملین ڈالر خرچ ہوئے۔ یہ واقعہ جس قدر زود آتش تھا اس کا ردعمل بھی اسی قدر' دوررس ثابت ہوا۔ اس واقعہ سے عالمی دہشت گردی میں جس قدر تیزی' تندی اور خون آشامی شامل ہوئی اس کا کلائمکس گیارہ ستمبر سن 2001ء کو نیویارک میں ہوا۔ اس امر کے باوجود کہ موجودہ دہشت گردی کے نقطہ آغاز پر مسلمان دہشت گردوں میں شامل نہیں تھے بلکہ دہشت گردی کا شکار ہوئے تھے۔ 1970ء کے عشرے کو ایک طرف ماڈرن ٹیرر ازم کے آغاز کا دورانیہ قرار دیا جاتا ہے اور دوسری طرف اس آغاز کا سہرا مسلم اُمہ کے سر باندھ دیا گیا ہے۔ یہ تو قرین قیاس ہے کہ 1970ء ماڈرن ٹیرر ازم کا نقطہ آغاز ہی ہو لیکن اعداد و شمار' حقائق اور واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ مسلمان پچھلے تین عشروں میں دہشت گرد نہیں بلکہ دہشت گردی کا شکار ہوئے ہیں۔ پچھلے تین عشروں کی دہشت گردی کی جس کالک سے ہمارا منہ کالا کیا جا رہا ہے ہم اس کالک کے ایک چوتھائی کے بھی سزاوار نہیں ہیں۔

ہمیں اقتدار کے ربتھے ہوئے مسلمان حکمرانوں کے خالص خود سپرد اور معذرت خواہانہ رویے پر تین حروف بھیجتے ہوئے 1970ء کے عشرے میں عالمی دہشت گردی کے المناک واقعات کا احاطہ اور تجزیہ کر کے مبنی بر حقیقت نتائج اخذ کرنا ہوں گے۔ اس صریحاً جھوٹے الزام کو پوری شدت سے جھٹلانا ضروری ہے کہ مسلم اُمہ پر جس ماڈرن ٹیرر ازم کو شروع کرنے کا الزام عائد ہے اس کی حقیقت صرف اسی قدر ہے کہ جتنا عراق میں وسیع تباہی کے ہتھیاروں کا ہونا سچ تھا۔ 1970ء کے عشرے میں عالمی دہشت گردی کے ریکارڈ کردہ واقعات کی درج ذیل تفصیل سے حقائق اخذ کرنے اور الزام رد کرنے کے لیے کسی خصوصی تجزیاتی مہارت کی ضرورت نہیں ہے۔

1970ء

22 تا 29 جنوری

سپین میں باسک فادر لینڈ اینڈ لبرٹی کے سولہ میں سے چھ دہشت گردوں کو ایک پولیس آفیسر کے قتل میں سزائے موت کا حکم سنائے جانے کے خلاف باسک کے دہشت گردوں کے شدید ردِعمل کے نتیجے میں متاثرہ

علاقوں میں جزوی ایمرجنسی کا نفاذ کردیا گیا۔ لوٹ مار، توڑ پھوڑ، مظاہرے، ہڑتال، جلوس اور تشدد کا اختتام جرمن سفارت کار کے اغواء پر ہوا۔

10 فروری

میونخ ایئر پورٹ پر اسرائیلی ایئر لائن کی مسافر بس پر فلسطینی دہشت گردوں کے حملے میں ایک مسافر ہلاک، گیارہ شدید زخمی ہوگئے۔ لبریشن آف فلسطین کے تینوں حملہ آور گرفتار کرلیے گئے۔

21 فروری

پاپولر فرنٹ، فلسطین لبریشن کے دہشت گردوں نے زیورخ کے قریب سوئس ایئر لائن کے طیارے میں دھماکہ کرکے جہاز تباہ کردیا۔ 47 مسافر ہلاک ہوگئے۔

8 مئی

شمالی فلسطین کے علاقے میں آباد کردہ اسرائیلی بستی ایویوم میں سکول بس پر دہشت گرد حملے میں بارہ افراد ہلاک کردیئے گئے جن میں نو بچے شامل ہیں۔ پی ایل او نے ذمہ داری قبول کرلی۔

14 مئی

مغربی جرمنی میں ریڈ آرمی فیکشن کے رہنما، بائیں بازو کے مشہور عالم دہشت گرد اینڈ ریز بیڈر کو الرک مین ہوف کی سرکردگی میں مغربی برلن کی جیل سے رہا کرالیا گیا۔ کاروائی کے دوران جیل کی لائبریرین ہلاک ہوگئیں۔

18 مئی

نیویارک میں روسی ایئر لائن ایروفلوٹ کے دفتر میں بم دھماکے سے عمارت کو شدید نقصان پہنچا۔ جیوش ڈیفنس لیگ کے ملوث ہونے کا شبہ ظاہر کیا جارہا ہے۔

31 جولائی

ٹوپیک امارو ٹیررسٹ گروپ نے مونٹی ویڈیو یوراگوائے میں یو۔ ایس

ایڈ۔ مشن کے مشیر کو اغوا کر کے قتل کر دیا۔ 31 جولائی کو لاش یو۔ ایس ایڈ۔ مشن کے سامنے پھینک دی گئی۔

24 اگست

امریکی ریاست وسکانسن میں، وسکانسن یونیورسٹی کے شعبہ ریاضیات میں بم دھماکہ سے ایک پروفیسر ہلاک کئی طلباء زخمی ہو گئے۔

6 ستمبر

ڈاسن فیلڈ اردن میں بیک وقت تین مختلف ایئر لائنز ٹی ڈبلیو اے، سوئس ایئر اور بی او اے سی کے طیاروں کے اغوا میں چار سو مسافر یرغمال بنا لیے گئے جب کہ لندن میں اسرائیلی ایئر لائن کے اغوا کی کوشش میں لیلیٰ خالد گرفتار کر لی گئیں جب کہ لیلیٰ خالد کے ساتھی نکارا گوا کے مشہور ٹیررسٹ پیٹرک آرگیلو ہلاک ہو گئے۔ جرمنی، سوئس اور برطانوی حکومت نے دہشت گردوں سے مذاکرات کے نتیجے میں لیلیٰ خالد اور تین دوسرے فلسطینی اغوا کاروں کو رہا کر کے یرغمالی آزاد کرا لیے۔

10 اکتوبر

کینیڈا میں کیوبک کی علیحدگی کے حامی ٹیررسٹ گروپ ایف ایل کیو نے حکومت کے ایک وزیر پائرے لیپورٹے کو اغوا کر کے قتل کر دیا جب کہ برطانیہ کے ٹریڈ کمشنر جیمز کراس کو اغوا کر لیا گیا۔

1970ء کے آغاز سے شروع ہونے والی دہشت گردی جسے مسلم دہشت گردی کا پہلا سال کہا جاتا ہے، اس پہلے سال ہی دہشت گردی کی دس عالمی کارروائیوں میں سے چھ غیر مسلم دہشت گردوں نے انجام دیں۔

1970 میں مسلم دہشت گردی کی شرح = 40 فیصد
1970 میں غیر مسلم دہشت گردی کی شرح = 60 فیصد

1971ء

8 جنوری

یوراگوائے میں برطانوی سفیر سر جیفری جیکسن کو اغوا کرلیا گیا۔ ٹو پیک امارو ٹیررسٹ گروپ نے سفیر محترم کو آٹھ ماہ تک یرغمالی بنائے رکھا۔

17 مئی

ترک عیسائی انتہا پسندوں نے اسرائیلی کونسل جنرل کو استنبول میں قتل کردیا۔

8 اگست

کیلیفورنیا میں سان کوئنٹن جیل میں بلیک پینتھر رہنما جارج جیکسن کو گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔

22 اکتوبر

شمالی آئر لینڈ میں 37 سالہ جین مکانول؛ دس بچوں کی ماں کو آئرش ری پبلکن آرمی نے برطانوی فوج کے لیے مخبری کرنے کے جرم میں سزائے موت دے دی۔

28 نومبر

اردنی وزیر اعظم واصفی طل کو قاہرہ میں بلیک ستمبر فلسطینی ٹیررسٹ گروپ نے قتل کردیا۔

4 دسمبر

شمالی بلفاسٹ میں تین برطانوی فوجیوں کو اغوا کرکے ہلاک کردیا گیا۔ آئرش ری پبلکن آرمی نے ذمہ داری قبول کرلی۔

4 دسمبر

السٹر والنٹیر فورس (رومن کیتھولک مخالف) نے جوابی وار کرتے ہوئے بلفاسٹ میں گنجان کیتھولک آبادی کے علاقے میں متعدد بم دھماکوں سے پندرہ افراد ہلاک کردیئے۔ مرنے والوں کی اکثریت رومن کیتھولک

عیسائیوں کی تھی۔

5 دسمبر

نیو یارک میں ایک روسی گفٹ شاپ میں بم دھماکے سے گفٹ شاپ کے پرخچے اڑ گئے۔ جیوش آرمڈ موومنٹ نے ذمہ داری قبول کر لی۔

5 دسمبر

نیویارک میں دھماکے کے کچھ دیر بعد منی سوٹا میں ایک اور روسی سٹور میں دھماکہ جیوش آرمڈ موومنٹ نے اس دھماکے کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔

29 دسمبر

برطانیہ میں اردنی سفیر پر بلیک ستمبر گروپ کے حملے سے سفیر شدید زخمی ہو گئے۔ کئی گولیاں لگیں۔

1971ء میں عالمی دہشت گردی کی دس کاروائیاں رجسٹرڈ کی گئیں۔ دو میں مسلمان دہشت گرد ملوث پائے گئے جب کہ آٹھ کاروائیوں میں انتہا پسند یہودی اور عیسائی شامل تھے۔

1971ء میں مسلم دہشت گردی کی شرح = 20 فیصد
1971 میں غیر مسلم دہشت گردی کی شرح = 80 فیصد

1972ء

26 جنوری

نیویارک میں شو بزنس پروموٹر سول ہیوراک کے دفتر پر حملہ کر کے دو افراد ہلاک اور بارہ زخمی کر دیئے گئے جن میں سول ہیوراک خود بھی شامل تھے۔ جیوش ڈیفنس لیگ سول ہیو راک کی روسی فنکاروں کو امریکہ مدعو کرنے کے سخت خلاف تھی۔

30 جنوری

بوگ سائیڈ ڈیری آئرلینڈ میں غیر مسلح اور پُر امن مظاہرین کی ریلی پر برطانوی فوجیوں کی اچانک فائرنگ سے تیرہ مظاہرین ہلاک اور سینکڑوں

زخمی ہوگئے اس المناک سانحے کو ”بلیک سنڈے“ کے نام سے منسوب کیا گیا

22 فروری

ایلڈر شاٹ، انگلینڈ میں آئرش ری پبلکن دہشت گردوں نے برطانوی پیراشوٹ رجمنٹ کے آفیسرز میس پر حملہ کر کے سات آفیسرز ہلاک کر دیئے۔

4 مارچ

السٹراوالنٹیئر فورس نے مرکزی بلفاسٹ میں ابیرکارن ریسٹورنٹ میں بم دھماکے سے دو افراد ہلاک اور ایک سوتیس زخمی کر دیئے۔

5 مئی

فلورنس، اٹلی میں ریڈ بریگیڈ کا دہشت گرد بجلی کے کھمبے پر بم نصب کرتے ہوئے قبل از وقت بم پھٹ جانے سے ہلاک ہو گیا۔

8 مئی

اسرائیل میں بن گوریان ایئر پورٹ پر اسرائیلی کمانڈوز نے بلجئین ایئر لائن کے یرغمالی طیارے پر حملہ کر کے چاروں فلسطینی ہائی جیکروں کو ہلاک کر کے یرغمالی مسافر رہا کرا لیے۔ ہلاک ہونے والوں میں ایک مسافر اور چار اسرائیلی کمانڈوز بھی شامل تھے۔

11 مئی

فرینکفرٹ جرمنی میں یو ایس آرمی ہیڈ کوارٹر پر ریڈ آرمی فیکشن کے کار بم دھماکے سے ایک امریکی فوجی آفیسر ہلاک اور تیرہ زخمی ہو گئے۔

28 مئی

ہائیڈل برگ جرمنی میں یو ایس آرمی کیمپ پر ریڈ آرمی فیکشن کا ایک اور بم دھماکہ۔ ایک امریکی فوجی ہلاک ہو گیا۔

30 مئی

جاپان ریڈ آرمی اور فلسطینی پاپولر فرنٹ نے مشترکہ کاروائی کرتے ہوئے لاڈ ائیر پورٹ اسرائیل میں مسافر لاؤنج پر فائرنگ کر کے 26 افراد ہلاک اور سو سے زائد زخمی کردیئے۔ رسوائے زمانہ جاپانی ٹیرررسٹ کو زو اوکاموٹو کو اسرائیلی کمانڈوز نے زندہ گرفتار کرلیا۔

21 جولائی

آئرش ری پبلکن آرمی نے بلفاسٹ میں 22 مسلسل بم دھماکوں میں 37 افراد ہلاک کردیئے۔ اس خونی دن کو بلیک فرائیڈے کہا گیا۔

22 جولائی

آئرلیش ری پبلکن آرمی نے کلاڈی نامی قصبے میں تین کار بم دھماکوں میں چھ افراد ہلاک کردیئے۔

5 ستمبر

فلسطینیوں کے بلیک ستمبر ٹیرررسٹ گروپ نے میونخ اولمپکس میں شریک گیارہ اسرائیلی کھلاڑیوں کو یرغمال بنالیا۔ مغربی جرمنی کے حکام کی یرغمالیوں کو آزاد کرانے کی کوشش میں نو یرغمالی کھلاڑی' پانچ فلسطینی دہشت گرد اور ایک جرمن کمانڈو مارا گیا۔

1972ء میں دہشت گردی کی بارہ کاروائیاں ریکارڈ کی گئیں۔ تین میں مسلمان دہشت گرد ملوث پائے گئے۔

1972ء میں مسلم دہشت گردی کی شرح= 25فیصد

1972ء میں غیر مسلم دہشت گردی کی شرح= 75فیصد

1973ء

4 فروری

آئرش ری پبلکن آرمی نے مسافر کوچ پر حملہ کرکے بارہ برطانوی فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

2 مارچ

فلسطینی بلیک ستمبر گروپ نے سوڈان میں امریکی سفیر اور ان کے تین ساتھیوں کو خرطوم کے سعوی سفارتخانے میں قتل کر دیا۔

12 مارچ

فلسطینی بلیک ستمبر گروپ نے قبرص میں ایک اسرائیلی بزنس مین کو اغوا کے بعد قتل کر دیا۔

4 مئی

میکسیکو میں امریکن کونسل جنرل کو پیپلز آرمڈ فورسز کے دہشت گردوں نے اغوا کر لیا۔

17 مئی

اٹالین ریڈ بریگیڈ نے میلان پولیس ہیڈ کوارٹر میں بم دھماکے سے ایک پولیس آفیسر ہلاک اور 20 زخمی کر دیئے۔

4 اگست

نیو فاشسٹ ٹیررسٹ گروپ نے بلوگنا، (اٹلی) میں ٹرین پر حملہ کر کے بارہ افراد ہلاک اور پچاس زخمی کر دیئے۔

5 اگست

فلسطینی بلیک ستمبر کے خودکش دہشت گرد سکواڈ نے ایتھنز کے ایئر پورٹ پر تین مسافروں کو ہلاک، 55 زخمی کر دیئے۔

17 دسمبر

روم کے ایئر پورٹ سے شروع ہونے والے دہشت گردی کے اس واقع نے پوری دنیا کو تجسس اور تحیر سے دوچار کر دیا۔ پانچ فلسطینی دہشت گردوں نے اچانک اپنے سامان سے آٹو میٹک رائفل نکالے اور دو مسافروں کو فوری طور پر ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد پان امریکن کے بیروت اور تہران جانے والے طیارے پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا جہاز

میں سوار 29 مسافر ہلاک ہو گئے۔ ہلاک زدگان میں مراکش کے چار اعلیٰ حکام بھی شامل تھے۔ پان امریکن ایئر لائن کا طیارہ تباہ کرنے کے بعد ان دہشت گردوں نے پانچ اطالوی مسافروں کو یرغمال بنا کر لفتھانسا ایئر لائن کے ایک طیارے کو قبضے میں لے کر لبنان جانے پر مجبور کر دیا۔ لبنانی حکومت کی طیارے کو لبنان میں اترنے کی اجازت نہ دینے پر طیارے کو ایتھنز لے جایا گیا جہاں دہشت گردوں نے دو عرب دہشت گردوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ یونانی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے ایک یرغمالی مسافر کو قتل کر کے طیارے سے باہر پھینک دیا گیا۔ اس کے بعد طیارہ دمشق لے جایا گیا' یہاں سے تیل اور خوراک حاصل کرنے کے بعد طیارے کو' کویت لے جایا گیا جہاں اطالوی یرغمالیوں کو' ہائی جیکرز کے لیے فرار کا محفوظ راستہ مہیا کرنے کی ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ اس پُر تجسس ہائی جیکنگ کی ذمہ داری کسی نے قبول نہیں کی نہ ہی ہائی جیکرز کا پتہ لگایا جاسکا کہ وہ کون تھے اور کس گروپ سے متعلق تھے۔ ہائی جیکنگ' اغوا اور قتل کا یہ کیس روم ایئر پورٹ سیکورٹی پولیس کی فائلوں میں ابھی تک کھلا ہوا ہے۔

20 دسمبر

میڈرڈ سپین میں باسک فارد لینڈ اینڈ لبرٹی گروپ نے سپین کے وزیر اعظم ایڈمرل لوئیس بلانکو کو ان کی کار میں قتل کر دیا۔

1973ء میں عالمی دہشت گردی کے نو واقعات رونما ہوئے' چار میں مسلمان دہشت گرد ملوث پائے گئے۔

1973ء میں مسلم دہشت گردی کی شرح = 44 فیصد

1973ء میں غیر مسلم دہشت گردی کی شرح = 56 فیصد

1974ء

31 جنوری

جاپان ریڈ آرمی اور فلسطینی پاپولر فرنٹ نے مشترکہ دہشت گردی کی بیک وقت کاروائی میں سنگا پور میں شیل آئل کمپنی اور کویت میں جاپانی سفارت خانے پر قبضہ کرلیا۔

4 فروری

امریکی دہشت گرد گروپ سمبانیز لبریشن آرمی نے ایکٹریس اور سماجی کارکن پیٹریشا ہرسٹ کو اغوا کرلیا۔

11 اپریل

فلسطینی پاپولر فرنٹ نے فریاط شمونہ اسرائیل میں دہشت گردی کی کاروائی میں 18 افراد ہلاک کردیے۔

14 مئی

آئرش ری پبلکن آرمی نے گلفورڈ پب لندن میں بم دھماکوں سے پانچ افراد ہلاک، 182 زخمی کردیے۔

15 مئی

فلسطینی پاپولر فرنٹ نے مالوط سکول، اسرائیل میں نوے بچوں کو یرغمال بنالیا۔ بچوں کو رہا کرانے کی کوشش میں اسرائیلی کمانڈوز کے ہاتھوں 21 افراد ہلاک اور اسی افراد زخمی ہوگئے۔

17 مئی

آئر لینڈ میں رومن کیتھولک مخالف ٹیررسٹ گروپ السٹر ڈیفنس نے ڈبلن میں بم دھماکوں سے 22 افراد ہلاک کردیے۔

13 جون

شمیر قہوط اسرائیل میں پاپولر فرنٹ کے حملے میں گیارہ اسرائیلی اور چار حملہ آور ہلاک ہوگئے۔

17 جون

اٹالین ریڈ بریگیڈ نے برسکیا' (اٹلی) میں فاشسٹ مخالف ریلی کے مظاہرے میں بم دھماکوں سے سات مظاہرین ہلاک' 93 زخمی کر دیئے۔

26 جون

الفتح کے دہشت گرد کشتی کے ذریعے نہاریہ' اسرائیل میں داخل ہوئے اور سویلین آبادی کو یرغمال بنانے کی کوشش میں اسرائیلی پولیس کے ہاتھوں مارے گئے جب کہ تین اسرائیلی پولیس ارکان بھی ہلاک ہو گئے۔

19 اگست

قبرص میں امریکی سفیر اور ان کے سیکرٹری کو نکوسیا میں امریکی سفارت خانے کے باہر گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

2 اکتوبر

اٹالین ریڈ بریگیڈ نے میلان بزنس ڈسٹرکٹ میں بم دھماکے سے دو افراد ہلاک' گیارہ زخمی کر دیئے۔

21 نومبر

آئرش ری پبلکن آرمی نے برمنگھم میں بیک وقت کئی شراب خانوں میں دھماکہ کر کے 21 افراد ہلاک دو سو سے زائد زخمی کر دیئے۔

23 نومبر

فلسطینی پاپولر فرنٹ کے ہائی جیکر برٹش ایئر لائن کے طیارے کو دوبئ ایئر پورٹ سے ہائی جیک کر کے تنزانیہ لے گئے جہاں ایک جرمن مسافر کو قتل کر دیا گیا۔

6 دسمبر

نائٹس برج انگلینڈ میں [illegible] سٹور میں [illegible] دھماکہ [illegible]

26 فروری

لندن پولیس کے ایک آفیسر سٹیفن سٹیل کو اس وقت گولی مار کر ہلاک کردیا گیا جب وہ آئرش ری پبلکن آرمی کی خفیہ بم فیکٹری میں کام کرنے والوں کا تعاقب کررہے تھے۔

5 مارچ

تل ابیب کے سیوائے ہوٹل میں پی ایل او کے دہشت گرد نے 60 افراد یرغمال بنالئے بعد ازاں 8 یرغمالی اور تین اسرائیلی پولیس کے ارکان دہشت گردوں سے مقابلے میں مارے گئے۔

24 اپریل

جرمن ریڈ آرمی کے دہشت گردوں نے سٹاک ہوم، سویڈن میں جرمن سفارت خانے پر قبضہ کرکے سفارت خانے کے عملے کو یرغمال بنالیا۔ دہشت گردوں نے جرمن ریڈ آرمی کے دہشت گردوں کو قید سے آزاد کرنے کا مطالبہ کیا۔ دہشت گردی کی اس کاروائی سے ایک نئے نظریے نے جنم لیا جسے ''سٹاک ہوم سنڈروم'' کا نام دیا گیا۔ اس نظریے کے تحت اس خدشے کا اظہار کیا گیا کہ اگر یرغمالی طویل دورانیے کے لیے حالت یرغمال میں رہیں تو ان کی ہمدردیاں دہشت گردوں سے وابستہ ہو جاتی ہیں اور وہ دہشت گردوں کی ''کاز'' سے متاثر ہوسکتے ہیں۔ اس ضمن میں امریکن ایکٹریس پیٹریشا ہرسٹ کی مثال دی جارہی ہے جو اغوا کے بعد اغوا کاروں کی ہی ہورہی۔ بعد ازاں وہ خود دہشت گرد بن گئی اور دہشت گردوں کے ساتھ بنک لوٹتے ہوئے گرفتار ہوئی۔

31 جولائی

السٹر والنٹیئر فورس نے آئرلینڈ کی پاپولر میامی فرنٹ کے تین دہشت گردوں کو ہلاک کردیا۔

27 اگست

آئرش ری پبلکن آرمی نے کیٹرہم پب میں بم دھماکے سے تین افراد قتل اور 27 زخمی کر دیئے۔

5 ستمبر

آئرش ری پبلکن آرمی نے لندن میں ہلٹن ہوٹل میں بم دھماکے سے دو افراد ہلاک اور 63 زخمی کر دیئے۔

22 ستمبر

شمالی آئرلینڈ میں اغوا کی گئی ٹرین اڑا دی گئی 12 افراد ہلاک، سو سے زائد زخمی ہو گئے۔

13 اکتوبر

آئرش ری پبلکن آرمی نے ڈبلن میں ڈچ صنعت کار ٹائیڈ ہریما کو اغوا کر کے قتل کرنے کی دھمکی دی۔

14 اکتوبر

سپین میں فاشسٹ مخالف ''فرسٹ اکتوبر'' گروپ نے پولیس کے چار افراد کو ہلاک کر دیا۔ ایک ہفتہ قبل پولیس کی زیرنگرانی فرسٹ اکتوبر کے 5 دہشت گردوں کو گولیوں سے اڑا دیا گیا تھا۔

27 نومبر

برطانوی پبلشر اور ٹی وی اناؤنسر راس میک وائیڈ جنہوں نے آئرش ری پبلکن آرمی کے دہشت گردوں کی مخبری پر انعام مقرر کر رکھا تھا انہیں ان کے گھر کے سامنے قتل کر دیا گیا۔

2 دسمبر

ھالینڈ میں ساؤتھ ملوکین نامی دہشت گرد گروپ نے بیلین کے مقام پر بارہ دن تک ایک مسافر ٹرین کو یرغمال بنائے رکھا۔ پولیس مقابلے میں تین دہشت گردوں کے مارے جانے کے بعد ٹرین اور مسافروں کو رہا

کرالیا گیا۔

4 دسمبر

ایمسٹر ڈیم میں ساؤتھ ملوکین گروپ نے انڈونیشیا کے سفارت خانے پر قبضہ کرکے اس کے عملے کو یرغمال بنالیا۔ سفارتی عملے کا ایک افسر فرار کی کوشش میں کھڑکی سے چھلانگ لگا کر گرنے سے ہلاک ہوگیا۔

6 دسمبر

آئرش ری پبلکن آرمی نے بال کومب لندن میں دو افراد کو چھ روز تک یرغمال بنائے رکھا جب کہ لندن پولیس بال کومب کا محاصرہ کیے ہوئے تھی۔

21 دسمبر

بدنام زمانہ عالمی دہشت گرد کارلوس دی جیکال نے ویانا میں اوپیک کانفرنس میں شریک مختلف ممالک کے تیل کے گیارہ وزراء اور ساٹھ دوسرے نمائندوں کو یرغمال بنالیا۔ شرکائے کانفرنس کو یرغمال بنانے کے بعد کارلوس دی جیکال نے آسٹریا سے الجزائر کا سفر اختیار کیا۔ الجزائر میں کارلوس اور فلسطینی پاپولر فرنٹ کے دہشت گردوں نے کئی سو ملین ڈالر تاوان میں وصول کیے۔ تاوان کے بھاری معاوضہ کی وصولی کے بعد یرغمالیوں کو ویانا میں آزاد کردیا گیا۔ کارلوس اور پاپولر فرنٹ کے ٹیرررسٹ الجزائر سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔

29 دسمبر

لاگارڈیا ایئر پورٹ نیویارک میں بم دھماکے سے گیارہ افراد ہلاک اور 75 زخمی ہوگئے۔

1975ء میں عالمی دہشت گردی کے 20 واقعات رونما ہوئے تین میں مسلمان دہشت گرد ملوث پائے گئے۔

1975ء میں مسلم دہشت گردی کی شرح = 15 فیصد

1975ء میں غیر مسلم دہشت گردی کی شرح = 85 فیصد

1976ء

3 فروری

صومالی کوسٹ لبریشن فرنٹ نے جبوتی میں سکول بس اغوا کر کے دو بچوں کو ہلاک کر دیا۔

16 فروری

آرمینیا سیکرٹ آرمی نے ترک سفارت کار طہ سیرت کو پیرس میں قتل کر دیا۔

25 مئی

نیویارک میں سویت ایئر لائن ایروفلوٹ اورچیکوسلواکیہ بلڈنگ میں بیک وقت بم دھماکوں سے کئی افراد زخمی۔ جیوش ڈیفنس لیگ نے ذمہ داری قبول کر لی۔

26 جون تا 4 جولائی

جرمن ریڈ آرمی اور پاپولر فرنٹ کے مشترکہ آپریشن کے تحت ایئر فرانس کے طیارے کو تل ابیب سے اغوا کر کے انٹی بے یوگنڈا لے جایا گیا۔ طیارے کے 258 مسافروں میں سے غیر اسرائیلی مسافروں کو رہا کر دیا گیا۔ چار جولائی کو اسرائیلی کمانڈوز نے انٹی بے پہنچ کر یرغمالیوں کو آزاد کرالیا۔ اس آپریشن میں تمام دہشت گرد ہلاک ہو گئے جب کہ 3 مسافر اور ایک اسرائیلی کمانڈو بھی مارا گیا۔

11 جولائی

نیویارک میں اقوام متحدہ کی لائبریری کے قریب نصب شدہ تین بم پھٹنے سے پہلے ناکارہ بنا دیئے گئے۔

21 جولائی

برطانوی سفیر کرسٹو برجس کی کار ڈبلن میں آئرش ری پبلکن آرمی کی نصب کردہ لینڈ مائن سے ٹکرا کر تباہ ہو گئی۔ برطانوی سفیر ہلاک ہو گئے۔

10 ستمبر

نیویارک سے پیرس جانے والی ٹی ڈبلیو اے کی فلائٹ کو کروشیا ٹیرررسٹ گروپ نے ہائی جیک کر کے 93 مسافروں کو یرغمال بنالیا۔

11 ستمبر

نیویارک میں ایک پولیس آفیسر کروشیا گروپ کے نصب کردہ خفیہ بم کے پھٹنے سے ہلاک ہوگیا۔

21 ستمبر

چلی کے جلاوطن وزیر خارجہ اورلینڈو لیٹیلر کو کار بم دھماکے میں ہلاک کردیا گیا۔

6 اکتوبر

باربڈوس سے ہوانا جاتے ہوئے ایک کیوبن طیارے پر بمباری سے طیارہ تباہ' 73 مسافر ہلاک۔ امریکہ میں مقیم کیوبن جلاوطنوں کی دہشت گرد تنظیم ''الکانڈر'' نے ذمہ داری قبول کرلی۔

4 دسمبر

ساؤتھ ملوکین گروپ نے ہیگ (ہالینڈ) میں انڈونیشیا کے سفارت خانے پر قبضہ کر کے ایک سفارت کار کو قتل کر دیا۔

1976ء میں دہشت گردی کے گیارہ واقعات ہوئے' دو میں مسلمان دہشت گرد ملوث پائے گئے۔

1976ء میں مسلم دہشت گردی کی شرح= 18 فیصد
1976ء میں غیر مسلم دہشت گردی کی شرح= 82 فیصد

1977ء

10 جنوری

آئرش ری پبلکن آرمی نے شمالی آئر لینڈ میں کنگ ملز کے مقام پر ایک مسافر بس پر فائرنگ کر کے دس مسافر ہلاک' 27 زخمی کر دیئے۔

9 مارچ

نامعلوم دہشت گردوں نے واشنگٹن ڈی سی میں تین عمارتوں' ڈسٹرکٹ بلڈنگ' اسلامک سنٹر اور بی نائے برتھ پر قبضہ کر کے سو افراد کو یرغمال بنالیا سٹی کونسل کے نمائندے میرون بیری گولی لگنے سے شدید زخمی ہو گئے۔

7 اپریل

جرمنی میں ریڈ آرمی فیکشن نے چیف فیڈرل پراسیکیوٹر اور ان کے ڈرائیور کو قتل کر دیا۔

4 تا 23 مئی

ھالینڈ میں ساؤتھ ملوکین گروپ نے ایسین کے مقام پر مسافر ٹرین کے 85 مسافروں کو یرغمال بنالیا۔ 23 مئی کو یرغمالیوں کو آزاد کرانے کے لیے ڈچ کمانڈوز کے حملے میں دو مسافر اور دو دہشت گرد ہلاک ہو گئے۔

24 مئی

ساؤتھ ملوکین گروپ نے سملڈی کے مقام پر ایک سکول میں 105 بچوں اور 5 ٹیچرز کو یرغمال بنالیا۔

11 جون

ھالینڈ میں گرون جین کے مقام پر ساؤتھ ملوکین گروپ نے مسافر ٹرین اغوا کر کے 55 مسافروں کو یرغمال بنالیا۔ ڈچ آرمی کی یرغمالیوں کو آزاد کرانے کی کوشش میں چھ دہشت گرد اور تین مسافر ہلاک ہو گئے۔

30 جولائی

جرمنی میں ریڈ آرمی فیکشن نے ڈریسڈنر بنک کے صدر کو اغوا کی کوشش میں ناکامی پر انہیں قتل کر دیا۔

5 ستمبر

مغربی جرمنی کے مشہور صنعت کار مارٹن شلائر کو اغوا کے چوالیس دن بعد قتل کر دیا گیا۔ ریڈ آرمی فیکشن نے ذمہ داری قبول کر لی۔

13 تا 17 اکتوبر

چار فلسطین دہشت گرد جرمن ایئر لائن لفتھانسا کے طیارے کو 90 مسافروں سمیت اغوا کر کے مختلف ملکوں میں لے گئے۔ موغا دیشو (صومالیہ) میں پائلٹ کے قتل کے بعد جرمن جی ایس جی فورس نے جوابی کاروائی کر کے تمام مسافروں کو رہا کرالیا جب کہ تین دہشت گرد ہلاک ہوگئے۔

1977ء میں عالمی دہشت گردی کے نو واقعات ہوئے ایک واقعہ میں مسلمان دہشت گرد ملوث پائے گئے۔

1977ء میں مسلم دہشت گردی کی شرح = 11 فیصد

1977ء میں غیر مسلم دہشت گردی کی شرح = 89 فیصد

1978ء

17 فروری

آئرش ری پبلکن آرمی نے کمبر' (شمالی آئر لینڈ) میں لاموں ہاؤس میں بم دھماکوں سے بارہ افراد ہلاک کردیئے۔

18 فروری

آنند امرگا بھارتی دہشت گرد گروپ نے سڈنی کے ہلٹن ہوٹل میں منعقدہ ایک کانفرنس کے شرکاء پر بم کے حملے سے دو افراد ہلاک کردیئے۔

19 فروری

لارنیکا ایئر پورٹ قبرص سے نامعلوم عرب دہشت گردوں کے اغوا کردہ طیارے کو مشرق وسطیٰ کے کسی ملک میں اترنے کی اجازت نہ ملنے پر طیارہ واپس لارنیکا ایئر پورٹ پر اتر گیا۔ مصری کمانڈوز جو کہ طیارے کو آزاد کرانے کے لیے بھیجے گئے تھے کسی غلط فہمی کی بنا پر قبرصی ٹروپس کے مقابل آ گئے۔ اس سانحہ میں 15 مصری کمانڈوز' سات قبرصی فوجی اور ایک جرمن خاتون صحافی ہلاک ہوگئیں۔

6مارچ

ھالینڈ میں ساؤتھ ملوکین گروپ نے ایسین کے مقام پر صوبائی دفاتر پر قبضہ کرکے 67 افراد کو یرغمال بنالیا۔ ڈیڑھ ماہ تک قبضہ جاری رکھنے کے بعد دو یرغمالی ہلاک کردیئے گئے۔

11مارچ

اسرائیل میں الفتح کے دہشت گردوں نے حیفہ میں سیاحوں کی بس اغوا کرکے 37 مسافر قتل کردیئے۔ بعد ازاں اسرائیلی ردِعمل میں تمام دہشت گرد مارے گئے۔

16مارچ

اٹالین ریڈ بریگیڈ نے پانچ مرتبہ منتخب ہونے والے اطالوی وزیر اعظم ایلڈو مارو کو اغوا کرکے 55روز بعد قتل کردیا۔

25 مئی

نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی ایونسٹن (الی نائس) امریکہ میں یونی بومبر کی طرف سے بھیجے گئے پہلے لیٹر بم کی وصولی۔ 1978 سے 1995ء تک ڈاکٹر تھیوڈور جان کوزنسکی نے وقتاً فوقتاً ڈاک پیکج کے ذریعے 3افراد قتل اور 29 زخمی کیئے۔ برکلے یونیورسٹی میں ریاضی کا سابق پروفیسر ڈاکٹر کوزنسکی 'یونی بومبر' (یونیورسٹی اینڈ ایئر لائن بومبر) کے طور پر مشہور ہوا۔ ڈاکٹر کوزنسکی کو 1996ء میں دوہری عمر قید کی سزا دی گئی۔

12اگست

بیروت میں اسرائیلی دہشت گردوں نے فراکرامی بلڈنگ کو بم دھماکوں سے تباہ کرکے دوسو افراد ہلاک اور ایک سو دس زخمی کردیئے۔

20اگست

لندن میں ایوریا ہوٹل کے باہر اسرائیلی ایئر لائن کی ایئر ہوسٹس پاپولر فرنٹ کے دہشت گردوں کے ہاتھوں قتل ہوگئی۔

3 ستمبر

لندن میں بلغاریہ کے جلاوطن صحافی اور قلمکار جورجی مارکوف کو بلغاریہ کی سیکرٹ سروس کے ایجنٹوں نے زہر کا انجکشن لگا کر قتل کر دیا۔

4 ستمبر

نیویارک میں جیوش ڈیفنس لیگ کے دہشت گردوں کا سلووز مین ہٹین آفس میں نصب کردہ بم پھٹنے سے پہلے دریافت کرلیا گیا۔

1978ء میں عالمی دہشت گردی کے گیارہ واقعات رونما ہوئے دو میں مسلمان دہشت گرد ملوث پائے گئے۔

1978ء میں مسلم دہشت گردی کی شرح= 18 فیصد

1978ء میں غیر مسلم دہشت گردی کی شرح= 82 فیصد

1979ء

14 فروری

کابل میں امریکی سفیر اڈولف ڈوبس کو افغانی دہشت گردوں نے اغوا کرکے قتل کر دیا۔ ان دہشت گردوں نے سفیر کی رہائی کے بدلے میں چند مذہبی رہنماؤں کی آزادی کا مطالبہ کیا تھا۔

22 مارچ

ھالینڈ میں برطانوی سفیر سر رچرڈ سائیکس کو ہیگ میں ان کی رہائش گاہ کے سامنے قتل کر دیا گیا۔ ساؤتھ ملوکین گروپ پر قتل کا شبہ کیا گیا۔

30 مارچ

آئرش ری پبلکن آرمی نے برطانوی سیاستدان آئیری نیاؤف کو قتل کر دیا۔ دارالعوام کی کار پارکنگ میں بم دھماکے سے آئیری نیاؤف ہلاک اور کئی کاریں تباہ ہوگئیں۔

9 مئی

نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی ایونسٹن (الی نائس) امریکہ میں یونی بومبر کی طرف

سے بھیجے گئے ایک اور لیٹر بم کی وصولی سے ایک پروفیسر شدید زخمی ہو گئے۔

18 جون

ریڈ آرمی فیکشن نے جرمنی میں نیٹو کے سپریم کمانڈر جنرل الیگزینڈر ہیگ کی کار پر بموں سے حملہ کردیا۔ جنرل الیگزینڈر ہیگ بال بال بچ گئے۔

29 جولائی

باسک لبرٹی کے دہشت گردوں نے میڈرڈ کے ریلوے سٹیشن پر بم دھماکے سے سات افراد ہلاک کر دیئے۔

27 اگست

آئرش ری پبلکن آرمی نے آئرش ری پبلکن کوسٹ لائن پر مولا گھ مور کے مقام پر سابق وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی کشتی کو اس وقت بم سے اڑا دیا جب وہ اپنے تین دوسرے گھریلو افراد کے ہمراہ مچھلی کا شکار کررہے تھے۔ بم دھماکے سے چاروں افراد مارے گئے۔

27 اگست

ویرن پوائنٹ کے مقام پر ایک اور حملے میں آئرش ری پبلکن آرمی نے 18 برطانوی فوجیوں کو ہلاک کردیا۔ آج کے دن کو ''سرخ اگست'' کہا گیا۔

4 نومبر

صدر جمی کارٹر کی شاہ ایران رضا شاہ پہلوی کو امریکہ میں داخلے کی اجازت دینے کے خلاف ایرانی انتہا پسندوں نے تہران میں امریکی سفارت خانے کے 66 اہل کاروں کو یرغمال بنالیا۔ ان امریکی سفارت کاروں کی رہائی 20 جنوری 1981ء کو عمل میں آئی۔

15 نومبر

امریکن ایئرلائن کے ایک طیارے میں بم دھماکہ ہونے سے بارہ افراد

شدید زخمی ہو گئے۔ اس بم دھماکے کو یونی بومبر کی کاروائی کہا گیا۔

20 نومبر

دوسو مسلمان انتہا پسندوں نے مکہ مکرمہ میں مسجد الحرام میں سو زائرین کو یرغمال بنا کر حرم شریف پر قبضہ کرلیا۔ سعودی فورسز اور فرنچ سیکورٹی فورس کی مشترکہ کاروائی سے مسجد الحرام کو آزاد کرالیا گیا۔ اس سانحے میں 250 افراد ہلاک اور چھ سو سے زائد زخمی ہو گئے۔

1979 میں عالمی دہشت گردی کے گیارہ واقعات رونما ہوئے تین واقعات میں مسلمان دہشت گرد ملوث پائے گئے۔

1979ء میں مسلم دہشت گردی کی شرح= 27 فیصد

1979ء میں غیر مسلم دہشت گردی کی شرح= 73 فیصد

9۔ (یو۔ ایس۔ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ' ہسٹورین آفس:2005)

10۔ (سنٹر فار ڈیفنس اینڈ انٹرنیشنل سیکورٹی سٹڈیز:1970-1980)

11۔ (ایمرجنسی اینڈ ڈزاسٹر مینجمنٹ' یو۔ ایس۔ اے:2004)

یو۔ ایس۔ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ' ہسٹورین آفس کے ٹیرر ازم ریکارڈ (1961-2003) سے ہمیں مایوسی ہوئی۔ اس ریکارڈ میں ایک طرف تو مسجدوں میں دہشت گردی کے واقعات کا اندراج نہیں ہے اور دوسری طرف دہشت گردی کے ان واقعات کو نظر انداز کردیا گیا ہے جن میں مسلمان دہشت گردی کا نشانہ بنے ہیں۔ چین' سربیا' روس' برما' انڈیا اور تھائی لینڈ کے مسلمان جس بدترین دہشت گردی کا نشانہ بنے ہیں ان کا سرے سے کوئی اندراج' کوئی حوالہ یو ایس سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ریکارڈ میں موجود نہیں ہے۔ اسی طرح جیوش ڈیفنس لیگ اور آئرش ری پبلکن آرمی کی دہشت گردی کے نسبتاً بہت ہی کم واقعات درج کیے گئے ہیں۔ جب کہ ہر وہ واقعہ جس میں مسلمان ملوّث تھے خصوصی توجہ سے درج کیا گیا ہے مثلاً آئرش ری پبلکن آرمی کے ہاتھوں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا قتل یو۔ ایس سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے نزدیک دہشت گردی نہیں ہے سو اس کا اندراج نہیں ہے۔ یو۔ ایس۔ ایس کول پر حملے کا اندراج موجود ہے کہ اس میں مسلم دہشت گرد ملوّث تھے لیکن یو ایس ایس لبرٹی پر اسرائیلی حملے کا اندراج نہیں ہے چونکہ اس میں یہودی ملوّث تھے۔ فلسطینیوں کے خلاف اسرائیلی دہشت گردی کا صرف ایک واقعہ درج

ہے جب کہ اسرائیلیوں کے خلاف فلسطینی دہشت گردی کا ہر ایک واقعہ قلم بند ہے۔ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی اس مذکورہ فہرست کے مصدق ہونے کا یہ حال ہے کہ اس میں 1996ء کے اٹلانٹا اولمپکس میں دہشت گردی کا مشہور عالمی واقعہ تک شامل نہیں ہے۔ شیلا موسا جیؔ یو۔ ایس سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے اس ریکارڈ کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

> ”توڑ موڑ کر پیش کردہ حقائق کے زور پر مخصوص مذہب اور لوگوں کے خلاف عمومی رائے کو بدلنے کی کوشش دانشورانہ دہشت گردی کی ایک بدترین صورت ہے“ 12۔ (شیلا موسا جی: 2005)

یوں 1970ء سے 1979ء تک عالمی دہشت گردی کے کل 117 واقعات ہوئے۔ 30 واقعات میں مسلم دہشت گرد ملوث پائے گئے جب کہ 87 واقعات میں انتہا پسند عیسائی، یہودی، ہندو اور سیکولر عقیدے کے دہشت گرد ملوث تھے۔ حقائق، اعداد و شمار، شہادت اور ثبوت کے حوالے سے مسلم دہشت گردی کی شرح 25 فیصد ہے جب کہ الزام کے ناطے سے سو فیصد۔ 1970ء کا عشرہ جسے مسلم دہشت گردی کا عشرہ اور عروج قرار دے کر مسلم اُمہ کو دفاعی صورت حال سے دوچار کردیا گیا ہے۔ حقیقتاً یہ عشرہ مسلمانوں کی دہشت گردی کا نہیں بلکہ دہشت گردی کے نشانہ بننے کا ہے۔ 1969ء میں مسجد اقصیٰ میں آتش زدگی کے واقعے سے شروع ہونے والا دہشت آمیز عشرہ 1979ء میں مسجد الحرام کو لہولہان کردینے کے سانحہ پر ختم ہوا۔ جس دورانیے کا آغاز ہماری آبرو اور افتخار پر بٹہ لگنے سے شروع ہوا تھا انجام کار تک عزت نفس اور حلقوم پر چھری چلنے تک آن پہنچا۔ آغاز سے انجام تک جن کا لہو پانی کی طرح بہا ہو ان پر ہی خون بہانے کا الزام ـــــ ایک ایسا کذبِ سفاک ہے جسے انسانی ضمیر تاریخ کے صفحے اور انصاف کی آنکھ قبول نہیں کرسکتی۔

تاریخ کے دھارے پر نظر رکھنے والے دیکھتے ہیں کہ جب بھی مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ والی معجزہ صفت راہ گزر اور امن و عافیت والی جائے پناہ کی حرمت کا ضابطہ توڑا گیا ہے جب بھی خون بہانے کی ناپسندیدہ جگہ پر خون بہتا ہے ایک نادیدہ سرخ آندھی عالم کو اپنے حصار میں باندھ لیتی ہے۔ یہ آندھی اپنے جلو میں خون ہی خون، موت در موت، قحط اندر قحط اور آفات تا آفات ساتھ لاتی ہے۔ جس طرح سن 691 میں حجاج بن یوسف کی گستاخی لاکھوں کے سر لے گئی تھی اور سرخ آندھی کا نادیدہ حصار سن 702ء تک کھینچا رہا تھا اسی طرح مائیکل روہن کی جسارت

کی سزا جب 1979ء میں ختم ہونے کے قریب آئی تو مسجد الحرام لہو میں نہا گئی اور اب 2003 میں مسجد علی مرتضیٰ اور روضہ غوث الاعظم کی بے حرمتی کا خراج دینا ہوگا۔ ایک طرف تو تاریخ انصاف بے حرمتی کے خراج کی وصولی پر گواہ ہے تو دوسری طرف تاریخ کا عندلوصول لہو کی جنس اور سروں کی فصل میں ہے سو بہہ رہا ہے اور کٹ رہی ہے گو کہ عرصہ ابتلاء متعین نہیں ہے لیکن روایت ایک عشرے کی ہے اب یہ نصیب مبتلا کہ حسب روایت سزا کا ایک عشرہ کہ ایک تقصیر ایک ایک عشرہ۔ ہم تو دم بخود ارض کوفہ و کربلا کو 2013 تک اور کوئے کابل و مزار شریف کو اس سے بھی زیادہ لہولہو، خون آشام اور چھینٹوں چھینٹ دیکھتے ہیں۔

* * *

حال بدحال

مغربی تہذیب......... یہ ایک اچھا خیال ہوگا۔ (موہن داس کرم چند گاندھی:1940)

اس سوال کا جواب تحقیق کرنا عین منطقی ہے کہ کولمبس سے لے کر امریکی صدور تک اور امریکی اہل قلم سے لے کر ارباب سیاست تک بہ یک زبان ریڈ انڈینز کو غیر مہذب، خبث بھرے اور ترقی کرنے کی صلاحیت سے محروم ہونے کی تکرار کیوں کرتے رہے جب کہ وہ خود کسی مہذب، ترقی یافتہ اور شائستہ معاشرے سے متعلق نہیں رہے تھے۔ ایک جہالت بھرے اور غیر مہذب فرد کی تنقید دوسرے جاہل اور غیر مہذب کے لیے جس قدر باوزن اور بامعنی ہوسکتی ہے، سپین، فرانس، برطانیہ، ہالینڈ اور دیگر یورپینز کی ریڈ انڈینز پر تنقید کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہے۔ دیکھا یہ جانا چاہیے کہ جب یورپینز امریکہ میں آباد ہوئے تو وہ یکا یک مہذب کیسے ہوگئے۔ جب کہ یورپ سولہویں صدی کی آخر تک اُسی ہزار سالہ دور تاریکی کی گرفت میں تھا جو بالعموم یورپ میں چھٹی صدی کے آغاز سے سترھویں صدی کے آخر تک طاری رہی۔ قرون وسطیٰ کے یورپ کی جہالت، تعصب، خبث، غربت، قحط، بیماری، پسماندگی اور راہبانیت تاریخ میں محفوظ ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں ہے سو اس دورِ جہالت کے یورپینز کا اقوام دیگر کو غیر مہذب قرار دینا نہ صرف بے معنی اور بے وزن تھا بلکہ یہ ایک لفظی اور مفاداتی جارحیت کے مترادف تھا۔

976 عیسوی میں مغربی یورپ میں رومن سلطنت کے اقتدار کے خاتمے کے ساتھ ہی جو ہزار سالہ تاریکی کا دور شروع ہوا وہ عیسائیت کے ہیرو میگنس شارلیمن کے ہاتھوں آٹھویں صدی کے آغاز سے ہی مشرف بہ راہبانیت ہوچکا تھا۔ وائی کنگ، نارمن اور گاتھ حکمرانوں کے چرچ پر بڑھتے ہوئے انحصار نے یورپ پر ایسی تاریکی مسلط کردی جسے دور ہوتے ہوتے بھی ہزار سال

لگ گئے۔ ان ہزار سالوں میں یورپی اقوام کا اپنا حال اس قدر بد حال تھا کہ وہ کسی بھی حیثیت میں دوسروں کو غیر مہذب قرار نہیں دے سکتے تھے۔ یورپ کے اس مشہور دورِ جہالت میں یورپ کی معاشی، تعلیمی، سیاسی، ثقافتی، ذہنی اور معاشرتی بدحالی کسی ایک یورپی ملک تک محدود نہیں تھی۔ یہ تاریکی اور بدحالی راہبانیت سے منسلک ہونے کی وجہ سے پورے یورپ پر مسلط تھی۔ سو پندرہویں اور سولہویں صدی میں یورپینز جب امریکہ میں آباد ہوئے تو جہالت، پسماندگی، تعصب اور مذہبی تنگ نظری کا ورثہ بھی امریکہ پہنچ گیا۔ ریڈ انڈینز جو اپنے اطوار میں یورپینز سے مختلف تو ضرور تھے لیکن انہیں غیر مہذب اور غیر انسانی خصائل کا حامل قرار دینے میں امریکی آبادکاروں کی اپنی مصلحت اور ضرورت شامل تھی وگرنہ ریڈ انڈینز کو غیر مہذب قرار دے کر قتل کرنے والوں کا اپنا سماجی، ثقافتی، معاشی اور تعلیمی پس منظر کوئی ایسا ترقی یافتہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ دوسروں کو غیر مہذب قرار دے سکتے۔

پندرہویں صدی سے سترہویں صدی تک یورپ کا اپنا یہ حال تھا کہ وہاں طاعون اور چیچک کی وباء وقفے وقفے سے پھیلتی اور لاکھوں مارے جاتے۔ اس کے ساتھ ساتھ انفلوئنزا، خارش، خسرہ، پیچش اور جلدی بیماریاں مستقلاً یورپ میں کثیر اموات کا سبب بنی رہیں۔ اوسطاً چالیس فیصد یورپینز کسی ایک نہ ایک بیماری میں مبتلا رہتے۔ 1650ء کے عشرے میں صرف لندن میں اسّی ہزار افراد طاعون سے ہلاک ہوئے یعنی لندن کی آبادی میں ہر چھ میں سے ایک فرد طاعون سے مارا گیا۔ اینڈریو اپیل بائی لکھتے ہیں کہ:

> ”ہر 25 یا 30 سالوں بعد اور بعض اوقات اس سے زیادہ تسلسل سے شہر کسی بڑی وبا کا شکار ہوجاتے تھے۔ حقیقتاً کئی صدیوں تک یورپ میں فرد واحد کی شرح حیات اس قدر کم تھی کہ اس سے یورپی آبادی کی قدرتی افزائش شدید متاثر ہوئی“ 1۔ (اینڈریو اپیل بائی: 1980)

بیماریوں کے دوش بدوش یورپ میں قحط بھی تسلسل سے پڑتے رہتے۔ جے ایچ ایلیٹ نے قحط اور قحط الرجالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے:

> ”امراء کھاتے ہیں اور زیادہ کھاتے ہیں جب کہ ہزاروں بھوکی آنکھیں انہیں لذیذ اور مقوی کھانے ہضم کرتے ہوئے دیکھتی رہتی ہیں“

2۔ (جے۔ ایچ۔ ایلیٹ: 1964)

یورپ کے اس عہد بلاخیز میں عوام کی معاشی حالت اس قدر ابتر ہو چکی تھی کہ اجناس کی قیمتوں میں قلیل ترین اضافہ بھی ہزاروں اموات کا سبب بن جاتا تھا۔ سولہویں صدی کے برطانیہ، فرانس، سپین اور ہالینڈ میں گندم کی قیمت میں اضافے کا نتیجہ ہزاروں افراد کی فوری اموات کی صورت میں نکلتا۔ سپین کے کاشت کاروں کا وہ خونی احتجاج تاریخ میں محفوظ ہے جو انہوں نے اشیائے خوردنی کی بڑھتی ہوئی قلت اور قیمتوں کے خلاف 1513ء میں کیا تھا۔ یورپ کے اس نامہرباں عہد میں گرانی نے موت ارزاں اور جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ ایک پونڈ گوشت کی قیمت ایک بھیڑ جتنی اور ایک روٹی کی قیمت پچاس روٹیوں کے برابر ہو چکی تھی۔ قحط، گرانی اور اشیاء کی نایابی نے برطانیہ، فرانس اور سپین کے دیہاتی علاقوں کو خصوصاً شدید متاثر کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں کاشتکاروں کی شہروں کی طرف نقل مکانی سے پیرس، روم، غرناطہ، میڈرڈ، مالغا اور لندن میں مزید مسائل پیدا ہوئے۔ یورپ میں سولہویں صدی میں قحط اور بیماریوں سے مسلسل اموات کی افراتفری میں یہ ریکارڈ تو نہ رکھا جا سکا کہ کتنے قحط سے مرے اور کتنے بیماریوں سے لیکن جن مرنے والوں کو نہ دفنانے والے میسر تھے نہ نوحہ گر وہاں ریکارڈ رکھنے والے کہاں سے آتے۔ اس زبوں حالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے مشہور تاریخ دان لارنس سٹون لکھتے ہیں:

> "پندرھویں اور سولہویں صدی میں لندن کا خصوصی مسئلہ یہ تھا کہ وہاں جگہ بہ جگہ بڑے بڑے گڑھے کھود کر انسان اور جانوروں کی لاشوں کو ایک دوسرے کے برابر رکھ دیا جاتا پھر لاشوں کے اوپر لاشیں رکھ دی جاتیں جب وہاں مزید لاشیں رکھنے کی جگہ نہ رہتی تو گڑھے کو مٹی سے ڈھانپ دیا جاتا۔ بارش کے بعد اور موسم گرما میں ان گڑھوں کے پاس سے اٹھتے ہوئے تعفن کی تاب نہیں لائی جا سکتی تھی اور یہ سب کچھ انتہائی کریہہ المنظر تھا۔"
>
> 3۔ (لارنس سٹون:1977)

یورپ کے ایک ہزار سالہ دور جہالت میں جہالت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس عہدِ جہالت کے بطن سے ایسے مہذب پیدا ہونے عبث تھے جو دوسروں کو غیر مہذب قرار دے سکتے مگر چشم فلک، کرہ ارض پر یہ پُر آشوب منظر بھی دیکھ چکی ہے کہ یورپ سے امریکہ میں آ کر آباد ہو جانے والے چور خواجہ بنے ہوئے تھے۔ ڈاکو اور قاتل اخلاقیات کا درس دیتے تھے۔ زنا کار بدچلنی کے قلع قمع کے منصوبے باندھتے تھے، غاصب منصف بنے ہوئے تھے اور بددیانت راہبی

پر متعین تھے۔ بیماری، افلاس، قحط اور جہالت کے ساتھ ساتھ یورپ میں جرائم کی بھی بھر مار تھی۔ لندن اور پیرس میں لوٹنے کے آسان اور آزمودہ نسخے میں راہ چلتے راہ گیر پر اوپر کی منزل سے پتھر پھینکنے کا عام رواج تھا۔ راہ گیر جب زخمی ہوکر گر پڑتا تو اس کی اشیاء چھین لی جاتیں۔ وسط گرما کے میلوں ٹھیلوں میں زندہ بلیوں کو آگ میں جلانے کا مظاہرہ کیا جاتا۔ ان دو صدیوں میں ثقافتی طور پر درندگی اور معاشرتی طور پر بے رحمی یورپ کا مزاج بن چکا تھا۔

قانون کے نفاذ کے لیے نہ پولیس تھی نہ ادارے نہ مناسب عدالتیں۔ محلے اور آبادیاں چوراچکّوں اور ٹھگوں کا مسکن بن چکی تھیں۔ امراء رات کے وقت لالٹین بردار محافظوں کے بغیر گھر سے نکل نہیں سکتے تھے۔ وقفے وقفے سے متاثرین قحط کے جلوس نکلتے رہتے تھے جو مزید لاقانونیت کو جنم دیتے۔ 1542ء میں اسی طرح شروع ہونے والے مظاہرے کسانوں کی جنگ میں بدل گئے جو کئی سال جاری رہے اس خون خرابے میں ایک لاکھ افراد مارے گئے۔ فرانس میں دیہی معاشرت بدترین معیار زندگی سے چمٹی ہوئی تھی۔ فرانس کے مشہور کیری کچر آرٹسٹ اور طنز نگار جین لابروئے رینے اس ہولناک فرانسیسی دیہی زندگی کی تصویر کھینچتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ”خاموش اور افسردہ نر اور مادہ جانور دیہی علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تمازت زدہ، نیم سوختہ سیاہی مائل اور بدرنگ جلدوں والے اپنے کھودے ہوئے گڑھوں سے وابستہ جو کچھ بھی فتح کرنے پر قادر نہیں ہیں اپنے مخصوص طرز بیان کے ساتھ جب اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ہیں تو ان پر انسان ہونے کا شبہ گزرتا ہے۔ حقیقتاً یہ انسان ہی ہیں جو رات کو اپنے بلوں میں گھس جاتے ہیں جہاں یہ مخلوق کالی روٹی، پانی اور جڑی بوٹیوں پر زندہ رہتی ہے۔“ 4۔ (جیکولیز بولانگر:1963)

ان دو صدیوں میں یورپی معاشرت خوف، خودغرضی، نفرت اور راہبانیت کی ایسی انتہا پر پہنچ چکی تھی جہاں رحم، انسانیت، توازن، شائستگی اور بقائے باہمی کا ناطہ مفقود ہو جاتا ہے۔ انسانی سرشت پر حیوانی جبلّت غالب آجاتی ہے۔ لارنس سٹون نے لندن میں برہنہ قبروں کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صرف لندن تک محدود نہیں تھا بلکہ یورپ کے اکثر شہروں اور دیہاتوں میں یہ کریہہ المنظری عام تھی۔ یورپ میں سماجی اقتدار کے زوال سے نفرت، جہالت اور نفسانفسی کو فروغ

حاصل ہوا اور پاپائیت کے عروج سے تنگ نظری، تعصب اور توہم کو۔ یورپ کے بیشتر شہروں میں کم از کم ایک تہائی آبادی پر شیطانی قوتوں کے پیرو کار ہونے کا الزام عائد تھا۔ ''وچ کرافٹ'' کے نام پر ہونے والے قتل بڑے بہیمانہ تھے اور اس کی بنیاد میں خانقاہی جہالت کار فرما تھی۔ وسیع پیمانے پر سفلیات، عملیات اور جادوگری کے عہد تاریک کے بارے میں ڈیوڈ سٹینرڈ لکھتے ہیں:

> ''سولہویں صدی کے آخر میں سوئٹزر لینڈ جیسے پُرامن ملک میں صرف ایک سال میں تین ہزار تین سو لوگوں کو شیطانی حرکات کے الزام میں سرعام سزائے موت دی گئی۔ وائزن سٹیگ جیسے چھوٹے شہر میں 67 عورتوں کو شیطانی قوتوں کی آلہ کار ہونے پر زندہ جلایا گیا جب کہ اوبر مارچٹل میں جس کی آبادی صرف سات سو نفوس پر مشتمل تھی، چون افراد کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔ گو کہ یہ کہنا تو ٹھیک ہوگا کہ اس عہد کے یورپی افراد کے جذبات ہم جیسے ہی رہے ہوں گے لیکن ان کے محبت بھرے جذبوں پر نفرت غالب آ چکی تھی۔'' 5۔ (ڈیوڈ سٹینرڈ: 1992)

ان دو سو سالوں میں خصوصاً برطانیہ اور فرانس پستی کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ بے گھر، بے یار و مددگار لوگ اپنے آپ کو خدمت گار غلاموں کے طور پر معینہ مدت کے لیے فروخت کر دیتے تھے۔ یہ مدت عموماً موسم سرما کے آغاز سے آخر تک ہوتی۔ اس وقت فروخت ہو جانے والوں کو خوش قسمت تصور کیا جاتا تھا چونکہ جو اپنے آپ کو فروخت نہیں کر سکتے تھے انہیں شدید سردی کے ہاتھوں مر جانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ سرما کی آمد کے ساتھ ساتھ جنہیں خود کو بیچنے کا مرحلہ درپیش ہوتا گرمیوں کی آمد پر وہ اپنے آپ کو طاعون سے محفوظ رکھنے کی فکر میں مبتلا ہو جاتے۔ طاعون گرمی گرمی یورپی شہروں پر یلغار کرتا اور ہزاروں لوگ مارے جاتے۔ موسم گرما کے شروع ہوتے ہی روم، لندن، پیرس، جینوا، وینس اور دوسرے یورپی شہروں سے امراء و اشرافیہ کا طبقہ طاعون کے ڈر سے دور دراز علاقوں کا رخ کر لیتا جو شہروں سے نقل مکانی کی سکت نہیں رکھتے تھے وہ یا تو طاعون سے مارے جاتے یا بھوک سے یوں گرمیوں میں یورپ کے شہر، شہر خموشاں کا نظارہ پیش کر رہے ہوتے۔ صحت عامہ کی حالت بھی قابل رحم تھی۔ صرف چالیس فیصد بچے دس سال کی عمر تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے اموات کم عمری کی وجوہات میں بیماریاں، خوراک کی

قلت اور غیر معیاری خوراک کے علاوہ بچوں کا پھینک دیا جانا بھی شامل تھا۔ کوڑا کرکٹ کے انبار کے پہلو بہ پہلو ایسے عمودی گڑھے بھی پائے جاتے تھے جن سے بچوں کے رونے کی مسلسل آوازیں آتی رہتی تھیں۔ ان گڑھوں سے بچوں کو نکال کر فروخت کر دینا ایک عام بات تھی۔ اس قبیح فعل سے یورپ میں غلام بچوں کے کاروبار کی ایک ایسی صنعت ابھری جس میں اشیائے فروخت، خرید کردہ کی بجائے حاصل کردہ ہوتیں۔ دیہی علاقوں کے بڑے زمیندار کھیتی باڑی کی مشقت کے لیے ان بچوں کی پوری پوری لاٹ خرید لیتے اور پورے پورے جہازوں کا سودا کرتے۔ فرانس میں غلام بچوں کی یہی نسل جب جوان ہوئی تو انقلاب فرانس میں گلوٹین سے گردنیں کاٹنے اور امراء و اشرافیہ کو کھولتے تیل میں پھینکنے پر فائز ہوئی۔ سترھویں صدی میں یورپ کی انقلابی شورشوں میں غلام بچوں کی اس نسل نے موثر کردار ادا کیا۔ یورپ میں بچوں کی تجارت پر روشنی ڈالتے ہوئے جان بوزویل لکھتے ہیں:

> ”مشرقی یورپ کے بچوں خصوصاً رومانیہ کے بچوں کی بہت مانگ تھی۔ وہ بالغ غلاموں کی قیمت پر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتے۔ غلام بچوں کی تجارت میں ملوث ایک دلال کے خط سے اس کاروبار کے بہیمانہ اسرار اور یورپ کی ذہنی پستی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غلام بچوں کی خرید و فروخت میں ملوث ایک دلال اپنے گاہک کو مطلع کرتے ہوئے لکھتا ہے ”ہمیں اطلاع ملی ہے کہ تمہیں ایک کم عمر غلام لڑکی، کی ذاتی وجوہات کی بنا پر فوری ضرورت ہے۔ لڑکی کے مطلوبہ کوائف، خدوخال، ناک نقشہ، عمر اور ناپختہ حیض کی شرط سے ہم آگاہ ہو چکے ہیں۔ جس ضرورت کے لیے یہ لڑکی درکار ہے ہمیں اس کا بھی اندازہ ہے۔ رومانیہ سے آنے والے جہاز اکثر ایسی غلام لڑکیاں لاتے ہیں جو تمہاری شرائط کے مطابق ہوتی ہیں لیکن تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ نو عمر غلام لڑکیاں بھی انہی داموں بکتی ہیں جتنی کہ پختہ حیض والی جوان عورتیں۔ رومانیہ سے لائی گئی لڑکیوں میں کوئی بھی ایسی نہیں ہوتی جس کی قیمت پچاس ساٹھ فلورنس سے کم ہوتی ہو۔ قابل قدر چیز جو تمہیں مطلوب ہے اس پر دام بھی اتنے ہی خرچ ہوں

> گے۔" ان نوعمر فروخت کی جانے والی غلام لڑکیوں میں سے دس سے بیس فیصد پہلے ہی حاملہ ہوتیں جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتیں چونکہ ایک متوقع انسانی جان کی اضافی قیمت وصول نہیں کی جاتی تھی" 6۔ (جان بوزویل:1988)

یوں پیدائش سے پہلے ہی یورپی جاگیرداروں کے غلام بن جانے والوں کی زندگی کی المناکی کا اندازہ تو لگایا جاسکتا ہے لیکن اس کا تعین نہیں کیا جاسکتا کہ حقیقتاً ان غلاموں کی زندگی کس قدر پُر آشوب رہی ہوگی۔ پندرہویں صدی کے آخر میں یورپ جس دہشت گردی، لاقانونیت اور تشدد کی زد میں آیا وہ اگلی دو صدیوں پر پھیل گیا۔ قتل ہونا اور قتل کرنا معمول اور معمولی بات بن کر رہ گیا۔ انتھونی پیگ ڈن اس درندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "شیطانی طاقتوں کے حامل، پیروکاروں، عاملوں وغیرہ کا شکار کرنا اور انہیں زندہ جلانے کے علاوہ بھی انتہا پسندی اور تشدد کے مظاہرے عام تھے۔ 1476ء میں میلان میں قتل ہونے والوں کے اعضاء کھاتے ہوئے افراد عموماً دیکھے جاسکتے تھے۔ پیرس اور لیون کے بازاروں میں انسانی اعضاء سرعام فروخت ہوتے تھے۔ مذہبی فرض کی حیثیت سے قتل کر دینا اور تشدد کے بہیمانہ اطوار کو عبادت کا درجہ حاصل تھا۔" 7۔ (انتھونی پیگ ڈن:1986)

انتھونی پیگ ڈن نے پندرہویں اور سولہویں صدی کے یورپ کی جو منظر کشی کی ہے اس کے آئینے میں نہیں نہیں کے باوجود بھی ایک مانوس معاشرت کا عکس نظر آتا ہے۔ خون، گردے جگر اور آنکھوں کی خرید وفروخت سے اگر جہالت اور ظلم نہیں تو مال منفعت اور استحصالی بے رحمی یقیناً وابستہ ہے۔ اسی طرح گلی گلی سلطان العارفین اور قریہ قریہ سلطان الفقراء یورپ کے شیطانی قوتوں والے عاملوں سے ہرگز کم نہیں ہیں۔ حسب اُمید و وعدہ جب نہ تو جوانی پلٹ کے آئی نہ محبوب قدموں میں ڈھیر ہوئے نہ ہنڈیا چڑھی نہ سفل سبز ہوئے، نہ شریک اندھے ہوئے نہ مایا برسی تو ان عاملین کے خلاف اہل یورپ کا ماتھا ٹھنکا۔ ماتھا ٹھنکتے ہی انہوں نے ان کا شکار شروع کردیا کبھی انہیں زندہ جلایا کبھی جلانے سے پہلے مارلیا۔ ماتھا تو ادھر بھی ٹھنکا ہوا ہے لیکن ہم حسب روایت آخری حد تک نااُمیدی کے انتظار میں ہیں یہ حد آئے تو ادھر بھی شکار لگے۔

تا کجا اخگر کنارے ہی کنارے جایئے

ایک طرف یورپ اپنی بدترین جہالت میں گرفتار تھا تو دوسری طرف انہی سالوں میں

کرسٹوفر کولمبس اپنی مہم جوئی میں مصروف تھا۔ پس ماندہ' غیر مہذب' غیر انسانی اور بد خصائل یورپینز جب امریکہ پہنچے تو انہوں نے بے ساختہ اور یک زبان ریڈ انڈینز کو غیر مہذب کہنا شروع کردیا جب کہ وہ خود ایسے معاشرے کی پیداوار تھے جہاں انسانیت سنگسار' آدمیت شرمندہ اور شرف انسانی ناپید تھا۔ یہ حقیقت خاصی دلچسپ ہے کہ کولمبس اوراس کے رفقانے امریکہ پہنچتے ہی یہاں کے مقامی لوگوں کو غیر مہذب اور غیر انسانی صفات کا حامل قرار دے دیا تھا جب کہ کولمبس کی سپین سے روانگی کے وقت عینی شاہدین نے سپین کے جس مہذب معاشرے کا نقشہ کھینچا ہے اس کے پیش نظر ریڈ انڈینز کے غیر مہذب قرار دیئے جانے کو پندرہویں صدی کا سب سے بڑا جھوٹ تو کہا جاسکتا ہے مگر ریڈ انڈینز کو غیر مہذب اور یورپینز کو مہذب نہیں کیا جاسکتا۔

3 اگست 1492ء کو سپین کی بندرگاہ پالوس پر معمول سے زیادہ گہما گہمی تھی اقوام عالم کی تاریخ میں یہ بڑا عجیب وغریب دن تھا۔ ایک طرف تو عین اسی دن امیر البحر کوسٹوفر کولمبس نئی دُنیا کی دریافت پرروانہ ہورہا تھا' اس کے تینوں جہاز روانگی کے لیے کیل کانٹے سے لیس تیار کھڑے تھے جو کولمبس کو ایک ایسے سفر پر لے جارہے تھے جس سے اقوام عالم کے بدن پر گہرا شگاف پڑنا تھا اور دوسری طرف وہ جہاز لنگر انداز تھے جو سپین سے جلاوطن کئے جانے والے یہودیوں کو لے جانے پر معمور تھے۔ تین اور چار اگست کی درمیانی شب آخری یہودی کی سپین سے نکل جانے کی مہلت ختم ہورہی تھی۔ سپین کے عیسائی حکمرانوں کے ہاتھوں یہودیوں کی بربادی کا عمل مکمل ہوچکا تھا۔ مسلمانوں کا شروع تھا اور ریڈ انڈینز کا شروع ہونے کو تھا۔ قرائن کہتے ہیں کہ یہودیوں کی تاریخ اپنے آپ کو دوہرانے والی ہے۔ انسانی تاریخ میں یہودیوں کی تاریخ نے ایک مخصوص وقفے کے بعد اپنے آپ کو دوہرائے جانے کا تسلسل قائم رکھا ہے۔ کولمبس اور ملکہ ازابیلا کے ورثا کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد تاریخی دائرے کی گردش اپنی تکمیل کے اگلے مرحلے میں یہودیوں کا شکار کرتی نظر آتی ہے۔ منطقی طور پر یوں بھی ملکوں ملکوں سے یہودیوں کے نکالے جانے کے بعد اب امریکہ سے یہودیوں کا نکالا جانا واجب ہوچکا ہے۔ فرانس' بیلجیم' ہنگری' برطانیہ' آسٹریا' پروشیا' سپین' اٹلی' ہالینڈ اور جرمنی سے یہودیوں کی بے دخلی کے بعد اب امریکہ سے ان کا نکالا جانا تاریخ کا منطقی عمل اور تاریخی گردش کی منطقی تکمیل ہوگی۔ پچھلے ایک ہزار سالوں میں اوسطاً ہر سو سال بعد یہودیوں پر کوئی نہ کوئی زمین تنگ ہوتی رہی ہے۔ جرمنی میں ان پر آخری افتاد کو قریب ساٹھ برس بیت چکے ہیں اگر تاریخ کی

گردش کی راہ میں کوئی رخنہ نہ ڈالا گیا اور تاریخ نے اپنے دوہرائے جانے کا بھرم قائم رکھا تو لگ بھگ 2040ء میں امریکہ سے یہودیوں کے انخلاء کی اُمید رکھی جاسکتی ہے۔

چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کسی کی نہیں

مورخ بارتھولیمیو سینا ریگا تاریخ کے اس عجیب وغریب دن کے عینی شاہد ہیں۔ پالوس میں تین اگست کو ان کی چشم حیرت نے روانگی کے دونوں منظر دیکھے اور محفوظ کر لئے یہودیوں کی سپین سے جلا وطنی کی تکمیل ہونے تک تین لاکھ یہودی قتل یا ملک بدر ہوچکے تھے ان کی آبرو اور املاک لوٹی جاچکی تھیں وہ غم زدہ تھے اور ان کی مہلت ختم ہورہی تھی۔ بارتھولیمیو تین اگست 1492 کے دن کی عینی شہادت میں لکھتے ہیں:

> ”ان یہودیوں کی حالت قابل رحم تھی اور ان کے مصائب پر رحم آتا تھا۔ ان میں سے بیشتر کو بھوک نگل چکی تھی خصوصاً دودھ پلانے والی ماؤں اور دودھ پینے والے بچوں کی حالت غیر تھی۔ نیم مردہ ماؤں نے مرے ہوئے بچوں کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ میں بہ مشکل ہی یہ بیان کرسکتا ہوں کہ انہیں جہازوں تک لانے والے ہسپانوی حکام کس قدر لالچی اور ظالم تھے۔ بہت سوں کو صرف اس وجہ سے قتل کردیا گیا تھا کہ ان کے پاس تاوان میں دینے کو کچھ بھی نہیں تھا جب کہ اکثر نے اپنے بچوں کو بیچ کر سفر کا تاوان ادا کیا یا بچے ہی تاوان میں دے دیئے۔“

8۔(بارتھولیمیو سینا ریگا:1514)

کولمبس کی روانگی کے بارے میں بارتھولیمیو لکھتے ہیں:

> ”پالوس کا شہری حاکم ملکہ و بادشاہ کی طرف سے کولمبس کو رخصت کرنے آیا ہوا تھا اور دوسرے حکام بھی موجود تھے کولمبس نے ایڈمرل والی امتیازی ٹوپی اور کپڑے پہن رکھے تھے۔ تینوں جہازوں کے عمال سرگرمی سے اس کے احکامات بجالانے میں مصروف تھے۔ اسے کولمبس کی دور اندیشی یا خوش بختی ہی کہا جاسکتا ہے کہ جب دوسرے یہودیوں کی جان پر بنی تھی اور انہیں گردن بچانا مشکل ہورہا تھا کولمبس اس افتاد سے پوری طرح محفوظ تھا۔ وہ یقیناً اپنے یہودی النسل ہونے کو غیر ضروری بنا کر پیش

کرنے میں کامیاب رہا تھا۔" 9۔ (بارتھولیمیو سینا ریگا:1514)

یہ اس تضاد بھرے مہذب یورپ کا احوال تھا جہاں سے افریقی غلاموں کی تجارت کا سابقہ دلال کرسٹوفر کولمبس نئی دنیا کی تلاش میں روانہ ہوا تھا جس ملک اور براعظم سے وہ چلا تھا وہاں قحط، بیماری، تشدد، جہالت، مذہبی تنگ نظری، توہم پرستی، افلاس، بے راہ روی اور لاقانونیت اپنے عروج پر تھی۔ روم، لندن، پیرس، فلورنس اور جینوا میں کسبیاں، بھانڈ، بھڑوے، ڈوم، میراثی، لونڈے، سپردائی، زنخے، امرد، ڈومیناں، کنچنیاں، ہیجڑے، ناچے، پاتریں، ٹھگ اور نوسر باز اس کثرت سے پائے جاتے تھے کہ ان شہروں میں رہائشیوں کو تحفظ کی خاطر کسی ایک نہ ایک کی حمایت حاصل کرنا ضروری ہوتی۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق اس مہذب یورپ کی تہذیب و معاشرت کے بارے میں ڈاکٹر ڈریپر (1882) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "قرون وسطی میں یورپ کا بیشتر حصہ لق و دق بیابان یا بے راہ جنگل تھا، کہیں کہیں راہبوں کی خانقاہیں اور چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد تھیں، جا بجا دلدلیں اور غلیظ جوہڑ تھے، لندن اور پیرس جیسے شہروں میں لکڑی کے ایسے مکانات تھے، جن کی چھتیں گھاس کی تھیں، چمنیاں، روشندان اور کھڑکیاں مفقود، آسودہ حال امراء فرش پر گھاس بچھاتے اور بھینس کے سینگ میں شراب ڈال کر پیتے تھے۔ صفائی کا کوئی انتظام نہ تھا، نہ گندے پانی کو نکالنے کے لیے نالیوں اور بدروؤں کا رواج تھا، گلیوں میں فضلے کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ چونکہ سڑکوں پر بے اندازہ کیچڑ ہوتا تھا، اور روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا، اس لیے رات کے وقت جو شخص گھر سے نکلتا، وہ کیچڑ میں لت پت ہو جاتا، تنگی رہائش کا یہ عالم تھا کہ گھر کے تمام آدمی اپنے مویشیوں سمیت ایک ہی کمرے میں سوتے تھے، عوام ایک لباس سالہا سال تک پہنے رہتے تھے، جسے دھوتے نہیں تھے، نہانا اتنا بڑا گناہ تھا کہ جب پاپائے روم نے سسلی اور جرمنی کے بادشاہ فریڈرک ثانی پر کفر کا فتویٰ لگایا تو فہرست الزامات میں یہ بھی درج تھا کہ وہ ہر روز مسلمانوں کی طرح غسل کرتا ہے۔" 10۔ (غلام جیلانی برق:1977)

طاہر محمود گوریجہ اپنی کتاب نوادرات میں رابرٹ بریفالٹ کی ''ایورپا'' سے ایک اقتباس میں لکھتے ہیں:

> ''غلیظ جسم اور میلے لباس کی وجہ سے جوؤں کی ایسی کثرت تھی، کہ جب کنٹربری (برطانیہ) کالاٹ پادری باہر نکلتا تھا تو اس کی قبا پر سینکڑوں جوئیں چلتی پھرتی نظر آتی تھیں۔ فقر و فاقہ کا یہ عالم تھا کہ عام لوگ سبزیاں، پتے اور درختوں کی چھال اُبال کر کھاتے تھے، 1030ء کے قحط میں لندن کے بازاروں میں انسانی گوشت بھی بکتا تھا، اور فرانس کے ایک دریا ''ساؤن'' کے کنارے انسانی گوشت کی کتنی ہی دکانیں تھیں۔
>
> جاگیرداروں کے قلعے ڈاکوؤں کے اڈے تھے، جو مسافروں پر چھاپے مارتے اور زر فدیہ وصول کرنے کے لیے انہیں پکڑ لاتے اور حصول زر کے لیے وہ مختلف طریقے استعمال کرتے تھے۔ مثلاً پاؤں کے انگوٹھوں کو رسی سے باندھ کر الٹا لٹکا دیتے، یا گرم سلاخوں سے جسم کو داغنے یا گرہ دار رسی کو سر کے گرد لپیٹ کر پوری طاقت سے مروڑتے۔
>
> رومیوں نے دریائے رائن کے کنارے جتنے شہر آباد کئے تھے وہ رفتہ رفتہ سب اجڑ گئے، نویں صدی میں ان میں سے ایک بھی باقی نہیں تھا، ان کے کھنڈروں میں بھیڑیوں، ریچھوں، اور خنزیروں کے گلے گھومتے نظر آتے تھے، لوگوں کی بے حیائی کا یہ عالم تھا کہ ڈٹ کر کھاتے تیز شراب پی کر ہنکارتے، غل مچاتے، فساد کرتے اور ہر روز حرام کاری کے نئے ریکارڈ قائم کرتے تھے۔'' 11۔ (طاہر محمود گوریجہ: 1995)

ایک طرف تو ملکہ ازابیلا، کرسٹوفر کولمبس، امریکی صدر جارج واشنگٹن، تھامس جیفرسن اور دوسرے امریکی صدور اور حکام بظاہر تو ریڈ انڈینز کو غیر مہذب اور ناقابل اصلاح کہے جاتے تھے۔ لیکن اندرخانے اور آپس کی خط و کتابت سے ریڈ انڈینز کے بارے میں ان کے مختلف خیالات سامنے آتے ہیں جیسا کہ 4 مارچ 1493ء کو کولمبس نے ایک خفیہ مراسلے میں ملکہ ازابیلا کو لکھا:

> ''اس جزیرے کے لوگ اور ان تمام جزائر کی آبادی جو کہ میں دیکھ چکا ہوں یہاں مرد اور عورتیں برہنہ رہتے ہیں جیسا کہ ان کی ماؤں نے

> انہیں جنم دیا تھا۔ عورتیں درخت کے بڑے پتوں سے یا باریک کپڑے سے جسم کے مخصوص حصوں کو ڈھانپے رکھتی ہیں۔ ان کے ہاں لوہا، فولاد یا ہتھیار مستعمل نہیں ہیں نہ ہی ان لوگوں میں انہیں استعمال کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ گو کہ یہ مضبوط جسم اور خوبصورت خدوخال والے لوگ ہیں کیونکہ یہ لوگ آزادانہ گھومتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ حق ملکیت سے اس قدر لاتعلق ہیں کہ انہیں دیکھے بغیر اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ان کے پاس جو کچھ بھی ہو اسے دینے میں تامل نہیں کرتے بلکہ وہ لوگوں کو وسائل کے مشترکہ استعمال کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہ لوگ انتہائی محبت اور گرم جوشی سے پیش آتے ہیں اور حقیر سے حقیر تحفے کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔" 12۔ (کرسٹوفر کولمبس: 1493)

یہ اسی کرسٹوفر کولمبس کی تحریر ہے جس کی گردن پر چالیس لاکھ ریڈ انڈینز کے خون کا بار ہے اور انہی ریڈ انڈینز کے بارے میں ہے جنہیں وہ غیر مہذب اور غیر فطری مخلوق قرار دے کر قابل گردن زدنی ٹھہرا چکا تھا۔ کولمبس کے بعد برطانوی آبادکار بھی ریڈ انڈینز کے بارے میں دوعملی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ امریکہ کے قیام کے بعد امریکی حکومتیں، صدور اور سرکاری حکام بھی کولمبس کے نقش قدم پر ہی چلتے رہے بظاہر تو وہ بھی انہیں غیر مہذب اور کمتر مخلوق کہتے رہے لیکن اندر خانے وہ ریڈ انڈینز کی امن پسندی، انسانیت اور جمہوری اطوار کے معترف رہے۔ صدر تھامس جیفرسن، ایڈورڈ کیرنگسٹن کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "میں اس بات کا قائل ہوں کہ ریڈ انڈینز جیسے معاشرے جو کسی حکومت کے بغیر رہ رہے ہیں ان کی اکثریتی آبادی خوشی سے زیادہ لطف اندوز ہوتی ہے نسبتاً یورپینز حکومت کے ماتحت معاشروں کے۔ اول الذکر میں عوامی رائے کو قانون کا درجہ حاصل ہے اور اخلاقیات کا اطلاق اتنے ہی موثر طریقے سے ہوتا ہے جتنا کہ قانون کی موجودگی میں ہوسکتا ہے جب کہ موخر الذکر کی صورت میں حکومت کی موجودگی کے باوجود معاشرہ بھیڑ اور بھیڑیئے کی دو انتہاؤں میں بٹ چکا ہے۔" 13۔ (تھامس جیفرسن: 1787)

⌑ ⌑ ⌑

پھر حشر کے سامان ہوئے ایوانِ ہوس میں

> "میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسا معاشرہ جو بیک وقت ظالمانہ بھی ہو اور خود کو مہذب بھی کہتا ہو، ریاست کیسے تخلیق کر سکتا ہے۔ ہمیں یا تو غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنا ہو گا یا آزادی سے۔"
>
> (رالف والڈو ایمرسن: 1855)

مشہور امریکن فلاسفر، سیاسی دانشور اور مصنف رالف ایمرسن نے 1855 میں اپنی شہرہ آفاق تقریر میں جب درج بالا خیالات کا اظہار کیا تو وہ امریکی حکومت اور امریکی معاشرے کی اس دورخی پر تنقید کر رہے تھے جہاں بیک وقت آزادی بھی موجود تھی اور غلامی بھی۔ ان دونوں کا بیک وقت موجود ہونا ارفع انسانی اصول، اعلیٰ معاشرتی اقدار اور کسی بھی آئینی و جمہوری ضابطوں کی نفی کے مترادف ہوتا ہے۔ انسانی حقوق کا بج لگے اور جمہوریت کا زعم لاحق امریکہ میں یہ دو عملی اس کی مجموعی عمر کے 230 سالوں میں سے کم و بیش 200 سال پوری شد و مد سے جاری رہی ہے۔ انسانی حقوق اور جمہوریت کے ساتھ ساتھ جبریہ خدمت گار، نسلی منافرت اور دوسرے درجے کے شہریوں کی موجودگی امریکی آئین کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اس زمانے میں امریکی آئین کا حال، حلیہ ہمارے پاکستانی آئین سے مختلف نہیں تھا کہ آئینی ضابطوں کی موجودگی میں غیر آئینی اقدامات کی گنجائش، نکال لی گئی تھی۔ مردہ ضمیروں کو ادھر بھی ضمیر کی آواز سننے کا زعم لاحق رہا ہے۔ جس طرح پاکستانی آئین کی دفعات 62 اور 63 میں خائن، بد دیانت، فاسق، رسہ گیر اور ڈاکوؤں کو عوامی نمائندگی کے لیے نا اہل قرار دیے جانے کے باوجود ہماری اسمبلیوں میں ان کی کمی نہیں ہے اسی طرح امریکی آئین (بل آف رائٹس) میں انسانی حقوق اور آزادی کی ضمانت موجود ہونے کے باوجود امریکہ میں غلام پائے جاتے تھے۔ لاکھوں غلاموں کی موجودگی

امریکی آئین کا ایسے ہی منہ چڑا رہی تھی جس طرح اسمبلیوں میں ہمارے نمائندے' ایوان صدر میں فوجی صدور' بھاری قرضوں کے نادہندگان وزراء' چنبہ ہاؤس کی چادریں' تولیئے' فٹ میٹ' بلب' صابن دانیاں' پردے' پنکھے' دیواری گھڑیاں' تکیہ غلاف' ایش ٹرے اور ائیر کنڈیشنر لے کر بھاگے ہوئے نمائندگان اور ایم این اے ہاسٹلز کے کھانے' لانڈری اور فون کے بل دبائے ایم این ایز پاکستانی آئین کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پنجاب اسمبلی کے اجلاس کے خاتمے پر جب نمائندگان اپنے گھروں کو پلٹتے ہیں تو چنبہ ہاؤس اس طرح اجڑ جاتا ہے جس طرح کابل سے روسی افواج کا انخلاء چنبہ ہاؤس میں ہی رونما ہوا ہو۔

رالف ایمرسن کے خیال میں ایک ہی معاشرے میں غلامی اور آزادی' ظالمانہ سماج اور مہذب معاشرے کی بیک وقت موجودگی ممکن العمل ہی نہیں تھی لیکن امریکہ میں یہ ناممکن بھی ممکن ہوگزرا ہے کہ امریکی آبادی کا دس فیصد مستقلاً غلاموں پر مشتمل ہونے کے باوجود امریکہ خود کو جمہوریت' انسانی حقوق اور آزادی کا چیمپئن سمجھتا تھا 1۔(رابن بلیک برن : 1997)

جس آبادی کا دس فیصد غلاموں پر مشتمل ہو یا تو وہاں آزادی مشروط ہوگی یا انسانی حقوق سوالیہ اور جس معاشرے میں انسانی حقوق ہی سوالیہ ہوں اسے کم ازکم مہذب نہیں کہا جاسکتا لیکن امریکہ میں یہ اندھیر نہ مشروط تھا نہ سوالیہ بلکہ سرعام اور تہذیب عام تھا۔ امریکی آبادی کے اس دس فیصد کو افریقہ سے اغوا کر کے لایا گیا تھا اور سیاہ فام و سیاہ بختوں کو بھیڑ' بکریوں کی طرح خریدا اور بیچا گیا تھا۔

ریڈ انڈینیز کی ساڑھے تین لاکھ مربع میل زمین ہتھیا لینے کے بعد اگلا مرحلہ اس زمین پر کاشت کاری کا تھا۔ جس طرح زمین مفت میں حاصل کی گئی تھی اسی طرح اس زمین پر بلا معاوضہ کام کرنے والے بھی ڈھونڈ لیئے گئے۔ جبریہ بیگار کے لیے غلاموں کی ضرورت افریقیوں کے اغوا سے پوری کی گئی۔ ان اغوا کاروں میں دلندیزی' برطانوی' پرتگالی' سویڈش اور ہسپانوی سرفہرست تھے لیکن امریکہ کا چاند چڑھتے ہی افریقہ تاریکی کے ساتھ ساتھ آہوں اور آنسوؤں میں بھی ڈوب گیا۔ یوں تو غلامی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ انسانی تمدن کی تاریخ لیکن جدید تاریخ میں غلامی کا اولیّن مستند حوالہ 700 عیسوی میں زنجبار (شمالی افریقہ) سے شروع ہوتا ہے۔ عرب اور ایرانی تسلط کے دوران زنجبار آٹھویں صدی میں غلاموں کی تجارت کے مشہور مرکز کے طور پر مشہور ہوا۔ جوزف انیکوری لکھتے ہیں :

> ''آٹھویں صدی میں مشرقی افریقہ کا ساحلی شہر زنجبار غلاموں کی تجارت کا اہم مرکز تھا۔ تنزانیہ کے نیاموزی اور بنٹونامی قبائل اندرون افریقہ سے لوگوں کو اغوا کر کے زنجبار میں اپنے اڈوں پر جمع کرتے رہتے۔ بعد ازاں انہیں غیر ملکی تاجروں کے ہاتھوں فروخت کر دیا جاتا۔ زنجبار کی مارکیٹ میں آٹھویں سے نویں صدی تک سالانہ تین ہزار غلام فروخت ہوتے تھے۔''
> 2۔ (اینکوری، انگرمین: 1986)

دسویں اور گیارہویں صدی میں افریقہ کے قبائلی سرداروں کا اپنے مخالف قبائل کے افراد کو اغوا کر کے حراست میں رکھنے سے افریقہ میں غلامی کی داغ بیل پڑی۔ خوراک اور دیگر اشیاء کے بدلے میں انسانی معاوضے کے رواج نے وقتی حراست طویل غلامی میں بدل دی اور بارہویں صدی تک افریقہ میں غلامی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ 1325 میں جب مالی کا مسلمان حکمران منشاء موسیٰ حج پر روانہ ہوا تو 500 غلام اس کے ہمرکاب تھے۔ 1453 میں بازنطینی سلطنت جونہی ترکی کے عثمانیوں کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچی اور معاشی لہر مشرق سے مغرب کے رخ چلی تو یورپ میں نئے معاشی امکانات پیدا ہونے لگے۔ ان امکانات میں افریقی غلاموں کی تجارت بھی شامل تھی۔ پندرہویں صدی کے آغاز سے ہی اٹلی، سپین، جنوبی فرانس، پرتگال اور برطانیہ میں افریقی غلاموں کی آمد اور خرید و فروخت شروع ہو چکی تھی۔ گو کہ یورپی تاریخ کے ہر عہد میں غلامی کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی ہے لیکن پندرہویں صدی کے وسط میں چیٹل سلیوری 'CHATTEL SLAVERY' کے نظریے، فروغ اور پھیلاؤ نے غلامی کو خالص منفعت اور صنعت کے طور پر مقبول بنا دیا۔ چیٹل سلیوری نے غلاموں کو ذاتی یا گھریلو خدمت گاروں اور زرعی کارکنوں کی بجائے اشیاء، اثاثہ، ملکیت، وزن اور پراڈکٹ قرار دے کر غلاموں کی آزادانہ خرید و فروخت کا راستہ ہموار کر دیا۔ اخلاق باختہ اور جہالت بھرا یورپ یوں تو صدیوں سے ہی عدم اخلاقیات کا شکار رہا تھا لیکن چیٹل سلیوری کے اس نئے نظریے نے مذہبی دباؤ بھی ختم کر دیا۔ غلامی کے اس تازہ بتازہ نظریے سے یورپی اقوام کی ظالمانہ سرشت اور حیوانی جبلت عریاں ہو کر آشکارا ہو گئی۔ اس نظریہ چیٹل سلیوری نے انسانوں کو اشیا میں بدل کر ان سے بہیمانہ سلوک کی انتہا کر دی، انسانوں سے اس سے زیادہ ظالمانہ سلوک ہلاکو اور چنگیز خان کے نظریات کے تحت بھی نہیں ہوا تھا۔ افریقیوں کو جس طرح اغوا کر کے جہازوں سے امریکہ لایا گیا اس کی ایک جھلک سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان افریقی ستم زدگان پر انسانوں سے

'اشیا' بننے پر کیا کیا گزری ہوگی۔ 1819 کے امریکی بحری قانون کے مطابق بحری جہاز کے 5 ٹن وزن میں دو مسافروں کی بار برداری ممکن تھی یعنی سو ٹن وزنی جہاز پر عملے کے سمیت 40 مسافر سفر کر سکتے تھے لیکن اشیاء پر اس قانون کا نفاذ نہیں ہوتا تھا اور چونکہ چیٹل سلیوری نے افریقی غلاموں کو اشیاء قرار دے دیا تھا سو' ان کی بار برداری میں '5 ٹن دو مسافر' والا ضابطہ نافذ العمل ہی نہیں سمجھا جاتا تھا' اس سے بہیمانہ اور کراہیت آمیز صورت حال نے جنم لیا۔ درج ذیل میں جہازوں کا وزن' 'اشیا' اور گنجائش کے تناسب سے انسانوں پر 'اشیا' بننے تک جو گزری اس کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے اس کا تعین نہیں کیا جا سکتا:

سال	جہاز	وزن جہاز (ٹن)	قانون کے مطابق مسافروں کی ممکنہ تعداد	'اشیا' (سوار/غلام مسافروں) کی تعداد	اونچائی (کمرہ/کیبن)
1824	ڈیانا	66	26	156	2 فٹ 7 انچ
1824	برازیلین فرینڈ	95	38	260	2 فٹ 6 انچ
1824	اولیسو	165	66	465	3 فٹ 2 انچ
1837	ڈی لورس	107	42	314	2 فٹ 8 انچ
1837	لیفیاٹ	184	73	448	نامعلوم
1837	وبورا بردے	100	40	269	3 فٹ
1838	اسابیلٹا	36	14	150	2 فٹ دس انچ
1838	فلیساڈس	218	86	559	2 فٹ 6 انچ
1838	فلورلوانڈرو	90	36	289	نامعلوم
1838	پیسواہ	92	36	225	2 فٹ 7 انچ
1838	ڈیاکسا	72	28	210	نامعلوم
1838	ایروگینٹے	150	60	473	نامعلوم
1838	ڈان ارماس	64	21	305	2 فٹ دس انچ

3۔ (ریلیجس سوسائٹی آف فرینڈز رپورٹ: 1841)

جہاں ایک کی گنجائش تھی وہاں دس قید تھے، اس کھلی قانون شکنی پر انسانی آزادی اور انسانی حقوق کے امریکی منادلب بستہ وچشم بستہ رہے ۔ چونکہ روایتی طور پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر امریکی مروڑا اسی وقت اٹھتا ہے جب امریکہ کے حقوق زد پر ہوں نہ کہ انسانی و جمہوری حقوق ۔

موجودہ انسانی تاریخ میں ریکارڈ شدہ پہلا انسانی نیلام **1441** میں لاگوس (پرتگال) میں ہوا۔ ایک بحری جہاز کے پرتگالی کپتان نیونو ٹرشاؤ نے برانکو (ماریطانیہ) سے بارہ افریقی اغوا کیے اور انہیں لاگوس میں لا کر فروخت کردیا۔ **1444** میں پرتگالی حکومت کے ایک ٹیکس کمشنر لان کروٹے نے لاگوس میں افریقی غلاموں کی تجارت کی غرض سے ایک کمپنی قائم کی ۔ اس کمپنی کا پہلا سودا ہی ایسی کامیابی سے ہمکنار ہوا کہ پورے یورپ میں ہل چل مچ گئی ۔ لان کروٹے **235** افریقیوں کو اغوا کر کے پرتگال تک لانے میں کامیاب رہا تھا یہ تمام بدنصیب افراد پرتگال میں ہاتھوں ہاتھ نیلام ہوئے تھے۔ **1452** میں جب پہلی بار نیشکر دریافت ہوا اور پرتگال میں گنے کی وسیع پیمانے پر کاشت شروع ہوئی تو بلا معاوضہ کارکنوں کی مانگ میں کئی گنا اضافہ ہوگیا ۔ اس مانگ کو تجربہ کار بردہ فروش لان کروٹے نے کامیابی سے پورا کیا لیکن اسی دوران مزید پرتگالی اور ولندیزی بھی اس کاربد میں سرگرم ہوچکے تھے ۔

18 جون **1452** کو انسانیت کے بدترین مجرم، لاکھوں ریڈ انڈینز اور افریقیوں کے قاتل پوپ نکولس پنجم نے پرتگیزیوں کو ایک خصوصی مذہبی فرمان کے ذریعے غیر عیسائیوں کو غلام بنانے کا فتویٰ دے دیا۔ عیسائیت کے سب سے بڑے ادارے اور مقدس ترین پیشوا کی طرف سے غیر عیسائی نسل انسانی کو غلام بنانے کی مذہبی اجازت نے اگلی چار صدیوں کے لیے افریقیوں پر زمین تنگ اور زندگی عذاب کردی ۔ اس فتویٰ کی زد مسلمانوں پر بھی پڑی اور مغربی افریقہ کے مردم خیز مسلمان علاقے بھی شدید متاثر ہوئے ۔ **4**۔ (پوپ نکولس پنجم : **1452**) پوپ نکولس پنجم کی لگائی آگ افریقہ میں ابھی بھڑکنا ہی شروع ہوئی تھی کہ قاتل اعظم یعنی اسقف اعظم نے **8** جنوری **1454** کو ایک اور مذہبی فرمان کے ذریعے افریقی غلاموں کی تجارت پر، پرتگیزیوں کی اجارہ داری مختص کردی ۔ **5**۔ (پوپ نکولس پنجم: **1454**)

اس حکم نامے سے ہسپانوی اور ولندیزی بردہ فروش مشتعل ہوگئے اور قرطبہ اور میڈرڈ کے چوراہوں پر پوپ نکولس پنجم کی ماں بہن ایک کرکے رکھ دی۔ **1461** میں پرتگیزیوں نے

آرگیون (ماریطانیہ) میں غلاموں کی پہلی تجارتی کوٹھی قائم کی۔ اس کوٹھی میں ہزاروں غلاموں کو قید رکھنے، اذیت دینے اور ہلاک کرنے کا معقول انتظام تھا۔ 1470 میں ہسپانوی قزاق اور بردہ فروش پوپ نکولس پنجم کے 1454 کے مذہبی فرمان پر تین حرف، ہزار تبرہ اور لکھ لعنت بھیجتے ہوئے کاروبار میں زبردستی شریک ہوگئے یوں غلاموں کی تجارت سے پرتگیزیوں کی اجارہ داری تو جاتی رہی مگر ہالینڈ، فرانس، اٹلی اور برطانیہ کے بردہ فروش بھی میدان میں آ گئے۔ بردہ فروشوں کی بہتات سے غلاموں کی قیمتیں گر گئیں اور طلب میں اضافہ ہوگیا۔ ادھر یہ مانگ بڑھتی جاتی تھی ادھر افریقہ میں موت کا سایہ۔ ماریطانیہ، تنزانیہ، کانگو، موزمبیق، نمبیا، انگولا، سینیگال، گنی، گیانا، گھانا، نائیجیریا اور جنوبی افریقہ کے عوام غیر محفوظ ہوچکے تھے اور انہیں بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ سمندروں پر واقع افریقی ممالک اس بربریت کا خصوصی نشانہ بنے۔ نتیجے، غیر ترقی یافتہ اور سادہ لوح افریقیوں کے شکار میں پوپ نکولس پنجم سے لے کر، کرسٹوفر کولمبس تک اور ملکہ ازابیلا سے لے کر نئی دنیا کے امریکی تک سبھی شامل تھے۔

پندرہویں صدی سے سترہویں صدی تک افریقی غلام ہی افریقہ کی سب سے بڑی برآمد اور ہتھیار سب سے بڑی درآمد بن کر رہ گئے۔ خود کو محفوظ رکھنے کی جس امید پر یہ ہتھیار خریدے جاتے تھے نہ کبھی وہ مقصد پورا ہوسکا نہ غلاموں کی برآمد میں کمی آئی۔ یہ کمی آتی بھی کیسے، جو سفید فام افریقیوں کا شکار کرنے اور انہیں خریدنے آتے تھے انہی سے اغوا سے بچاؤ کا نسخہ پوچھا جاتا، وہ نسخے میں ہتھیار تجویز کردیتے۔ صیاد سے ہی حلقہ دام کی پیچیدگی پوچھنے والے سادہ دلوں میں محض میر تقی میر ہی شامل نہیں تھے، جن سے عارضہ لاحق تھا ان سے ہی دوا لینے کی سادگی افریقیوں میں بھی رائج رہی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں صنعتی اور معاشی ہما ہمی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ''افریقی برآمدات'' بھی بڑھتی جاتی تھیں غلاموں کی تجارت پر، پرتگیزیوں کی اجارہ داری ختم کرتے ہوئے جب دیگر یورپی اقوام اس کاروبار میں ملوث ہوئیں تو نئی انسانی منڈیوں کی ضرورت بھی بڑھتی گئی۔ 1480 کے وسط عشرے سے ہی غرناطہ میں مسلمانوں کے اقتدار کا جانا ٹھہر چکا تھا۔ ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ نئے اور عیسائی سپین کے لیے وسائل کی فراہمی اور معاشی منصوبہ بندی میں مصروف تھے، یہ منصوبہ بندی انہیں امریکہ سے پہلے افریقہ لے گئی۔ ملکہ اور بادشاہ کی حمایت سے 1481 میں ڈیاگو ازامیو نے مسلم اکثریت والے افریقی علاقے المینا (گھانا) میں مستقل بنیادوں پر غلاموں کی تجارت کے لیے ہسپانوی کوٹھی

قائم کی۔ مغربی افریقہ میں غلاموں کی تجارت کے لیے یہ پہلی ہسپانوی کوٹھی تھی جو اپنی مضبوطی، سنگینی اور خون آشامی کے سبب اگلی تین صدیوں تک دہشت، ظلم اور استحصال کی علامت بنی رہی۔ پندرہویں صدی کے آخر میں صرف اندلس کے مسلمان ہی نہیں بلکہ وہ جہاں بھی تھے ملکہ ازابیلا کے شر سے محفوظ نہیں تھے۔ جس طرح سکنک کا سانس متعفن اور لیکیر یا سانپ کے سانس میں سم ہوتا ہے اور ہوا کے رخ پر پھیلتا جاتا ہے اسی طرح ملکہ کا سانس اسلام دشمنی کے زہر سے آلودہ تھا۔ سو ہوا جس رخ بھی اس متعفن اور زہر بھرے سانس کو لے جاتی تھی وہیں مسلمانوں میں صف ماتم بچھتی چلی جاتی تھی۔

1481 میں اس کوٹھی کے قائم ہوتے ہی یہاں سے جو پہلا سودا، کاسٹائل (سپین) پہنچا وہ چار سو افریقی غلاموں پر مشتمل تھا۔ اس سودے کے حصول پر ملکہ اور بادشاہ کی باچھیں کھلنے کا اندازہ صرف وہی لگا سکتے ہیں جنہوں نے یہ خباثت بھری باچھیں کھلتی دیکھی ہوں گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اور آپ کو اس کریہہ المنظری سے محفوظ رکھا سو، صرف ادیبانہ قیافہ ہی باندھتا ہوں کہ ملکہ عالیہ کی باچھیں آخری حد تک کھل گئی ہوں گی، البتہ ان سم آلود باچھوں کو کھلتے دیکھنے والوں میں ملکہ کا وقائع نگار گوڈوئے کنتار شامل تھا۔ وہ اس موقع کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''کاسٹائل میں افریقی غلاموں کی وصولی کی اطلاع پھیلتے ہی جشن کا سماں پیدا ہو گیا، ملکہ عالیہ سے لے کر اس کے سنتریوں تک، ہر کوئی اس کامیابی کی خوشی میں شریک تھا اور ایک دوسرے کو مبارک کہتا تھا۔''

6۔ (گوڈوئے کنتار: 1868)

12، اکتوبر 1492 کو، کولمبس کے امریکہ پہنچنے کے ساتھ ہی براعظم افریقہ ایک نئی افتاد سے دوچار ہو گیا یہ افتاد اس قدر کڑی اور بھیانک تھی کہ افریقہ کی تین چوتھائی آبادی اس سے متاثر ہوئی ہیو تھامس لکھتے ہیں کہ:

> ''یورپینز نے افریقہ سے 40 ملین افریقیوں کو غلام بنا کر پا بہ سلاسل امریکہ کی طرف روانہ کیا جن میں سے قریب دس ملین ہی امریکہ تک پہنچ سکے۔ ایک افریقی غلام کو امریکہ تک پہنچانے کے لیے تین راستے میں ہلاک کیئے گئے یعنی 30 ملین افریقی راستے کی صعوبتوں، بیماری، بھوک

اور تشدد کا شکار ہو گئے۔" 7۔ (ہیو تھامس: 1977)

امریکہ کی اساس انسانی خون کی ارزانی پر استوار ہوئی۔

امریکہ کی بنیاد رکھنے والوں کی اسلام دشمنی تیس لاکھ اندلسی مسلمانوں کے سر لے گئی تھی' اس کی تعمیر کے مرحلے میں یورپی آباد کار امریکیوں نے سو ملین ریڈ انڈینز کو تہ تیغ کیا اور معاشی ترقی کا ڈالر ڈالر لاکھوں افریقیوں کے خون سے آلودہ ہے جس میں افریقی مسلمانوں کا لہو بھی شامل ہے۔ ہوس زر' جوع الارض اور جاہ کی خاطر اتنے وسیع پیمانے پر قتل و غارت کی کوئی اور مثال انسانی تاریخ میں مشکل سے ہی ملے گی۔ کرسٹوفر کولمبس کے سبز قدم امریکی زمین پر پڑتے ہی دو براعظم افریقہ اور امریکہ خون میں نہا گئے۔ امریکہ میں غلامی کی بنیاد کرسٹوفر کولمبس نے اپنے دست نحس سے خود رکھی۔ انسانوں کی نقل و حمل اور خرید و فروخت کا سابقہ تجربہ اس کے بہت کام آیا۔ ولندیزی برطانوی اور ہسپانوی بردہ فروشوں نے اس کا ربد کو آگے بڑھایا اور امریکیوں نے اسے انتہا اور عروج پر پہنچا دیا۔

امریکہ میں غلامی کی تاریخ 3 نومبر 1493 سے شروع ہوتی ہے۔ آج کے دن کرسٹوفر کولمبس جب امریکہ کے دوسرے سفر سے سپین واپس پہنچا تو اس کے جہازوں میں تائینو قبائل کے سات سو ریڈ انڈینز محبوس تھے۔ جنہیں وہ امریکہ سے واپس آتے ہوئے اغوا کر لایا تھا۔ سپین کے شاہی دربار میں کولمبس کو جرم بردہ فروشی پر پھانسی دیئے جانے کی بجائے اس کی تحسین کی گئی جس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ ادھر اس کا حوصلہ بڑھتا جاتا تھا ادھر سپین اور امریکہ میں غلاموں کی تعداد۔ سال 1502 کی کسی بد ساعت میں گردن اور پاؤں میں بندھی رسیوں سے گھسیٹتے ہوئے پہلے افریقی غلام کو امریکہ کے ساحل پر اتارا گیا۔ اس بدنصیب سیاہ فام کو وان ڈی کورڈوبا نامی بردہ فروش نے ہسپانوی دربار کی اجازت سے امریکہ میں فروخت کی غرض سے ارسال کیا تھا۔ اسی اثناء میں کولمبس کا بیٹا ڈیاگو کولون جسے ہسپانوی حکومت نے جزائر غرب الہند (امریکہ) میں اپنا گورنر مقرر کیا تھا وہ ریڈ انڈینز غلاموں کی کارکردگی سے نالاں تھا اسے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ ریڈ انڈین غلام اس قدر محنتی اور مخلص نہیں ہیں جتنی کہ وہ توقع رکھتا ہے۔ ڈیاگو کولون کی مسلسل شکایتوں کے جواب میں بادشاہ فرڈی نینڈ نے 22 جنوری 1510 کو پچاس افریقی غلاموں کا دستہ سپین سے سانٹو ڈومینگو (ڈومینکین ری پبلک) روانہ کیا جہاں ان افریقی غلاموں کو براہ راست گورنر کولون کی زیر نگرانی گنے کی کاشت پر مامور کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی

TO BE SOLD
SLAVES
SLAVES.
BLUCHER

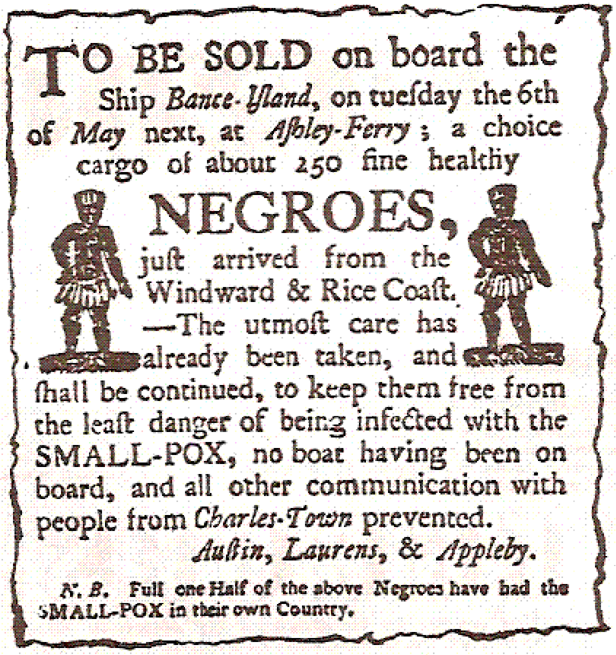

TO BE SOLD on board the Ship *Bance-Yſland*, on tueſday the 6th of *May* next, at *Aſhley-Ferry*; a choice cargo of about 250 fine healthy

NEGROES,

juſt arrived from the Windward & Rice Coaſt. —The utmoſt care has already been taken, and ſhall be continued, to keep them free from the leaſt danger of being infected with the SMALL-POX, no boat having been on board, and all other communication with people from *Charles-Town* prevented.

Auſtin, Laurens, & Appleby.

N. B. Full one Half of the above Negroes have had the SMALL-POX in their own Country.

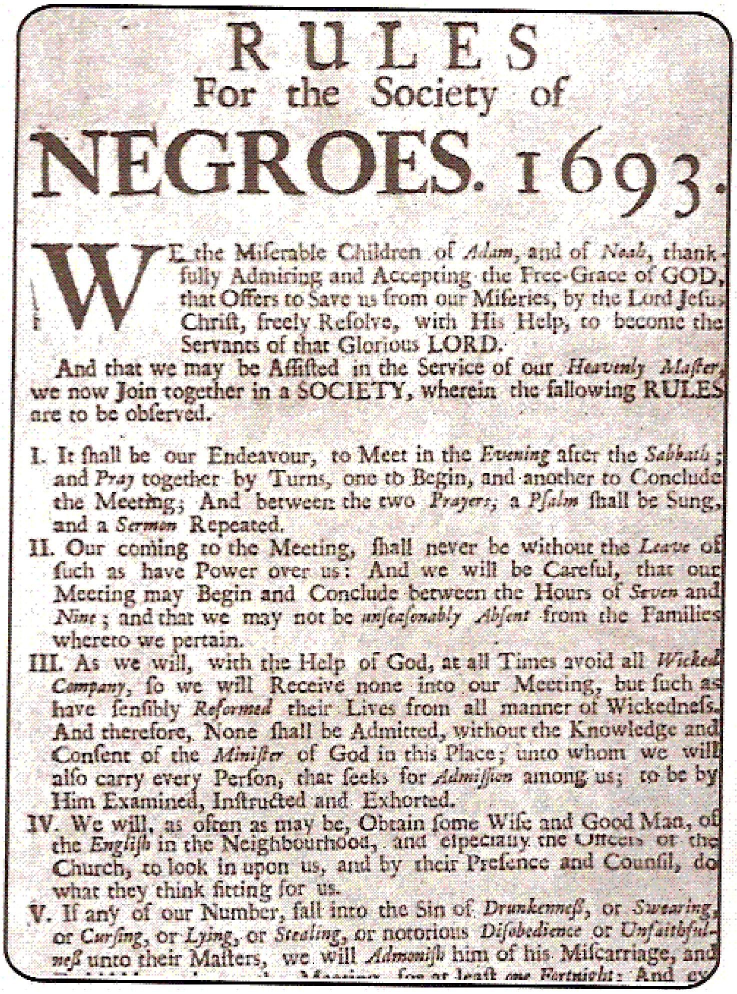

RULES
For the Society of
NEGROES. 1693.

WE the Miſerable Children of *Adam*, and of *Noah*, thankfully Admiring and Accepting the Free-Grace of GOD, that Offers to Save us from our Miſeries, by the Lord Jeſu Chriſt, freely Reſolve, with His Help, to become the Servants of that Glorious LORD.

And that we may be Aſſiſted in the Service of our *Heavenly Maſter*, we now Join together in a SOCIETY, wherein the following RULES are to be obſerved.

I. It ſhall be our Endeavour, to Meet in the *Evening* after the *Sabbath*; and *Pray* together by Turns, one to Begin, and another to Conclude the Meeting; And between the two *Prayers*, a *Pſalm* ſhall be Sung, and a *Sermon* Repeated.

II. Our coming to the Meeting, ſhall never be without the *Leave* of ſuch as have Power over us: And we will be Careful, that our Meeting may Begin and Conclude between the Hours of *Seven* and *Nine*; and that we may not be *unſeaſonably Abſent* from the Families whereto we pertain.

III. As we will, with the Help of God, at all Times avoid all *Wicked Company*, ſo we will Receive none into our Meeting, but ſuch as have ſenſibly *Reformed* their Lives from all manner of Wickedneſs. And therefore, None ſhall be Admitted, without the Knowledge and Conſent of the *Miniſter* of God in this Place; unto whom we will alſo carry every Perſon, that ſeeks for *Admiſſion* among us; to be by Him Examined, Inſtructed and Exhorted.

IV. We will, as often as may be, Obtain ſome Wiſe and Good Man, of the *Engliſh* in the Neighbourhood, and eſpecially the Officers of the Church, to look in upon us, and by their Preſence and Counſil, do what they think fitting for us.

V. If any of our Number, fall into the Sin of *Drunkenneſs*, or *Swearing*, or *Curſing*, or *Lying*, or *Stealing*, or notorious *Diſobedience* or *Unfaithfulneſs* unto their Maſters, we will *Admoniſh* him of his Miſcarriage, and [illegible] Meeting, for at leaſt *one Fortnight*: And ev

---

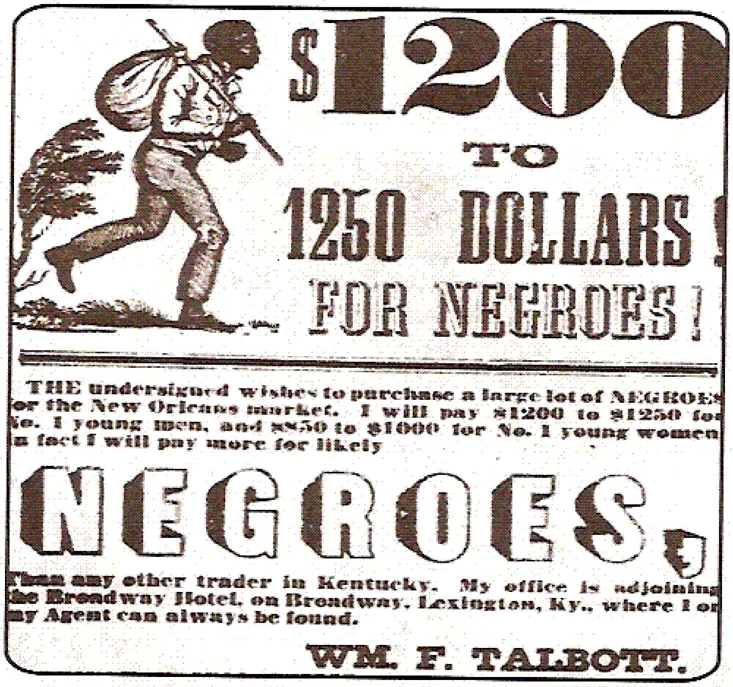

$1200
TO
1250 DOLLARS!
FOR NEGROES!

THE undersigned wishes to purchase a large lot of NEGROES or the New Orleans market. I will pay $1200 to $1250 fo o. 1 young men, and $850 to $1000 for No. 1 young women n fact I will pay more for likely

NEGROES,

Than any other trader in Kentucky. My office is adjoining he Broadway Hotel, on Broadway, Lexington, Ky., where I o y Agent can always be found.

WM. F. TALBOTT.

بادشاہ فرڈی ننڈ نے امریکہ میں غلاموں کی برآمد پر ہسپانوی حکومت کی عاید کردہ پابندیاں ختم اور طریق کار سہل کر دیا۔ گورنر کولون ریڈ انڈین غلاموں کی نسبت افریقی غلاموں کو زیادہ محنتی اور جفاکش سمجھتا تھا لیکن افریقیوں کی اسی جفاکشی کی شہرت نے انہیں امریکہ میں ایسی پراڈکٹ بنا دیا جس کے حصول کے لیے ہر حربہ اختیار کیا گیا۔ ہر ظلم روا رکھا گیا۔

غلاموں کی موجودگی کی تین صدیوں میں امریکی زمین انسانیت کے شرف سے محروم اور حیوانیت کے ننگ سے دوچار رہی۔ حقارت، درشتی، ظلم اور تذلیل کے امریکی ساحل پر گھسیٹے جانے والے اس پہلے افریقی غلام کا کوئی نام نہیں تھا۔ چیٹل سلیوری کے تحت اس کا شمار جہاز پر موجود اشیاء میں کیا گیا تھا۔ اس کا اندراج سامان کے نگ کے طور پر ہوا تھا۔ علم نفسیات کی جدید تحقیق اور نئے نظریے کے مطابق فرد کا ماضی سے ناطہ کاٹ دینے کو انفرادی اور امتیازی شناخت مٹانے کی خشت اول قرار دیا گیا ہے۔ اس سائیکی کے تحت افریقی غلاموں کو سب سے پہلے ان کے ذاتی اور قبائلی ناموں سے آزاد کیا گیا پھر خاندانی اکائی کی ریخت عمل میں آئی۔ بیٹی نیو یارک میں نیلام کی گئی اور بیوی مشی گن میں، بیٹا بالٹی مور میں بکا اور بھائی ٹیکساس میں، اس کے بعد غلاموں کو اپنی زبان، ثقافت، مذہب، رواج اور تہذیب کے بوجھ سے آزاد کیا گیا نتیجتاً رنج بھرا، انتقام آمادہ، ماضی سے بے نیاز، مستقبل سے لاپرواہ اور بقائے ذات کے مدار میں سرگرداں ایک ایسا سیاہ فام تخلیق ہوا جو آج کے امریکہ سے اپنے اجداد کی بلا معاوضہ محنت کی پائی پائی مع سود وصول کر رہا ہے۔ وہ کبھی امریکی معاشرے سے ان زیادتیوں کا جواب طلب کرتا ہے جو اس کے اجداد پر روا رکھی گئیں اور کبھی سفید فاموں کے اس تشدد کا جواب مزید تشدد سے دیتا ہے جس سے اس کی روح گھائل، سراپا زخم زخم اور عزت نفس تار تار ہوئی تھی۔ امریکہ کے ماہرین معاشرتی وعمرانی امور، ماہرین نفسیات واصلاح کار سالوں سے سر پکڑے یا سر جوڑے بیٹھے ہیں کہ اب اس کا کیا علاج کریں کہ امریکہ میں سیاہ فاموں کی موجودہ تعداد امریکی آبادی کا محض 12 فیصد ہے لیکن امریکی جیلوں میں سیاہ فاموں کی شرح 47 فیصد ہے۔ جبکہ 16 سال سے 37 سال کی عمر کے دوران 71 فیصد سیاہ فام مرد کم از کم ایک بار جیل جا چکا ہے۔ یہ شرح سیاہ فاموں کے اس انتقام بھرے اور دفاعی رویے کو ظاہر کرتی ہے جو امریکی سیاہ فام کیمسٹری میں نمایاں ہے۔

8۔(ہیومن رائٹس واچ ورلڈ رپورٹ : 2000)

امریکہ میں غلاموں کی طلب اس قدر عریاں تھی کہ عیسائیت کے پاپائے اعظم سے لے

کر امریکی صدر تک، عدلیہ کے اراکین سے لے کر بردہ فروشوں تک اور اہل قلم سے لے کر اصلاح کار تک بلاامتیاز منصب و احترام غلامی کے حق میں سینہ سپر تھے اور غلامی کے ثمر سے مستفید ہو رہے تھے۔ ان مستفید ہونے والوں میں پہلے امریکی صدر اور بابائے امریکی قوم جارج واشنگٹن بھی شامل تھے۔ صدر جارج واشنگٹن کے بعد مزید 12 امریکی صدور بھی سینکڑوں سیاہ فام غلاموں پر مالکانہ حقوق رکھتے تھے۔ کرسٹوفر کولمبس کے امریکی ساحل پر قدم رکھتے ہی امریکی زمین ایک ایسے المیے سے دوچار ہوئی کہ یہاں نظریہ، اصول اور انصاف پر کاروبار منافع اور منفعت غالب آ گئی۔ کولمبس کا مطمع نظر اس زمین سے زیادہ سے زیادہ مالی فائدہ سمیٹنے سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ سے اس کا یہی معاہدہ طے ہوا تھا کہ وہ نئی دنیا سے سونا، چاندی، معدنیات، غلام اور مال و زر لا کر خوش حالی کے انبار لگا دے گا۔ کرسٹوفر کولمبس اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کامیابی کی قیمت میں سو ملین ریڈ انڈینیز کی ہلاکت اور ان کی لاکھوں ملین ایکڑ زمین پر غاصبانہ قبضے کا غیر انسانی فعل بھی شامل تھا۔ امریکہ کے بارے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس کی دریافت اور قیام میں کسی نظریئے، اصول، انصاف اور حق کو قائم کرنا ہرگز نہیں تھا۔ امریکہ کی دریافت سے لے کر آزادی تک صرف ایک ہی نظریہ موجود رہا ہے جسے آسان ترین لفظوں میں 'نظریہ منفعت' کہا جاسکتا ہے...... کاروبار، سودے، خرید و فروخت ......جن مقاصد کے لیے امریکہ وجود میں آیا تھا وہ پورے ہوئے، یہاں کاروبار پھلا پھولا، سودے سر عام ہوئے اور ساہوکارہ سر تک آن پہنچا۔

امریکہ اور اصول، نظریئے، انصاف اور حق کا آپس میں کوئی ناطہ ہرگز نہیں ہے یہ دو متضاد چیزیں ہیں اول الذکر کا خون ہوا ہے تو موخرالذکر پروان چڑھا ہے۔ سو ملین ریڈ انڈینیز، 40 ملین افریقی اور دس ملین افریقی مسلمان اس کی بھینٹ چڑھے ہیں۔ انسانی حقوق پر امریکی واویلے نے اس کے دو سو سالہ گلٹ، پشیمانی اور پچھتاوے سے جنم لیا ہے، اسی لیے یہ مشروط، یک طرفہ اور غیر متوازن ہے۔ اصول کی اساس یافت پر اور نظریے کی بنیاد منفعت پر استوار ہو تو اسی طرح کے انسانی حقوق پھوٹتے ہیں کہ جس طرح کے امریکی زمین سے پھوٹ رہے ہیں۔

امریکی سرزمین پر انسانی آزادی اور انسانی حقوق کی ایک بیکراں، سوالیہ اور آزردہ ہوک قطب شمالی سے بحیرہ قلزم تک اور الاسکا کے سرد زار سے بحر اوقیانوس تک نامراد و تشنہء جواب گزرتی ہے۔ لب ساقی پر ہی صدا کا مکرّر ہونا متعین نہیں ہے یہ مرقد ستم زدگان سے بھی بلند ہوتی رہتی

ہے:

بے گناہ جنہیں کوڑے مارے گئے
درختوں پر پھانسی دی گئی
لٹکتی لاشوں کو آگ لگائی گئی
لاشیں جھولتی رہیں
کم سن بچیوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا
معصوم بچوں کو ماں سے جدا کیا گیا
باپ کے پاؤں توڑے گئے
زبانیں کاٹی گئیں
جوان عورتوں کو برہنہ کر کے نیلام کیا گیا
جوان مردوں کے جنسی اعضا کاٹے گئے
نقطہ انجماد میں زمین میں گاڑا گیا
درجہ کھولاؤ میں ریت پر باندھا گیا
عورتوں کی شرم گاہوں پر کھولتا ہوا صابون پھینکا گیا
نومولود بچوں کو شکاری کتوں کی خوراک بنایا گیا
مرد و زن کو تلوار کے ایک ہی وار سے دو ٹکڑے کر دینے پر شرطیں لگائی گئیں

جس نظریہ حیات میں غلام اونٹ پر سوار ہو اور امیر مہار تھامے آگے آگے چلتا ہو اور دوسری طرف غلاموں کی جان، مال، ناموس اور اہل خانہ تک ہوس کے ہاتھوں محفوظ نہ ہوں تو ایسے آخرالذکر کا اوّل الذکر پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا دعویٰ اسی قدر معتبر ہے جتنا کہ امریکی مورخوں کا تاریخ جاننے پر۔ تاریخ تو تاریخ وہ جن کا تین صدیوں پہلے جغرافیہ تک نہیں تھا اب قوم ڈیڑھ ہزار سالہ کو کبھی تاریخ سکھاتے ہیں کبھی تہذیب، کبھی جمہوریت کبھی انسانی حقوق۔

امریکی زمین کبھی کسی اصول، نظریئے، حق اور انصاف سے روشناس نہیں ہو سکی، اگر ہوئی ہوتی آج کا امریکہ، میکسیکو، پیرو، گوئٹے مالا یا نکارا گوا کی طرح کا ملک ہوتا۔ چونکہ یہ ملک کاروبار کے لیے وجود میں لایا گیا تھا سو یہاں 'سیلز' ہر شے پر حاوی ہوگئی۔ پراڈکٹ کا بول بالا

ہوا امریکی ماؤں نے ایک سے ایک سیلز مین جنا۔ امریکی کلمہ چونکہ شرح سود شرح منافع اور سرمائے کی شرح واپسی کی زبان میں لکھا گیا تھا سو یہاں یہی پڑھا گیا' یہی سمجھا گیا اور اسی پر ایمان در آمد ہوا۔ امریکہ میں اصول' نظریے' حق اور انصاف کا مالی منفعت اور کاروبار سے مشروط ہوجانا خود امریکہ کے لیے بھی اور اقوام عالم کے لیے بھی بہت بڑا سانحہ ثابت ہوا۔ اس سانحے کے بطن سے ایک ایسی دو رخی' بد تدبیری اور دوہرا معیار عمل میں آیا کہ اصول کاروبار کے' نظریات مالی منفعت کے' حق ہماہمی کے اور انصاف مفادات کے تابع ہو کر رہ گیا۔ کاروباری انصاف' مفاد زدہ جمہوریت' منفعت بھرا حق اور فروخت کا نظریہ امریکی زمین میں اس طرح سے پیوستہ ہوا کہ یہاں سے کبھی انصاف برائے انصاف کی آواز نہ اٹھ سکی۔ یکساں انسانی حقوق کا نعرہ بلند نہ ہوسکا' نظریہ نظیر نہ بن سکا نہ اصول' اصول کی اساس۔ یہ دورخی' یہ کاروباری دباؤ یہ مفادات کوئی نیا امریکی رخ نہیں ہے کولمبس نے روز اول سے ہی یہاں یہی بیجا تھا۔ پانچ صدیوں میں یہ بیج پختہ ہو کر آدم خور آکاس میں بدل چکا ہے۔ کاروباری اور مفاداتی غلبے سے دورخی پر مبنی ایک ایسا امریکی نظریہ وجود میں آیا کہ جس نے روز اول سے ہی امریکہ میں حق و انصاف کا گلا دبا رکھا ہے اس نظریے کی رو سے حق و انصاف اسی حد تک قابل قبول ہے جہاں تک مالی منفعت اس کی زد میں نہ آتی ہو۔ نظریہ اور اصول اسی وقت تک اچھے ہیں جب تک کاروبار پر اثر انداز نہ ہوتے ہوں۔ وہی انسانی حقوق چاہئیں جن کے گھٹنے پیٹ کی طرف مڑتے ہوں اور جمہوریت ایسی کہ جس میں خریدار کو خریدنے کی آزادی ہو' فرد ایسا جو پراڈکٹس میں امتیاز کرسکتا ہو' قرض لینے کا اہل ہو' دستخط کرسکتا ہو اور قرض اتارنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اس امریکی ساختہ نظریے کا اطلاق بابائے قوم جارج واشنگٹن سے شروع ہو کر موجودہ صدر جارج بش تک آن پہنچا ہے اور گمان اغلب ہے کہ..................

اس رات کی آنکھوں میں شناسائی بہت ہے

امریکی تاریخ میں اس نظریہ کی پہلی زد ریڈ انڈینز پر پڑی۔ امریکی صدور' رہنما اور مشاہیر ان کے قتل کی تو مذمت کرتے تھے اور ان کے قتل کو نامناسب بھی سمجھتے تھے لیکن ان کو قتل کیئے بغیر ان کی زمین ہتھیانا بھی مشکل تھا۔ اس پہلی آزمائش میں ہی مالی منفعت نے حق و انصاف کا گلا دبا دیا نتیجتاً ایک ایسی بے عملی' دو رخی اور بے حس صورت حال نے جنم لیا کہ ریڈ انڈینز کی نسل کشی بھی جاری رہی' ان کی زمینوں پر قبضہ بھی ہوتا رہا اور ان کے قتل کی مذمت

بھی کی جاتی رہی ۔ آہستہ آہستہ یہی دو عملی دوہرے معیار میں بدل گئی ۔ بابائے قوم جارج واشنگٹن پر جب اپنے جمہوری، انسانی اور ترقی یافتہ نظریات کو ثابت کرنے کا وقت آیا تو نظریاتی آزمائش کی اس گھڑی میں ان کے پاؤں لڑکھڑا گئے اور گھٹنے پیٹ کی طرف مڑ گئے ۔ برطانیہ کو میدان جنگ میں ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کرنے والے جنرل جارج واشنگٹن نے سفید فام امریکیوں کے کاروباری مفادات اور غاصبانہ حصول اراضی کے آگے سپر ڈال دی ۔ وہ جو کچھ کانگریس میں کہتے تھے، پبلک میں جن ارفع خیالات کا اظہار کرتے تھے اور جن انسانی خیالات سے اپنے ووٹروں کو پرچاتے تھے، ان کے عملی اقدامات ان کے کہے کی نفی کر دیتے تھے ۔ صدر جارج واشنگٹن نے اپنے جس ہاتھ سے ریڈ انڈینز کے تحفظ نامے اور ان کی زمینوں پر قبضہ نہ کرنے کی دستاویز پر دستخط کیئے تھے اسی ہاتھ سے وہ ان کے محضر نامے پر دستخط کرنے کے مرتکب ہوئے ۔ ریڈ انڈینز کی وسیع زمینوں پر قبضے کی کشش اور منفعت کا دباؤ اس قدر شدید تھا کہ وہ اسی طرف کو کھنچتے چلے گئے ۔ ادھر تو وہ عالمی پائے کے مدبر، مصلح، سیاسی دانشور، فاتح سپہ سالار اور معمار قوم تھے، کانگریس میں امن، انسانی حقوق، اخلاقیات، جمہوریت اور صلح و آشتی کے بل پر بل پاس کر رہے تھے ادھر ریڈ انڈینز گاجر مولی کی طرح کٹ رہے تھے، ان کی زمینوں پر سفید فام امریکی اور وفاقی حکومت قابض ہو رہی تھی، ادھر امریکی کانگریس میں انسانی حقوق اور ان کی املاک کے تحفظ کی ضمانت دی جا رہی تھی لیکن ریڈ انڈینز کی زمینوں سے جو کاروبار، فائدے اور خوش حالی متوقع تھی اس کے پیش نظر ان کے قتل پر سب چشم بستہ اور زمینوں پر قبضے میں سب شریک تھے ۔ انصاف اور اصول کے مقابلے میں تین سینٹ فی ایکڑ زمین میں ایسی کشش تھی کہ وہ اصول، آئین، جمہوریت، انسانی حقوق اور نظریات سب پر غالب آتی چلی گئی ۔

یہ دو رخی چال ایسی مہارت سے چلی گئی کہ نہ تو امریکی آئین پر کوئی حرف آیا نہ انسانی حقوق پر شگاف پڑا نہ جمہوریت پر خم آیا نہ امریکی مشاہرین کے اعلیٰ اخلاقی نظریات پر زد پڑی ۔ آئین، اصول، انصاف اور انسانیت کا بھی بول بالا رہا اور نسل کشی بھی جاری رہی ۔ سفید فاموں کی زمینی ملکیت بھی ملٹی پلائی ہوتی رہی اور انسانی حقوق کے چارٹر بھی مرتب ہوتے رہے ۔ اس کامیاب دو رخی اور دوہرے معیار نے اس امریکی نظریے کو پختہ کر دیا کہ بات بے شک اصول، انصاف اور نظریے کی ہی کرو لیکن اسی حد تک کہ فائدہ، مفاد اور یافت متاثر نہ ہو ۔ مالی مفادات

کو انصاف اور اصول پر قربان کرنے کی بجائے انصاف اور اصول کا خون ہو' تو ہو۔ بیک وقت ریڈ انڈینیز کی قتل و غارت اور انسانی حقوق کا ڈھنڈورا' ان کی زمینوں پر غاصبانہ قبضہ اور جمہوری حقوق کی تشہیر اس امریکی نظریے کا پہلا ٹیسٹ کیس تھا جس میں صدر جارج واشنگٹن نے ریڈ انڈینیز کی قتل و غارت سے آنکھیں چراتے ہوئے کاروبار' زمینوں پر قبضہ اور معاشی پھیلاؤ کو ترجیح دے کر اس نوزائیدہ امریکی نظریے کی آبیاری کی۔ ان کے اس اقدام نے آنے والی کئی صدیوں کے لیے نظیر قائم کر دی۔ اس وقت امریکی تاریخ کی سلیٹ صاف ہونے کی وجہ سے کہ امریکہ کی کوئی تاریخ ہی نہیں تھی' انہوں نے جو بھی نقش بنایا وہی نظیر بن گیا اور نظیر عمومی امریکی رویے میں نمایاں ہو کر اکیسویں صدی تک آن پہنچی۔ سو' آج اقوام عالم کو انسانی حقوق اور امریکی جمہوریت کا جو بپتسما دیا جا رہا ہے یہ عین اسی امریکی نظریے اور امریکی جمہوریت کے مطابق ہے جس میں مفادات اور منفعت کو بہر حال اوّلیت حاصل ہے۔

ریڈ انڈینیز کے خاتمے کے بعد امریکہ میں غلامی کا خاتمہ امریکی قیادت کا انسانی حقوق اور جمہوریت سے اخلاص کا دوسرا ٹیسٹ کیس تھا۔ امریکہ میں غلامی کے بارے میں صدر جارج واشنگٹن کے غلامی کے خلاف واضح موقف سے قوی امید تھی کہ وہ اپنے اثر و رسوخ اور بطور صدر امریکہ سے غلامی کی لعنت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ امریکہ میں غلامی ختم کرنے کے بارے میں جارج واشنگٹن رقم طراز ہوئے:

> ''میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ کوئی اور مجھ سے زیادہ اخلاص سے غلامی کے خاتمے کا منصوبہ دیکھنے کا متمنی نہیں ہو گا لیکن جب غلام اپنے موجودہ آقاؤں کے ساتھ رہنے میں خوش ہوں اور انہیں غلامی کے خلاف اکسایا جائے تو اس سے مزید برائی پھیلتی ہے نہ کہ اس کا تدارک۔''

9۔ (صدر جارج واشنگٹن: 1786)

وہ جنہیں غلامی کے خاتمے کی دنیا میں سب سے زیادہ تمنا تھی قریب نصف صدی تک 216 افریقی غلاموں کے مالک رہے۔ آٹھ سال امریکی صدر رہنے اور بابائے قوم ہونے کے باوجود غلامی کی تنسیخ کے بارے میں وہ بال برابر بھی کچھ نہ کر سکے ان کے صدر امریکہ بننے پر امریکہ میں جس قدر غلام موجود تھے وہ اس سے کہیں زیادہ چھوڑ کر رخصت ہو گئے البتہ اپنے طرزِ عمل سے وہ اس نظریے اور نظیر کو پختہ کر گئے کہ انسانی آزادی' حقوق اور جمہوریت سے لفظی

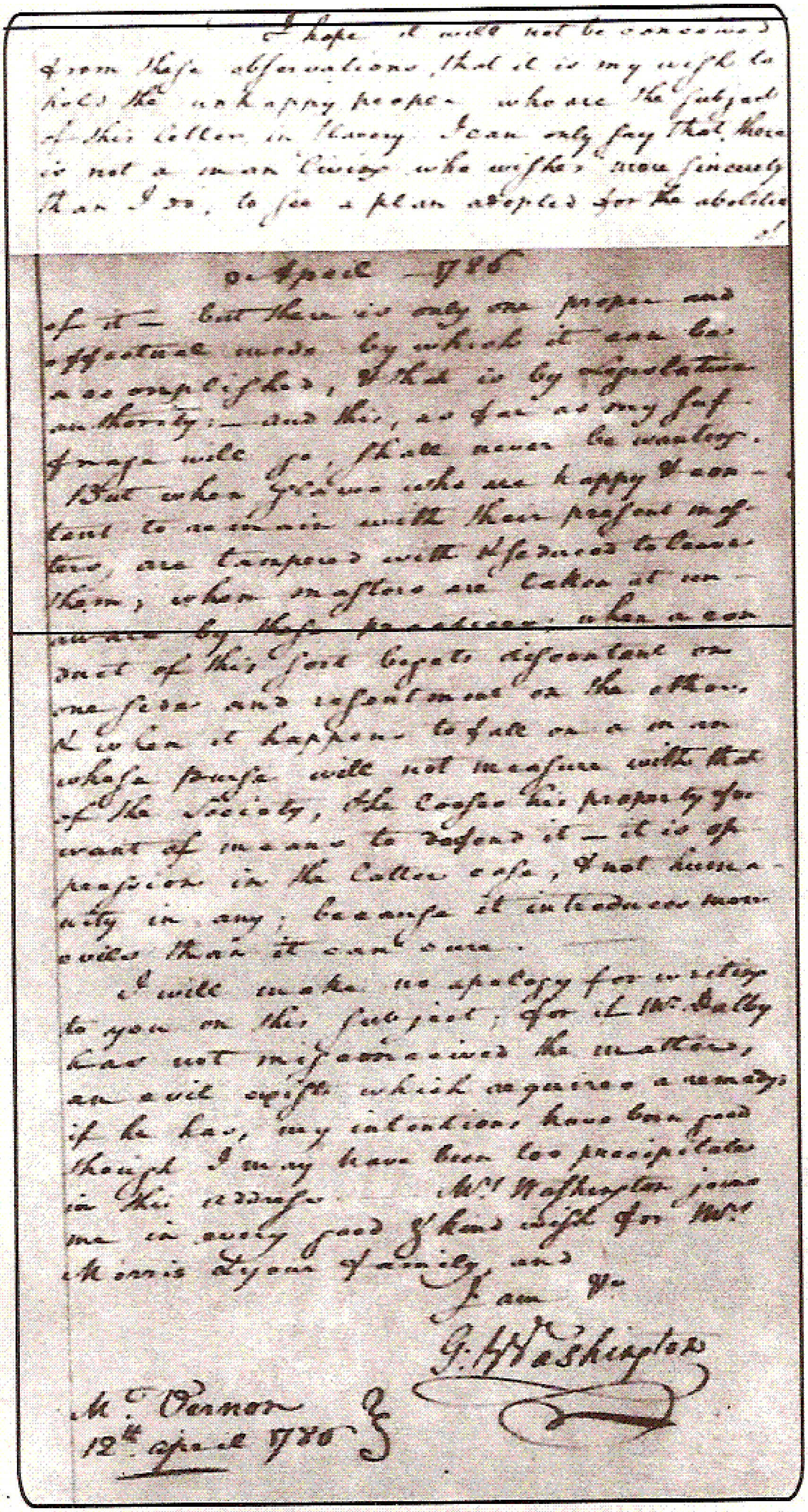

I hope it will not be conceived from these observations, that it is my wish to hold the unhappy people who are the subject of this letter in slavery. I can only say that there is not a man living who wishes more sincerely than I do, to see a plan adopted for the abolition of

12 April 1786

of it — but there is only one proper and effectual mode by which it can be accomplished, & that is by Legislative authority: — and this, as far as my suffrage will go, shall never be wanting. But when slaves who are happy & contented with their present masters, are tampered with & seduced to leave them; when masters are taken at unawares by these practices; when a conduct of this sort begets discontent on one side and resentment on the other, & when it happens to fall on a man whose purse will not measure with that of the Society, & he looses his property for want of means to defend it — it is oppression in the latter case, & not humanity in any; because it introduces more evils than it can cure.

I will make no apology for writing to you on this subject; for if Mr Dalby has not misconceived the matter, an evil exists which requires a remedy; if he has, my intentions have been good though I may have been too precipitate in this address. Mrs Washington joins me in every good & kind wish for Mrs Morris & your family, and

I am &c.

G: Washington

Mt Vernon
12th April 1786

غلامی کے خاتمے میں مجھ سے زیادہ کوئی مخلص نہیں ہے

جارج واشنگٹن کی تحریر کا عکس

اخلاص اپنی جگہ لیکن کاروبار اور مفادات اپنی جگہ۔ 1799 میں جب بابائے قوم فوت ہوئے اور ان کی وصیت پڑھی گئی تو غلامی کے خاتمے سے ان کے اخلاص کی بجائے غلامی کے تسلسل سے ان کی محبت آشکارا ہوگئی۔ مروجہ دستور کے مطابق مرنے والا اپنی وصیت میں اپنے غلاموں کو عموماً آزاد کر جاتا تھا لیکن اس کے برعکس جارج واشنگٹن اپنے غلاموں کی بریت کو اپنی زوجہ محترمہ مارتھا واشنگٹن کی تحویل میں دے کر ان کی موت سے منسلک کر گئے۔ جیمز فلیکسز لکھتے ہیں:

> ”جب جارج واشنگٹن کا انتقال ہوا تو وہ اپنی وصیت میں اپنے ایک خدمت گار ولیم لی کو مع پنشن کے آزاد جبکہ دوسرے (215) غلاموں کی آزادی کو اپنی بیوہ مسز مارتھا واشنگٹن کی موت سے منسلک کر گئے۔“

10۔ (جیمز فلیکسز: 1969)

جارج واشنگٹن کی موت کے سالوں بعد جب ان کے ذاتی کاغذات منظر عام پر آئے تو غلاموں کے خاتمے میں سب سے زیادہ اخلاص کا دعویٰ کرنے والے کی غلامی کے تسلسل میں دلچسپی اور انہماک سے ایک عالم حیرت زدہ رہ گیا۔ جارج واشنگٹن جتنا وقت کانگریس میں غلامی کے خلاف مصروف پیکار رہے اس سے کہیں زیادہ وقت وہ اپنی جاگیر میں غلام رعیت کے معاملات‘ حساب کتاب‘ پیدائش و اموات‘ بیماری‘ جھگڑوں اور سزاؤں کے اندراج میں گزار دیتے۔ ان کی خوبصورت طرز تحریر میں غلاموں کے تفصیلی ریکارڈ سے غلامی کے خاتمے سے اخلاص کی بجائے غلامی کے تسلسل میں ان کی دلچسپی دیدنی ہے۔

جارج واشنگٹن سمیت بارہ ایسے افراد امریکی صدر ہو گزرے ہیں جو غلاموں کے مالک تھے ان میں سے 8 صدور ایسے تھے کہ دوران صدارت وہ جب وہائٹ ہاؤس میں مقیم تھے تو عین اس وقت بھی غلام ان کی ملکیت میں تھے۔ غلاموں کے مالک کی حیثیت میں عہدہ صدارت پر ایسے افراد کی تعیناتی سے امریکی اعلان آزادی کے خوش رنگ وعدوں اور امریکی آئین میں انسانی حقوق کے بارے میں دی گئی ضمانت کی دھجیاں بکھر کر رہ گئیں۔ قیام امریکہ کے اولین 60 سالوں میں سے 50 سال غلاموں کے مالکان صدور کے منتخب ہوتے رہنے سے یہ امریکی کاروباری نظریہ پختہ تر ہوگیا کہ آئین‘ قانون‘ اصول‘ انصاف اپنی جگہ خوش آئند مگر مالی مفادات کو بہر حال ان پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ درج ذیل جدول میں امریکی صدور کے غلاموں کی تعداد سے انسانی حقوق اور انسانی آزادی سے ان کے خلاص کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

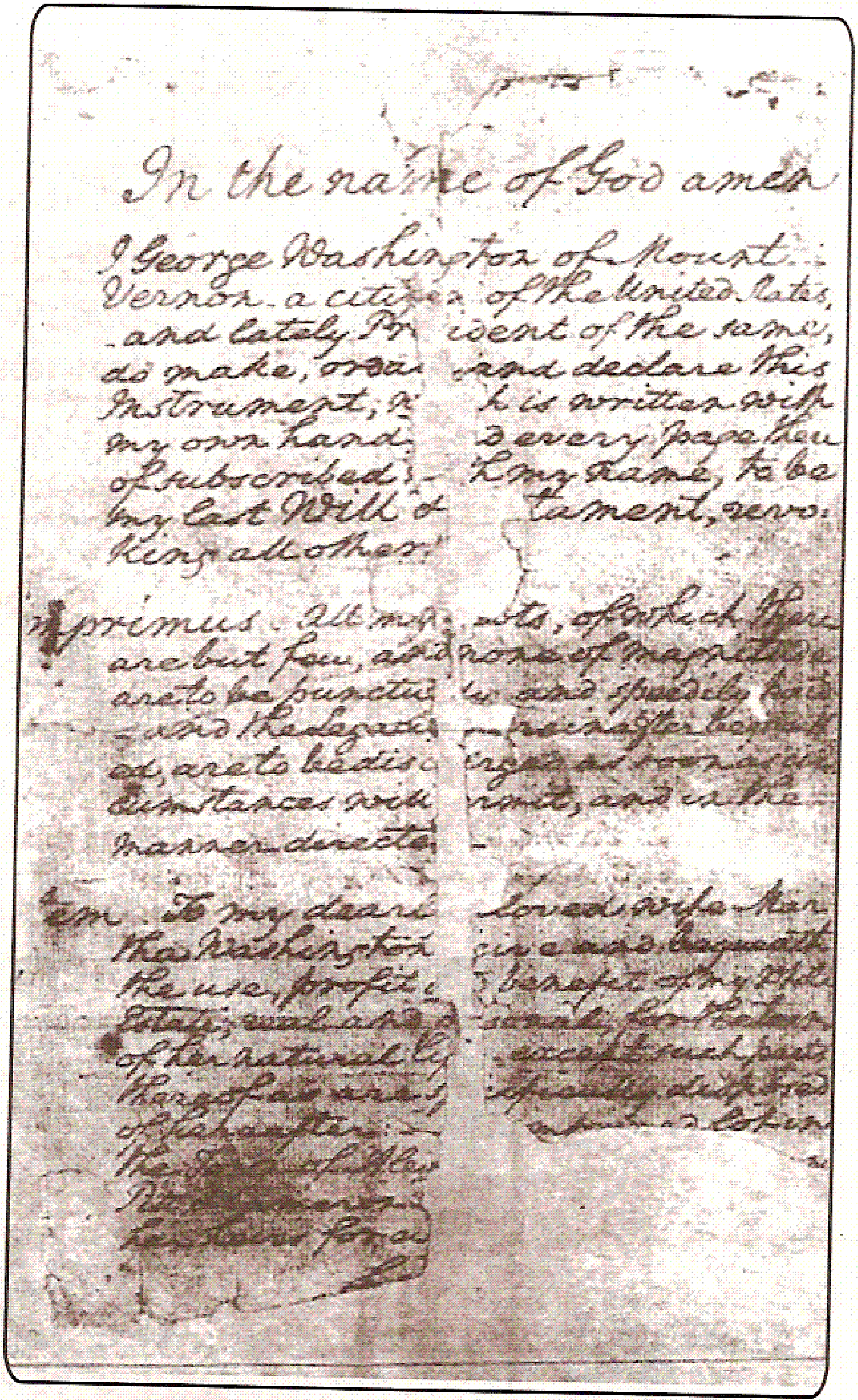

In the name of God amen

I George Washington of Mount
Vernon – a citizen of the United States,
– and lately Pr[illegible]sident of the same,
do make, ordai[illegible] and declare this
Instrument, w[illegible]h is written with
my own hand [illegible] every page thereof
subscribed [illegible]h my name, to be
my last Will & [illegible]tament, revo-
king all others.

Imprimus. All my [illegible]ts, of which there
are but few, and none of magnitude
are to be punctu[illegible]ly and speedily paid
– and the Legacie[illegible] hereinafter bequeath-
ed, are to be dis[illegible]rged as soon as cir-
cumstances will [illegible]mit, and in the
manner directe[illegible] –

Item. To my dear[illegible] loved wife Mar-
tha Washington [illegible] give and bequeath
the use, profit [illegible] benefit of my whole
Estate, real and [illegible]sonal, for the term
of her natural li[illegible] except such parts
thereof as are [illegible] specially disposed
of hereafter. – [illegible] to her
The [illegible] of Alex[illegible]
Pitt [illegible]
her heirs forev[illegible]

وصیت نامہ جارج واشنگٹن

میرے مرنے کے بعد میرے غلام مارتھا (مسز واشنگٹن) کی تحویل
میں دے دیئے جائیں (جارج واشنگٹن)

صدر	عہد صدارت میں غلاموں پر ملکیت	وصیت میں غلاموں کو آزاد کیا یا نہیں یا کتنے آزاد کیے	غلاموں کی تعداد	بحوالہ
جارج واشنگٹن 1789-1797	ہاں	صرف ایک	216	11۔ جیمز فلیکسز :1969
تھامس جیفرسن 1801-1809	ہاں	صرف پانچ	141	12۔ جان بجلو : 1885
جیمز میڈلیسن 1809-1817	ہاں	نہیں	100	13۔ اروِنگ برانٹ :1970
جیمز منرو 1817-1825	ہاں	نہیں	75	14۔ گیری وِلس :2003
اینڈریو جیکسن 1829-1837	ہاں	نہیں	160	15۔ جیمز پی: 1910
مارٹن وان بیورن 1837-1841	نہیں	۔	1	16۔ ڈونلڈ کول :1984
ولیم ہنری ہیری سن 1841	نہیں	۔	11	17۔ فری مین کلیوس : 1939
جان ٹائیلر 1841-1845	ہاں	صرف چھ	70	18۔ گیری وِلس :2003
جیمز کے پوک 1845-1849	ہاں	۔	75	19۔ گیری وِلس :2003
زاچرے ٹیلر 1849-1850	ہاں	۔	100	20۔ ہالمن ہملٹن :1951
اینڈریو جانسن 1865-1869	نہیں	سب کو آزاد کیا	8	21۔ لیٹلی تھامس : 1968
یولی سس گرانٹ 1869-1877	نہیں	صرف ایک	5	22۔ جان سائمن : 1967

باباۓ امریکہ صدر جارج واشنگٹن کے بعد صدر تھامس جیفرسن امریکہ کی اہم ترین شخصیت اور اہم ترین صدر تھے وہ بلا شبہ امریکہ کے سب سے بڑے سیاسی دانشور اور امریکی اعلان آزادی و آئین کے معمار و ماہر تھے۔ امریکی اعلان آزادی کی دستاویز انہی کے زور قلم اور ذہنی صلاحیتوں کا اظہار ہے۔ اس دستاویز کو نہ صرف امریکہ بلکہ اقوام عالم میں انسانی حقوق کی منشآت میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ اعلان آزادی کی اس تحریر میں ان کی دانش، ترقی پسندی اور احترام آدمیت، شاعرانہ تخیئل کے امتزاج سے ایک ایسی تحریر کی صورت میں سامنے آئی کہ جسے روز اوّل سے ہی عالمی ادب اور عالمی افکار و سیاست میں امتیازی مقام حاصل رہا ہے۔ تھامس جیفرسن کا تحریر کردہ یہ امریکی اعلان آزادی قرار داد مقاصد کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں ریاست کے قیام کی وجوہات، اغراض و مقاصد، ریاستی تخلیق کا بنیادی اصول، شہری و انسانی حقوق اور ریاستی حدود متعین کردی گئی تھیں۔ لیکن اس امریکی قرار داد مقاصد کا حشر بھی پاکستانی قرار داد مقاصد سے مختلف نہیں ہوا۔ ابھی اس دستاویز اعلان آزادی کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ سیاہ فاموں کی غلامی کے عدم خاتمہ نے اسے مشکوک اور سوالیہ بنا دیا تھا۔ عین اسی طرح ایک قرار داد ہماری طرف بھی پائی جاتی ہے جس میں اسلامی تقاضوں سے متصادم قوانین نہ بنائے جانے کی ضمانت موجود ہے لیکن اس کے باوجود پاکستان میں ایسے قوانین ڈھونڈنے پڑیں گے جو اسلام سے متصادم نہ ہوں۔ رنڈیوں سے لے کر رباح کے کاروبار تک اور اراکین اسمبلی کے کردار سے سرکاری عمال کے رویے تک سب کچھ اسی قدر اسلامی ہے جتنا کہ امریکی اعلان آزادی کے تحت ریڈ انڈینز اور سیاہ فاموں کے حقوق محفوظ تھے۔

تھامس جیفرسن ایک متمول گھرانے میں 1743 میں پیدا ہوئے اکیس برس کی عمر میں انہیں ایک ہزار ایکڑ زرعی اراضی وراثت میں تفویض ہوئی۔ ان کی زمین پر تمباکو کی فصل کاشت کی جاتی تھی جسے فرانس اور برطانیہ میں مہنگے داموں بیچا جاتا تھا۔ سونا اگلی اس زمین کی یافت یوں بھی زیادہ بار آور تھی کہ فصل کی پیدا وار کے اخراجات واجبی تھے۔ قریب دو سو افریقی غلام ہمہ وقت اس بیگار پر متعین تھے۔ تھامس جیفرسن نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور ورجینیا جنرل کورٹ بار میں پریکٹس شروع کردی۔ 1774 میں انہوں نے ”برٹش - امریکینز“ کے حقوق کے بارے میں ایک کتابچہ تحریر کیا جس سے ان کی قانونی اور آئینی اٹھان کا اندازہ ہوتا تھا۔ اسی دوران انہیں اپنی بیوی کے خاندانی ورثے سے گیارہ ہزار ایکڑ اراضی اور 150 غلام مزید مل

گئے۔ 1775 میں انہیں کانٹی نینٹل کانگریس کا رکن منتخب کیا گیا۔ 1776ء میں انہوں نے امریکہ کا اعلان آزادی تحریر کیا جسے حقیقتاً کسی بھی عظیم الشان کارنامے سے کم قرار نہیں دیا جا سکتا اسی برس تھامس جیفرسن کو ریاست ورجینیا کے قوانین پر نظر ثانی اور ترمیم و اضافے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ 1777 میں انہوں نے ریاست ورجینیا کے لیے مذہبی آزادی کا قانون تحریر کیا جسے ورجینیا جنرل اسمبلی نے 1786 میں منظور کر کے نافذ کردیا۔ 1779 میں تھامس جیفرسن کو ورجینیا کا گورنر مقرر کیا گیا۔ قیام امریکہ کے بعد 1784 میں تھامس جیفرسن فرانس میں امریکی سفیر مقرر ہوئے۔ فرانس میں قیام کے دوران انہوں نے یورپ کا معاشرتی' معاشی اور سیاسی مطالعہ کیا جو امریکہ واپسی پر ان کے بہت کام آیا۔ 1790 میں وہ امریکہ کے پہلے سیکریٹری آف سٹیٹ بنے۔ 1797 سے 1801 تک وہ صدر جان ایڈمز کے نائب صدر رہے جبکہ 1801 سے 1809 تک وہ امریکہ کے صدر رہے۔

امریکہ کا اعلان آزادی تخلیق کرنے سے امریکی صدارت تک تھامس جیفرسن ایسے سیاسی و حکومتی عہدوں پر فائز رہے کہ وہ قانونی اور آئینی طور پر امریکہ میں غلاموں کی بریت کے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے۔ امریکی آئین و سیاست پر ان کی گرفت اور اثر و رسوخ سے توقع بھی یہی تھی کہ موقع ملتے ہی وہ امریکہ سے غلامی ختم کردیں گے چونکہ امریکہ کے اعلان آزادی میں وہ اپنے ہاتھ سے یہ سنہرے حروف لکھ چکے تھے:

> ''ہم خود نظر آنے والی اس صداقت کے امین ہیں کہ تمام انسانوں کو برابر تخلیق کیا گیا ہے۔ ان کے تخلیق کار نے انہیں خصوصی حقوق جو ناقابل انتقال و ناقابل تنسیخ ہیں تفویض کیئے ہیں۔ ان حقوق میں زندگی' آزادی اور خوشی کی جدوجہد شامل ہے۔ انہی حقوق کے تحفظ کے لیے انسانوں میں حکومتوں کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔ ہم مذہبی سنجیدگی سے اس بات کی اشاعت اور اعلان کرتے ہیں کہ یہ (امریکن) کالونیز آزاد ہیں اور واضح طور پر آزاد اور خود مختار ہونی چاہئیں۔''

23۔(تھامس جیفرسن: 1776)

امریکہ کے اعلان آزادی میں تحریر کردہ ارفع و نادر خیالات' آزادی اور انسانوں کی برابری پر تھامس جیفرسن کے پر یقین لہجے سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ امریکہ کی آزادی کے ساتھ

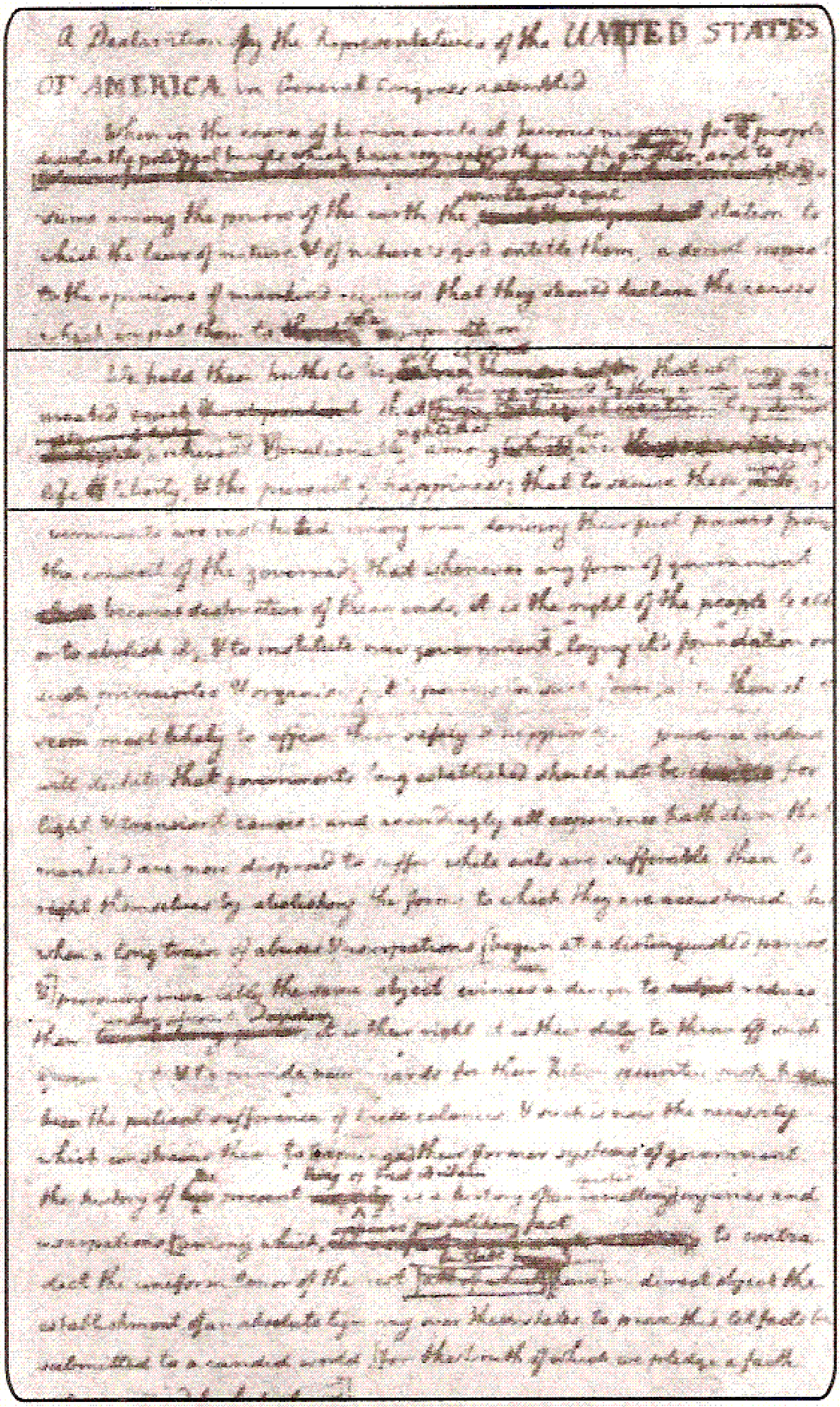

A Declaration by the Representatives of the UNITED STATES OF AMERICA in General Congress assembled

’تمام انسانوں کو برابر تخلیق کیا گیا ہے‘

تھامس جیفرسن کے تحریر کردہ اعلان آزادی کا عکس

ہی ریڈ انڈینز اور سیاہ فاموں کی شب سیاہ بھی پوری ہو جائے گی۔ اعلان آزادی میں انسانوں کے تخلیق کار کی طرف سے عطا کردہ جن حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی اس کے پیش نظر ریڈ انڈینز کی نسل کشی اور سیاہ فاموں کی نسل در نسل غلامی کا قریب تر نظر آنے والا خاتمہ ایک سراب' ایک واہمہ اور ایک خوش رنگ خیال سے زیادہ کچھ بھی نہ نکلا یوں جیسے تھامس جیفرسن کے انقلابی اور ارفع خیالات مالی منعفت اور کاروبار کی ہماہمی کی بھینٹ چڑھ گئے ہوں۔

برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے میں امریکی جنگی قیادت کا میدان جارج واشنگٹن کے اور قانونی میدان تھامس جیفرسن کے ہاتھ رہا تھا۔ یہ دونوں رہنما اپنے الفاظ' اقوال' تحریر اور بیان میں غلامی کی مذمت کرتے رہے تھے ایک نے غلامی ختم کرنے میں دنیا کا مخلص ترین فرد ہونے کا دعویٰ دائر کر رکھا تھا جبکہ دوسرے کے انسانوں کی غیر امتیازی تخلیق کے نظریے نے آزادی افکار کی دنیا میں دھاک بٹھا رکھی تھی۔ ایک کے ہاتھ میں نئے نکور امریکہ کا آئین اور قانون بنانے کی لگام تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں انہیں منظور اور نافذ کرنے کی تلوار لیکن نئے امریکی آئین وقوانین میں قریب ڈیڑھ سو سال سے جاری سیاہ فاموں سے متعلق ان ظالمانہ ریاستی قوانین کی تنسیخ کے بارے میں ایک لفظ تک نہ کہا گیا جو مختلف ریاستوں میں وقتاً فوقتاً بنائے جاتے رہے تھے اور جنہیں امریکی اعلان آزادی کی روا روی اور آئین کی ہماہمی میں بہ یک جنبشِ قلم' قلم زد کیا جا سکتا تھا۔ یورپ خصوصاً برطانیہ و فرانس کو' ان امریکی اقدامات نے تشویش میں مبتلا کر دیا چونکہ امریکہ کا انسانی حقوق کے بارے میں عملی قدم اس خوش کن نظریاتی دعویٰ سے یکسر مختلف تھا جو اعلان آزادی میں لکھا گیا تھا۔ اور جس کی توقع کی جا رہی تھی۔ انقلاب فرانس کے زیر اثر فرانس نے غلامی کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا جبکہ برطانوی پارلیمنٹ نے بھی غلامی کو غیر قانونی قرار دے کر امریکہ پر دباؤ بڑھا دیا تھا۔ انقلاب فرانس سے یورپ میں انسانی حقوق' آزادی اور جمہوریت کو جو لہر اٹھی تھی یورپی حکومتیں اس کا اطلاق امریکہ میں بھی دیکھنا چاہتی تھیں ادھر امریکی قیادت غلامی ختم کرنے کی بجائے مزید زمین' مزید مفادات' وسعت اور کاروبار کے مواقع دیکھ رہی تھی اور اس کے لیے غلامی ختم کرنے کی بجائے اسے جاری رکھنے کی اشد ضرورت تھی۔ اس فیصلہ کن تاریخی لمحے میں امریکی قیادت یہ فیصلہ کرنے سے محروم رہی کہ ان کے کون سے اقدامات تاریخ کے سیاہ صفحات پر لکھے جائیں گے اور کون سے سنہرے پر۔ ان کے کن اعمال پر ملامت کی جاتی رہے گی اور کن پر تحسین۔

ملامت کی زد میں سرفہرست اس واقعہ نے جارج واشنگٹن' تھامس جیفرسن' جان ایڈمز' جیمز میڈیسن اور دیگر رہنماؤں کے اعلیٰ وارفع خیالات اور دانش مندی کے غبارے سے یکسر ہوا نکال دی۔ اس واقعہ نے طویل قامتوں کو' کوتاہ قامتوں میں بدل دیا۔ 1787 کے آئینی کنونشن میں جنوبی اور شمالی ریاستوں میں سیاہ فاموں کی نمائندگی پر شدید اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ 1780 سے 1790 کے درمیان امریکہ میں سیاہ فام غلاموں کی 90 فیصد آبادی جنوبی ریاستوں میں مقیم تھی چونکہ بڑے بڑے زرعی فارم اور کاشت کاری کے وسیع علاقے انہی ریاستوں میں تھے۔ صدر جارج واشنگٹن اور صدر تھامس جیفرسن دونوں کا تعلق ریاست ورجینیا سے تھا اور خیر سے ریاست ورجینیا ہی امریکہ میں غلاموں کی سب سے بڑی ریاست تھی۔ اس آئینی کنونشن کے وقت امریکہ میں سیاہ فام غلاموں کی 42 فیصد آبادی ریاست ورجینیا میں ہی غلامی کاٹ رہی تھی جبکہ دوسری جنوبی ریاستوں جنوبی کیرولائنا' شمالی کیرولائنا' میری لینڈ اور جارجیا وغیرہ میں 48 فیصد غلام موجود تھے۔ اس کے مقابلے میں شمالی ریاستوں نیو یارک' میساچوسٹس' ورمانٹ' رہوڈ آئی لینڈ' پنسلوینیا' نیو ہمپشائر' نیو جرسی اور کنکٹی کٹ میں صرف دس فیصد غلام پائے جاتے تھے۔ آئینی کنونشن میں جنوبی ریاستوں کا غلاموں کی تعداد کو بھی ریاست کی کل آبادی میں شامل کرنے کا مطالبہ وجہ تنازعہ بن گیا۔ حالانکہ غلام نہ تو قانوناً امریکی شہری تھے نہ انہیں ووٹ دینے کا حق تھا۔ جن لوگوں کو نہ تو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا' نہ وہ کسی شمار میں تھے' نہ ان کے کوئی آئینی حقوق تھے نہ شہری لیکن اس کے باوجود ان کی تعداد سے سیاسی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ 5 لاکھ سیاہ فام جو جنوبی ریاستوں میں مقیم تھے ان کو شمار کر لینے سے جنوبی ریاستوں کو کانگریس میں فیصلہ کن برتری حاصل ہو سکتی تھی اور جنوبی ریاستوں کا اس پر اصرار اسی وجہ سے تھا۔

درج ذیل گوشوارے سے 1790 میں ریاست وار سفید فام اور سیاہ فام آبادی کے تناسب سے جنوبی ریاستوں کے اصرار کی وجہ تو سمجھ آتی ہے جو سراسر سیاسی' کاروباری اور غیر انسانی تھی لیکن انسانی شعور اسے اصولی' منطقی اور جمہوری ماننے میں متامل رہا ہے:

جنوبی ریاستیں 1780-1790

سیاہ فام/سفید فام تناسب آبادی

ریاست	سفید فام (لاکھ)	سیاہ فام (لاکھ)	سیاہ فام (غیر غلام) ریڈ انڈینز
ورجینیا	442,117	292,627	12,866
میری لینڈ	208,649	103,036	8,043
جارجیا	52,886	29,264	398
ڈیلاویر	46,310	8,887	3,899
شمالی کیرولائنا	289,181	100,783	5,041
جنوبی کیرولائنا	140,178	107,094	1801

شمالی ریاستیں 1780 - 1790

سیاہ فام/سفید فام تناسب آبادی

کنکٹی کٹ	232,236	2,648	2,771
میساچوسٹس	373,187	-	5,369
نیوہمپشائر	141,112	157	630
نیوجرسی	169,954	11,423	2,762
نیویارک	314,366	21,193	4,682
پنسلوینیا	317,479	3,707	6,531
رہوڈ آئی لینڈ	64,670	958	3,484

23۔ (ہسٹوریکل سٹیٹکس آف یو۔ ایس: 1970)

1780 - 1790

ریاست وار کل آبادی کی فیصد غلام آبادی

ورجینیا	66 فیصد
جارجیا	55 فیصد
میری لینڈ	49 فیصد
جنوبی کیرولائنا	76 فیصد
شمالی کیرولائنا	35 فیصد
ڈیلاویر	19 فیصد
نیویارک	7 فیصد
نیوجرسی	7 فیصد
پنسلوینیا	1 فیصد
رہوڈ آئی لینڈ	1 فیصد
کنکٹی کٹ	1 فیصد

1780:1790: سفید فام امریکی آبادی کی فیصد غلام آبادی 24 فیصد

25۔ (ہسٹوریکل سٹیٹکس آف یو ایس: 1970)

غلاموں کی آبادی کی بنیاد پر کانگریس میں ریاستی نمائندگی پر جنوبی ریاستوں کا اصرار اس قدر شدید ہوگیا کہ کنونشن ناکام ہوتا دکھائی دینے لگا اسے ناکامی سے بچانے کے لیے مصالحت کا ڈول ڈالا گیا۔ جنوبی ریاستوں نے ایک سیاہ فام انسان کو تین چوتھائی شمار کرنے کا ننگ انسانیت فارمولا پیش کیا جبکہ شمالی ریاستوں نے اسے ایک چوتھائی مان لینے کی حامی بھری' بالآخر پانچ تہائی پر یہ سودا طے ہوگیا۔ ایک پورے مکمل فرد کو ساٹھ فیصد تسلیم کرنے کے پس منظر میں یہ نظریہ بھی کارفرما تھا کہ چونکہ سیاہ فام تہذیب بندز اور گوریلوں سے انسانی ارتقاء کے وسط میں ہے سو' ایک سیاہ فام کو زیادہ سے زیادہ ساٹھ فیصد انسان ہی مانا جا سکتا ہے چونکہ اس میں تاحال 40 فیصد حیوانی خصوصیات ہی پائی جاتی ہیں۔ ایک طرف تو سفید فام امریکی قیادت ایک سیاہ فام فرد کو محض 60 فیصد انسان قرار دے رہی تھی لیکن اندر خانے ان ہی نامکمل انسانوں سے بچے

بھی پیدا کر رہے تھے سفید فام مرد نوعمر سیاہ فام لڑکیاں خرید لاتے اور سفید فام عورتیں سیاہ فام مرد نوکروں پر ریجھ جاتیں ۔ امریکی قیادت سیاہ فاموں کی افرادی قوت سے سیاسی فوائد تو حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن انہیں آزاد کرنے' امریکی شہری ماننے یا کسی بھی طرح کے حقوق دینے کی راہ میں دیوار بن جاتی ۔

امریکی آئین میں ''پانچ تہائی'' کی اس شق (آرٹیکل 1' سیکشن 2) کے تحت کانگریس میں ریاستی نمائندگی کا اصول تحریر ہے ۔ اس پانچ تہائی کے ننگ سے جنوبی ریاستیں ہمیشہ سیاسی فائدے میں رہیں ۔ اس سیاسی فائدے پر روشنی ڈالتے ہوئے مشہور امریکی مورخ گیری ولس لکھتے ہیں :

> ''غلام رکھنے والی ریاستوں کو کانگریس میں ان کی اصل آبادی کی بنیاد پر ممکنہ نشستوں سے ایک تہائی زیادہ نشستوں کا فائدہ حاصل رہا ہے ۔ یہ فائدہ 1800 میں تھامس جیفرسن کے صدارتی انتخاب میں فیصلہ کن ثابت ہوا جس میں تھامس جیفرسن نے شمالی ریاستوں کے امیدوار جان ایڈمز اور ایرن برن کو ایوان نمائندگان میں انہی اضافی نشستوں کی بناء پر شکست سے دوچار کردیا تھا ۔'' 26۔(گیری ولسن: 2003)

'پانچ تہائی' کے اسی غیر انسانی فارمولے کے مضمرات پر بحث کرتے ہوئے مورخ ڈیوڈ برائن ڈیوس لکھتے ہیں :

> تاریخ کی اکثر کتابیں یہ بتانے سے قاصر رہی ہیں کہ صدر جارج واشنگٹن سے صدر ابراہام لنکن تک امریکی حکومتوں پر کس حد تک غلامی سے وابستہ فائدوں اور غلاموں کے مالکان کا قبضہ رہا ہے ۔ اس کی ایک وجہ امریکی آئین میں غلاموں کی نمائندگی کے نام پر 'پانچ تہائی' کی اضافی نمائندگی بھی رہی ہے ۔ جنوبی ریاستوں میں غلاموں کے آقاؤں نے پہلے 72 سالوں میں سے 50 سال امریکہ پر حکومت کی ہے جبکہ شمالی ریاستوں کے 6 میں سے 4 صدور نے غلامی کے حقوق میں جنوبی ریاستوں کے صدور کی پالیسیز جاری رکھیں ۔ جیسا کہ صدر ملرڈ فلمور نے جن کا تعلق

> شمالی ریاست نیو یارک سے تھا' 1850 میں مفرور غلاموں کی واپسی کے قانون پر دستخط کیئے تھے ۔ اس قانون کے تحت پکڑے جانے والے مفرور غلاموں کو خواہ وہ غلامی سے آزاد ریاستوں میں ہی کیوں نہ پکڑے گئے ہوں ان کے مالکان کو'لوٹانا لازمی تھا ۔ آغاز سے ہی امریکہ کی خارجی پالیسی نے غلامی سے وابستہ مفادات کا تحفظ کیا ہے ۔ امریکی حکومتوں نے برطانوی حکومت کی ان کوششوں سے عدم تعاون کا روّیہ اپنایا جن سے غلاموں کی بین الاقوامی تجارت کو دبایا جاسکتا تھا۔''

27۔(ڈیوڈ برائن ڈیوس: 1969)

یہاں امریکہ میں غلامی سے متعلق قوانین کا جائزہ لینا مناسب ہوگا جنہیں صدر جارج واشنگٹن اور ان کے بعد تھامس جیفرسن ان کالے قوانین کو کالعدم قرار دے سکتے تھے جنھوں نے سیاہ فاموں کی آزادی کا راستہ روک رکھا تھا لیکن وہ بوجہ ایسا نہیں کر سکے ۔ امریکہ میں پہلی برطانوی کالونی جیمز ٹاؤن ورجینیا میں قائم ہوئی ۔ 1618 میں یہاں تمباکو کی پہلی فصل کاشت ہوئی ۔ اس پہلی فصل کی یافت نے افریقہ میں لاکھوں سیاہ فاموں کی تقدیر کا فیصلہ کردیا تھا ۔ جیمز ٹاؤن میں پہلی فصل ہی پیداوار میں توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہی تھی ۔ اسی سال پہلی دفعہ جیمز ٹاؤن سے دس ٹن تمباکو برطانیہ لاکر بیچا گیا ۔ جیمز ٹاؤن کے تجارتی دلالوں نے اگلی فصل کی کاشت کے لیے 20 افریقی غلام اور 90 یورپین عورتیں ایک ڈچ بحری جہاز سے خریدیں ۔ افریقی غلام خوراک کے بدلے میں خریدے گئے جبکہ ہر عورت کے عوض ایک سوبیس پونڈ تمباکو دیا گیا ۔ 1637 تک جیمز ٹاؤن ورجینیا دنیا بھر میں سب سے عمدہ تمباکو پیدا کرنے والا مرکز بن گیا ۔ 1638 میں یہاں تمباکو کی سالانہ پیداوار 750 ٹن ہوگئی ۔ اس کامیابی میں سیاہ فام غلاموں اور ان سفید فام یورپین عورتوں کا بہت ہاتھ تھا جنہیں ڈچ جہاز سے خریدا گیا تھا ۔ اس منافع بھرے سودے کی بنیاد میں مفت لیبر ایک یقینی اکائی تھی ۔ پیداوار کی اسی اکائی کو مفت حاصل کرنے کی ہوس نے اگلے ڈھائی سو سالوں کے لیے افریقہ کے افق پر موت اور غم و اندوہ کا حصار باندھ دیا ۔

28۔(ورجینیا ہسٹوریکل ہسٹری: 1957)

امریکہ میں غلاموں کی سب سے بڑی منڈی ورجینیا میں غلاموں کی روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد اور سرگرمیوں سے غلاموں پر کڑی نگرانی کمزور پڑنے لگی ۔ اس موقع سے فائدہ

اٹھاتے ہوئے غلاموں نے فرار ہونا شروع کردیا اس پس منظر میں امریکہ میں غلاموں پر کنٹرول رکھنے کے لیے پہلی قانون سازی 1639 میں ورجینیا اور نیو یارک میں عمل میں آئی ۔ ان ریاستوں میں اپنے مالکان سے بھاگے ہوئے غلاموں کو پناہ دینا ' ان کی مدد کرنا ' خوراک مہیا کرنا ' سمت یا راستہ بتانا ' چھپانا اور علاج معالجے کی سہولت دینے پر سزا کا قانون پاس کیا گیا۔

مارچ 1641 میں ریاست میں میساچوسٹس میں غلامی کو قانونی قرار دے کر اسے ریاستی قانون کے خون آشام پنجے میں دے دیا گیا۔ اس سے ایسی صورت حال نے جنم لیا کہ سیاہ فام مردوں کو اغوا کر لینے ' انہیں ایذائیں دینے ' ان سے مشقت لینے اور سیاہ فام عورتوں کی آبرو ریزی کوئی غیر قانونی اقدام نہ رہا۔ ریاست میساچوسٹس کے اس قانون سے سیاہ فاموں پر داد فریاد امید اور انصاف کے سارے دروازے بند ہوگئے ۔ انسانوں سے یکا یک بے جان ورثہ بن جانے پر ان کے وہ تمام حقوق سلب ہوگئے جو انسان ہونے کے شرف سے فطری طور پر وابستہ ہوتے ہیں ۔ آج جس سرزمین پر انسانی حقوق کی ہاہا کار مچی ہے یہاں انسانی حقوق اور شرف انسانیت ہی سب سے زیادہ شرمسار اور سرنگوں رہی ہے ۔ میساچوسٹس اسمبلی کا یہ قانون انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کا منفرد قانون تھا جس میں انسانوں کا اغوا جائز ' عصمت دری قابل قبول اور بردہ فروشی کو قانون کی پشت پناہی حاصل تھی ۔ جس سفید فام اشرافیہ نے اپنے حق میں یہ قانون بنایا تھا مختلف صورتوں میں وہی اشرافیہ آج بھی اسی قانون پر کار بند ہے ۔ امریکی ' یورپی ' اسرائیلی ' افغانی ' عراقی اور پاکستانی شہریوں کی جانوں کی قدر و قیمت میں فرق اسی رویے کا اظہار ہے جو میساچوسٹس اسمبلی نے 1641 میں متعارف کرایا تھا ۔ انسانی حقوق کے مختلف معیار ' جمہوریت کی دوہری اقسام اور قسم قسم کی آزادی کے لیے جس قدر موٹی کھال ' سفاکانہ جانبداری اور ظالمانہ سرشت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسی طرح کے امتیازی قوانین اور مفاداتی ہوس سے جنم لیتی ہے ۔ جس طرح کے قوانین میساچوسٹس اسمبلی نے پاس کیے تھے ۔ کیا عجب کہ امریکی باطن کی تاریکی کو اس طرح کے غیر انسانی قوانین نے مزید تاریک کردیا ہو ۔ درج ذیل کے سرسری جائزے سے ایسے قوانین بنانے والوں کی نیات کو سمجھنے کے لیے کسی عالمانہ قیافے اور منطقی وجدان کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے:

> 1643 میں کنکٹی کٹ ' میاچوسٹس اور نیوانگلینڈ کے وفاق نے مفرور غلاموں کے خلاف قانون سازی کی ۔

1650 میں کنکٹی کٹ ریاست نے میسا چوسٹس کی پیروی میں غلامی کو قانونی قرار دیا۔

1652 میں میسا چوسٹس نے تمام ریڈ انڈینیز اور سیاہ فاموں کے لیے لازمی فوجی تربیت کا قانون پاس کیا۔

1657 میں ریاست ورجینیا نے مفرور غلاموں کے خلاف قانون سازی کی۔

1660 میں برطانوی بادشاہ چارلس دوئم نے امریکہ میں سیاہ فام غلاموں اور، ریڈ انڈین خدمت گاروں کو عیسائی بنانے کے لیے ترغیبات دینے پر زور دیا۔

1662 میں ریاست ورجینیا نے ریاست میسا چوسٹس کے بعد انسانی تاریخ کا دوسرا بدترین قانون پاس کرتے ہوئے غلامی کو نسلی ورثہ قرار دے دیا یعنی ایک غلام عورت کے بطن سے جنم لینے والے بھی غلام قرار دے دیے گئے۔ ان کی آزادی پر بھی ہر وہی شرط عائد کر دی گئی جو غیر پیدائشی غلاموں پر عاید تھی۔

1662 میں ہی ریاست میسا چوسٹس نے اپنے 1652 کے لازمی فوجی تربیت کے قانون کو کالعدم قرار دے دیا چونکہ اس دوران فوجی تربیت یافتہ مفرور غلاموں نے اپنی فوجی تربیت اور اسلحہ کے استعمال کو اپنی آزادی کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس قانون کے تحت سیاہ فاموں کے لیے اسلحہ رکھنا، خریدنا یا استعمال کرنا غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ اسی سال نیو یارک، کنکٹی کٹ اور نیو ہمپشائر میں بھی سیاہ فاموں کے لیے اسلحہ کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا۔

1663 میں ریاست میری لینڈ نے غلامی کو قانونی قرار دے دیا۔

1664 میں نیو یارک اور نیو جرسی میں غلامی کو قانونی قرار دیا گیا اسی سال ریاست میری لینڈ میں ایک اور قانون وجود میں آیا جس کے تحت سیاہ

فام مردوں اور سفید فام عورتوں کے درمیان شادی ممنوع قرار دے دی گئی اور اس پر سزاؤں کا اجرا ہوا۔

1664 میں ہی ریاست میری لینڈ، نیو یارک، نیو جرسی، ورجینیا اور کیرو لائنا میں غلاموں کے لیے عمر بھر کی غلامی لازمی قرار دے دی گئی یہ ایک اور ظالمانہ قانون تھا جس نے سیاہ فاموں پر سب بلائیں تمام کر دیں۔

1666 میں ریاست میری لینڈ نے مفرور غلاموں کے خلاف قانون سازی کی۔

1667 میں ریاست ور جینیا نے ایک قانون کے تحت سیاہ فاموں کو عیسائیت کا بپتسما لے لینے کے باوجود ان کی غلامانہ حیثیت میں تبدیلی پر پابندی عاید کر دی ریاست ور جینیا کا یہ قانون سپین کے بادشاہ فلپ سوئم کے 1609 کے اس قانون سے مشابہ تھا جس کے تحت عیسائیت کا بپتسما لے لینے کے باوجود اندلس کی زمین ان مسلمانوں پر بھی تنگ ہو چکی تھی جنہوں نے بپتسما کے سم کو حیات نو کا استعارہ سمجھ لیا تھا۔

1668 میں ریاست نیو جرسی نے مفرور غلاموں کے خلاف قانون سازی کی۔

1674 میں ریاست نیو یارک نے ان غلاموں کی آزادی پر پابندی عاید کر دی جو اس امید پر عیسائی ہو گئے تھے کہ شاید انہیں عیسائی ہو جانے کی وجہ سے آزادی دے دی جائے۔

1680 میں ریاست ورجینیا نے فرار ہونے کی کوشش کرنے والے غلاموں پر کڑی سزائیں جاری کیں۔

1682 میں ریاست ورجینیا نے درآمد کیئے جانے والے سیاہ فام غلاموں کے لیے تاحیات لازمی غلامی کا قانون پاس کیا۔

1684 میں ریاست نیو یارک نے سیاہ فاموں پر اشیاء کی خرید و فروخت قانوناً ممنوع قرار دے دی۔

1691 میں ریاست ورجینیا نے ایک اور ظالمانہ قانون کے تحت غلاموں کی آزادی پر غیر مشروط پابندی عائد کردی۔ اس قانون کے تحت ریاست ورجینیا کی حدود میں غلاموں کی آزادی جرم قرار دے دی گئی۔ آزادکردہ غلاموں کو ریاست کی حدود سے نکل جانے کا حکم جاری کیا گیا۔ وقتاً فوقتاً جاری ہونے والے یہ غیر انسانی قوانین سپین کے ان قوانین کے ہو بہو تھے جو وہاں مسلمانوں کے خلاف آزمائے گئے تھے۔ اس میں کیا مضائقہ کہ ملکہ ازا بیلا اور کرسٹو فر کولمبس کی روح برطانوی آباد کاروں کے اجسام میں حلول کرچکی تھی۔ اور اب اس میں کیا اچنبھا کہ کل کے برطانوی آبادکار ہی آج کی ''امریکی حکومت'' ہیں۔

1691 میں ریاست جنوبی کیرو لائنا نے غلاموں کے لیے پہلا ضابطہ اخلاق جاری کیا۔ اس ضابطے کے تحت سیاہ فاموں کو سانس لینا دوبھر ہوگیا۔ یہ ضابطہ جسے اخلاق کہا گیا حقیقتاً شرمناک حد تک غیر اخلاقی تھا اس میں بالجبر سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے تک کے قواعد مرتب کردیے گئے تھے۔ مثلاً یہ کہ جب تک آقا سو نہ جائے غلام کو جاگتے رہنا ہوگا، جب تک مالک کھا نہ لے، غلام نہیں کھا سکتا، مالک کھڑا ہو تو غلام بیٹھ نہیں سکتا جبکہ اس ضابطہ میں یہ پتہ چلانے کا کوئی فارمولا درج نہیں تھا کہ مالک کے سونے یا نہ سونے کا پتہ کیسے چلے گا۔ سو سونے یا جاگنے ہر دو صورتوں میں مالک، غلام کی چمڑی ادھیڑنے کا قانونی اختیار رکھتا تھا۔

1700 میں پنسلوینیا میں غلامی کو قانوناً جائز قرار دے دیا گیا۔

1702 میں نیو یارک کی ریاستی اسمبلی نے سیاہ فاموں کی عدالتوں میں گواہی پر پابندی عاید کردی جبکہ ایک اور قانون کے تحت تین سے زیادہ سیاہ فاموں کے یک جا ہو جانے پر سزائیں جاری کی گئیں۔

1703 میں میسا چوسٹس میں غلاموں کو آزاد کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کے

لیے غلاموں کو آزاد کرنے والوں پر پچاس پونڈ فی غلام زر ضمانت جمع کرانے کا قانون منظور کیا گیا جبکہ ان دنوں غلام مرد کی قیمت 20 سے 30 پونڈ اور غلام عورت کی قیمت 10 سے 20 پونڈ کے درمیان تھی۔

1703 میں ریاست کنکٹی کٹ میں ان سیاہ فام غلاموں کو سرعام کوڑے مارنے کا حکم جاری کیا گیا جو نقص امن کا باعث بنے ہوں یا سفید فاموں کی تابعداری سے منکر ہوں۔

1703 میں ہی ریاست رہوڈ آئی لینڈ میں ریڈ انڈینیز اور سیاہ فاموں کے لیے آقاؤں کی تحریری اجازت کے بغیر رات کو گھر سے نکلنا غیر قانونی قرار دیا گیا۔

1705 میں ورجینیا کی جنرل اسمبلی نے آخری کیل ٹھونکتے ہوئے سیاہ فاموں کو ورجینیا کی حدود میں آقاؤں کی ملکیت اور اثاثے قرار دے دیا۔ انسانوں کو اشیاء بنا دینے کے اس غیر انسانی قانون میں آقاؤں پر غلاموں کا قتل اس مشروط وجہ سے معاف کردیا گیا کہ اگر غلاموں کو تابعداری سکھانے اور انہیں سدھانے کے عمل میں آقا کے ہاتھوں غلام مارا جائے تو اسے قتل تصور نہیں کیا جائے گا اور اس قتل پر آقا سے باز پرس نہیں ہوگی۔

1705 کے اس قانون کے نافذ ہوتے ہی غلاموں کے 99 فیصد قتل، تابعداری سکھانے کے زمرے میں آگئے جس سے غلاموں کی زندگی کی قانونی ضمانت ختم ہوگئی 1705 میں ہی میسا چوسٹس کی جنرل اسمبلی نے سفید فام اور سیاہ فاموں کے درمیان شادی بیاہ اور جنسی اختلاط پر پابندی لگا دی جبکہ اندر خانے سیاہ فام عورتوں پر جنسی تشدد جاری رہا۔ جہاں سیاہ فاموں کے قتل پر کوئی تعزیر مقرر نہیں تھی وہ وہاں بالجبر سے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے سو، سیاہ فام عورتوں کے لیے زنا بالجبر ایک معمول کی بات بن گیا

1708 میں ریاست رہوڈ آئی لینڈ میں سیاہ فاموں کی نقل و حرکت محدود

کرنے کا بل پاس ہوا۔ اس قانون کے تحت غلاموں کو اپنے آقاؤں کی معیت میں ہی نقل و حرکت کی اجازت تھی۔ بصورت دیگر اس پر سخت سزاؤں کا اجراء ہوا۔

1708 میں ہی جنوبی ریاستوں نے ریاستی فوج کے ہر سفید فام سپاہی کے لیے ایک سیاہ فام غلام مقرر کرنے کا بل پاس کیا۔

1710 میں ریاست نیو یارک نے سیاہ فاموں اور ریڈ انڈینز کے لیے رات کے وقت لالٹین کے بغیر چلنے پر پابندی عاید کر دی۔ خلاف ورزی پر کڑی سزاؤں کا اجراء کیا گیا۔

1712 میں نیو یارک اسمبلی نے سیاہ فاموں کو جائیداد بنانے، خریدنے یا مالکانہ حقوق حاصل کرنے پر پابندی لگا دی۔

1715 میں رہوڈ آئی لینڈ میں غلامی کو قانوناً جائز قرار دے دیا گیا۔

1715 میں ریاست میری لینڈ نے ایک قانون کے تحت ریاست کی حدود میں داخل ہونے والے سیاہ فاموں پر تا حیات غلامی کی غیر مشروط حد نافذ کر دی۔

1717 میں ریاست نیو یارک نے مفرور غلاموں کے خلاف قانون سازی کی۔

1724 میں لوئز یانا میں سیاہ فاموں کو شادی کے لیے اپنے مالک سے تحریری اجازت لینے کا پابند کر دیا گیا۔

1738 میں جارجیا کی ریاستی اسمبلی نے افریقہ سے سیاہ فاموں کی براہ راست درآمد کے اجازت نامے جاری کیے۔

1740 میں جنوبی کیرولائنا نے بدنام زمانہ نیگرو ایکٹ جاری کیا اس ایکٹ کے تحت سیاہ فاموں کا ریاست سے باہر جانا، ایک جگہ جمع ہونا، ذاتی فصلیں اگانا، پیسہ کمانا، کاروبار کرنا، لکھنا پڑھنا اور انگریزی سیکھنا غیر قانونی قرار دیا گیا جبکہ مالکان کو باغیانہ خیالات رکھنے والے غلاموں

> کے قتل کی اجازت دے دی گئی۔ تابعداری سیکھنے کے عمل میں قتل ہونے سے جو سیاہ فام بچ رہے تھے وہ 'باغیانہ خیالات' رکھنے کے جرم میں قتل ہو گئے۔
>
> 1778 میں رہوڈ آئی لینڈ نے سیاہ فاموں پر ریاست سے باہر جانے پر پابندی کا قانون منظور کیا۔

1770 کے عشرے میں جب تھامس جیفرسن کو امریکہ کا اعلان آزادی لکھنے اور امریکہ کا وفاقی آئین بنانے کا کام سپرد ہوا تو ان کے سامنے سیاہ فاموں کے خلاف بنائے گئے ڈیڑھ سو سالہ غیر انسانی قوانین کا انبار لگا تھا جسے وہ یک جنبش قلم منسوخ کر سکتے تھے جبکہ وہ ''تمام انسانوں کی برابر تخلیق'' کے پر زور حامی بھی تھے تو اس سے امریکہ کے سیاہ فاموں اور یورپ کے آزادی پسندوں کو یقین تھا کہ اب امریکہ سے غلامی ختم ہو جائے گی لیکن جو کچھ ہوا وہ ان توقعات کے برعکس تھا جو تھامس جیفرسن سے وابستہ تھیں۔ ان غیر انسانی بہیمانہ قوانین کے ہوتے ہوئے اور سات لاکھ کے قریب سیاہ فام غلاموں کی موجودگی میں تمام انسان جس قدر برابر اور آزاد ہو سکتے تھے غالباً تھامس جیفرسن کے نزدیک اسی قدر کافی تھے کہ وہ انسانی حقوق کے زور پر قائم ہونے والی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی بنیاد' انسانی حقوق کی راکھ پر رکھتے ہوئے نہ آزردہ ہوئے نہ بد دل' یہ الگ بات کہ امریکہ میں سیاہ فاموں اور ریڈ انڈینز کے لیے بنائے گئے کالے قوانین تمام انسانوں کی مساوی تخلیق اور یکساں حقوق کا مذاق اڑا رہے تھے۔

تمام انسانوں کی برابر تخلیق اور ان کی فطری آزادی کے حقوق پر یقین رکھنے والا ان کی آزادی اور حقوق کی جنگ لڑنے کی بجائے انہیں اسیر رکھنے اور ان کے حقوق غصب رکھنے کی کوشش میں شریک ہو گیا۔ انہیں اپنے لفظی اور نظریاتی دعویٰ اور اپنے غلاموں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کا مرحلہ در پیش تھا اس تاریخی ساعت میں ان کے گھٹنے بھی پیٹ کی طرف مڑ گئے تھامس جیفرسن دوسروں کو تو کیا آزادی دلاتے یا کسی اور کے حقوق کا تو کیا تحفظ کرتے وہ تو اپنے ذاتی غلاموں کو بھی آزاد نہ کر سکے۔ انہیں اپنی وصیت میں بھی اپنے غلاموں کو آزاد کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ وہ اپنے غلاموں کو اپنی صاحبزادی کی ملکیت میں دے کر وفات پا گئے۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کے غلاموں میں سے سیلی ہیمنگ کے جن پانچ بچوں کو رہا کیا گیا ان میں

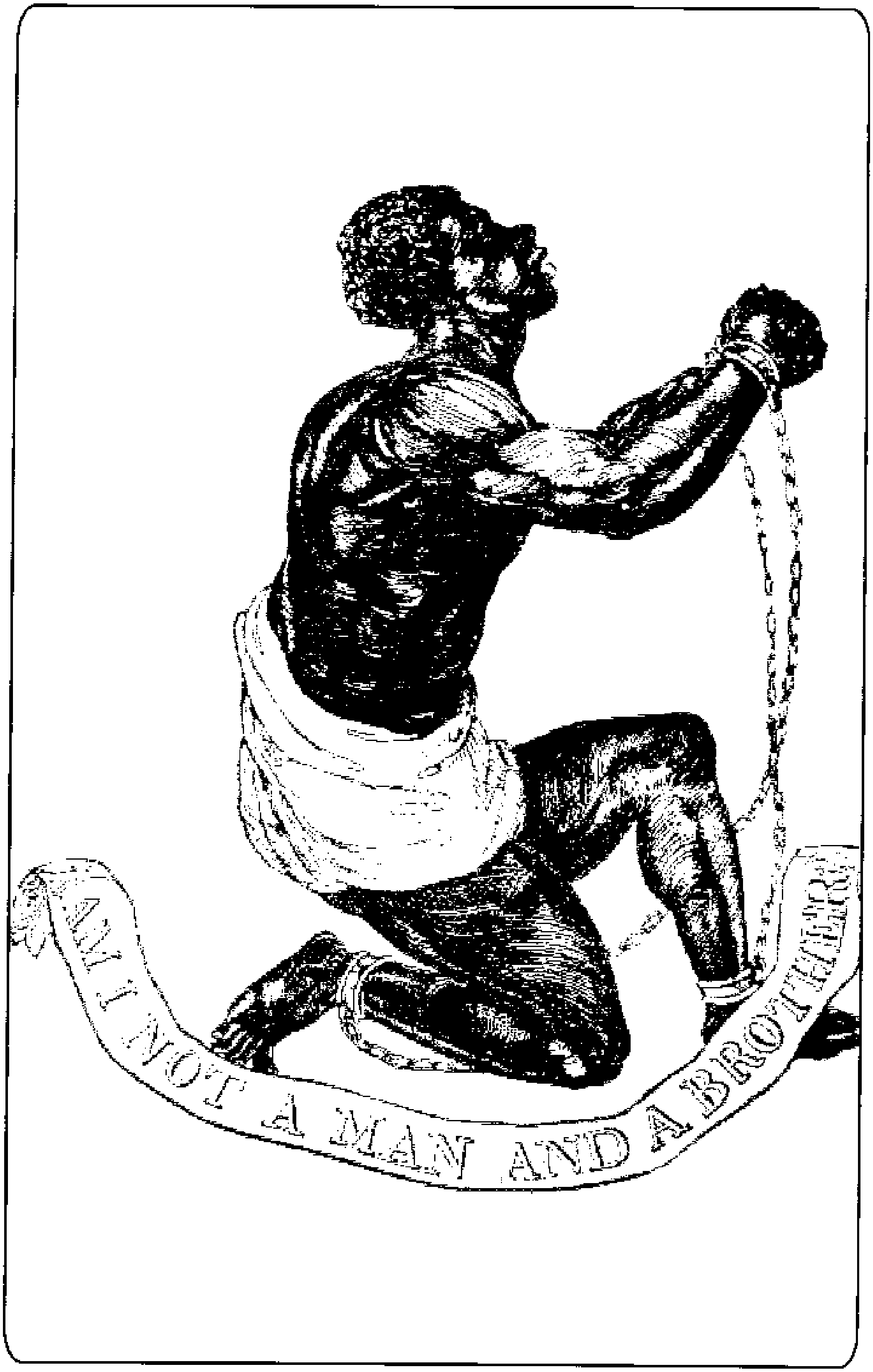
AM I NOT A MAN AND A BROTHER?

Mapping Jefferson's Y Chromosome

Only males carry the Y chromosome. Certain features of the chromosome are passed from father to son without much change over generations.

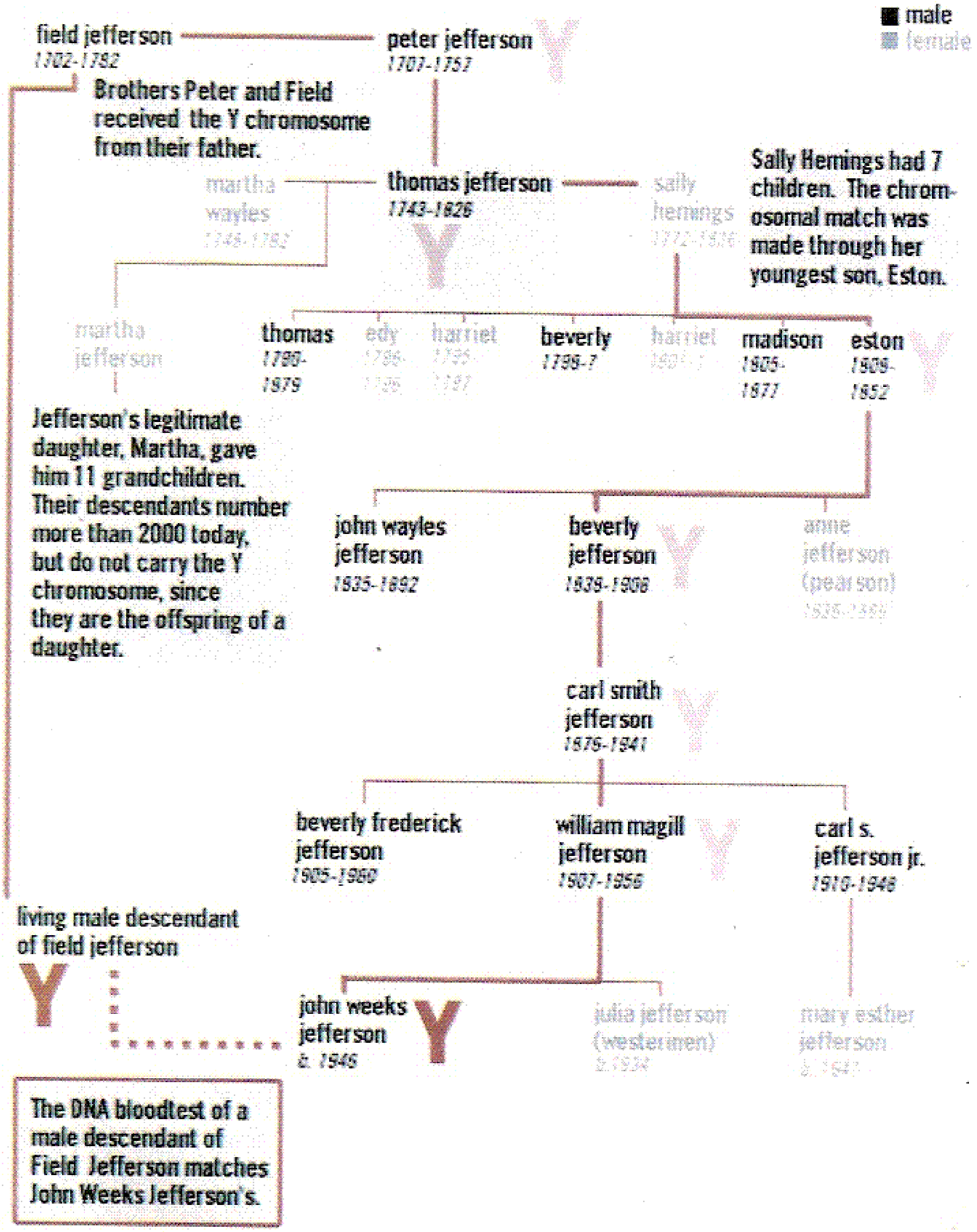
■ male
▨ female
field jefferson
1702-1782
peter jefferson
1707-1757
Y
martha wayles
1748-1782
thomas jefferson
1743-1826
Y
sally hemings
martha jefferson
thomas
1790-1879
edy
harriet
1795-1797
beverly
1798-?
harriet
madison
1805-1877
eston
1808-1852
Y
john wayles jefferson
1835-1892
beverly jefferson
1838-1908
Y
anne jefferson (pearson)
carl smith jefferson
1875-1941
Y
beverly frederick jefferson
1905-1950
william magill jefferson
1907-1956
Y
carl s. jefferson jr.
1910-1948
living male descendant of field jefferson
Y
john weeks jefferson
b. 1945
Y
julia jefferson (westerman)
mary esther jefferson

Brothers Peter and Field received the Y chromosome from their father.

Sally Hemings had 7 children. The chromosomal match was made through her youngest son, Eston.

Jefferson's legitimate daughter, Martha, gave him 11 grandchildren. Their descendants number more than 2000 today, but do not carry the Y chromosome, since they are the offspring of a daughter.

The DNA bloodtest of a male descendant of Field Jefferson matches John Weeks Jefferson's.

تھامس جیفرسن کا اپنی مخلوط النسل (سیاہ فام خادمہ) سیلی ہیمنگ سے پیدا کردہ وہ ناجائز بچہ بھی شامل تھا جس سے تھامس جیفرسن ہمیشہ انکار کرتے رہے۔

1802 میں ورجینیا کے اخبار 'رچمنڈ ریکارڈ' میں شائع ہونے والی اس خبر نے ایک عالم کو اچنبھے میں ڈال دیا کہ وائٹ ہاؤس میں مقیم امریکی صدر تھامس جیفرسن جنہیں اس وقت دنیا کا عظیم ترین مدبر، دانشور، عظیم سیاستدان اور بے مثال راہنما مانا جاتا تھا، اندر خانے اپنی غلام خادمہ سے ناجائز بچے بھی پیدا کر رہے ہوں گے۔ تھامس جیفرسن نے اس اخباری رپورٹ کی تو کبھی تردید نہ کی البتہ وہ ان افواہوں کی تردید ضرور کرتے رہتے کہ ان کے اپنی خادمہ سے کسی بھی قسم کے تعلقات ہیں یا وہ اندر خانے ناجائز بچے پیدا کرتے رہے ہیں۔ وہ وہائٹ ہاؤس میں اپنی حرام کاریوں کے ارتکاب کو الزام اور اپنے سیاسی مخالفین کے اوچھے ہتھکنڈے قرار دیتے رہتے۔ یکم ستمبر 1802 کو جیمز کیلنڈر نے رچمنڈ ریکارڈ میں لکھا:

> ''یہ اچھی طرح معلوم ہوگیا ہے کہ وہ آدمی جس کی عزت کرنے سے لوگ خوش ہوتے ہیں، اس نے کئی سالوں سے اپنی ایک غلام کو داشتہ بنا کر رکھا ہوا ہے۔ اس کا نام سیلی ہے اور اس کے سب سے بڑے لڑکے کا نام ٹام ہے۔ یہ لڑکا رنگ میں کالا ہونے کے باوجود حیران کن حد تک صدر تھامس جیفرسن سے مشابہت رکھتا ہے۔ لڑکے کی عمر دس یا بارہ سال ہے اس کی ماں (سیلی ہیمنگ) اسی جہاز میں اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ تھامس جیفرسن کے ساتھ فرانس گئی تھی جس جہاز میں تھامس جیفرسن امریکہ کے سفیر کی حیثیت سے فرانس روانہ ہوئے تھے۔ اس انتظامی تانے بانے کی نزاکت پر عام سمجھ بوجھ کے ہر شخص کو چونک جانا چاہیے۔ ایک امریکی سفیر کے لیے یہ کس قدر عظیم الشان منظر ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے دونو جوان عورتیں موجود رہیں۔ کچھ سال پہلے بھی ایک دوبار یہ واقعہ 'رنڈز فیڈ رلسٹ' میں شائع ہو چکا ہے لیکن اس وقت ہمیں یقین تھا کہ یہ سراسر جھوٹا الزام ہے اسے الزام سمجھنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد مسٹر تھامس جیفرسن کو صدارت پر فائز نہ

دیکھنے کی خواہش مند تھی ۔ اس ایک حقیقت کے سامنے آجانے سے ان کے لیے انتخابات میں کامیابی ناممکن ہوجاتی ۔'' 29۔ (جیمز کیلنڈر: 1802)

رچمنڈ ریکارڈ کی خبر کے قریب دو سو سال بعد ایک عالم اس وقت پھر حیرانی میں ڈوب گیا جب 1998 میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے ماہر جینیٹکس کرسٹوفر ٹائیلر سمتھ نے سیلی ہیمنگ اور تھامس جیفرسن کے ورثا کے وائی کروموسوم ڈی این اے ٹیسٹ سے یہ ثابت کردیا کہ سیلی ہیمنگ کا ایک بچہ لازماً اور پانچ دوسرے بچے غالباً تھامس جیفرسن ہی کی اولاد تھے۔ نورس ول پنسلوینیا میں مقیم سیاہ فام جان جیفرسن جو سیلی ہیمنگ کے ورثاء میں شامل ہیں اور جنہوں نے ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے اپنے خون کا نمونہ مہیا کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ''مجھے عملی طور پر ہمیشہ سے یہ پتہ تھا کہ تھامس جیفرسن ہی میرے جداعلیٰ ہیں۔'' 30۔ (اکانومسٹ: 1998)

1998 میں جب صدر بل کلنٹن وائٹ ہاؤس میں مونیکا لیونسکی سے جنسی سرمستیوں کے الزام میں رنگے ہاتھوں دھر لئے گئے تو میڈیا اور عوام کا غصہ صدر بل کلنٹن کی بے راہ روی کی نسبت وائٹ ہاؤس کا تقدس مجروح ہوجانے پر زیادہ تھا ۔ تین ماہ بعد جب اکانومسٹ اور نیچر میگزین میں صدر تھامس جیفرسن اور سیلی ہیمنگ کے ورثاء کی ڈی این اے رپورٹ مع ڈی این چارٹ کے شائع ہوئی تو وائٹ ہاؤس کی تقدیس مجروح ہو جانے پر غصہ کھانے والے ٹھنڈے پڑ گئے ۔ سیلی ہیمنگ اور تھامس جیفرسن کے ورثاء کے بارے میں اس تحقیقی رپورٹ نے کہ ''اصل میں دونوں ایک ہیں'' جلتی پر تیل کا کام کرنے کی بجائے صدر بل کلنٹن کے حق میں بجھتی پر پانی کا' کام کیا ۔ تین ماہ پہلے وہی امریکی عوام جو صدر بل کلنٹن کے وائٹ ہاؤس کی تقدیس مجروح کردینے پر خار کھائے بیٹھے تھے' صدر تھامس جیفرسن کے وائٹ ہاؤس میں حرام کے بال پیدا کرنے کی تصدیق پر ٹھنڈے پڑ گئے ۔ انہیں یہ جان کر شدید مایوسی ہوئی کہ وائٹ ہاؤس کا تقدس تو دو سو سال پہلے ہی اجڑ چکا تھا ۔ یہ جان کر عوام کا غصہ کافور ہوگیا کہ صدر تھامس جیفرسن نے وائٹ ہاؤس میں دو سو سال پہلے جو انت مچایا تھا' صدر بل کلنٹن کا جرم تو ان کے مقابلے میں ذہنی و جنسی بے راہروی' اخلاقی کج روی اور جنسی چھیڑ خانیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور امریکہ میں یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے کہ متعلقین کی بساط ہی لپیٹ دی جائے ۔

سو' صدر بل کلنٹن اور مونیکا لیونسکی دونوں محفوظ رہے خصوصاً مونیکا لیونسکی تو فائدے میں بھی رہیں ۔ انہوں نے صدر بل کلنٹن سے اپنے جنسی تجربے' اٹھکیلیوں اور چھیڑ خانی کے دام

کھڑے کر لیئے۔ وہ راتوں رات یورپ اور امریکہ میں وی وی آئی پی اور میڈیا سٹار بن گئیں۔ کہیں لذت بھری حکایت بیچی، کہیں جنس بھرا تجربہ اور کہیں کہیں جنس زدہ رویہ۔ انہوں نے غروب ہوجانے سے پیشتر جو ایک ساعت میسر تھی اسے ہوش مندی سے استعمال کیا۔ مشرق میں جس لغزش کی پاداش تنہائی گمنامی، خود اذیتی اور لعن طعن میں کاٹنے کی روایت ہے امریکہ میں یہی کشت ڈنکے کی چوٹ پر با آواز بلند اور فخریہ انداز میں کاٹا جاتا ہے۔ سو مونیکا نے نیویارک، لاس اینجلس، لنڈن روم اور پیرس دھون کر رکھ دیئے۔ کہیں خطاب کیا، کہیں پریس کانفرنس، کہیں مہمانِ خصوصی بنیں، کہیں استقبالیئے کی منظور نظر۔ کسی کو آٹوگراف دیئے اور کسی کو نیم برہنہ تصاویر۔ کہیں سے لاکھوں لیئے، کہیں سے ہزاروں۔ کسی سے بیعانہ پکڑا، کسی سے زر ضمانت، کسی سے نقد لیئے اور کسی سے وعدہ یوں دیکھتے ہی دیکھتے وہ لاکھوں لوٹ لائیں اور محفوظ ہوگئیں۔ مونیکا نے ثابت کردیا کہ امریکہ میں صرف ڈالر محفوظ ہے، دوام مالی حیثیت سے ہے۔ استحکام کرنسی کو ہے، عصمت و آبرو کو نہیں —— یہ تو آتی جاتی دھوپ چھاؤں ہے۔

صدر بل کلنٹن، صدر امریکہ ہونے کے باوجود بھی مونیکا کو نہ کوئی نوکری دلوا سکے، نہ کوئی گھر، نہ پلاٹ نہ اراضی نہ کوئی غیر ملکی دورہ نہ کار نہ کاروبار نہ دھیلا نہ ٹکا۔ آہ، بے چارے کلنٹن غمزدہ اور، رت جگوں کے مارے ہوئے۔ البتہ مونیکا لیونسکی اس کل کل چیچے سے لاکھوں لے اڑیں۔ ہمیں تو اس وقت صدر بل کلنٹن دنیا کا مضبوط ترین حاکم ہونے کی بجائے مظلوم ترین فرد لگتے تھے۔ ایک طرف مونیکا لیونسکی کیس میں ان پر لعن طعن ہو رہی تھی اور اندر کی باتیں باہر آرہی تھیں، دوسری طرف پاؤلا جونز کی سربراہی میں خواتین کے ایک گروپ نے صدر بل کلنٹن پر جنسی دست درازی کا ایک اور مقدمہ قائم کر رکھا تھا۔ پاؤلا جونز کا دعویٰ تھا کہ بل کلنٹن جب ارکنساس کے گورنر تھے اور وہ ان کی سٹاف سیکریٹری تھیں تو بل کلنٹن ان کی عصمت لوٹنے کے بھی مرتکب ہوئے تھے۔ ادھر میڈیا، کانگریس، عدلیہ اور وکلا میں بل کلنٹن کے جنسی رجحان کی جزئیات کی تفصیل و تشریح کی جارہی تھی ادھر اندر خانے ہیلری کلنٹن چھالیں مار رہی تھیں۔ صدر بل کلنٹن کا دن عدلیہ، وکلاء، پریس اور کانگریس سے بے عزت ہونے میں گزر جاتا اور رات کو وہ ہیلری کے ہتھے چڑھ جاتے۔ اب یہ تو وہی جانیں کہ ان کے یہ دن زیادہ طویل تھے یا راتیں زیادہ بھاری لیکن دیکھنے والوں کو وہ آٹھوں پہر یکساں اداس، نڈھال اور دباؤ میں نظر آتے۔ چوبیس گھنٹے اور چہار سمت سے دشنام اور، رسوائی کے چلتے تیروں میں ان کا وہی وقت خیر سے

گزرتے لگتا جو وہ اپنے کتے کے ساتھ گزارتے ۔

اینڈریو جیکسن امریکہ کے ساتویں صدر تھے جو 1829 سے 1837 تک امریکہ کی صدارت پر فائز رہے ۔ ان کا عہد محض ریڈ انڈینز پر ہی بھاری نہیں تھا بلکہ سیاہ فام بھی ان کے عہد نا مبارک میں محفوظ نہیں تھے۔ ان کے مزاج کی شدت اور انتہا پسندی ان کے الفاظ میں ہمیشہ نمایاں رہی ۔ سیاہ فاموں کے بارے میں اینڈریو جیکسن رقم طراز ہیں :

> ”جس حد تک اس بدقسمت (سیاہ فام) مخلوق پر رحم کیا جاسکتا ہے' میری خواہش ہے کہ تم اس حد تک ضرور ایسا کرو ۔ پہلے تابعداری کو یقینی بنایا جائے اس کے بعد اچھے سلوک کو ۔“ 31۔ (مارکیوز جیمز : 1937)

اینڈریو جیکسن واحد ایسے امریکی صدر تھے کہ جو صرف غلاموں کے مالک ہی نہیں بلکہ غلاموں کے تاجر بھی رہے تھے ۔ انہیں بردہ فروشی کا معقول تجربہ تھا۔ جیمز مارکیوز لکھتے ہیں :

> ”1774 میں ان کے تجارتی مال میں غلام بھی شامل تھے ۔“
>
> 32۔ (مارکیوز جیمز : 1937)

اینڈریو جیکسن نے 1788 میں جبکہ وہ اکیس سال کے متمول جوان آدمی تھے ایک سیاہ فام نوعمر غلام لڑکی خرید لی تھی یہ نوعمر خادمہ جس غرض سے خریدی گئی تھی اس کا اندازہ لگانے میں کسی مہارت کی ضرورت نہیں ہے ۔ 1820 تک وہ 160 غلاموں کے آقا بن چکے تھے ۔ امریکہ کے اعلان آزادی' آئین' انسانی حقوق اور انسانی آزادی سے ان کے اخلاص کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے بھی دم مرگ اپنی وصیت میں اپنے غلاموں کو آزاد نہیں کیا تھا ۔ اینڈریو جیکسن کے بعد آنے والے صدور بھی ذاتی فائدے اور سفید فاموں کے مفادات کے دباؤ میں اعلان آزادی میں لکھے گئے خوش رنگ وعدے کی مسلسل خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے رہے ۔ اصولی طور پر غلامی کو غلط سمجھنے کے باوجود کاروباری تقاضوں نے ان کے ہاتھ باندھے رکھے ۔ اصل اور اصول کے اس واضح تضاد نے ایک ایسی دورخی کو پروان چڑھایا ۔ جو نظریے کے طور پر پختہ ہوکر امریکی پالیسی میں ہمیشہ کے لیے نمایاں ہوگئی۔ سیاہ فاموں اور غلامی کے بارے میں اینڈریو جیکسن کے بعد آنے والے صدور بھی اسی دوہرے معیار کا شکار' رہے جسے جارج واشنگٹن شروع کر گئے تھے 1840 سے 1860 کے درمیانی عرصے میں شمالی ریاستوں کا غلامی ختم کرنے کا دباؤ اور جنوبی ریاستوں کا غلامی جاری رکھنے کا مفاد اپنے عروج پر پہنچ گیا ۔

اس دوران امریکی صدور کے خیالات سے سیاہ فاموں کے بارے میں وہ نمائشی اعتدال بھی رخصت ہو گیا جو جارج واشنگٹن اور تھامس جیفرسن بہر حال قائم رکھے ہوئے تھے یا ان کے رویوں سے وہ منافقت جاتی رہی جو جارج واشنگٹن اور تھامس جیفرسن کے کردار و اعمال میں نمایاں تھی ۔ واقعہ جو بھی رہا ہو لیکن اب سیاہ فاموں کے بارے میں امریکی حکومتوں کا روّیہ مزید جارحانہ ہو چکا تھا ۔ صدر جان جائیلر (1841-1845) کے درج ذیل ارشاد سے سیاہ فاموں پر بڑھتے ہوئے مصائب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے :

> "خدا' انسانوں کے لیے بہتر ہی کرتا ہے ۔ سیاہ فام جنہیں افریقہ سے لایا گیا ہے ۔ وہ وہاں جاہل اور وحشی تھے جبکہ یہاں امریکہ میں وہ تعلیم یافتہ' مہذب حتیٰ کہ عیسائی تک ہیں ۔" 33۔ (لیون ٹائیلر: 1884)

1838 میں صدر جان ٹائیلر کا امریکہ میں سیاہ فاموں کو تعلیم یافتہ قرار دینا اسی قدر سچ تھا جتنا جارج واشنگٹن کا غلامی ختم کرنے میں اخلاص گہرا تھا یا تھامس جیفرسن کا انسانوں کی مساویانہ تخلیق پر اعتماد ۔ نوبل انعام یافتہ امریکی مصنفہ پرل ایس ۔ بک نے جب یہ لکھا کہ:

> "انسان کا آزاد ہونا خواہ بھوکا ہو' کہیں بہتر ہے بہ نسبت غلامی میں پیٹ کے بھرے ہونے سے ۔" 34۔ (پرل ۔ ایس ۔ بک: 1996)

تو عین ممکن ہے کہ جان ٹائیلر کا یہ دروغ نظریہ ہی ان کے پیش نظر رہا ہو ۔ صدر جان ٹائیلر کے اس کہے کو محض جھوٹ قرار دے دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ اس قدر بدترین اور فریب کارانہ جھوٹ تھا کہ اسے امریکی تاریخ کے کذبِ سفاک کا درجہ حاصل ہے ۔ صدر جان ٹائیلر جن سیاہ فام افریقی غلاموں کو امریکہ میں تعلیم یافتہ قرار دے رہے تھے تعلیم کے حصول پر ہی انہیں تشدد کا سب سے زیادہ نشانہ بننا پڑا ۔ انہیں حصول علم پر کوڑے مارے گئے' بھوکا رکھا گیا' ہاتھ کاٹے گئے' پاؤں توڑے گئے' زبان کھینچی گئی اور ان کا زندہ رہنا مشکل کردیا گیا ۔ جاگیردار خواہ امریکی ہی کیوں نہ ہو لیکن کسی مشترکہ خناس کے تحت پاکستانی جاگیردار کی طرح اسے بھی ہمیشہ سے یہ پتہ تھا کہ رعیت' رعایا' کامیوں اور مزارعوں کو پڑھنے لکھنے اور تعلیم سے محروم رکھنے میں ہی اس کی عافیت ہے ۔ صدر جان ٹائیلر کا کذب اپنی جگہ مگر حقیقت یہ تھی کہ امریکہ میں غلاموں کو پڑھنے لکھنے کی سخت ممانعت تھی اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں ۔ یہ ناانصافی صرف انفرادی یا اجتماعی سطح پر ہی مروّج نہیں تھی بلکہ اس کے لیے حکومتی سطح پر قانون

سازی ہوتی رہتی تھی:

> ”1705 میں ریاست ورجینیا میں غلاموں کو پڑھنے' لکھنے اور تعلیم حاصل کرنے سے محروم رکھنے کے لیے ریاستی اسمبلی میں قانون منظور کیا گیا۔ اسی قانونی نظیر کی پیروی میں دوسری 17 ریاستوں نے بھی اسی سے ملتے جلتے قوانین بنا کر سیاہ فاموں پر تعلیم کا دروازہ بند کیئے رکھا۔“
>
> 1730 کے عشرے میں نیو یارک میں غلاموں کو فروخت کرنے والے کو مال فروخت کی ناخواندگی کی ضمانت بھی دینی پڑتی یعنی میں جو غلام بیچ رہا ہوں یقین کیجئے یہ ناخواندہ اور جاہل ہیں اور میں ان کی ناخواندگی اور جہالت کا ضامن ہوں۔
>
> 1730 کے عشرے میں ہی ریاست ورجینیا میں ایسے اساتذہ کو جیل میں اذیت ناک سزائیں دی گئیں جو سیاہ فام بچوں کو پڑھانے کے مجرم پائے گئے تھے۔
>
> نارتھ کیرولائنا اور ٹیکساس میں کسی بھی سطح کے تعلیمی اداروں میں غیر سفید فاموں کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا جو کئی عشروں تک نافذ العمل رہا۔
>
> ریاست اوکلوہاما میں ایسے اساتذہ پر بھاری جرمانے عائد کئے جاتے جو کسی بھی تعلیمی ادارے میں سیاہ فام بچوں کو پڑھاتے ہوئے پکڑے جاتے۔ ایسے اساتذہ کو معلمی کے لیے نااہل قرار دے دیا جاتا۔

یکم جنوری 1863 کو صدر ابراہام لنکن کے صدارتی فرمان سے آزاد ہونے والے سیاہ فام غلام مزید مصائب کا شکار ہوگئے۔ صدر ابراہام لنکن امریکہ کے سولہویں صدر ہونے کے باوجود امریکہ کے پہلے ایسے صدر تھے جن کا نہ کوئی غلام تھا نہ وہ کبھی غلاموں کے بیوپاری رہے تھے۔ غلامی کے بارے میں ان کے خیالات کسی منفعت' اثاثے' یافت اور کاروبار سے آلودہ نہیں تھے وہ شروع ہی سے غلامی کے خلاف دوٹوک' واضح اور فیصلہ کن نظریات کے سیاستدان تھے۔ وہ 1865 میں اپنی مشہور تقریروں میں کہہ چکے تھے۔

> ”مجھے یقین ہے کہ یہ امریکی حکومت مستقلاً آدھے غلام اور آدھے آزاد

> کی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتی۔" 35۔(ابراہام لنکن : 1865)
>
> "میں جب بھی کسی کو غلامی کو حق میں دلائل دیتے ہوئے دیکھتا ہوں تو ایک فوری ردعمل کے تحت اسے خود کو غلامی کے تجربے سے دوچار ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔" 36۔(ابراہام لنکن : 1865)

اپنے طور پر تو انہوں نے صدارتی فرمان کے ذریعے امریکی حدود میں سیاہ فام غلاموں کو غیر مشروط طور پر آزاد کر دیا لیکن غلاموں کی بھاری اکثریت والی جنوبی ریاستیں خانہ جنگی کی وجہ سے اس وقت خود کو امریکی وفاق کا حصہ ہی نہیں سمجھتی تھیں بلکہ وفاق سے علیحدگی کی جنگ لڑ رہی تھیں۔ امریکی وفاق سے علیحدگی کا اعلان کر کے یہ ریاستیں کنفیڈریٹ سٹیٹس کے نام سے ایک نیا ملک قائم کر چکی تھیں اور فروری 1861 میں جیفرسن ڈیوس وہاں کے صدر منتخب ہو چکے تھے۔ سو سیاہ فاموں کی اکثریت پر اس پروانہ آزادی کا اطلاق ہی نہ ہو سکا لیکن خانہ جنگی میں شکست سے دو چار ہوتے ہی کنفیڈریٹ سٹیٹس (جنوبی ریاستوں) کے چار لاکھ سیاہ فام غلام یکایک آزاد ہو گئے۔ سیاہ فاموں کی آزادی سے امریکی معاشرت پر گہرے اثرات مرتب ہوئے جن میں سے درج ذیل اثرات نمایاں طور پر سنگین اور سنجیدہ ثابت ہوئے۔

- آزادی کے بعد سیاہ فام غلام نظر نہ آنے والی غیر اعلانیہ غلامی کے شکنجے میں آ گئے۔
- ظالمانہ اور بے رحمانہ سفید فام سرشت عریاں ہو کر سامنے آ گئی۔
- حیلہ سازی، قانون شکنی اور قانونی موشگافیاں عام ہو گئیں۔
- امریکہ میں بدترین لاقانونیت وقت کا قانون بن گئی۔

وفاقی حکومت کی طرف سے غلاموں کے اعلان آزادی کے بعد جنوبی اور سرحدی ریاستوں نے نسلی تعصب اور نسلی امتیاز کی بنیاد پر ایسے غیر انسانی قوانین وضع کیئے جن سے سیاہ فام دوسرے درجے کے شہری بن کر رہ گئے۔ ان قوانین کو جم کرو (Jim Crow Laws) کہا گیا۔ جو امریکہ کے طول و عرض میں قریب ایک صدی 1860 کے عشرے سے 1960 کے عشرے تک نافذ رہے۔ یہ قوانین ایسے شرمناک اور غیر انسانی تھے کہ ان سے زیادہ ظالمانہ قوانین اس وقت کرہ ارض پر کہیں اور نافذ نہیں ہوں گے لیکن اس کے باوجود امریکی جمہوریت کے ماتھے سے نہ تو ندامت کا پسینہ پھوٹا نہ یہاں انسانی حقوق کی بلند قامتی پر کمند پڑی۔ 1945 میں اقوام متحدہ کے ہیڈکوارٹر کے لیے امریکہ کا انتخاب اسرار اور شکوک وشبہات سے آلودہ تھا۔ اسرار اس وجہ

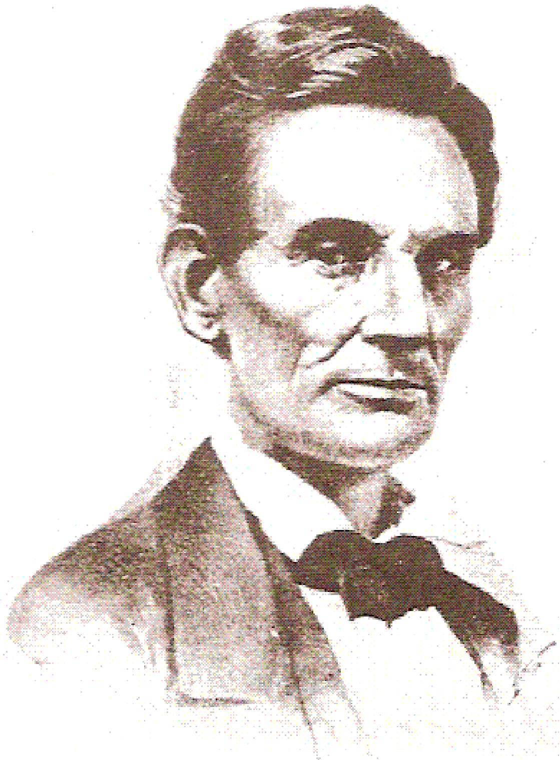

مقتول صدر ابراھام لنکن

As I would not be a slave, so I would not be a master — This expresses my idea of democracy — Whatever differs from this, to the extent of the difference, is no democracy —

A. Lincoln —

سے کہ عالمی انسانی حقوق کے تحفظ کی خاطر وجود میں آنے والے ادارے کے لیے ایسے ملک کے انتخاب کا فیصلہ جہاں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں ہی وہاں کا طرہ امتیاز رہی ہوں یقیناً پر اسرار اور سوالیہ ہے اور یہ اسرار آج تک جاری ہے۔ کہ اقوام متحدہ کو بہر حال امریکہ کے شکنجے سے نکالا نہیں جا سکا' شکوک وشبہات اس وجہ سے ہیں کہ اقوام متحدہ امریکہ اور اسرائیل کے علاوہ اور کسی کے کام نہ آسکا۔

جم کرو قوانین نے امریکہ میں سفید فام نسلی برتری کو جنم دیا' آہستہ آہستہ ضابطہ جم کرو' ایک نظریے اور فلسفے میں بدل گیا۔ اس نظریے کے تحت سفید فام امریکیوں کو ذہانت، اخلاقیات اور تہذیب روز مرہ میں غیر سفید فاموں سے برتر ہیں اور ہر دونسلوں کے درمیان قربت سے سفید یہ تھا کہ سفید فام غیر سفید فاموں سے برتر ہیں اور ہر دونسلوں کے درمیان قربت سے سفید فاموں کی نسلی برتری متاثر ہوسکتی ہے۔ سیاہ فام' ریڈ انڈینز' ہسپانوی' ایشیائی اور امریکہ میں بسنے والی دیگر نسلوں کو سفید فام برتری قبول کرنی ہوگی اور اپنے آپ کو کمتر مخلوق تسلیم کرنا ہوگا۔ عیسائی پادری خصوصاً اس نظریے کے حامی تھے اور اس دوران امریکہ میں مذہبی طور پر یہ تعلیم عام تھی کہ سفید فام خدا کی منتخب نسل ہے (بطرز نظریہ یہودیت)' سیاہ فام خدا کے دھتکارے ہوئے لوگ ہیں جن پر غلامی قائم کر دی گئی ہے اور خدا نسلی امتیاز کا حمایتی اور مددگار ہے۔ ان سو سالوں میں امریکہ میں نسلی امتیاز کے اس فلسفے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ سیاستدان سرعام اس نسلی امتیاز کو ختم نہ کرنے کے خلاف تقریریں کرتے اور مرادیں پاتے۔ ہر طرح کا میڈیا سیاہ فاموں کو' نگرز' کونز' ڈور کی اور اسی طرح کے تحقیری ناموں سے پکارتا اور طرح طرح سے غیر سیاہ فاموں کی تحقیر کی جاتی۔ 37۔(ڈیوڈ بلگرم: 2000)

امریکہ میں یہ کالے قوانین اور غیر انسانی نظریات اس حد تک مسلط تھے کہ جب 1956 میں سٹیٹسن کینیڈی نے ان قوانین کی مذمت میں جم کرو گائیڈ لکھی تو امریکہ کے طول و عرض میں کوئی پبلشر کوئی ادارہ یہ کتاب شائع کرنے کو تیار نہیں تھا بہ مشکل تمام جین پال سارتر نے یہ کتاب پیرس سے شائع کرائی جس کے کئی زبانوں میں ترجمے ہو کر مقبول عام ہوئے۔ سٹیٹسن کینیڈی جم کرو قوانین اور جم کرو نظریے کے بنیادی اصولوں کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جم کرو ضابطے کی بنیاد میں درج ذیل احکامات اصول کی صورت میں مروج تھے:

- کبھی یہ سوچنا بھی نہیں چاہیے کہ سفید فام مرد جھوٹ بول رہا ہے۔

- کسی سفید فام کے خلاف تحقیر آمیز خیالات تک ذہن میں نہیں آنے چاہئیں۔
- کسی سفید فام کے بارے میں نچلے طبقے سے متعلق ہونے کا گمان پیدا نہ ہو۔
- سفید فاموں کی ذہانت اور علمیت پر اپنے سے کمتر ہونے کا شبہ نہ کرو۔
- کسی سفید فام کی شان میں گستاخی کا خیال تک دل میں نہیں لایا جاسکتا۔
- سفید فاموں پر ہنسنا منع ہے۔
- کسی سفید فام خاتون کی شکل و شباہت پر تبصرے سے گریز کرو۔

38۔(سٹیٹسن کینیڈی: 1956)

آج جس امریکہ کو ہزاروں میل دور اسلامی ملکوں میں انسانی حقوق، آئین اور جمہوریت کا فکر لاحق ہے اسی امریکہ میں قریب دو سو سال تک جو حشر آئین اور انسانی حقوق کا ہو چکا ہے اسے ضبط تحریر میں لانے کے لیے جس قدر سیاہ، سیاہی کی ضرورت ہے وہ ابھی ایجاد ہی نہیں ہوئی۔ امریکی آئین میں ترمیمی شق 13، 14 اور 15 کے تحت سیاہ فاموں کو سفید فاموں کے برابر تحفظ اور حقوق دیئے گئے تھے لیکن 1877 میں صدر روتھرفورڈ ہیز کے صدر بنتے ہی جنوبی ریاستوں نے سیاہ فاموں کے خلاف سیاہ قوانین بنانے کا آغاز کردیا۔ جو سراسر امریکی آئین سے متصادم تھے لیکن مفادات کے حمام میں امریکی انتظامیہ، کانگریس، عدلیہ، میڈیا اور اہل دانش حسب معمول برہنہ نکلے۔ 1896 میں امریکی سپریم کورٹ نے مشہور عالم پلیسی بمقابلہ فرگوسن مقدمے میں سیاہ فاموں کے آئینی تحفظ سے صرف نظر کرتے ہوئے ایسا فیصلہ کیا جس سے جم کرو قوانین کو قانونی تحفظ اور جم کرو نظریے کو قانونی حمایت حاصل ہوگئی۔ امریکہ میں سیاہ فاموں کی زندگی اجیرن کرنے میں جو کسر رہ گئی تھی وہ امریکی سپریم کورٹ نے پوری کردی۔ آج کے خوش خیال اور فراخ دل امریکی، جن کی روشن خیالی کی تقلید میں ہم اپنی خواتین کی مخلوط دوڑیں لگوا کر سمجھ رہے ہیں کہ ہم انہیں پر چالیں گے اور ہماری خواتین سے مصافحہ کر کے وہ ہم سے راضی ہو جائیں گے واضح رہے کہ یہ لوگ تو رنگ دار ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کے روادار ہی نہیں تھے شرح سود، سیلز اور منافع کے اسیر یہ لوگ حقیقتاً اتنے روشن خیال نہیں ہیں جتنا کہ سمجھا جا رہا ہے۔ جم کرو قانون اور ضابطے کے متاثرین امریکہ میں آج بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ابھی یہ بات اتنی پرانی نہیں ہوئی کہ اسے بھلایا جا سکے یا اس میں ابہام پیدا کیا جا سکے کہ امریکی روشن خیالی حقیقتاً کس قدر تنگ نظری سے عبارت ہے۔ جسمانی برہنگی اوز شرم گاہوں کی

عریانیت کو روشن خیالی سے تعبیر کرنے والے کسی سے بھی مخلص نہیں ہیں۔ اکیسویں صدی کو جس روشن خیالی کی ضرورت ہے وہ نظریہ حفظ ماتقدم یا کسی آئینی فریم ورک کی بجائے جز دانوں میں محفوظ ہے اور بالآخر اسی طرف مراجعت کرنی ہوگی۔ اکیسویں صدی قرآن کی طرف مراجعت اور کلام الٰہی سے رہنمائی لینے کی صدی ہوگی نہ کہ مجوزہ روشن خیالی کی۔ 1965 تک 'جم کرو کوڈ' کے درج ذیل ''روشن خیال'' قوانین' امریکہ میں نافذ رہے ہیں۔ یہ قوانین قانون ساز اداروں نے عوامی نمائندوں کی کثرت رائے سے منظور کیے تھے:

- سیاہ فام مرد سفید فام مرد سے مصافحہ کے لیے ہاتھ نہیں بڑھا سکتا۔ چونکہ اس سے سماجی حیثیت کی برابری کا اظہار ہوتا ہے۔
- سیاہ فام مرد سفید فام عورت سے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ دراز نہیں کر سکتا چونکہ اس سے زنا بالجبر کی ترغیب مل سکتی ہے۔
- سیاہ فام و سفید فام اکٹھے بیٹھ کر نہیں کھا سکتے اگر ایسا ہو تو سفید فاموں کو کھانا پہلے پیش کیا جائے گا اور دونوں کے درمیان حد فاصل قائم رکھا جائے۔
- کسی بھی صورت حال میں سیاہ فام مرد سفید فام عورت کی سگریٹ جلانے کے لیے اپنا لائیٹر روشن نہیں کرے گا اس طرز عمل سے اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے۔
- سیاہ فاموں کو ہمیشہ سفید فاموں سے متعارف کرایا جائے گا کیونکہ سفید فاموں کو سیاہ فاموں سے متعارف ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔
- سفید فام' سیاہ فاموں کے لیے کسی احترامی سابقے یا لاحقے کو استعمال نہیں کریں گے بلکہ انہیں ان کے پہلے نام سے مخاطب کریں گے جبکہ سیاہ فام سفید فاموں کو سر' مسٹر' مسز اور میڈم سے مخاطب کریں گے۔
- اگر سفید فام گاڑی چلا رہا ہو تو سیاہ فام اس کے برابر نہیں بیٹھے گا بلکہ پچھلی نشستوں پر بیٹھ سکے گا۔
- سفید فام ڈرائیور کو پہلے گزرنے کا حق حاصل ہے۔

ان بنیادی ضابطوں کے علاوہ' ریاست تا ریاست ایسے قوانین منظور کیے گئے جو سراسر

نسلی تعصب اور نسلی امتیاز پر مبنی تھے۔ اور جن کو توڑنے پر سنگین سزائیں مقرر تھیں:

- سیاہ فام حجام کسی سفید فام خاتون یا نوعمر لڑکی کے بال نہیں تراش سکتے۔
(ریاست جارجیا)
- نابیناؤں کے ہسپتال میں سیاہ فام اور سفید فام نابینا اکٹھے نہیں رکھے جا سکتے دونوں کے لیے علیحدہ عمارت کا انتظام ہوگا۔ (ریاست لوئزیانا)
- سفید فاموں کو سیاہ فاموں سے علیحدہ دفنایا جائے گا دونوں کے قبرستان مختلف ہوں گے۔ (جیسا کہ اسلام آباد میں اعلیٰ گریڈ اور ادنیٰ گریڈ ملازمین کے جداگانہ مدفن ہیں)
- سیاہ فام و سفید فام مسافروں کے علیحدہ ٹکٹ گھر، علیحدہ نشستیں، علیحدہ انتظار گاہ اور علیحدہ غسل خانے ہوں گے۔ (ریاست الباما)
- کوئی سفید فام کسی سیاہ فام بچے کو لے پالک نہیں بنا سکتا، نہ ہی اس کو سفید فام بچوں کی نگرانی کے لیے رکھ سکتا ہے نہ ہی سفید فام بچوں میں انہیں شامل کر سکتا ہے۔ (ریاست جنوبی کیرولائنا)
- سفید فام اور سیاہ فام بچوں کے سکول علیحدہ ہوں گے دونوں کو ایک ہی چھت تلے تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ (بہ طرز اسلامی جمہوریہ پاکستان)
(ریاست فلوریڈا)
- لائبریریز میں سیاہ فام اسی مخصوص حصے میں بیٹھ سکیں گے جو ان کے لیے مخصوص ہوگا۔ (ریاست شمالی کیرولائنا)
- ذہنی امراض کے ہسپتالوں میں اور قیام گھروں میں سفید اور سیاہ فام اکٹھے نہیں رکھے جا سکتے۔ (ریاست جارجیا)
- ریاستی افواج میں سیاہ فام اور سفید فام علیحدہ رکھے جائیں گے دونوں ایک ہی جگہ خدمات انجام نہیں دے سکتے سیاہ فام یونٹس پر لازماً سفید فام آفیسر متعین کیے جائیں۔ (ریاست شمالی کیرولائنا)
- ہسپتالوں میں جہاں سیاہ فام مریض داخل ہوں گے وہاں سفید فام نرسز تعینات نہیں کی جا سکتیں۔

- سیاہ فام و سفید فام قیدی علیحدہ رکھے جائیں گے، ہر دونوں کے رہائشی کمروں کے درمیان حد فاصل قائم رکھی جائے گی۔ (ریاست مسی پی)
- اصلاحاتی سکولز میں سفید فام اور سیاہ فام طلباء کو لازماً علیحدہ رکھا جائے گا۔ (ریاست کنٹاکی)
- ایسے اساتذہ جو سیاہ فاموں اور سفید فاموں کو اکٹھے پڑھانے کے مرتکب پائے جائیں انہیں سخت سزا دی جائے گی۔ (ریاست اوکلوھاما)
- سیاہ فام اور سفید فام آپس میں بلیرڈ نہیں کھیل سکتے۔ (ریاست الباما)
- طعام گھروں اور ریسٹورنٹس میں سفید فام اور سیاہ فام علیحدہ بیٹھیں گے اور ساتھ نہیں کھا سکتے۔ (ریاست الباما)
- سفید فام اور سیاہ فام سکولوں کی کتابیں ایک سے دوسرے سکول میں نہیں بھیجی جا سکتیں۔ خصوصاً سیاہ فام طلباء کی کتابیں وہیں رہیں گی۔ (ریاست شمالی کیرولائنا)
- سینما گھروں، سرکس اور دوسرے تفریحی مقامات پر ہر دو کے داخلی دروازے، ٹکٹ گھر اور نشستیں علیحدہ علیحدہ ہوں گی۔ (ریاست لوئزیانا)
- ایسی رہائشی عمارتیں جن کے کسی بھی حصے میں سفید فام مقیم ہوں وہاں پر سیاہ فاموں کو رہائش دینے والوں پر سخت سزا کا اطلاق ہوگا۔ (ریاست لوئزیانا)
- سیاہ فاموں کے لیے علیحدہ لائبریریز ہوں گی وہ سفید فاموں کی لائبریریز سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ (ریاست ٹیکساس)
- کوئی بھی سیاہ فام مرد اور سفید فام عورت یا اس کے برعکس اگر کسی کمرے میں رات کے وقت اکٹھے پائے گئے تو انہیں ایک سال کی سخت سزا دی جائے گی یا پانچ سو ڈالر جرمانہ کیا جائے گا۔ (ریاست فلوریڈا)
- سیاہ فام و سفید فام مرد و زن کے درمیان رشتہ ازدواج قائم نہیں کیا جا سکتا۔ (میری لینڈ، مسی پی، ویومنگ، فلوریڈا، ایری زونا)

39۔ (نیشنل ہسٹارک سٹاف لسٹ: 1998)

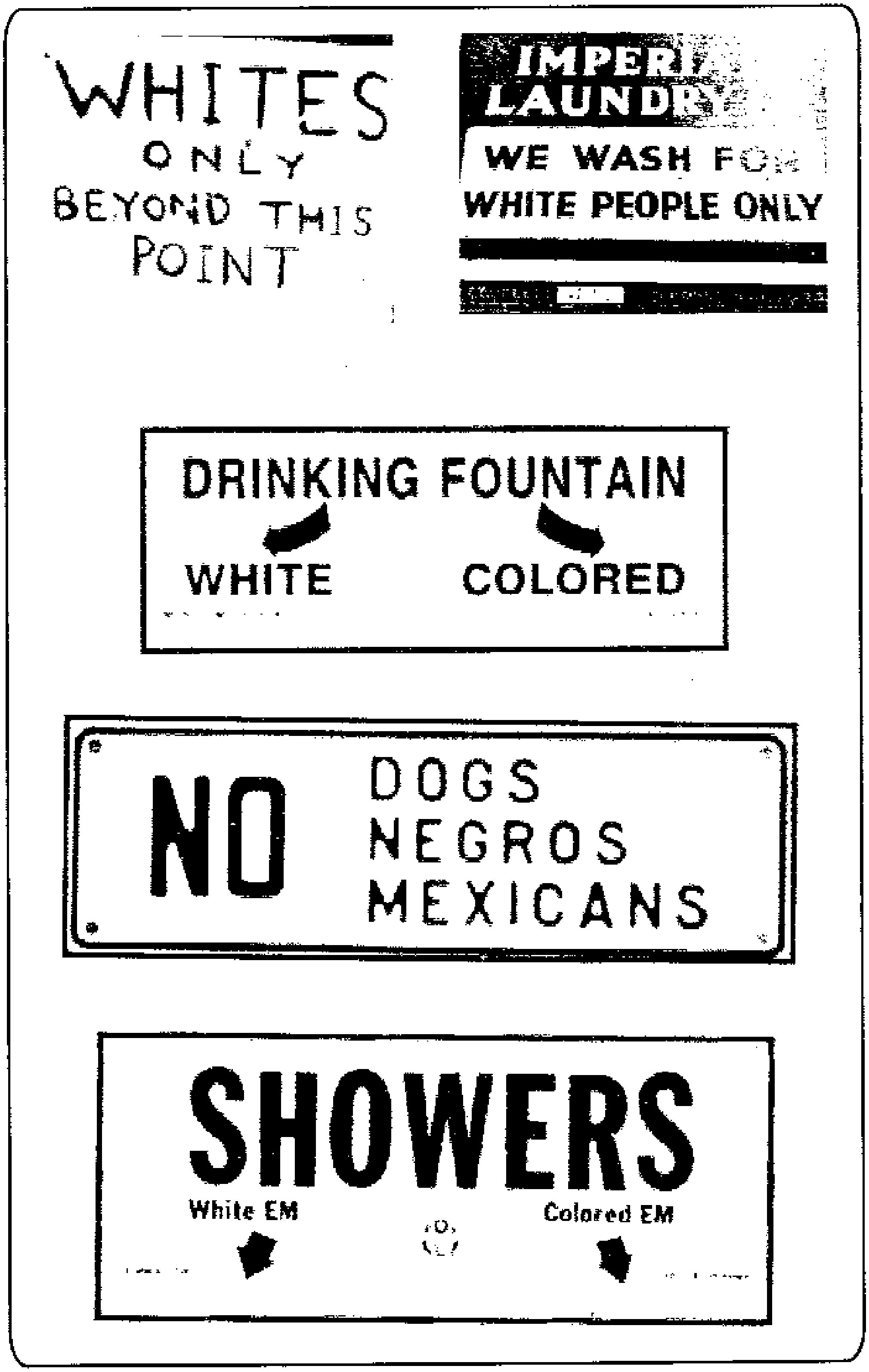
WHITES ONLY BEYOND THIS POINT
IMPERI LAUNDR
WE WASH FOR
WHITE PEOPLE ONLY
DRINKING FOUNTAIN
WHITE
COLORED
NO
DOGS
NEGROS
MEXICANS
SHOWERS
White EM
Colored EM

جم کرو قوانین کا نفاذ تشدد سے کیا گیا اور اس سے مزید تشدد نے جنم لیا' سیاہ فام جوان قوانین کو توڑنے کے مرتکب پائے جاتے مثلاً سفید فاموں کے پانی پینے کی مخصوص جگہ سے پانی پینا' یا اپنا حق رائے دہی استعمال کرنا یا کسی سفید فام سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھانا' ان پر جم کرو قوانین کی خلاف ورزی کی سزا عائد ہو جاتی سفید فاموں کو سیاہ فاموں پر جسمانی تشدد کرنے کی قانونی اجازت حاصل ہونے کی وجہ سے سفید فام اپنے طور پر ہی سیاہ فاموں کے مذکورہ 'جرائم' کے فیصلے کر کے سزائیں دے دیتے۔ یوں بھی سیاہ فاموں کی شنوائی نہیں تھی چونکہ جم کرو قوانین کے عہد میں پولیس' استغاثہ' جج' عدالتیں' صدر' جیوری اور جیل حکام سفید فاموں پر مشتمل تھے۔ سو ایک طرف تو انصاف سے محرومی نے سیاہ فاموں کو قانون شکنی پر ابھارا اور دوسری طرف سفید فام خود کو منصفی کا اہل سمجھتے ہوئے سیاہ فاموں کو براہ راست سزائیں دیتے ان سزاؤں کا ہولناک ترین پہلو ''لنچنگ'' تھا۔

1870 کی دھائی میں جم کرو قوانین کی خلاف ورزی کے مرتکب سیاہ فاموں کو سزائیں دینے کے لیے سفید فاموں کے تشدد پسند گروہ وجود میں آ گئے' اس سفید فام مافیا میں ایسے لوگ شامل ہو گئے جو سفید فام برتری اور 'خالص سفید فام نسل' کے پر زور حامی تھے۔ شہر شہر سفید فاموں پر مشتمل اس جرائم مافیا نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان لوگوں کے فوری انصاف فوری سزا کے فلسفے نے سو سال تک امریکی سیاہ فاموں کو دہشت سے دو چار کیئے رکھا۔ یہ 'انصاف مافیا' جس کو بھی چاہتی پکڑ لیتی' گلے میں پھندا ڈالتی اور پھانسی دے دیتی۔ پھانسی دینے کے بعد لٹکتی لاش کو آگ لگا دیتی' تالیاں بجاتی' سیٹیاں مارتی اور قہقہے لگاتی (پکنک) سے غائب ہو جاتی۔ پھانسی دینے کے اس عمل کو 'لنچنگ' کہا جاتا۔ لنچنگ کی اصطلاح دراصل کرنل چارلس لنچ کے نام سے اخذ کی گئی۔ امریکی خانہ جنگی (1865 - 1861) کے دوران کرنل لنچ نے کنفیڈریٹ آرمی کے مخبروں' برطانوی حکومت کے خیر خواہوں اور امریکی وفاق کے مخالفین کو اپنے طور پر سزائیں دینے کا عمل شروع کیا۔ یہیں سے لنچنگ کا لفظ اور نظریہ مقبول عام ہوا اور سیاہ فاموں کے خلاف استعمال کیا جانے لگا۔ 40۔ (رابرٹ زینگرا ئیڈو: 1979)

لنچنگ کی سزاؤں سے ہزاروں بے گناہ سیاہ فاموں کے ساتھ ساتھ ان سفید فاموں کو بھی عوامی پھانسی دی گئی جو غلامی کے خلاف یا جم کرو قوانین کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے تھے۔ ان سزاؤں نے سفید فام سرشت میں پوشیدہ حیوانی اور بے رحمانہ جبلت کو عریاں کر دیا۔

نازک اندام سفید فام دوشیزائیں، کم سن بچے، جوان امریکی مرد جنہیں روشن خیال، مہذب، تعلیم یافتہ اور جمہوری کہا جاتا تھا لٹکتی لاشوں پر تالیاں مارتے، تھوکتے، آگ لگاتے اور لطف اندوز ہوتے۔ اس میں اچنبھا نہیں ہونا چاہیے کہ اگر افغانستان میں انسانوں کو کنٹینرز میں دم پخت کرنے والوں کی سفاکی نے لنچنگ کی ہولناکی سے جنم لیا ہو۔ لنچنگ کے بارے میں درج ذیل حوالوں سے لنچنگ کی وجوہات، طریق کار، حکومت کا رد عمل اور معاشرتی پستی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> **19** جولائی **1935** کو روبن سٹیسی نامی سیاہ فام نوجوان کو جبکہ اسے پولیس کی بھاری معیت میں میامی (فلوریڈا) جیل لے جایا جا رہا تھا وائٹ مافیا نے اسے پولیس سے چھین کر میرین جونز نامی خاتون کے گھر کے پاس درخت پر پھانسی دے دی۔ میرین جونز کی شکایت پر روبن سٹیسی زیر حراست تھا، اس پر الزام تھا کہ وہ میرین جونز کی عصمت دری کرنے کے ارادے سے گھر میں داخل ہوا تھا بعد میں نیو یارک ٹائمز نے اصل حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے انکشاف کیا کہ روبن سٹیسی درحقیقت ایک بے گھر اور مفلس کسان تھا جو چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی کو کرایہ پر لے کر کاشت کاری سے بسر اوقات کرتا تھا۔ وہ میرین جونز سے کچھ خوراک مانگنے اس کے گھر گیا جبکہ میرین جونز اسے دیکھ کر گھبرا گئی اور اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا اس پر روبن سٹیسی کو گرفتار کر لیا گیا اور اگلے روز اس کی 'لنچنگ' کر کے میرین جونز کو انصاف مہیا کر دیا گیا۔ 41۔ (نیو یارک ٹائمز: 1935)
>
> روبن سٹیسی کی المناکی پر اخبار اپنے فیچر میں لکھتا ہے:

> ”علاقے کی تمام نمائندہ سماجی شخصیات وہاں موجود تھیں جن میں عورتیں اور بچے خصوصاً لنچنگ سے لطف اندوز ہونے آئے تھے۔ اونچی سوسائٹی کی خواتین ہجوم کے پیچھے پیچھے چلتی آئیں جبکہ قرب و جوار سے مزید عورتیں ہجوم میں شامل ہوتی گئیں۔ جونہی نیگرو کا بے جان لاشہ درخت سے زمین پر گرایا گیا، ہجوم نے پھانسی دی جانے والی رسی کو سوغات کے

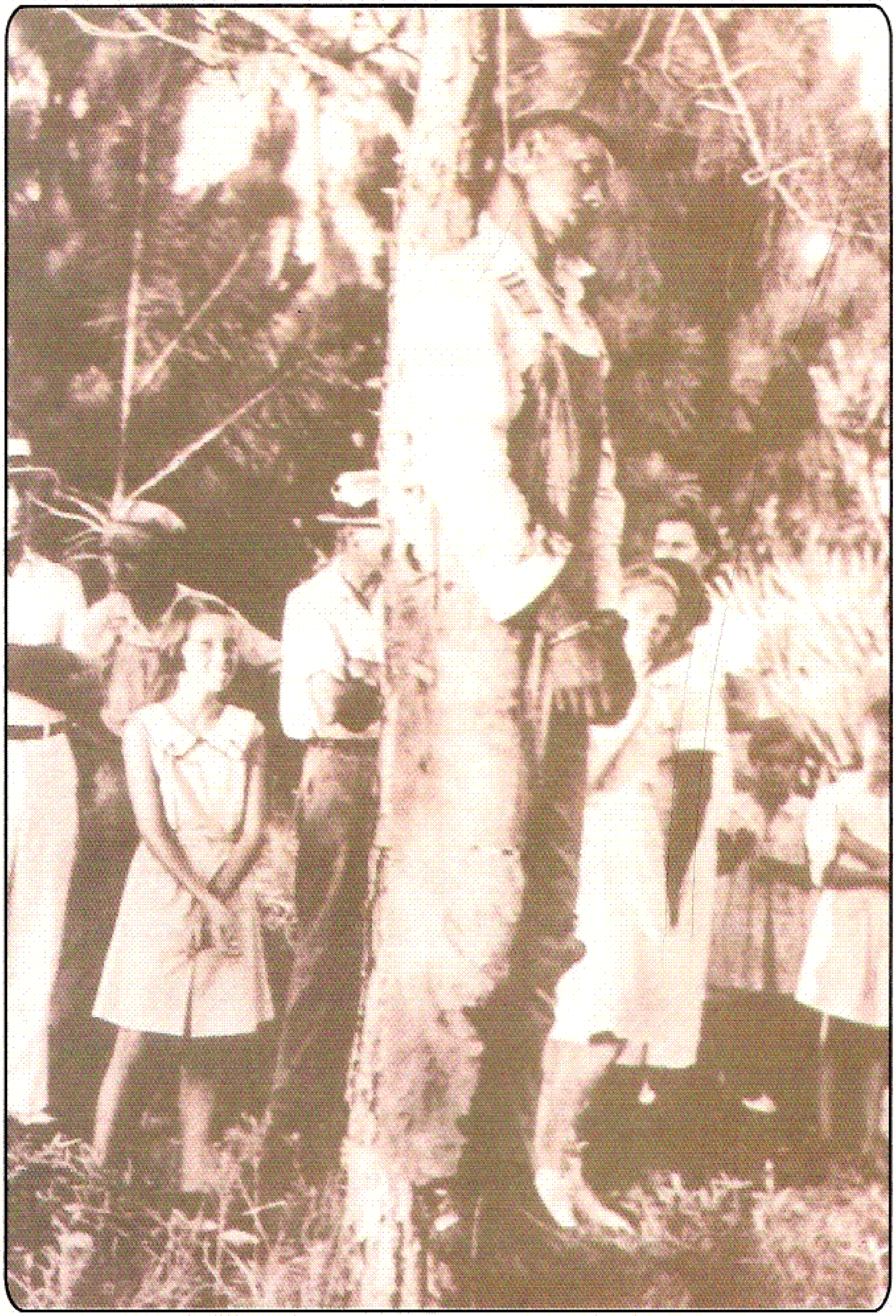

رابن سٹیسی کی لینچنگ سے لطف اندوز ہونے والے شائقین

فورٹ لاڈر ڈیل فلوریڈا: 9 جولائی 1935

> طور پر حاصل کرنے کے لیے زور آزمائی شروع کردی بالآخر قریب ایک فٹ رسی تین چار ڈالر میں بچی گئی ۔"

1932 میں جب فرینکلن روز ویلٹ امریکہ کے صدر منتخب ہوئے تو ان کے نظریات و خیالات سے بھی یہی توقع کی جارہی تھی کہ وہ امریکہ سے لنچنگ کا خاتمہ کردیں گے ۔ لیکن صدر منتخب ہوجانے کے بعد وہ اس بارے میں بالکل انجان بن گئے ۔ اخباروں میں جب روبن سٹیسی کی لٹکتی لاش کی تصاویر اور اس کی بے گناہی کی خبریں شائع ہوئیں تو ایک بار پھر امید بندھی کہ شاید صدر محترم پر بھی اس کا کچھ اثر ہوا ہو لیکن ان پر جو اثر ہوا اس نے ایک عالم کو سکتے میں مبتلا کردیا صدر فرینکلن روز ویلٹ نے روبن سٹیسی کی بے گناہ لٹکتی لاش پر لنچنگ مافیا کے خلاف کسی اقدام سے احتراز کرتے ہوئے فرمایا:

> "جنوبی ریاستوں کے ووٹر انہیں کبھی معاف نہیں کریں گے اور وہ آنے والا آئندہ صدارتی انتخاب ہار جائیں گے ۔"

جم کرو قوانین کے خلاف مشہور سیاہ فام خاتون رہنما ایدا ویلز (1862-1931) جم کرو قوانین اور لنچنگ کی ہولناکیوں کے بارے میں صدر ولیم مکنلی کو 1898 میں ایک خط میں لکھتی ہیں :

> "لنچنگ قوانین کے تحت بے یار و مددگار نشانہ بننے والوں پر ظلم کی حد تمام ہوچکی ہے ۔ پوشیدہ لادین خباثت کے مظالم بھی اس حد کو نہیں پہنچے تھے جتنا کہ ان سفید فام شیاطین نے لنچنگ قوانین کے حوالے سے کیئے ہیں ۔ یہ سفید فاموں کے ہاتھوں ہی ہوا ہے جو اپنے اپنے علاقوں میں لاء اینڈ آرڈر کے عناصر پر کنٹرول رکھتے ہیں اور جو باآسانی جنسی زیادتی کے مجرموں اور قاتلوں کو قانون کے مطابق سزا دینے پر قادر ہیں ۔ سیاہ فام جن کے پاس نہ تو سیاسی طاقت ہے نہ مالی استحکام کہ وہ آئی مصیبت کو ٹال سکیں ۔ میں جس قدر اس موضوع کا مطالعہ کرتی ہوں اسی قدر یہ آشکارا ہوتا جاتا ہے کہ جنوبی سفید فام یہ بھولنے میں ناکام ہوچکے ہیں کہ سیاہ فام ان کے 'غلام' ذریعہ آمدنی اور 'خدمت گار' رہے ہیں اور وہ سیاہ فاموں سے اسی کا انتقام لے رہے ہیں ۔"
>
> 42۔(ایدا ویلز : 1898)

درختوں پر جھولتی ہوئی سیاہ فام لاشوں سے امریکہ کا کوئی حصہ محفوظ نہیں تھا فوری انصاف اور فوری سزا دینے والے سفید فام گروہ سیاہ فام ملزموں کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ لنچنگ میں ہر طرح کے جرم کی سزا ایک ہی تھی...... پھانسی۔ ڈبل روٹی چرانے والے کو پھانسی، سفید فام کسبیوں سے جنسی اختلاط پر بھی پھانسی اور سفید فاموں کو دیکھ کر احتراماً نہ کھڑے پر بھی پھانسی۔ سیاہ فام کسی طرح بھی محفوظ نہیں تھے۔ ان کے خلاف با آواز بلند الزام لگانا ہی کافی تھا۔ نہ انہیں صفائی کا موقع دیا جاتا، نہ نام نہاد ہی سہی، انصاف کے عمل سے گزارا جاتا اس صورت حال پر اخبار چارلسٹن گزٹ نے 1918 میں اپنے ایڈیٹوریل میں لکھا:

> ”آخر وہ نیگروز کو لنچ کیوں کر رہے ہیں جبکہ سفید فام جج، سفید فام جیوری، سفید فام عوامی ردعمل اور سفید فام پولیس کی موجودگی ہی کافی ہے۔ نیگروز جن پر الزام لگایا جاتا ہے یا جن پر کسی جرم کا شبہ کیا جاتا ہے وہ تو ویسے بھی سفید فاموں کے 'انصاف' سے نہیں بچ سکتے۔“ 43۔(چارلسٹن گزٹ: 1918)

چارلسٹن گزٹ اسی ایڈیٹوریل میں سیاہ فام فوجیوں کی لنچنگ کے بارے میں رقم طراز ہے۔

> ”شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو کہ اخبارات میں نیگرو فوجیوں کی لنچنگ کی کوئی خبر نہ شائع ہوتی ہو کہ انہیں ان کی وردی میں لنچ کر دیا گیا ہے۔ کون سیاہ فام ہے جو محفوظ ہو۔“ 44۔(چارلسٹن گزٹ :1918)

7 اگست 1930 کو میرین (انڈیانا) میں دو نوجوان سیاہ فاموں تھامس شپ اور ابرام سمتھ کو لنچ کیا گیا۔ نیو یارک کی ایک نو جوان معلّمہ ابیل میرو پول کی نظر سے جب اس لنچنگ کی تصاویر گزریں تو وہ اس سے بہت متاثر ہوئیں۔ ابیل لکھتی ہیں کہ عرصہ دراز تک یہ تصاویر میرے حواس پر چھائی رہیں اور میرا پیچھا کرتی رہیں۔ اسی کیفیت کے زیر اثر انہوں نے STRANGE FRUIT کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو عالمی ادب میں کلاسیکی ادب پارے کی حیثیت سے مشہور ہو کر ساری دنیا میں پھیل گئی۔ بیشتر زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے۔ (ہم نے اس نظم کا اردو ترجمہ عجیب ثمر کے نام سے کیا ہے)۔ ابیل درختوں پر لٹکتی لاشوں کو درختوں کے ثمر سے منسوب کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

’عجیب ثمر‘

جنوب کے درختوں پر
عجیب ثمر آئے ہیں
پتے لہو لہان ہیں
جڑیں بھی لہولہان ہیں
درختوں پر بہ مثل یافت
سیاہ اجسام لٹکے ہیں
جنوب کی ہواؤں میں
جھولتے ہوئے لاشے
جنوب کے درختوں پر
عجیب ثمر آئے ہیں
یہاں کے شاداب و تعیش بھرے نظاروں میں
ابلتی ہوئی آنکھیں
عذاب جاں کنی سے بگڑے ہوئے چہرے
مگنولیا سے معطر جھونکوں کے پہلو بہ پہلو
جلتے جسموں کا تعفن بھی ساتھ آتا ہے
کہ جنوب کے درختوں پر عجیب ثمر آئے ہیں

45۔(ایبل میروپول: 1939)

1882 سے 1968 تک امریکہ کے طول و عرض میں چار ہزار سات سو بیالیس افراد کو، لنچنگ کے حوالے سے غیر قانونی اور انسانیت سوز طریقے سے پھانسی دی گئی ۔ ان میں سے 73 فیصد افراد سیاہ فام تھے ۔ جبکہ امریکی آبادی کا وہ صرف نو فیصد تھے، ان 73 فیصد کے 78 فیصد کو پھانسی سے پہلے شدید ترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا 21 فیصد کی پھانسی کے بعد لاشیں نذر آتش کی گئیں ۔ اکثر واقعات میں لاش اور پھانسی دی جانے والی رسی کے ٹکڑے تماش بینوں میں سوغات کے طور پر بانٹے گئے ۔

46۔(ایمری اینڈ ایمری: 1996)

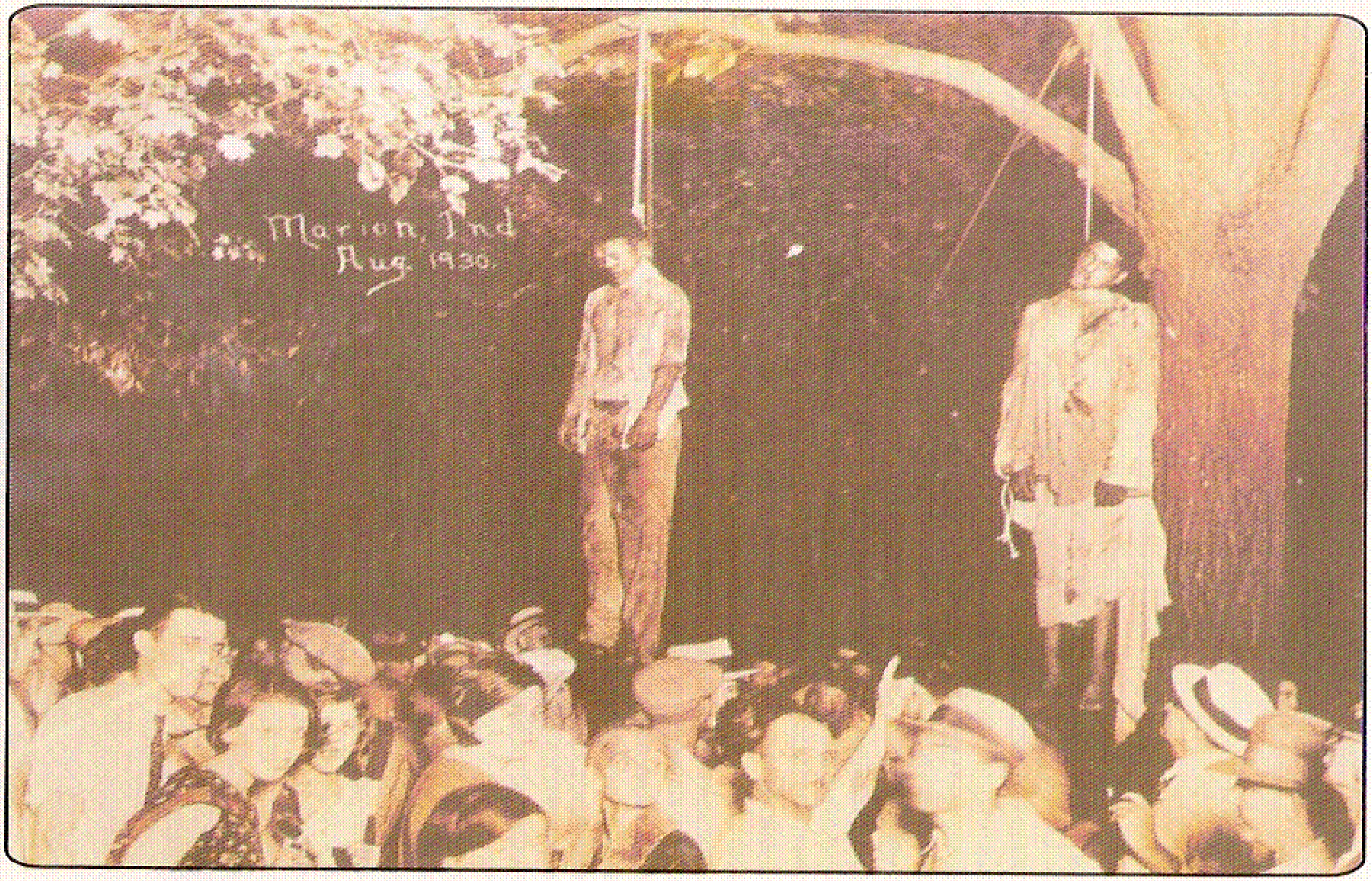
Marion, Ind
Aug. 1930.

تھامس شپ اور ابرام سمتھ کی لنچنگ ۔ میرین، انڈیانا : 7 اگست 1930
1930ء کے عشرے تک امریکہ میں انسانی حقوق اور، روشن خیالی کی منہ بولتی تصویر

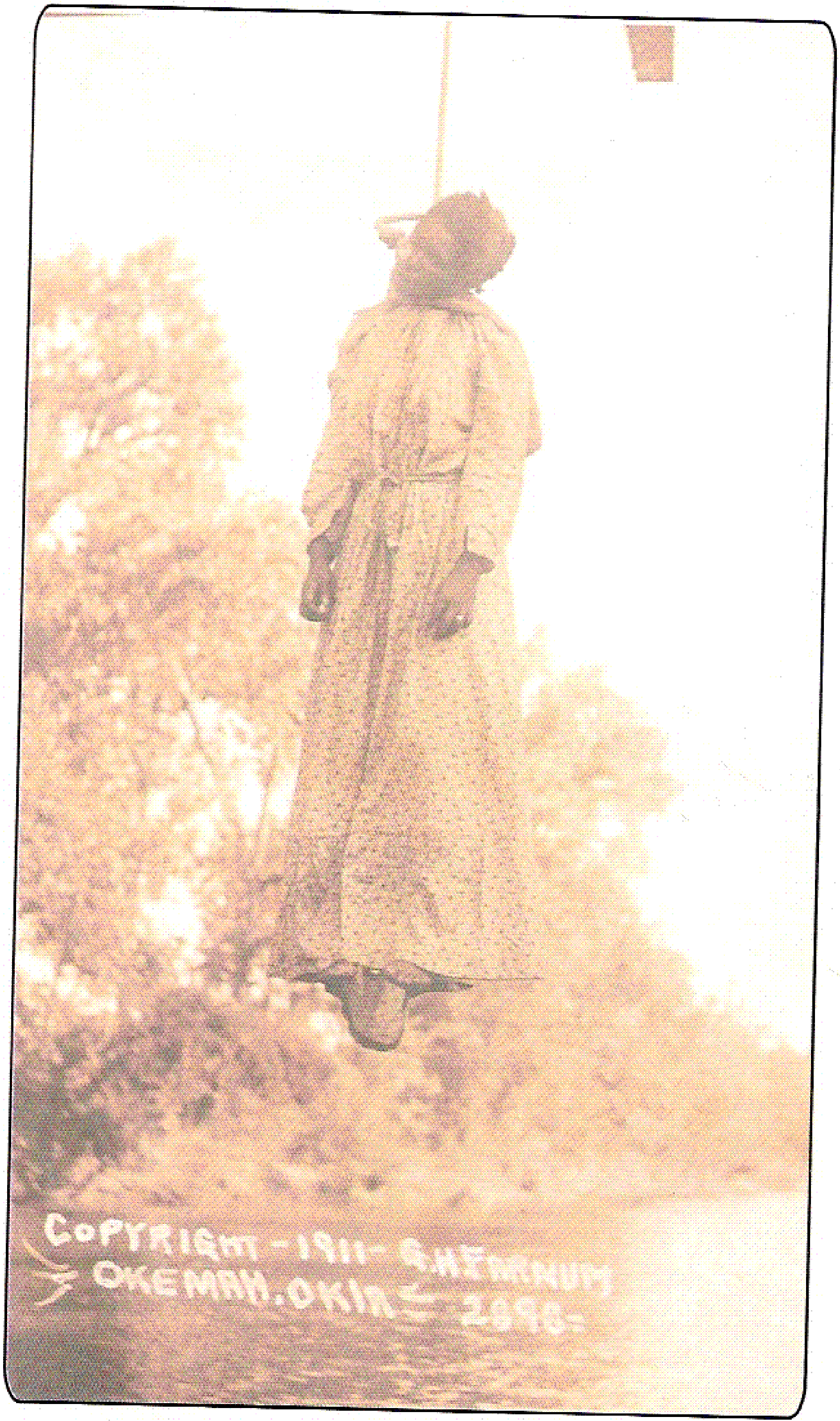
COPYRIGHT - 1911 - G.H.FARNUM
OKEMAH. OKLA. - 2898 -

امریکہ میں نسوانی حقوق بھی اسی قدر محفوظ رہے ہیں جتنا کہ غیر نسوانی حقوق
لارا نیلسن کی لنچنگ ۔ اوکیما، اوکلوہاما: 25 مئی 1911

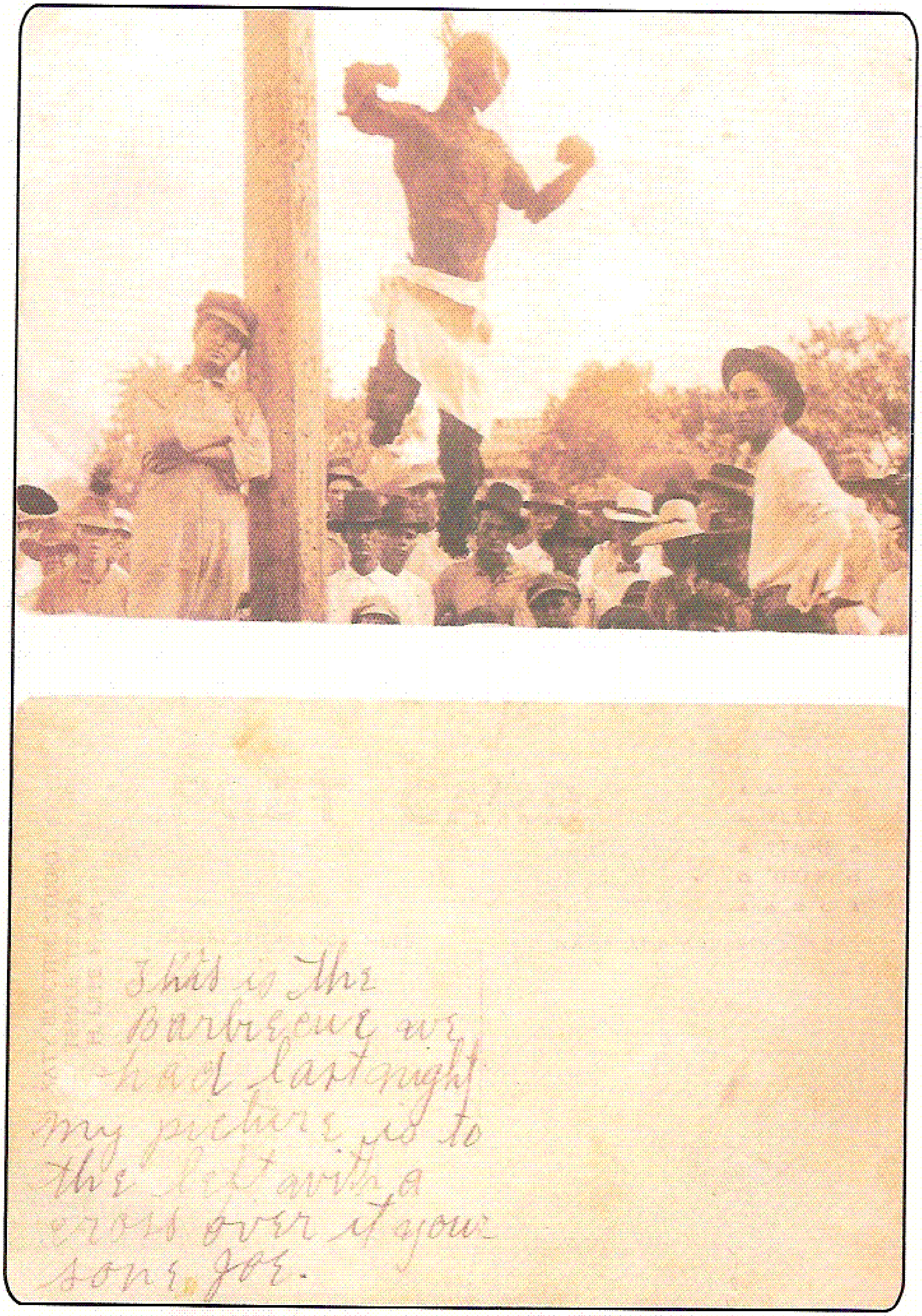

This is the
Barbecue we
had last night
my picture is to
the left with a
cross over it your
sone Joe.

'باربی کیو نائٹ' ولیم سٹینلے کی لنچنگ: ٹمپل، ٹیکساس
آج کی باربی کیو پارٹی' باربی کیو نائٹ سے مستعار ہے

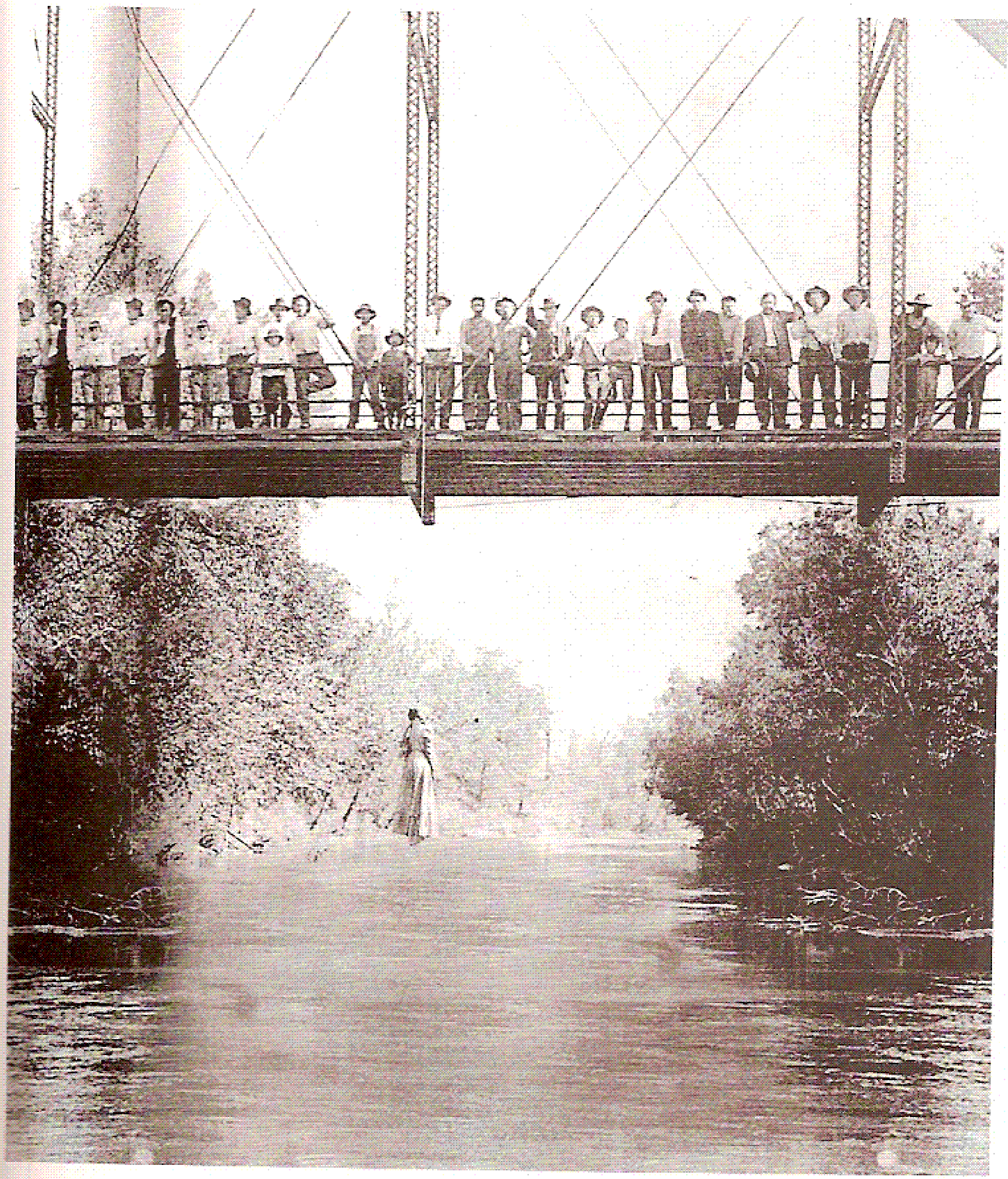

لارا نیلسن کی پھانسی سے لطف اندوز ہونے والے امریکی شائقین

اوکلوھاما: 25 مئی 1911ء

لنچنگ کی سزا پانے والوں کے لیے مجرم ہونا ضروری نہیں تھا بلکہ سیاہ بختوں کے لیے سیاہ فامی کے ساتھ ساتھ حالات کی زد پر آجانا کافی تھا۔ ڈبلیو براڈ نج نے جنوبی ریاستوں میں لنچنگ کے بارے میں اپنی تحقیقی کتاب میں ریاست جارجیا اور ورجینیا میں معمولی جرائم پر لنچنگ کا نشانہ بننے والوں کے اعداد وشمار مہیا کیے ہیں:

جارجیا

سال/عشرہ	جرم کی نوعیت	سیاہ فام/سفید فام	تعداد لنچنگ
1880-1889	معمولی	سیاہ فام	10
1889-1899	معمولی	سیاہ فام	21
1899-1909	معمولی	سیاہ فام	28
1909-1919	معمولی	سیاہ فام	37
1919-1929	معمولی	سیاہ فام	13
1930	معمولی	سیاہ فام	3

ورجینیا

1880-1889	معمولی	سیاہ فام	3
1889-1899	معمولی	سیاہ فام	2
1899-1909	معمولی	سیاہ فام	3
1909-1919	معمولی	سیاہ فام	-
1919-1929	معمولی	سیاہ فام	-
1930	معمولی	سیاہ فام	-

46۔ (ڈبلیو براڈ نج: 1993)

معمولی جرائم پر لنچنگ کا نشانہ بننے والے 285 افراد پر اپنی تحقیق کے نتیجے میں ایدا ویلز لکھتی ہیں:

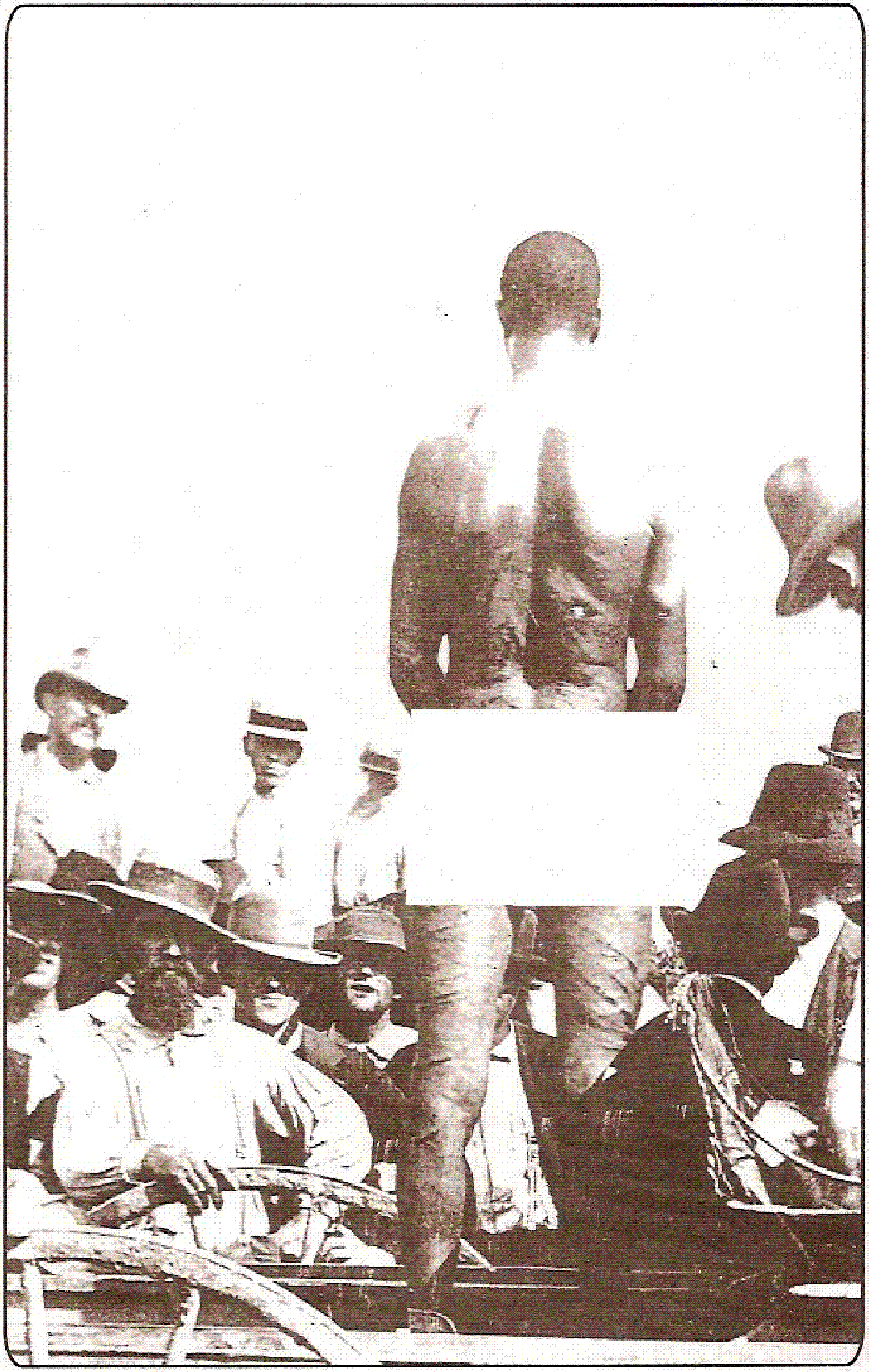

سفید فام خاتون سے مصافحہ کرنے کی سزا

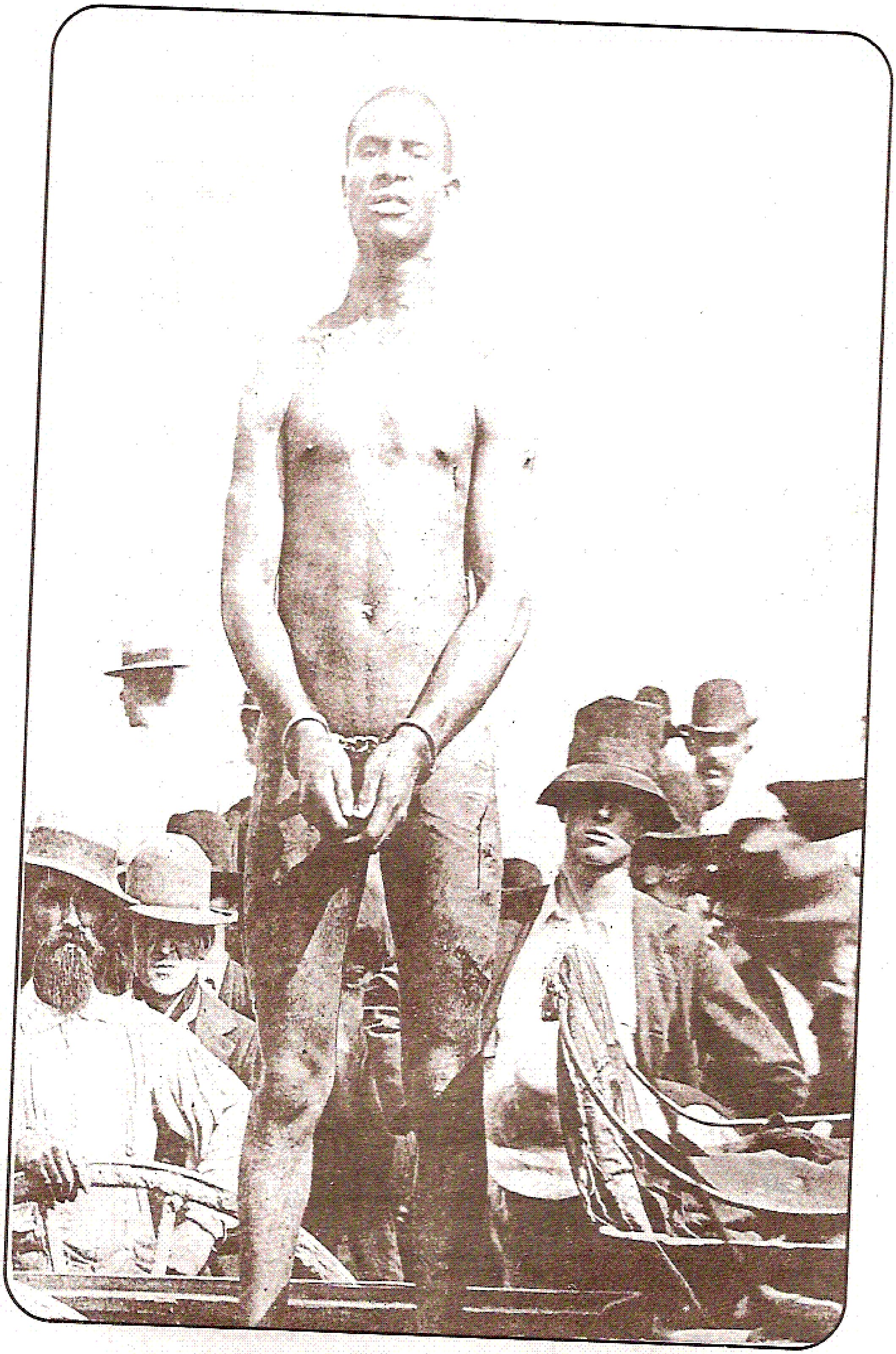

زخم زخم، فرینک ایمبری

فییٹ، مسوری: 22 جولائی 1899

میں نے سزائے موت پانے والے 285 سیاہ فام افراد کے جرائم پر تحقیق کی انہیں جن جرائم پر لنچ کیا گیا وہ درج ذیل ہیں :

جرم	تعداد لنچنگ
نامعلوم	92
بنا کسی جرم کے	10
نسلی تعصب کا شکار	49
متفرق	7
مخبری	12
دھمکی/ڈرانا/دھمکانا	11
اثاثوں کی دستبرداری سے انکار	3
فراڈ	5
عامل/عملیات	2
بری شہرت	11
غلط شناخت	5
تلخ زبانی	3
معاہدے کی خلاف ورزی	1
دھمکی آمیز خطوط لکھنا	2
بغیر اجازت کے شادی کرنا	2
مالکان کے گھوڑے کو زہر دینا	1
کنوئیں میں زہر ملانا	2
چودہراہٹ جمانا	14
گواہی دینے سے انکاری	2
سیاسی وجوہات	5

تنازعہ پر بدزبانی	1
نافرماں برداری	2
سفید فام بچے کو تھپڑ مارنا	1
ثبوت میں ردو بدل کرنا	3
سیاہ فام کا سیاہ فام کو پناہ دینا	1
فراہمی ثبوت سے انکار کرنا	1
آگ لگانا	1
سفید فام خاتون کو محبت نامہ لکھنا	1
سفید فام خاتون سے شادی کی درخواست کرنا	1
سفید فام لڑکی کو اپنی طرف راغب کرنا	1
چیچک کے مرض میں مبتلا ہونا	1
سیاہ فام ملزموں کی پشت پناہی کرنا	2
سیاسی اہلیت کا اظہار کرنا	1
دفاع برائے حفظ ماتقدم	6
سفید فام سے احمقانہ سلوک کرنا	1
خواتین سے غیر معیاری گفتگو کا مرتکب ہونا	5
سفید فاموں سے لڑائی جھگڑا کرنا	3
سیاہ فاموں کی علیحدہ آباد کاری پر زور دینا	1
سفید فام پر پتھر پھینکنا	1
سفید فام سے جوا کھیلنا	1

48۔ (ایدا ویلز : 1909)

ایدا ویلز نے جب بھیانک ترین سزائے موت پانے والے سیاہ فاموں کے جرائم آشکارا کیئے تو امریکہ سے یورپ تک سنسنی پھیل گئی ۔ وہ جن کی اکثریت کو سفید فام خواتین کی

آبروریزی کا مجرم قرار دے کر لنچ کیا جاتا تھا تحقیق سے سامنے آیا کہ ان کا جرم آبروریزی نہیں بلکہ سیاہ فامی تھا ۔ کورچشمی سے دیکھے جانے کے باوجود جن جرائم پر سیاہ فاموں کو انسانی تاریخ کی بدترین سزائیں دی گئیں ان جرائم پر کم ازکم امریکہ میں سزائے موت مروج نہیں تھی ۔ جس ظالمانہ سرشت' بے رحمانہ فطرت اور ہوس بھرے رویے کو لنچنگ کی لازمی ضرورت تھی' وہی سزا سے محفوظ رہ گیا' کیا عجب کہ اقوام عالم پر عموماً اور مسلم امہ پر خصوصاً ثمر عجیب کی موجودہ فصل اسی کا ثمرہ ہو ۔ ایڈا ویلز کی تحقیق کی تصدیق کرتے ہوئے آرتھر ریپر امریکی دہشت گردی کی پوری صدی کے امریکی رویے پر تحقیق کے نتیجے میں لکھتے ہیں:

> ''جن سیاہ فاموں کو لنچ کیا گیا ہے' ان میں سے ایک تہائی پر لگائے گئے الزامات بے بنیاد اور جھوٹے تھے ۔'' 49۔ (آرتھر ریپر 1933)

مشہور امریکی ماہر عمرانیات جیمز کٹلر 1905 میں امریکہ کے قومی جرم کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''ہمارے ملک (امریکہ) کا قومی جرم لنچنگ ہے ۔'' 50۔ (جیمز کٹلر: 1905)

قومی پھول' قومی پرندے' قومی رقص اور قومی کھیل کی طرح لنچنگ کو قومی جرم قرار دینا جرأت مندی کا' کام تھا ایک ایسے جرم کا انتخاب جو قومی سطح پر مقبول اور جسے دہشت گرد مافیا' ریاستی حکومتوں' عدلیہ' پولیس اور مقامی انتظامیہ کی حمایت حاصل تھی جبکہ وفاقی حکومت اس کھیل میں بارہویں کھلاڑی کی حیثیت سے پورے طور پر شریک تھی ۔ اس شراکت کے ایک سو ایک ثبوت موجود ہیں لیکن سب سے بڑا ثبوت ایک سوال کی صورت میں ہے جس کا جواب 1946 سے امریکی حکومت پر واجب الجواب ہے۔ یہ سوال لینن انعام یافتہ سیاہ فام ادیب' اداکار اور سول رائٹس لیڈر پال رابسن نے صدر ہیری ٹرومین سے با آواز بلند' مجمع عام میں ڈنکے کی چوٹ پر پوچھا تھا جس کا جواب ہنوز شرمندہ جواب ہے ۔ 12 ستمبر 1946 کو میڈیسن سکوئر گارڈن نیو یارک میں ایک احتجاجی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے پال رابسن نے سوال اٹھایا:

> ''پریذیڈینٹ ٹرومین' لنچنگ کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ اس خباثت کے بارے میں کچھ کہنے سے کیوں قاصر ہیں؟ وفاقی حکومت آخر کب ایسے اقدامات کرے گی جن سے ہمارے آئینی حقوق کی ضمانت

> کا تحفظ ہو سکے؟ اگر اس ملک کے لیڈر گودی ملاز مین اور ریلوے ورکرز کے خلاف آرمی اور نیوی کو طلب کر سکتے ہیں، تو وہ لنچرز (پھانسی دینے والوں) کے خلاف آرمی اور نیوی کو کیوں طلب نہیں کر سکتے۔''

51۔(پال رابسن : 1946)

پال رابسن جس جواب کی توقع لگائے تھے، اس کی ضرورت ہی نہیں تھی چونکہ صدر ہیری ٹرومین کے پیشرو صدر فرینکلن روز ویلٹ اس کا جواب پہلے ہی دے چکے تھے کہ لنچنگ کے خلاف وفاقی اقدامات سفید فاموں کو ناراض کردیں گے اور وہ انتخاب ہار جائیں گے۔

یوں تو امریکہ میں لنچنگ کا آخری سانحہ 1946 میں ورجینیا میں ہوا جس میں چار سیاہ فاموں کو بے دردی سے ہلاک کیا گیا۔ 52۔(لارا ویکسلر : 2003) لیکن 1946 کے بعد امریکہ سے لنچنگ ختم ہو جانے پر امریکیوں نے دوسرے ملکوں میں اپنے قومی کھیل کی مشق جاری رکھی چونکہ امریکی حدود سے باہر لنچنگ امریکی قانون کے تحت کوئی جرم نہیں ہے سو اکثر و بیشتر کوئی نہ کوئی نسل انسانی امریکی قومی کھیل کی بھینٹ چڑھتی رہتی ہے، فلپائن، جاپان، ویت نام، کوریا، کمبوڈیا، افغانستان اور عراق کو جس طرح Lynchized کیا گیا ہے تاریخ کے صفحوں اور انسانی ضمیر کے نہاں خانے میں یہ انشاء اللہ ضرور محفوظ رہے گا۔

⌑ ⌑ ⌑

وہ کون تھے وہ کہاں گئے

> ''مجھے ہر وقت یہ خیال تنگ کرتا رہتا ہے کہ مجھے جس طرح عیسائیت کا
> بپتسما دیا گیا یہ سراسر غلط تھا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے پہلے سے ہی اس
> معاملے کی نوعیت سے اچھی طرح آگاہ کیا جانا چاہیے تھا۔''
>
> 1۔ (محمد علی سعید: 1867)

جس طرح صدر جان ٹائیلر کا یہ کہنا یکسر دروغ پر مبنی تھا کہ افریقہ سے لائے گئے غلام وہاں جاہل اور وحشی تھے جبکہ امریکہ میں وہ تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں اسی طرح ان کا یہ نظریہ بھی بے بنیاد مباہ پر استوار تھا کہ ''حتیٰ کہ وہ عیسائی تک ہیں۔'' جس زمین پر عیسائیت کے ہاتھوں سوملین ریڈ انڈینز قتل ہوئے تھے وہاں عیسائی ہونے پر شرمندہ تو ہوا جاسکتا تھا لیکن اس پر فخر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ عیسائی ہونے پر صدر جان ٹائیلر کے فخر و مباہ کی جو بھی وجوہات ہوں وہ تو ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتیں لیکن سیاہ فام غلام جنہیں امریکہ میں عیسائیت کا بپتسما دیا گیا اور اس بپتسما کو ان کی آزادی سے مشروط کیا گیا اس کی شہادت موجود ہے۔ جس فریب دہی سے سیاہ فام غلاموں پر عیسائیت مسلط کی گئی اس سے امریکی تاریخ کے صفحات شرمسار اور امریکی ضمیر کی آنکھ ملامت زدہ ضرور ہوگئی۔

سیاہ فام غلام جنہیں امریکہ میں عیسائیت کا بپتسما دیا گیا اس کی زد مسلمانوں پر بھی پڑی۔ امریکی تاریخ کے اس پہلو پر بہت کم تحقیق کی جاسکی ہے کہ افریقہ سے لائے جانے والے غلاموں میں مسلمانوں کی تعداد اور تناسب کیا تھا۔ وہ کون تھے' وہ کہاں گئے ان پر امریکہ میں کیا گزری اور ان کا کیا بنا؟ منطقی طور پر یہ سوال مسلمانوں کو اٹھانا چاہیے تھا اور یہ تحقیقی مہم بھی انہیں

ہی سر کرنی چاہیے تھی لیکن مسلمانوں کے ”تحقیقی میدان“ مختلف ہونے کی وجہ سے ہم اس موضوع پر بھی غیر مسلموں کے محتاج رہ گئے کہ اگر یہ کام بھی وہی کریں تو کریں۔ جہاں ہمارے رسول کی حیات طیبہ پر بہترین تحقیقی کتب غیر مسلم محققین نے لکھیں وہاں امریکہ میں سیاہ فام مسلمان غلاموں پر عدم تحقیق سے کون شرمسار ہو؟ جب مسلمانوں کو ہی یہ پرواہ نہیں رہی کہ ان کلمہ گو اور اذان دینے والوں پر کیا گزری جنہیں پابہ سلاسل امریکی ساحلوں پر اترتے، نیلام ہوتے تو دیکھا گیا تھا لیکن اس کے بعد ...... انسانی حقوق کے اندھیرے میں وہ نظر نہ آئے، انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ انسانی حقوق کی راجدھانی، جمہوریت کی جنت اور اس سر زمین آزادی میں ان پر کیا گزری، وہ آخر گئے کہاں؟ جب ہم نے ہی یہ کھوجنے سے پہلو تہی کی تو اغیار کو بھلا اس سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ سو امریکی تاریخ کا یہ صفحہ جسے مسلمانوں کے خون سے تربتر صفحہ اوّل کی حیثیت حاصل ہے دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رہ گیا۔ یوں امہ کے موجودہ امریکی قتل عام پر کسی کو اچنبھا نہیں ہونا چاہیے کہ یہ کام تو مختلف ناموں اور صورتوں میں کئی صدیوں سے جاری ہے۔

بپتسما اوّل (عیسائیت) 1502 سے بپتسما ثانی (جمہوریت) 2006 تک، پانچ صدیوں سے ہمارا قتل ایک ہی نظریے ایک ہی ہاتھ اور ایک ہی وجہ سے ہو رہا ہے۔ امریکی تاریخ کے اس ایک اور غیر انسانی موضوع پر نہ تحقیق کی آری چلی نہ تجزیے کا رندا پھرا۔ وقت کی دھول مٹی، جبر، دباؤ اور امہ کی بے حسی سے ان قبروں کے نشان تک مٹ گئے جن کے کتبوں پر کبھی سعد، سعید، حسین، عمر، ابراہیم، عثمان، بلال، بلالی، عیسیٰ، فاطمہ، نوائیلہ، صالح اور صالحہ لکھا تھا۔

پسِ مرگ میرے مزار پر کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اسے آندھیوں نے مٹا دیا

یوں تو یہ شعر، شاعر خوش ہنر نے اپنی سیاہ بختی کی سند میں 1850 کے عشرے میں ہندوستان میں ہی لکھا تھا لیکن اس کا اطلاق بارہ ہزار میل دور امریکہ کے قبرستانوں میں مدفون افریقی مسلمانوں پر ہوا۔ اس شعر کی عملی تفسیر ورجینیا، کیرولائنا اور جارجیا کے ان میلوں میل قبرستانوں میں نظر آتی ہے جہاں مدفون مسلمانوں کی قبریں معدوم، ناپید، گم کردہ اور نامعلوم ہوچکی ہیں۔ انسانی تاریخ جب بھی اپنے سیاہ بختوں اور مظلوموں کی فہرست مرتب کرے گی تو عجب نہیں کہ امریکی زمین میں دفن یہ افریقی مسلمان اس میں سرفہرست ہوں کہ جو ان پر

گزری چشمِ فلک نے کم ہی دیکھی ہوگی کہ انہیں انجانے میں بلا کسی وجہ اور قصور کے رسہ تڑائے ہوئے جانوروں کی طرح گردن میں کمند پھینک کر پھندا لگایا گیا تھا۔ گھسیٹتے ہوئے سمندروں کی طرف لے جایا گیا تھا' برہنہ کرکے جہاز کے تہ خانوں میں محبوس کیا گیا تھا۔ انہیں بھوکا اور پیاسا رکھا گیا تھا' ان کی عزت نفس کچل دی گئی تھی۔ کمزور' بیمار اور مزاحمت کے مشتبہ افراد کو بلا توقف سمندر میں پھینکا گیا تھا۔ جوان عورتوں کی اجتماعی عصمت دری کی گئی اور جوان مرد اس کریہہ المنظری کو دیکھنے پر مجبور کیئے گئے تھے۔ امریکی زمین پر پہنچتے ہی وہ کوڑیوں کے مول نیلام ہوئے تھے۔ وہ جنہیں چشمِ فلک نے بھی کبھی ننگے سر نہیں دیکھا تھا وہ نیلامی کے تھڑوں پر برہنہ کھڑی تھیں۔ ان کے دام سینوں کے ابھار' تناؤ' ڈھلک' پکڑ' کھنچ' لچک اور کھنچاؤ کے مطابق طے ہوتے۔ خریدنے والے بھیڑ' بکریوں کی طرح ان کے دانت گنتے تھے' ہاتھ' پاؤں' گردن' آنکھ' ناک اور شرم گاہوں کا معائنہ کرنے کے بعد ان کے دام لگاتے تھے۔ سفید فام امریکی آقاؤں نے ظلم وستم اور جبر وتشدد کا ہر وہ غیر انسانی حربہ آزمایا تھا جسے انسانی شعور حیرت کدے میں ہی دیکھ سکتا ہے۔ اس بربریت میں خواتین کی آبروریزی سے ترک اسلام تک ہر وہ جبر شامل تھا جو ہسپانیہ سے آزمودہ نسخہ کی صورت یہاں پہنچا تھا۔ سجود و قیام میں جھکنے والے سر قلم کیئے گئے تھے اور تلاوت کرنے والے خوش الحان حلقوم پر پھندا تنگ کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو عیسائی نام دیئے گئے تھے۔ ان کے ناموں میں پرتگیزی کا' اوکسوری' یعنی 'او کتے' لاحقہ کے طور پر جوڑ دیا گیا تھا۔ انہیں ان کی مسلم شناخت سے محروم اور اسلامی تشخص سے بیگانہ کیا گیا تھا۔ تادمِ مرگ ان سے بلا معاوضہ مشقت لی گئی تھی' زمین میں گاڑ کر ان پر کتے چھوڑے گئے تھے۔ پھانسی دیئے جانے کے بعد ان کی لاشیں ہفتوں درختوں پر لٹکتی رہی تھیں۔ معصوم بچوں کو ماں باپ سے اور اہل خانہ کو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا گیا تھا۔

افریقہ سے امریکہ لائے گئے یہ سیاہ فام مسلمان ایسے سیاہ بخت نکلے کہ نہ انہیں نماز جنازہ میسر آ سکی نہ غسل میت' نہ قبر قبلہ رخ ہے نہ رخ قبلے کی طرف نصیب کے بھی ان سیاہ فاموں کو نہ اعزا دار میسر آئے نہ نوحہ گر' نہ کوئی نام لیوا' نہ والی وارث' نہ نام نہ نشان۔ بنگلہ دیش کے بہاری کیمپوں میں پناہ گزین پاکستانیوں کی طرح یہ بھی کسی کو مطلوب نہیں تھے۔ انہیں بھی کسی نے اپنا نہیں مانا تھا۔ نہ یہ کسی زمین کی ملکیت تھے نہ کہیں کے زمین زاد۔ ان

کے ہول، سناٹے اور ہُو بھرے جائے مدفون سے ایک ہی آواز آتی ہے اور ایک ہی سچ نقش بر وحشت ہے:

وَ لا غَالِب الا اللّٰہ

وَ لا غَالِب الا اللّٰہ

لَآ اِلٰهَ اِلَا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ مَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ط لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

اس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ اس کی ذات (پاک) کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے اور تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے ○ (سورۃ القصص)

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ط ○

آسمانوں اور زمین اور جو مخلوق ان میں ہے، سب کا مالک ہے غالب اور بخشنے والا ۔ (سورہ ص)

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ○

بے شک خدا ہر چیز کا حساب لینے والا ہے ۔ (سورۃ النساء)

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ ○

اور خدا زبردست اور بدلہ لینے والا ہے ۔ (سورۃ آل عمران)

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○

کہہ دو کہ خدا ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ یکتا اور زبردست ہے ۔ (سورہ الرعد)

اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○

بے شک خدا زبردست اور سخت عذاب دینے والا ہے ۔ (سورہ الانفال)

اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ج وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ○ ذُوالْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ○ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ○

وہی پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ زندہ کرے گا اور وہ بخشنے والا اور محبت والا ہے۔ وہ عرش کا مالک بڑی شان والا ہے۔ جو چاہتا ہے کر دیتا ہے ۔ (سورہ البروج)

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ○

کچھ شک نہیں کہ ان ظالموں کے لیے بھی عذاب کی نوبت مقرر ہے جس طرح ان

کے ساتھیوں کی نوبت تھی تو، ان کو مجھ سے طلبی عذاب میں جلدی نہیں کرنا چاہیے۔

(سورۃ الذاریات)

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ٥

پھر جب آسمان پھٹ کر تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا تو وہ کیسا ہولناک دن ہوگا۔ (سورۃ الرحمٰن)

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ٥

جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ (سورۃ البروج)

سو اس نے ان کی قبروں پر ہول، ہو اور ہیبت طاری کر دی۔ مسلمان جنہیں افریقہ سے اغوا کر کے امریکہ لایا گیا ان کی حتمی تعداد کا تعین نہیں ہے۔ اس بارے میں ابتدائی تحقیق اور تاریخی حقائق کے مطابق اسلام، عیسائیت سے بہت پہلے افریقہ پہنچ چکا تھا خصوصاً بارہویں صدی میں موجودہ سینیگال، مالی (ٹمبکٹو) اور جھیل چڈ کے درمیان وسیع علاقے میں اسلام کی موجودگی مسلمہ ہے جبکہ سولہویں اور سترہویں صدی میں اسی علاقے کے مغرب میں بحر اوقیانوس کے ساحل سے امریکہ کے لیے غلاموں کی تجارت عروج پر پہنچی۔ (یہ وہی خطہ اور عہد تھا جس میں ایلکس ہیلی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب اور فلم روٹس میں اپنے افریقی اجداد کو مسلمان ظاہر کیا ہے) امریکہ میں سیاہ فام مسلمان غلاموں کی تعداد کا تعین کرنے کے لیے یہ دیکھا جانا ضروری ہے کہ امریکہ لائے جانے والے افریقی، افریقہ کے کن علاقوں سے اغوا کیئے گئے، وہ کون تھے اور ان کا مذہبی پس منظر کیا تھا۔ اس موضوع پر جیمز رالی اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں کہ:

> “12 ملین افریقی غلام جنہیں براعظم امریکہ میں لایا گیا ان کی اکثریت مغربی افریقہ اور وسطی مغربی افریقہ سے اغوا کی گئی تھی۔ ان میں سب سے بڑی اکثریت قریب 40 فیصد وسطی مغربی افریقہ (کانگو۔ انگولا) ریجن سے متعلق تھی جبکہ 33 فیصد مغربی افریقہ سے اغوا کیے گئے تھے۔ سیاہ فام امریکیوں کی اکثریت کے اجداد کا تعلق شمال میں دریائے سینیگال اور جنوب میں انگولا کے درمیانی علاقوں سے تھا۔ مغربی افریقہ کے ساحلی علاقے جہاں سے افریقیوں کو اغوا کیا جاتا تھا ان میں سینیگال سے انگولا تک 500 سو میل سے زیادہ پر محیط اندرونی علاقوں کے مختلف

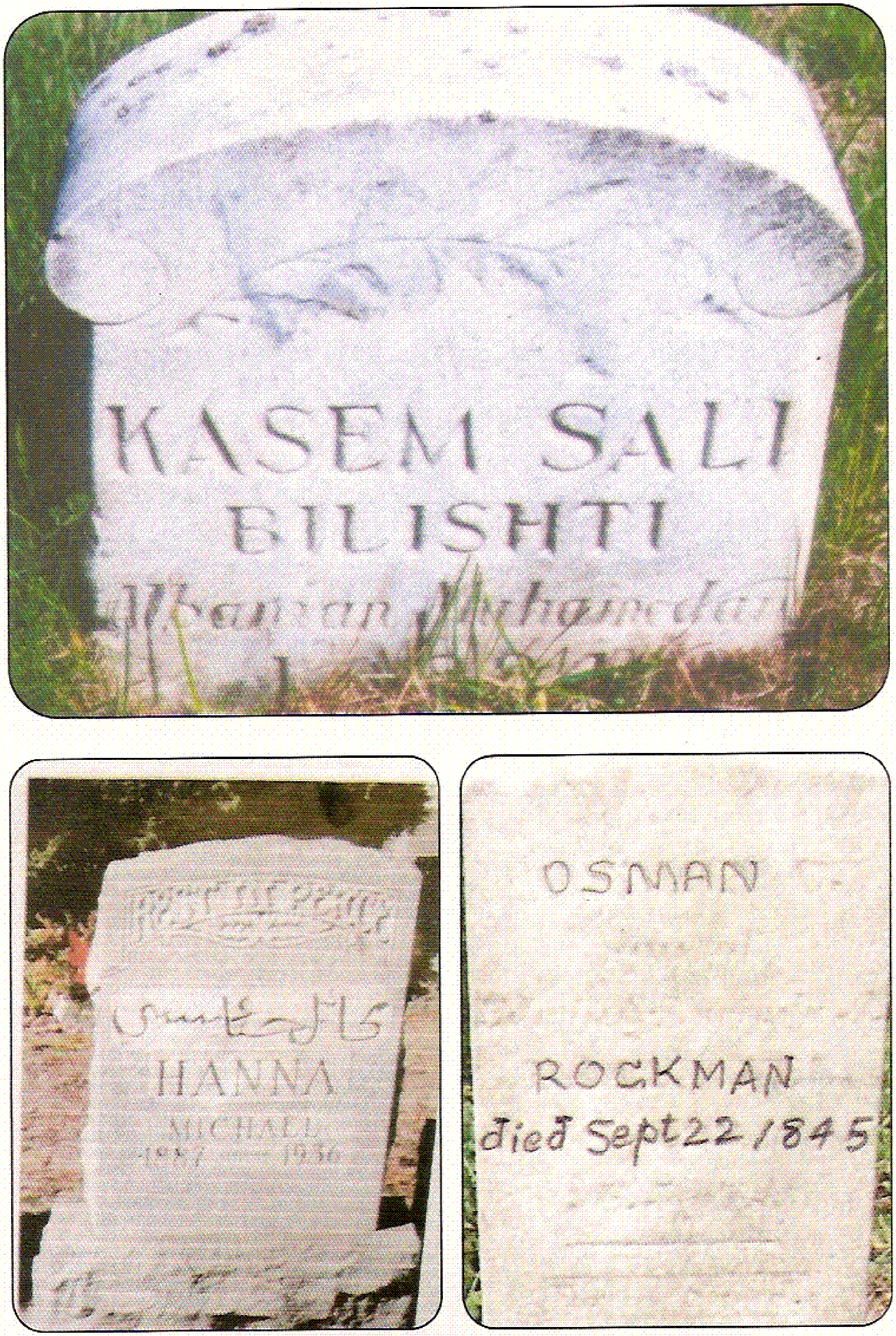
KASEM SALI
BILISHTI
Albanian Mohamedan
HANNA
MICHAEL
OSMAN
ROCKMAN
died Sept 22/1845

'پس مرگ میرے مزار پر کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے' نہ قبر قبلہ رخ، نہ رخ قبلے کی طرف
امریکی زمین میں ہو، ہول اور ہیبت کی زد میں مسلمانوں کی قبریں

ثقافتی پس منظر رکھنے والے افریقی قبائل شامل تھے ۔ ان قبائل کی جغرافیائی تقسیم اور تعداد کے مطابق 25 فیصد افریقی جو کانگو ۔ انگولا ریجن سے اغوا کیئے گئے تھے ان میں بھاری مسلم اکثریت کے قبائل شامل تھے ان قبائل میں بلنگو، ٹیو اور مبنڈو بڑے قبیلے تھے جن کی تقسیم درج ذیل ہے:

28 فیصد یوروبا (نائیجیریا، گبون، ٹوگا) سے اغوا کیئے گئے جن میں فیون، نیوپ اور آئیسو قبائل کے افریقی شامل تھے ۔

22 فیصد الکنز (گھانا) سے اغوا کیئے گئے ۔

18 فیصد سینی ۔ گمبی (سینیگال ۔ گیمبیا) سے اغوا کیئے گئے ۔ ان میں ولوف، فلبے اور سیرر قبائل شامل تھے (ان قبائل میں بھی مسلمانوں کی معقول تعداد موجود تھی ۔ مصنف)

6 فیصد سیرالیون سے اغوا کیئے گئے ۔

14 فیصد دریائے بنین کے اطراف سے پکڑے گئے ۔

4 فیصد مڈغاسکر سے اغوا کیئے گئے ۔

8 فیصد افریقہ کے مختلف اور نا معلوم علاقوں سے متعلق تھے ۔ 2 ۔ (جیمز رالی: 1981)

یہ مختلف افریقی قبائل اپنی زبان اور ثقافت ساتھ لائے تھے لیکن وسطی افریقہ سے لائے گئے افریقی مسلمانوں کے علاوہ دوسرے افریقیوں کی کوئی مذہبی وابستگی نہیں تھی ۔ خصوصاً عیسائیت کا تو نام اور نظریہ بھی ابھی افریقہ نہیں پہنچا تھا سو مسلمان امریکہ میں افریقی غلاموں کی صورت سپین کے بعد ایک اور بپتسما کی زد میں آ گئے اس بار بھی بپتسما کی چھری مسلمانوں کے حلقوم پر ہی چلی ۔ ایک طرف کٹنے والی شہ رگ اگر مانوس ابتلاء تھی تو دوسری طرف بازوئے قاتل بھی وہی تھا ۔ تجربہ کار و آمادہ قتل جو، اب سپین سے امریکہ پہنچ چکا تھا ۔ مورخین کا امریکہ در آمد کیئے جانے والے افریقی مسلمانوں کی تعداد پر اختلاف ہے ۔ مسلمان مورخ امریکہ میں افریقی غلاموں کی سات سے تیس فیصد تعداد کو مسلمان قرار دیتے ہیں 3 ۔ (ابو عباری: 1996) ہمارے خیال میں 23 فیصد کا شماریاتی مارجن اس تعداد کو قابل اعتبار سمجھنے میں بذات خود بڑی رکاوٹ

ہے۔ ناتھن مرفی اس تعداد کو دس فیصد قرار دیتے ہیں جبکہ ایلن آسٹن نے اپنے تحقیقی مقالے میں 1711 سے 1775 تک امریکہ لائے جانے والے افریقی مسلمانوں کی تعداد کو 18 ہزار قرار دیا ہے 4۔ (ایلن آسٹن : 1984) لیکن ایلن آسٹن کی تحقیق کردہ تعداد غلامی کی تجارت کے ایک قلیل عرصے پر محیط ہے جبکہ غلاموں کی تجارت کا دورانیہ سولہویں صدی کے آغاز سے 1808 تک ہے۔

کولن پامر نے اس تعداد کو 40 ہزار لکھا ہے' انہوں نے اپنی تحقیق کی بنیاد 1850 کے عشرے میں امریکہ کے طول وعرض میں دریافت ہونے والی ان عربی تحاریر پر رکھی ہے جنہیں مسلمان غلاموں نے مرتب کیا تھا۔ 5۔ (کولن پامر: 1998) ہمارے خیال میں امریکہ لائے جانے والے افریقی غلاموں میں مسلمانوں کی تعداد ان تمام اعداد وشمار سے کہیں زیادہ تھی جو اب تک تخمین کیئے گئے ہیں۔ ہماری کھوج کے مطابق یہ تعداد بیس لاکھ سے ہرگز کم نہیں تھی۔ ہماری تحقیق کی بنیاد ہیو تھامس کے مہیا کردہ ان اعداد وشمار پر استوار ہے جن کے مطابق 40 ملین افریقی براعظم امریکہ برآمد کیئے گئے تھے۔ اب جبکہ جیمز رالی نے ایک چوتھائی کا وطن کانگو۔ انگولا ریجن قرار دیا ہے اور افریقہ میں یہی علاقہ مسلم اکثریت کا علاقہ مانا جاتا تھا تو اس حساب سے دس ملین برآمد کردہ افریقی غلام مسلمان تھے جن میں سے تین چوتھائی امریکہ پہنچنے سے قبل ہی قتل ہوگئے 6۔ (ہیو تھامس : 1999) اس طرح ڈھائی ملین افریقی غلام براعظم امریکہ پہنچے جن میں سے بیشتر مسلمان ورجینیا' نیو یارک' جارجیا' کیرولائنا' میری لینڈ اور کنکٹی کٹ میں انسانی حقوق اور جمہوریت کی چکا چوند میں نیلام چڑھے۔

مشہور امریکی صحافی سٹیون بار بوزا جنہوں نے عیسائیت ترک کرکے اسلام قبول کیا اور امریکہ میں افریقی مسلمانوں پر قابل قدر تحقیقی کام کیا' اٹھارہویں صدی کے اختتام پر امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ قرار دیتے ہیں۔ 7۔ (سٹیون بار بوزا:1994) لیکن وہ اس تعداد کو برازیل اور امریکہ میں منقسم سمجھتے ہیں جبکہ ہماری کھوج کے مطابق افریقی مسلمانوں کی اتنی تعداد تو صرف امریکہ میں ہی تھی۔ امریکہ میں افریقی مسلمان غلاموں کی تعداد ہمیشہ سے متنازع رہی ہے۔ اس تنازع کی دو بڑی وجوہات میں سرفہرست امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں لاعلمی اور دوئم مسلمانوں سے وہ تعصب کارفرما رہا ہے جس سے ورثائے ازابیلا کے دل و دماغ فطری اور لازمی طور پر اسلام دشمنی سے آلودہ ومتاثر رہے ہیں۔ اوّل الذکر مسلمانوں

کی شناخت میں رخنہ بنی اور موخر الذکر امریکہ میں مسلم تشخص کی بقا کے لیے چیلنج ثابت ہوئی نیتجتاً امریکہ کے سیاہ فام غلاموں میں مسلمانوں کی صحیح تعداد کا کوئی ریکارڈ نہ رکھا جا سکا۔ اس عدم ریکارڈ کی وجہ سے اس موضوع پر تحقیقی کام کے مختلف نتائج نکلنے سے یہ موضوع مزید متنازع بن گیا۔ لیکن مختلف تحقیقاتی نتائج اور امریکہ میں سیاہ فام مسلمان غلاموں کے بارے میں مختلف تھیوریز کے عمومی رجحان سے مسلم تعداد کا وہ شماریاتی وسطی عدد متعین کیا جا سکتا ہے جس سے امریکہ میں دیگر مذاہب اور قومیتوں کے افراد کی تعداد متعین کی گئی ہے۔ افریقن۔ امریکن تاریخ کے پروفیسر اور مشہور محقق مائیکل گومیز لکھتے ہیں:

> ’’ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اگر لاکھوں نہیں تو یقیناً ہزاروں مسلمان غلام بنا کر لائے گئے تھے۔‘‘ 8۔(مائیکل گومیز: 1994)

جبکہ سلویانا ڈیوف امریکہ میں افریقی مسلمان غلاموں کی تعداد کے تعین کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ’’امریکہ میں مسلمان غلاموں کی تعداد کا تعین اس طرح بھی کیا جا سکتا ہے کہ افریقہ کے جن علاقوں سے یہ افراد حاصل کیئے گئے وہاں مسلمانوں کی تعداد کا تعین کیا جائے کہ وہ وہاں کل آبادی کا کتنے فیصد تھے۔ یہ بات طے ہے کہ غلاموں کی تجارت کے دورانیے میں مسلمان‘ سینگال‘ گیمبیا‘ گنی‘ سیرالیون‘ مالی‘ بنین‘ گھانا اور نائیجیریا کے ملکوں میں موجود تھے۔ ہم مجموعی اغوا کردہ افریقیوں کی تعداد کو 15 ملین مقرر کریں تو اس میں آدھے مغربی افریقہ کے مانئے ہوں گے۔ مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی مختلف فیصد آبادی کے پیش نظر اگر ہم وہاں مسلمانوں کی تعداد کو 30 سے 40 فیصد متعین کریں تو بر اعظم امریکہ میں مسلمان غلاموں کی تعداد 15 سے 20 فیصد یا سوا دو ملین سے تین ملین کے درمیان بنتی ہے۔ مغربی افریقہ سے اغوا کردہ لوگوں میں 30 فیصد تعداد عورتوں کی تھی جبکہ مسلمان غلاموں میں مسلمان عورتوں کی تعداد 15 سے 20 فیصد تھی ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں مسلمان غلاموں کی تعداد اگرچہ بہت بڑی

> نہ سہی لیکن ایک معقول تعداد ضرور تسلیم کی جانی چاہیے۔ اس سے قطع نظر کہ مسلمان افریقہ کے کن ملکوں سے اغوا کیئے گئے تھے لیکن ان کی زبان ایک تھی، ثقافت اور اقدار مشترک تھیں، تعلیم یکساں تھی اور طرز زندگی ایک جیسا تھا۔ اس یکسانیت نے امریکہ میں انہیں نمایاں طور پر ایک فریق بنا دیا تھا۔“ 9۔ (سلویانا ڈیوف: 1998)

امریکی تاریخ کے تشنہ جواب سوالوں میں یہ سوال سرفہرست ہے کہ آخر یہ مسلمان گئے کہاں اور ان کا کیا بنا۔ امریکی خانہ جنگی (1861-1865) کے خاتمے تک امریکہ سے مسلمان سیاہ فاموں کا تشخص مٹ چکا تھا۔ انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟ ہر دو کی شہادت مفقود ہے البتہ ان کے ہونے کی گواہی مستند ہے کہ وہ تھے ضرور۔ وہ اپنے ہونے کے ثبوت کو تحریر کر گئے اور یہ تحاریر محفوظ ہوگئیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں امریکی سیاہ فام غلاموں کا ریکارڈ مرتب کرنے کے سلسلے میں سیاہ فام افراد کی تحاریر منظر عام پر آئیں۔ ان کے حالات زندگی، روز مرہ ظلم وستم کا اندراج، بے کسی کا بیان، غلامی کے جبر تلے معمولاتِ روز وشب، سزاؤں کے گوشوارے، جبر کے روز نامچے اور گریہ کے سرنامے۔ انہی تحاریر میں مسلمان غلاموں کی تحریر کردہ عربی میں لکھی وہ تحاریر بھی شامل ہیں جو، ان کے ہونے پر شاہد ہیں۔ وہ اپنے ہونے کی شہادت میں سورۃ فتح، سورۃ نصر، سورۃ الملک اور سورۃ الناس لکھ گئے۔ اب انہیں کون جھٹلائے؟ جا بہ جا بکھری ہوئی ان عربی تحاریر نے صدر جان ٹائیلر کے اس دعویٰ کذب پر مہر ثبت کر دی کہ اغوا کردہ غلام افریقہ میں جاہل تھے اور یہاں امریکہ میں وہ تعلیم یافتہ ہیں، حقیقت اس کے برعکس نکلی۔ ثابت ہوا کہ انہیں جب افریقہ سے اغوا کر کے لایا گیا تھا تو وہ تعلیم یافتہ تھے، لکھنے پڑھنے پر قادر تھے وہ علم الکلام جانتے تھے اور علم البیان پر قادر تھے ان میں اصول، فقہ، شرع، شعر، حدیث، تفسیر، ریاضی اور زراعہ کے جاننے والے موجود تھے جبکہ صدر جان ٹائیلر شرع جاننے والے علماء اور شرح سود کے نوسر بازوں میں فرق سمجھنے سے قاصر رہے۔ مشہور محققہ سلویانا ڈیوف مسلمان افریقی غلاموں پر اپنی تحقیق میں لکھتی ہیں:

> ”مغربی افریقہ کے مسلمان تعلیم یافتہ تھے وہ جب غلاموں کی حیثیت سے امریکہ لائے گئے تو ان کا علمی امتیاز ان کے ساتھ امریکہ پہنچ گیا۔ اس تعلیمی اہلیت نے قیادت کے مطلوبہ عناصر مہیا کر دیئے اور سیاہ فام

> غلاموں کی جدوجہد آزادی کی باگ دوڑ اور قیادت کا منصب فطری طور پر مسلمان غلاموں کے ہاتھ آ گیا۔ 1880 میں سینیگال اور ملحقہ ملکوں میں 60 فیصد مسلمان تعلیم یافتہ تھے۔"
>
> 10۔ (سلویانا ڈیوف: 1998)

مغربی افریقہ کے مسلمانوں کی تعلیمی اہلیت پر سینیگال کے گورنر بیرن راجر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ایسے دیہات موجود ہیں جہاں اکثر عربی پڑھنے اور لکھنے والے نیگروز پائے جاتے ہیں بہ نسبت ہمارے فرنچ دیہی علاقوں کے' جہاں شاید ہی کوئی فرنچ لکھ یا پڑھ سکتا ہو۔"
>
> 11۔ (راجر بیرن: 1828)

مسلمان غلامی کے خلاف اپنی فطری ساخت وسائیکی اور قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے امریکہ میں سیاہ فام غلاموں کے حقوق و آزادی کا ہراول دستہ بن گئے۔ مسلمانوں کو غلاموں کی بغاوت کا مرکزی کردار سمجھا جاتا تھا عجب نہیں کہ امریکیوں نے یہ بات ہمیشہ کے لیے پلے باندھ لی ہو۔ دریافت امریکہ کے ابتدائی سالوں میں ہی سیاہ فاموں کی قیادت پر مسلمان فائز ہو چکے تھے۔ انہوں نے کبھی غلامی سے سمجھوتہ کیا نہ اسے تسلیم کیا۔ مسلمانوں نے 1503 میں ہی امریکہ سے ملکہ ازا بیلا کو اس نوع کی اپیلیں بھیجنا شروع کر دی تھیں کہ امریکہ میں مسلمان غلاموں کی درآمد پر پابندی عائد کی جائے۔ 1522 میں امریکہ کے ہسپانوی گورنر امیر البحر ڈان ڈیاگو' کولون (کولمبس کے بیٹے) کے زیر نگرانی گنے کی کاشت پر معمور ولوف قبائل کے جن افریقی غلاموں نے سب سے پہلے علم بغاوت بلند کیا ان کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ غلاموں کی اس پہلی بغاوت سے لے کر آخری بغاوت تک مسلمان ہر بغاوت میں شریک اور اس کے قائد رہے۔ غلاموں کی ان بغاوتوں میں 1523 میں میکسیکو میں بغاوت' 1529 کیوبا' 1627 گوئٹے مالا' 1647 چلی 1830 فلوریڈا (امریکہ) اور 1835 میں برازیل کی ناکام بغاوتیں شامل ہیں۔ ہر ناکام بغاوت کے بعد حسب روایت مقتل سجتا رہا اور باغی دار پر جھولتے رہے یوں مسلمان امریکہ سے نابود تو ضرور ہوتے چلے گئے مگر امریکی تاریخ میں ناانصافی کے خلاف حریت اور مزاحمت کے صفحے صفحے پر اپنا نام لکھ گئے۔ قرائن کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اس حریت پسندانہ مزاحمتی رویے کو امریکنز نے امریکہ میں مسلمانوں کی پہلی بغاوت (1522) سے بغداد (2003) تک ہمیشہ یاد رکھا سلویانا ڈیوف لکھتی ہیں:

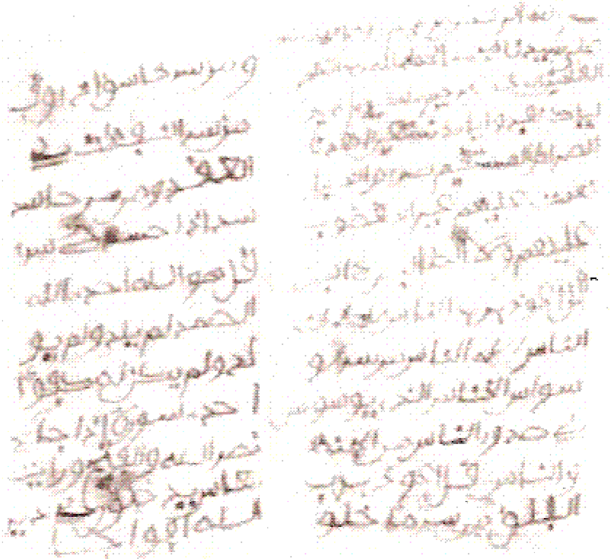

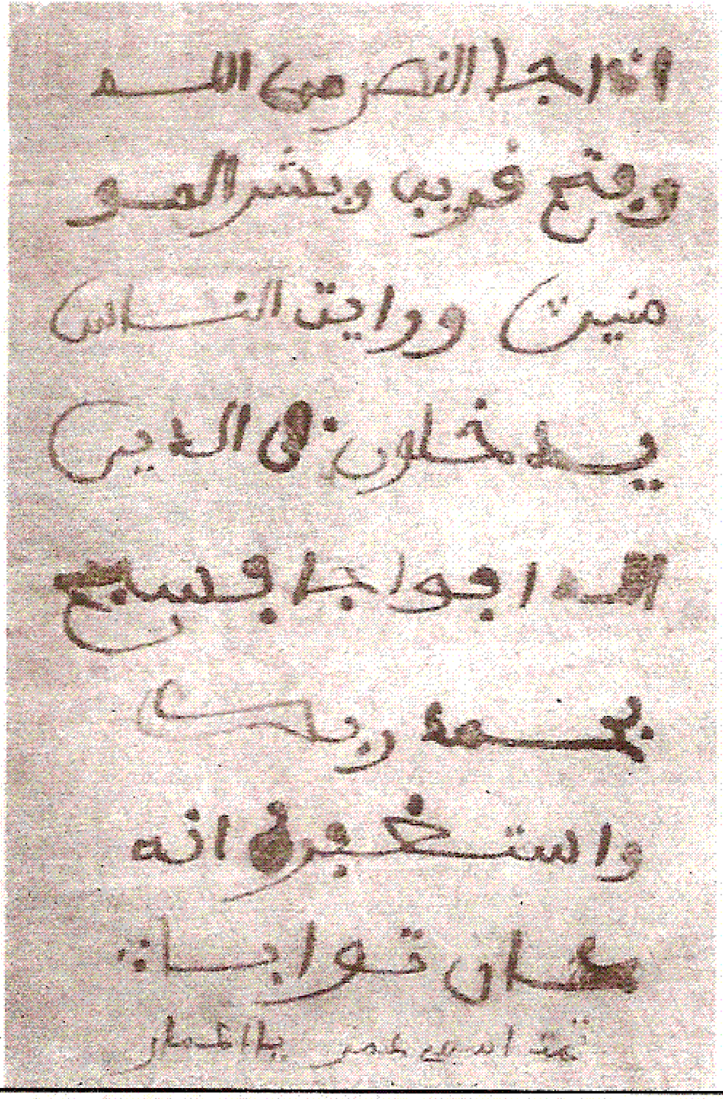

اذا جا النصر من اللـه
وفتح قريب وبشر المو
منين ورايت النـاس
يدخلون في الدين
اللـه افواجا فسبح
بحمد ربك
واستغفره انه
كان توابا

[illegible]

> ''ہیٹی میں سیاہ فام غلاموں کی جو واحد کامیاب بغاوت تھی اس کے مشہور رہنما بوق مان اور مقانڈل دونوں مسلمان تھے مسلمان امریکہ میں صرف مسلمانوں کے رہنما ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے تمام امریکی غلاموں کی جدو جہد آزادی کی قیادت کی ۔ انقلابی قیادت کے درمیان خفیہ پیغام رسانی کی زبان عربی تھی ۔ برا زیل میں 1838 کے باہیا انقلاب کے دوران جو عربی دستاویزات پکڑی گئیں ان کے ترجمہ سے پتہ چلا کہ مسلمانوں نے جنوبی امریکہ میں خفیہ مدرسے' نظام تعلیم اور خفیہ مساجد 'میران مرکز' کے نام سے قائم کر رکھی تھیں۔'' 12۔ (سلویانا ڈیوف: 1998)

ان عربی تحاریر کے ترجمے ہونے پر پتہ چلا کہ ان کے تحریر کنندہ افریقہ سے ہی تعلیم یافتہ آئے تھے۔ ان کے خیالات نادر اور بیان میں ندرت تھی وہ وسیع قلب ونظر کے مالک تھے ۔ ان کے نظریات ان کے مذہب سے متاثر تھے جس میں روا داری اور وسعت تھی ۔ ان کے علم و فضل نے انہیں قیادت کے منصب پر سرفراز رکھا تھا ۔ ان کے نظریات اس کاروباری امریکی نظریے سے یکسر مختلف تھے جس میں نظریہ مالی منعفت کی میزان میں تولا جاتا ہے ان عربی دستاویزات میں نیو یارک کے محمد باقوا قوا کی سوانح اور سات خطوط' کیرولائنا کے عمر ابن سعد کی خودنوشت اور سورۃ النصر' جار جیا کے بلالی محمد کا روز نامچہ اور رسالہ جس میں اسلامی قوانین کی تشریح اور سورۃ فتح ' میری لینڈ کے ایوب ابن سلیمان کا تحریر کردہ قرآن پاک کا نسخہ' جنوبی کیرو لائنا کے چرنو' کی سورۃ فتح' سورۃ الناس' اور جنوبی کیرو لائنا کے ہی عبیل قندر اور محمد کا ساؤتھ کیرو لائنا کونسل میں آزادی کے لیے عربی میں داخل کردہ مقدمہ بہت مشہور ہوا ۔

وہ کس کو اغوا کر رہے ہیں اور کسے پکڑ لائے ہیں یہ جانے بغیر اغوا کاروں کا پھندا بلا امتیاز خاص و عام' مسلم وغیر مسلم' مرد وزن' بچے اور جوان ہر کس و ناکس کی گردنوں میں پڑتا رہتا ۔ 1807 کے سال میں ایک دن یہ پھندا دریائے سینیگال کے جنوب میں واقع مسلم ریاست فیوٹا ٹو رو کے متمول و ہر دلعزیز مسلمان عالم اور دانشور 37 سالہ عمر ابن سعد کی گردن میں آن پڑا جو فروخت ہوتے ہوتے کیرو لائنا (چارلسٹن) آ گئے ۔ جہاں انہیں جانسن نامی زمیندار نے خرید لیا ۔ بد خصال' بد خو روایتی سفید فام آقاؤں کی طرح جانسن نے عمر ابن سعد پر ظلم و تشدد کی انتہا کر دی ۔ 1811 میں موقع ملتے ہی عمر ابن سعد نے وہاں سے فرار ہو کر فیئٹ

ول (شمالی کیرو لائنا) میں پناہ لے لی یہاں انہیں مفرور غلاموں کے خلاف قانون کے تحت پکڑ کر جیل میں بند کر دیا گیا۔ عمر ابن سعد نے جیل کی دیواروں پر قرآنی آیات لکھنا شروع کردیں۔ ان کے خوبصورت طرزِ تحریر، تسلسل اور نفاست سے جیل کے حکام متاثر ہوئے۔ سیدھے ہاتھ کی طرف سے الٹے ہاتھ کی طرف لکھتے دیکھا جانا ان حکام کے لیے حیران کن تھا۔ یہ جاننے کی کوشش کی جانے لگی کہ عمر ابن سعد کس زبان میں اور کیا لکھتے ہیں۔ فیئیٹ ول کے چھوٹے شہر میں یہ بات آگ کی طرح پھیل گئی کہ جیل میں مقید ایک سیاہ فام غلام لکھنا بھی جانتا ہے جو سیدھی طرف سے الٹی طرف روانی سے لکھتا ہے۔ عمر ابن سعد اور ان کی تحریر کو دیکھنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ملنے والے عمر ابن سعد کے مہذب رکھ رکھاؤ، وضعداری اور سنجیدگی سے متاثر ہوتے انہی متاثرین میں کیرولائنا کے گورنر جان اوون اور جنرل جم اوون کے سسر مسٹر ل فورڈ بھی شامل تھے جنھوں نے عمر ابن سعد کو اپنی بیٹی بنسا اوون اور داماد جنرل اوون کی خدمت گزاری کے لیے جیل سے رہا کرا لیا۔ جنرل اوون نے عمر ابن سعد کے اطوار و اخلاق سے ان کے مرتبے کا اندازہ کرتے ہوئے انہیں اپنے ذاتی خدمت گاروں میں شامل کر لیا جہاں عمر ابن سعد نے 1864 تک اپنی بقیہ زندگی وہیں گزاری۔ جنرل اوون فطرتاً رحمدل، انسان دوست اور نیک خصلت انسان تھے۔ عمر ابن سعد کی دیانت، امانت، وقار، علم اور اخلاص نے انہیں جنرل اوون کا معتمد خاص بنا دیا تھا اور وہ کافی حد تک غلاموں پر عاید پابندیوں سے آزاد ہو چکے تھے۔ مقامی چرچ میں عمر ابن سعد کی دلچسپی، طویل خدمات اور بائیبل سے شغف کے پیشِ نظر کہا جاتا ہے کہ عمر ابن سعد اپنی عمر کے آخری سالوں میں عیسائی ہو چکے تھے جبکہ حال ہی میں عمر ابن سعد کے زیرِ مطالعہ عربی زبان میں بائیبل کے صفحات پر اندراجات و حواشی کے ترجمے سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ ان کے لکھے ہوئے کسی حوالے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اسلام ترک کر چکے تھے۔ بلکہ ان کے نوٹس اسلام اور عیسائیت کے تقابلی جائزے اور تجزیے پر مبنی ہیں جس میں اللہ کی حقانیت، تعریف، حمد و ثناء عین اسلامی تقاضے کے مطابق بدرجہ اتم موجود ہے۔

عمر ابن سعد کی عربی بائیبل اور ان کی تحریر کردہ عربی دستاویزات ڈیوڈسن کالج لائبریری، شمالی کیرو لائنا میں محفوظ ہیں جبکہ ان کے ہاتھ کی تحریر کردہ قرآن پاک کی آیات اور چودہ دوسری تحاریر بشمول عربی میں خود نوشت نارتھ کیرو لائنا یونیورسٹی چیپل ہل میں محفوظ ہیں۔ عمر ابن سعد کا ایک طویل مکتوب یوشو رباح کے پاس محفوظ ہے اس خط کا آخری حصہ (قریب آٹھ صفحات)

ان کی اسی خودنوشت کا حصہ اور نسخہ ثانی ہے جس کا شمار امریکہ میں دور غلامی میں لکھے گئے تخلیقی ادب پاروں میں کیا جاتا ہے۔ عمر ابن سعد کا تحریر کردہ یہ فن پارہ 1920 میں پر اسرار طریقے سے غائب ہوگیا تھا۔ جو 1995 میں پر اسرار طریقے سے ہی ورجینیا سے برآمد ہوا۔ بعد ازاں عمر ابن سعد کی خودنوشت سوانعمری کا یہ اصل نسخہ نیو یارک میں نیلام ہوا جسے طارق ڈیرک ہیرڈ نے مہنگے داموں خریدا اور اب یہ انہی کی ملکیت میں ہے۔ طارق ڈیرک ہیرڈ کی تحویل میں عمر ابن سعد کی اس خودنوشت کا عربی سے انگریزی میں ترجمہ ییل یونیورسٹی کے پروفیسر علا الریکس نے کیا ہے۔ ہم نے علا الریکس کے اسی انگریزی ترجمے سے عمر ابن سعد کی خودنوشت کے ابتدائی حصے کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ عمر ابن سعد اپنی خودنوشت میں ایک فرضی کردار شیخ حنتہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اے شیخ حنتہ!
>
> میں اپنی زندگی کے بارے میں لکھنے سے قاصر ہوں۔ میں اپنی مادری زبان اور عربی زبان کا بیشتر حصہ بھول چکا ہوں، سو میرے بھائی مجھے اس بارے میں قصور وار نہ ٹھہراؤ۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، نیک کام کرنے والوں پر اس کی رحمت سوا ہے۔
>
> اللہ کے نام سے جو بہت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ سب تعریفیں اسی کو زیب ہیں جو ہدایت کا سرچشمہ اور فیاضی سے دینے والا ہے۔ اور تمام تعریفیں اسی کے لیے ہیں جو ختم نہ ہونے والے وقت کے پہلے سے موجود ہے۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مخلوقات اور ان کے الفاظ و اعمال کو اپنی بندگی کے لیے تخلیق کیا ہے۔
>
> یہ عمر ابن سعد کی طرف سے شیخ حنتہ کے لیے ہے:
>
> تم نے مجھ سے میرے حالات زندگی لکھنے کے لیے کہا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے بارے میں لکھنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں محدود حد تک ہی گرامر اور علم البیان کا مطالعہ کر سکا اس لیے میرے بھائی میں اللہ کے ناطے سے کہتا ہوں کہ مجھے الزام مت دینا۔ میری آنکھیں

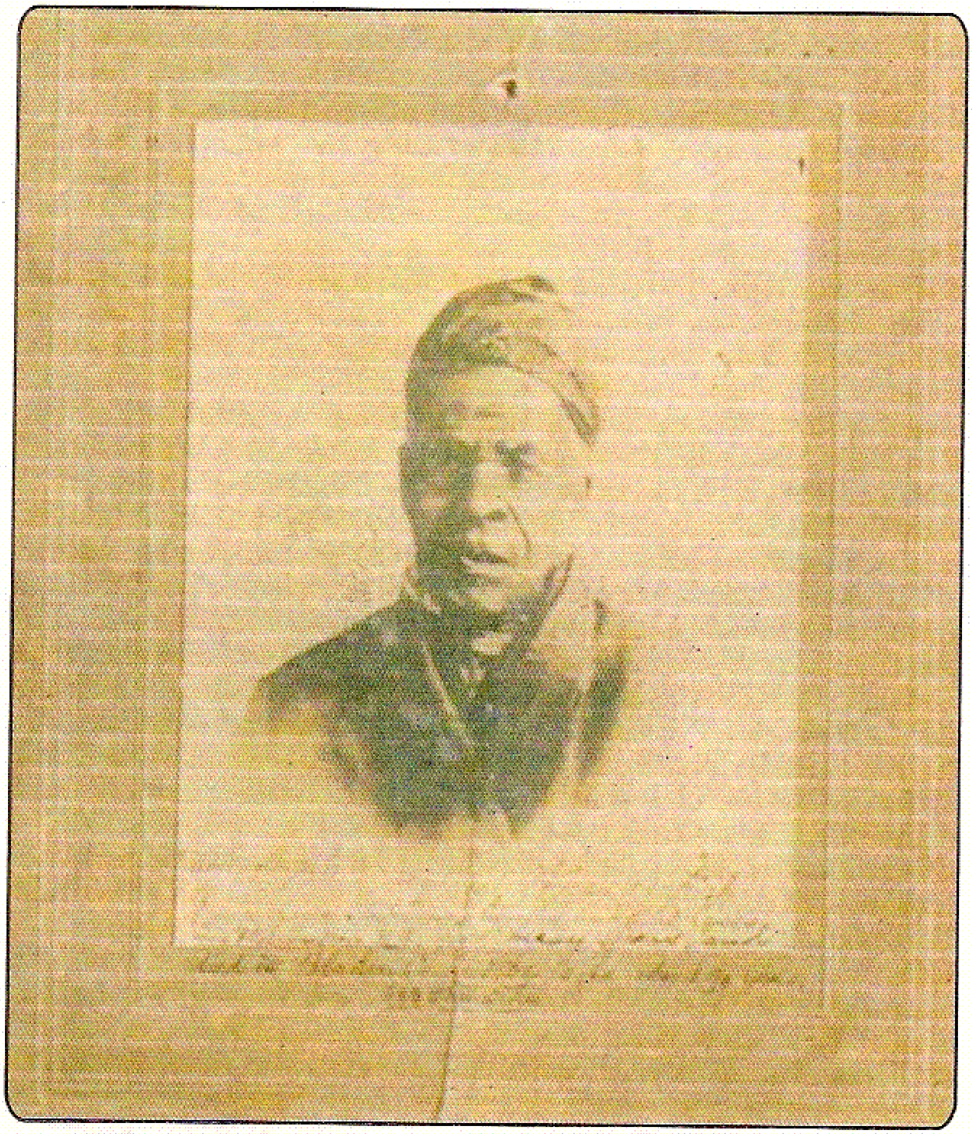

عمر ابن سعد

اور میرا جسم کمزور ہو چکا ہے۔

میرا نام عمر ابن سعد ہے۔ میری جائے پیدائش فیوٹو' تورو ہے جو کہ دو دریاؤں کے درمیان واقع ہے۔ میں نے بندو اور فیوٹا میں اپنے بھائیوں شیخ محمد سعید' شیخ سلیمان قیبا اور شیخ جبرائیل ابدال کے ساتھ علم حاصل کیا 25 سال تک میں علم سیکھنے میں سرگرم رہا ہوں۔ تحصیل علم کے بعد جب میں اپنے علاقے میں واپس آ گیا تو اس کے 6 سالوں بعد ایک بڑی فوج ہماری زمینوں پر آن وارد ہوئی انہوں نے وسیع پیمانے پر لوگوں کا قتل عام کیا جبکہ مجھے گرفتار کر کے سمندر پر لے گئے وہاں انہوں نے مجھے عیسائیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ خریدنے والے مجھے ایک بہت بڑے جہاز پر لے گئے۔ بڑے سمندر میں سفر شروع ہوا جو ڈیڑھ ماہ جاری رہا پھر ہم عیسائیوں کی زبان میں چارلسٹن (کیرو لائنا) کہلائی جانے والی جگہ پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر مجھے پھر سے فروخت کیا گیا۔ اب مجھے ایک بد خصال' کمزور اور بد فطرت جانسن نامی شخص نے خرید لیا جو شدت سے عقیدے کا منکر اور اللہ سے نہ ڈرنے والا شخص تھا۔

میں چھوٹے قد کاٹھ کا آدمی ہوں اور مشقت طلب کام کرنے کے قابل نہیں ہوں سو میں جانسن کے ہاتھوں سے نکل بھاگا حتیٰ کہ ایک ماہ بعد میں فیا ڈل (فییٹ ول) نامی جگہ پہنچ گیا۔ یہاں میں نے بہت سے مکانات دیکھے اسی دوران میں ایک مکان میں ادائیگی نماز کے لیے داخل ہوا۔ ایک نوجوان لڑکا جو گھوڑے پر سوار تھا اس نے مجھے دیکھ لیا اور اپنے باپ کو مطلع کر دیا کہ گھر میں ایک سیاہ فام شخص گھس آیا ہے۔ ھاؤنڈا نام کا شخص ایک اور فرد کی صحبت میں گھوڑوں پر سوار شکاری کتوں کے ہمراہ آیا اور مجھے پکڑ کر 12 میل دور فیا ڈل کاؤنٹی لے آیا اور مجھے ایک بہت بڑی عمارت میں قید کر دیا جسے وہ عیسائی زبان میں جیل کہتے ہیں۔ میں وہاں سولہ دن رات قید رہا۔ جمعہ کو انہوں نے میری کوٹھڑی کھولی جہاں

میں نے بہت سارے آدمیوں کو دیکھا جو سب کے سب عیسائی تھے۔ کچھ لوگ مجھ سے میرا نام پوچھتے تھے کہ تم عمر ہو یا سعد لیکن میں ان کی عیسائی زبان نہیں سمجھتا تھا۔

اسی اثنا میں باب مل فورڈ نامی ایک شخص نے مجھ سے کچھ کہا اور مجھے جیل سے چھڑا کر لے گیا۔ میں اس کے ساتھ جانے میں بہت خوش تھا۔ مجھے پہلے چار روز مل فورڈ نے گھر رکھا۔ پھر ایک اور شخص جم اوون جو کہ مل فورڈ کا داماد تھا اور اس کی بیٹی بنسا سے بیاہیا ہوا تھا، مجھے لے گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس کے ساتھ بلیڈن نامی جگہ جانے پر رضا مند ہوں میں نے کہا۔ ہاں۔ اس کے بعد سے میں آج تک جم اوون کے ساتھ ہی مقیم ہوں (عمر ابن سعد 1864 تک قریب 50 سال جم اوون کے ہاں مقیم رہے۔ مصنف) جنرل اوون کے ہاتھ آنے اور یہاں مستقل قیام کے فیصلے سے پہلے مچل نامی ایک شخص مجھے خریدنے آیا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس کے ساتھ چارلسٹن جانا چاہتا ہوں میں نے اسے جواب دیا۔ نہیں، نہیں، نہیں۔ میں چارلسٹن نہیں جاؤں گا۔ میں جنرل جم اوون کے ساتھ ہی رہوں گا۔

اے شمالی کیرولائنا کے لوگو
اے جنوبی کیرولائنا کے لوگو
سب امریکہ کے لوگو
کیا تمہارے درمیان دو اچھے لوگ موجود ہیں؟

ہاں تمہارے پاس دو بہترین افراد جم اوون اور جان اوون موجود ہیں یہ افراد بہترین لوگ ہیں یہ جو خود کھاتے ہیں مجھے بھی کھانے کو وہی دیتے ہیں۔ جو خود پہنتے ہیں مجھے بھی ایسا ہی پہناتے ہیں۔ جم میرے لیے اللہ کی انجیل پڑھتا ہے، ہمارا آقا، تخلیق کار اور بادشاہ جو ہمارے حالات کو ضابطے کے مطابق چلاتا ہے۔ اس ضابطے میں ہماری صحت اور دولت

> شامل ہے۔ وہ جو بے پناہ طاقت کے ہوتے ہوئے کسی مجبوری کے بنا رضا کارانہ طور پر ہم سے فیاضی کا سلوک روا رکھتا ہے۔

13۔ (عمر ابن سعد : 1831)

عمر ابن سعد کی مختصر خود نوشت کا جب عربی سے انگریزی میں ترجمہ ہوا تو اہل امریکہ ایسی بے ساختہ، سہل اور مکالماتی طرز تحریر پر ششدر رہ گئے۔ عمر ابن سعد کی تحریر نے ثابت کر دیا کہ عربی اور اپنی زبان سے نصف صدی کی فرقت ان کے اندر کے ہنرور ادیب، اور فہیم و نجیب عالم کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ عمر ابن سعد کی 25 سالہ حصول علم کی تپسیا رایگاں نہیں گئی تھی وہ جن پر جہالت کا الزام تھا امریکی ادب کے ماتھے پر اپنی تحریر کے جھومر اور طرز اسلوب کے ستارے ٹانک رہے ہیں۔ عمر ابن سعد کی تحریروں پر عربی ثقافتی ادب کی گہری چھاپ ہے جو امریکی ادب و اظہار میں بالکل نئی چیز تھی۔ انیسویں صدی کے وسط میں اگر ہندوستان میں مرزا اسد اللہ خان غالب نے بذریعہ خطوط غالب اختصار و روانی کی ایک نئی طرح ڈالی تھی تو عین اسی وقت امریکہ میں یہ کام عمر ابن سعد نے کیا حالانکہ دونوں یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی ادب، اسلوب اور اظہار میں ایزاد کردہ راہ اختصار پر چلنے والوں کے پاؤں چھل چھل جائیں گے۔ عمر ابن سعد کی مختصر سی سوانح نے نہ صرف عربی زبان کے حسن اختصار، گہرائی اور گیرائی پر بے ساختگی کی مہر ثبت کر دی بلکہ ریکارڈ کی درستگی کے لیے امریکی، افریقی تاریخ دوبارہ لکھے جانے کی بنیاد فراہم کر دی ہے۔

امریکی اور یورپی مورخین کے نزدیک افریقہ کی تاریخ، افریقہ میں یورپینز کی آمد اور تاریکی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ جبکہ عمر ابن سعد کے پہلے فقرے نے ہی افریقہ کے بارے میں دو سو سالہ امریکی تاریخ اور یورپی مورخوں پر خط تنسیخ کھینچ دیا ہے۔ عمر ابن سعد نے عربی کو افریقہ کی لاطینی زبان ثابت کر کے تحقیق کا نیا در کھول دیا کہ افریقی علماء نہ صرف اپنی مادری زبان جانتے تھے بلکہ اعلیٰ سطح کے علم کے لیے عربی مروّج تھی بالکل اسی طرح جیسے یورپ میں لاطینی، علمی و ادبی زبان رہی تھی۔ عمر ابن سعد کی عربی زبان پر گرفت نے امریکی اور یورپی مورخوں کے اس دعویٰ کو یکسر باطل ثابت کر دیا کہ افریقہ کی تاریخ تاریکی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے چونکہ افریقی زبانوں میں حروفِ تہجی اور طرز تحریر کی عدم موجودگی کی وجہ سے افریقہ کی تاریخ تحریر نہ کی جا سکی جبکہ عمر ابن سعد کی تحریر ثابت کرتی ہے کہ عربی کے علاوہ وہ ایک اور مادری یا

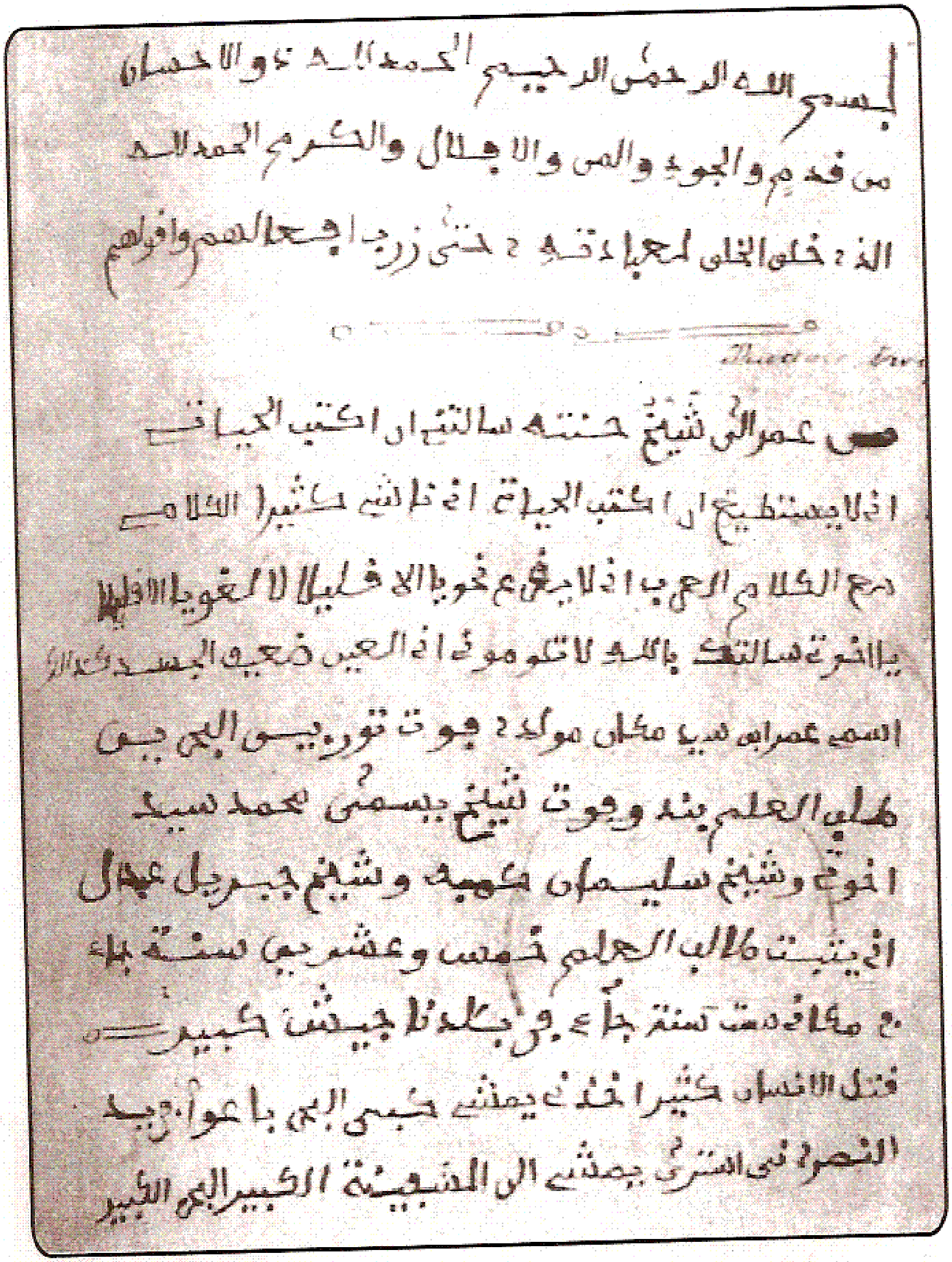

بسم الله الرحمن الرحيم الحمد لله ذو الاحسان
من قدم والجود والمن والاجلال والكرم الحمد لله
الذي خلق الخلق لعبادته حتى زرجا اعمالهم واقوالهم

Theodore Dw

من عمر الى شيخ هنته سالتني ان اكتب الحياة
فلا استطيع ان اكتب الحياة اني نسيت كثيرا الكلام
مع الكلام العرب اذ لا يحسن نحوا الا قليلا لا لغويا الاوليا
يا اخوتي سالتك بالله لا تلوموني ان العين ضعيف الجسد
اسمي عمر ابن سيد مكان مولدي فوت تور بين البحرين
طلب العلم في بند وفوت شيخ يسمى محمد سيد
اخي وشيخ سليمان كمبه وشيخ جبريل عبدال
اني بقيت طالب العلم خمس وعشرين سنة جاء
الى مكاني بعد ست سنين جاء في بلدنا جيش كبير
فقتل الانسان كثيرا اخذني يمشيني حتى البحر باعوني بيد
النصارى ثم اشتري بعثني الى السفينة الكبير البحر الكبير

عمر ابن سعد کی تحریر کا عکس: خودنوشت سوانح کے اولین صفحات

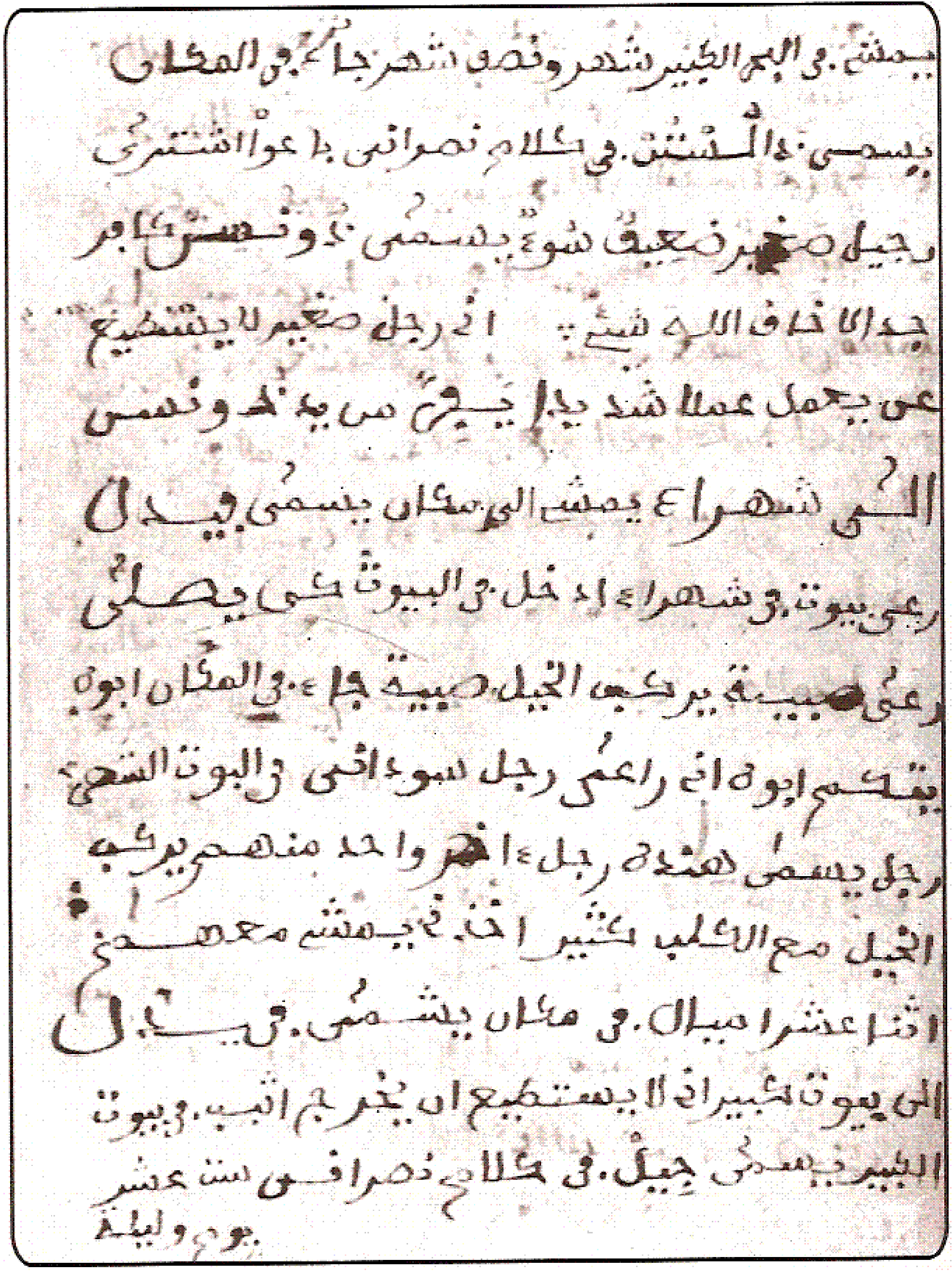

يمشى في البحر الكبير شهر ونصف الشهر جاء في المكان
يسمى د الستن. في كلام نصراني با عوا اشترى
رجيل صغير ضعيف سوء يسمى جو ونصسن ابو
جدا لا خاف الله شيء. انه رجل صغير لا يستطيع
عن يعمل عملا شديدا يجرس س به حد ونصس
الى شهرا ٤ يمشى الى مكان يسمى فيدل
رجعى بيوت في شهراء ادخل في البيوت حتى يصلى
رعى صبية يركب الخيل صبية جاء في المكان ابوه
يقسم ابوه انه راعى رجل سوداني في البوت الشعي
رجل يسمى هشده رجل ٤ اخر واحد منهم يركب
الخيل مع الاغلب كثير اخذ فيمشى معه حتى
اثنا عشرا ميال. في مكان يسمى. في بيـل
الى بيوت كبيرا لا يستطيع ان يخرج الشب. في بيوت
الكبير يسمى جيل. في كلام نصراني ست عشر
يوم وليلة.

مقامی زبان بھی جانتے تھے جس کے حروف تہجی بھی تھے، طرز تحریر بھی تھا اور اس میں حصول علم بھی ممکن و مروّج تھا۔

ایلن بیری لکھتے ہیں کہ ہارورڈ یونیورسٹی کے ماہرین لسانیات، نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی کے تاریخ کے پروفیسرز اور جان ہاپکنز یونیورسٹی کے محقق یہ طے کرنے میں مصروف ہیں کہ عمر ابن سعد کی تحاریر کو کس سطح کے نصاب میں شامل کیا جائے وہ لکھتے ہیں:

> ''عمر ابن سعد کی تحریر کے تراجم جو کہ جان ہاپکنز یونیورسٹی میں زیر اشاعت ہیں، جب دو سال بعد منظر عام پر آئیں گے تو عمر ابن سعد کا قصہ نصاب اور تاریخ کی کتابوں میں اپنی جگہ بنا لے گا۔ آج سے دس سال بعد اگر بچے عمر ابن سعد کو اپنے سکولز میں پڑھیں گے تو اس میں ڈیرک بیرڈ کا بھی ہاتھ ہوگا جو عمر ابن سعد کے تدریجی احیا کو یقینی بنا رہے ہیں۔ سیڈیگال، جہاں سے عمر ابن سعد لائے گئے، شمالی کیرولائنا جہاں وہ غلام کی حیثیت سے مقیم رہے۔ ہارلم (نیو یارک) جہاں انہوں نے کچھ وقت گزارا۔ اور اب ہارورڈ یونیورسٹی جہاں ڈیرک بیرڈ سے مستعار لی گئی عمر ابن سعد کی تحریر ماہرین کے زیر مطالعہ ہے۔ 14۔(ایلن بیری: 1998)

یہ مد نظر رکھنا ہوگا کہ امریکہ میں سیاہ فام غلاموں کو غیر تعلیم یافتہ اور غیر مہذب قرار دینے کی وجہ بھی وہی تھی جو ریڈ انڈینیز کو غیر مہذب قرار دینے کی رہی تھی۔ جس طرح ریڈ انڈینیز کو غیر مہذب قرار دے کر قتل کرنے میں واقعاتی آسانی رہی تھی اسی فلسفے کے از سر نو استعمال سے سیاہ فام گردنیں بھی ذہنی کے شکنجے میں کسی گئیں۔ یہ الگ بات کہ وقتاً فوقتاً جب بھی آستین کا لہو پکارتا ہے کوئی نہ کوئی دستاویز، تحریر، خط، کوئی پرزہ کہیں نہ کہیں سے برآمد ہو کر یہ الم نشرح کرتا رہتا ہے کہ سیاہ فام غلاموں میں تعلیم یافتہ اور مہذب افراد بھی تھے جو لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے وہ مذہب، فلسفہ، گرامر، اور ادب سے آشنا تھے۔ ایلن آسٹن لکھتے ہیں:

> ''اس حقیقت کو جھٹلانا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے کہ کچھ افریقی جیسا کہ عمر ابن سعد ہیں، بلا امتیاز مسلم اور غیر مسلم ہر دونوں سے زیادہ تعلیم یافتہ اور دانش مند تھے بہ نسبت ان کے سفید فام آقاؤں کے کہ وہ جن کی

غلامی کاٹ رہے تھے۔" (15۔ ایلن آسٹن: 1984)

اپنے سفید فام آقاؤں سے زیادہ مہذب، تعلیم یافتہ سیاہ فام غلاموں میں ایک افریقی شہزادہ بھی شامل تھا۔ کرنل ابراہیما عبدالرحمٰن ثوری جنہیں سیاہ و سفید فام عرف عام میں پرنس کہہ کر مخاطب کرتے تھے، 1762 میں وسطی مغربی افریقہ ٹمبکٹو (مالی) میں فیوٹا جالون کے المامی ثوری شاہی خاندان میں پیدا ہوئے۔ پرنس عبدالرحمٰن کے والد کی حکومت کا پایہ تخت ٹیمبو میں تھا جو المامی شاہی خاندان کے موروثی حکمران اور متقی و پرہیز گار مسلمان تھے۔ عبدالرحمٰن اپنے 33 بھائیوں میں دوسرے تھے اور اپنی اعلیٰ تعلیم، قد قامت، شخصیت، ذہانت اور بہادری کی وجہ سے بلا شبہ موروثی بادشاہت کے امید وار تھے لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پرنس عبدالرحمٰن نے جینی اور ٹمبکٹو کی درس گاہوں سے علم حاصل کیا جو اٹھارہویں صدی میں افریقہ کے مشہور علمی مراکز تھے۔ تحصیل علم کے بعد وہ اپنے والد کی فوج میں کیولری رجمنٹ میں کیپٹن کے عہدے پر تعینات ہوئے اور کئی علاقائی لڑائیوں میں جواں مردی دکھائی۔ مسلسل فتوحات اور قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے وہ 26 سال کی عمر میں کرنل بن چکے تھے۔ 1788 میں غیر مسلم افریقی قبائل کے بڑے اتحاد ہیوز سے لڑائی کے دوران وہ شدید زخمی حالت میں دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ گرفتاری کے بعد انہیں دریائے گیمبیا کے راستے بحر اوقیانوس کے ساحل پر لایا گیا جہاں انہیں ایک برطانوی تاجر نے آٹھ ہاتھ تمباکو، دو تھیلی بارود، چار بندوقوں اور دو گیلن رم کے عوض خرید لیا۔ یہاں سے انہیں تین ہزار میل دور پا بہ سلاسل جزائر غرب الہند میں ڈومینیکا روانہ کر دیا گیا۔ یہاں کچھ دن غلامی کی تربیت دینے کے بعد انہیں غلاموں کی بڑی منڈی نیو آرلینز (لوئزیانا، امریکہ) لایا گیا۔ نیو آرلینز سے انہیں نیٹ چز (مسی پی) کے نیلام گھر پہنچایا گیا جہاں تھامس فوسٹر نے انہیں ٹمبکٹو کے ایک اور غلام کے ہمراہ 930 ڈالر میں خرید لیا، یوں پرنس عبدالرحمٰن 465 ڈالر میں فروخت ہو گئے۔

16۔ (ایڈمز کاؤنٹی چانسری کلرک آفس ریکارڈ: 1788)

تھامس فوسٹر نے پرنس عبدالرحمٰن کو جس محنت مشقت پر لگایا، جس طرح ان کی تحقیر کی گئی اور ان کے لمبے بالوں کو ان کی مرضی کے خلاف کاٹا گیا وہ اس کے عادی نہیں تھے نتیجتاً وہ موقع ملتے ہی یہاں سے فرار ہو گئے۔ دو چار ماہ پکڑے جانے کے خوف سے دلدلوں، جنگلوں اور بیابانوں میں چھپتے پھرنے کے بعد عبدالرحمٰن تھامس فوسٹر کے پاس واپس آ گئے۔ تھامس

فوسٹر جو، ان کے یوں با آسانی واپس آ جانے سے پہلے ہی حیران تھا پرنس عبدالرحمٰن کی اس پیشکش پر مزید حیران ہوا کہ اگر وہ انہیں افریقہ واپس بھیج دے تو ان کے والد جو وہاں ایک ریاست کے بادشاہ ہیں میرے برابر سونا تول کر اسے دے دیں گے۔ اس پیش کش کا مثبت جواب نہ پا کر پرنس عبدالرحمٰن نے تھامس فوسٹر کی بیوی کا پاؤں اپنی گردن پر رکھا اور کچھ اقوال پڑھے جو کسی کی سمجھ میں نہ آ سکے۔ افریقی قبائل میں کسی کا پاؤں گردن پر رکھ لینا اس سے عہد نبھانے کا استعارہ تھا۔ پرنس عبدالرحمٰن نے جان بخشی کی شرط پر عہد نبھانے کا قول باندھا، انہوں نے اپنا عہد یوں نبھایا کہ پھر وہ 40 سال تک تھامس فوسٹر کے پاس اپنی مشیت نبھاتے رہے۔ پرنس عبدالرحمٰن کی قائدانہ صلاحیت، دیانت اور راست بازی سے متاثر ہو کر تھامس فوسٹر نے انہیں اپنے زرعی فارم کا نگران مقرر کر دیا اور وہ رفتہ رفتہ غلام سے تھامس فوسٹر کے دست راست بنتے گئے۔ اسی دوران پرنس عبدالرحمٰن ایک عیسائی خاتون ازا بیلا سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے اور ان کے نو بچے پیدا ہوئے۔ پرنس عبدالرحمٰن کو ایسی مراعات حاصل تھیں جو عام طور پر غلاموں کو حاصل نہیں تھیں۔ ان مراعات میں آزا دانہ نقل و حمل، محدود پیمانے پر اشیاء کی خرید و فروخت، سبزیوں کی فروخت سے منفعت اور دوسرے غلاموں سے میل جول شامل تھا۔ پھر 1807 میں ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا جس کی گونج وائٹ ہاؤس سے لے کر مراکش کے امیر مولائے سلیمان ثانی تک اور مسی سپی سے ٹمبکٹو تک یکساں سنی گئی۔

1807 کے موسم گرما کی ایک دوپہر کونیٹ چز کے باہر سبزی منڈی میں پرنس عبدالرحمٰن اپنی کاشت کردہ سبزیاں فروخت کر رہے تھے کہ قریب سے گزرتا ہوا ایک پختہ عمر گھوڑ سوار سفید فام ڈاکٹر جان کاکس پرنس عبدالرحمٰن کو دیکھ کر ٹھٹکا، کچھ دیر غور سے دیکھا اور دونوں کے درمیان درج ذیل مکالمہ ہوا جسے ارد گرد کے بہت سارے سفید فام سن کر سکتے میں آ گئے:

ڈاکٹر کاکس: لڑکے تم کہاں سے آئے ہو۔
پرنس: تھامس فوسٹر کے پاس سے۔
ڈاکٹر کاکس: کیا تم اسی ملک میں پلے بڑھے ہو۔
پرنس: نہیں، میرا تعلق افریقہ سے ہے۔
ڈاکٹر کاکس: کیا تم ٹیمبو سے آئے ہو۔
پرنس: ہاں مجھے ٹیمبو سے لایا گیا ہے۔

ڈاکٹر کاکس: کیا تمہارا نام عبدالرحمٰن ہے۔
پرنس: میرا نام یہی ہے۔
ڈاکٹر کاکس: کیا تم مجھے جانتے ہو۔
پرنس: ہاں میں تمہیں جانتا ہوں تم ڈاکٹر جان کاکس ہو۔

17۔ (ٹیری الفورڈ: 1977)

اس مکالمے کے بعد ڈاکٹر کاکس اپنے گھوڑے سے اترے اور پرنس عبدالرحمٰن سے بغل گیر ہوگئے اس منظر کو دیکھنے والے سینکڑوں سفید فام ششدر رہ گئے۔ اور یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ وہ جو پرنس ہونے کا دعویدار تھا حقیقتاً پرنس ہی ہے۔ ڈاکٹر جان کاکس کی گواہی سیاہ فام مسلمان غلاموں کے حق میں پہلی ایسی سفید فام شہادت تھی جس نے امریکی صدر سے عام امریکی شہریوں تک کو یہ سوچنے، جاننے اور ماننے پر مائل کیا کہ اغوا کردہ سیاہ فام غلام محض جاہل اور غیر مہذب نہیں ہیں بلکہ ان میں اپنے سفید فام آقاؤں سے زیادہ مہذب اور تعلیم یافتہ افراد بھی شامل ہیں۔ غلامی کی کمند بلا امتیاز علماء، شہزادگان، معالج، اساتذہ، فلاسفر، اہل قلم، اہل کتاب، صاحب فکر ونظر اور صائب الرائے جانے کس کس کو کھینچ لائی تھی۔

ڈاکٹر جان کاکس جو اصلاً آئرش تھے، 1780 میں غلاموں کو اغوا کرنے والے ایک برطانوی جہاز پر ڈاکٹر متعین تھے۔ جہاز جب افریقہ پہنچا تو جان کاکس شدید بیمار پڑ گئے اور ان کے بچ جانے کی امید نہ رہی۔ سست روی کے باعث وہ اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ گئے اور مقامی افریقیوں کے ہتھے چڑھ گئے وہ انہیں پکڑ کر اپنے بادشاہ ابراہیما ثوری کے پاس لے گئے ابراہیما، ڈاکٹر کاکس سے رحمدلی سے پیش آئے اور ایک خاتون طبیب کو ان کے علاج پر مامور کر دیا۔ چند ماہ کے علاج ونگہداشت سے ڈاکٹر کاکس صحت یاب ہوگئے۔ اور ایک سال ابراہیما ثوری کے شاہی مہمان رہے۔ اسی عرصہ مہمان داری میں وہ ایک لمبے تڑنگے، مضبوط قد کاٹھ اور گھڑسواری کے شوقین پرنس عبدالرحمٰن سے متعارف ہوئے۔ ایک سال بعد ڈاکٹر کاکس کی واپس جانے کی فرمائش پر بادشاہ نے کچھ سونا، زاد راہ کے لیے عنایت کیا اور سولہ محافظوں کی معیت میں ڈاکٹر کاکس کو بحر اوقیانوس کے لیے رخصت کیا کہ وہ کسی جہاز سے برطانیہ چلے جائیں۔ ڈاکٹر کاکس جلد ہی ایک جہاز پر سوار ہونے میں کامیاب ہوگئے اور برطانیہ پہنچے۔ سن 1800 میں برطانیہ سے ہجرت کر کے وہ امریکہ آن بسے اور مسی سپی میں مقیم ہوگئے۔ یہاں وہ ایک نیک

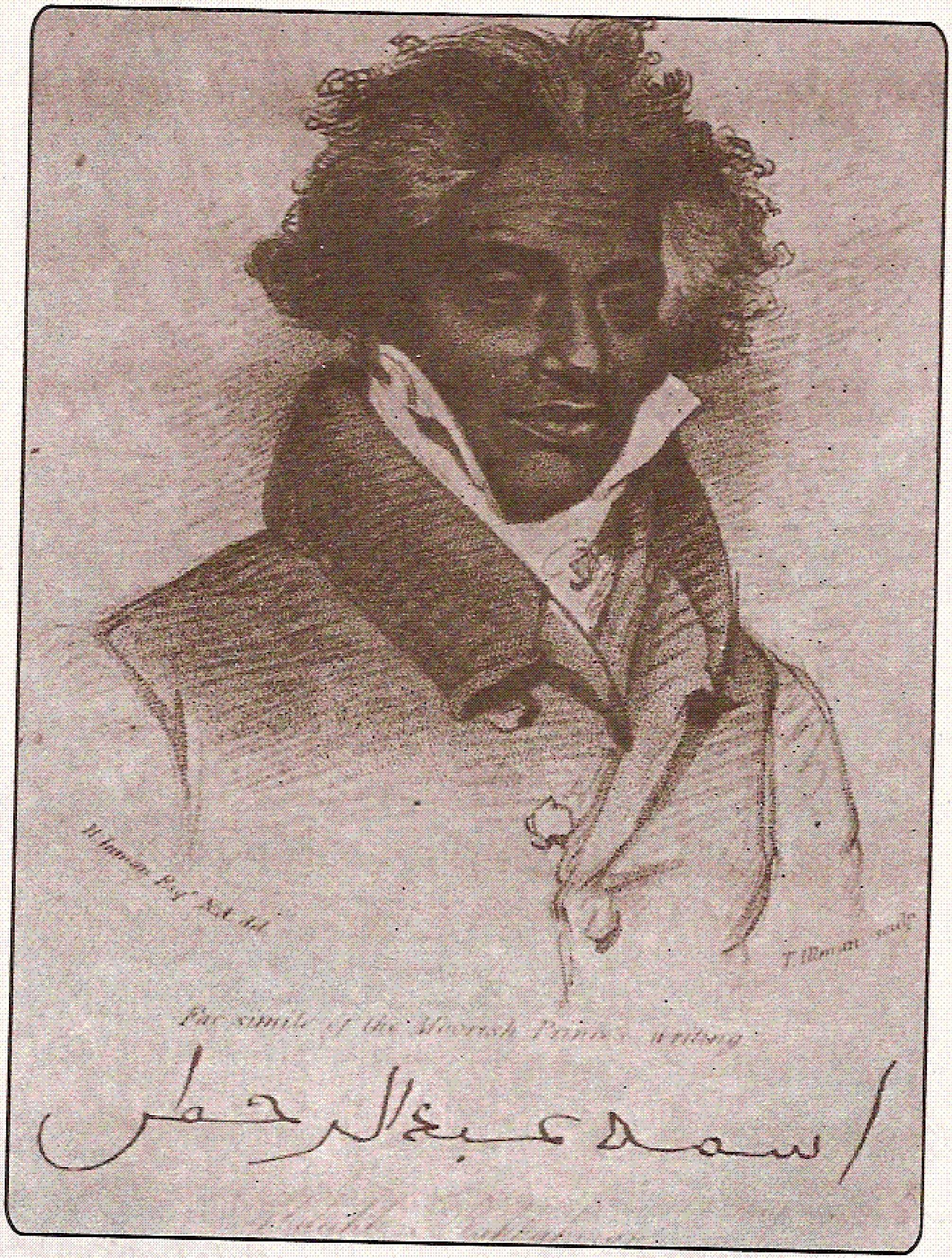
H. Inman Esqr Nat del
T. Illman sculp
Fac simile of the Moorish Prince's writing
اسمه عبد الرحمن

پرنس ابراہیما عبدالرحمٰن ثوری

آرٹسٹ ہنری انمان :1834

نام اور کامیاب سرجن مشہور تھے ۔ 1807 میں پرنس عبدالرحمٰن سے اچانک ملاقات نے ہر دونوں کی زندگی کا دھارا بدل دیا ۔ پرنس عبدالرحمٰن اپنی سوانح میں لکھتے ہیں :

> ”ڈاکٹر کاکس نے کہا کہ ان آلوؤں کو یہیں رکھو اور میرے ساتھ میرے گھر چلو ۔ میں نے کہا کہ میں نہیں جا سکتا البتہ یہ آلو تمہارے گھر پہنچانے جا سکتا ہوں ۔ یہ سن کر وہ تیزی سے گھوڑے پر سوار ہوگئے اور ایک نیگرو عورت کو میرے سر پر سے آلوؤں کا بوجھا اتارنے کا حکم دیا۔ پھر ڈاکٹر کاکس نے اپنے گھر مسی سپی کے گورنر ڈبلیو (وارے) کو مجھ سے ملانے کے لیے بلایا۔ گورنر سے ڈاکٹر کاکس نے کہا کہ میں اس کے والدین کے گھر رہ چکا ہوں اور انہوں نے مجھ سے میرے والدین کی طرح رحمدلی کا سلوک کیا تھا ۔ ڈاکٹر نے گورنر سے کہا کہ اگر کوئی بھی رقم مجھے خرید سکے تو وہ مجھے خرید کر افریقہ واپس بھیجنا چاہتے ہیں ۔ اگلی صبح ڈاکٹر کاکس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ میری کیا قیمت لگائی جائے گی لیکن میرا آقا تھامس فوسٹر مجھے کسی بھی قیمت پر بیچنے میں رضا مند نہیں تھا ۔ ڈاکٹر کاکس نے مجھے خریدنے کے لیے بڑی رقم کی پیشکش کی لیکن اسے قبول نہیں کیا گیا۔ اس پر ڈاکٹر کاکس نے میرے آقا سے کہا ”اگر تم اسے آزاد نہیں کر سکتے تو اس سے اچھی طرح پیش آؤ“ ڈاکٹر کاکس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے نے میری آزادی کے لیے خطیر رقم کی پیشکش کی ۔“
>
> 18۔ (پرنس ابراہیما عبدالرحمٰن : 1828)

سفید فاموں کا جو مجمع ڈاکٹر کاکس اور پرنس عبدالرحمٰن کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا اسی مجمع میں اخبار نیٹ چز ایڈورٹائزر کے ایڈیٹر اینڈریو مارز چک بھی شامل تھے انہوں نے مور پرنس (اندلسی مسلمان شہزادہ) کے نام سے ایک اخباری فیچر شائع کر دیا جو زبان زد عام ہوگیا ۔ یوں پرنس عبدالرحمٰن کا تذکرہ مسی سپی سے نکل کر بالٹی مور، نیو یارک، فلاڈیلفیا، بوسٹن اور واشنگٹن کے اخباروں میں پہنچ گیا فریڈم جرنل، ساؤدرن گلیکسی اور بالٹی مور ایڈورٹائزر جیسے بڑے اخبارات میں پرنس عبدالرحمٰن پر خصوصی مضامین لکھے جانے لگے یوں دیکھتے ہی دیکھتے وہ امریکہ کے مشہور

اور اہم فرد بن گئے۔ خصوصاً شمالی ریاستوں میں ان کی بہت پذیرائی ہوئی چونکہ ان امریکی ریاستوں میں غلامی کے خاتمے کی تحاریک شروع ہو چکی تھیں۔ پرنس عبدالرحمٰن کا پس منظر، شخصیت، ذہانت اور ان کی تحیر بھری کہانی ان تحاریک کے لیے مہمیز ثابت ہوئی۔ انہیں جگہ جگہ سے غلامی کے موضوع پر اپنا تجربہ بیان کرنے کے لیے مدعو کیا جانے لگا۔ ڈاکٹر ایلین آسٹن لکھتے ہیں:

> ''پرنس عبدالرحمٰن 1820 کے آخرعشرہ میں امریکہ کے مقبول ترین سیاہ فام شخصیت شمار ہوتے تھے۔'' 19۔ (ایلین آسٹن: 1984)

کسی نا معلوم اور پر اسرار وجہ سے پرنس عبدالرحمٰن نے خود کو 'مور پرنس' مشہور کر رکھا تھا جبکہ حقیقتاً وہ جالونی پرنس تھے۔ وہ اندلسی شہزادوں جیسا لباس پہنتے اور مورش پرنس پکارے جاتے حالانکہ ان کا تعلق وسطی افریقہ کے مشہور اسلامی مرکز ٹمبکٹو سے تھا۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ چونکہ اٹھارہویں صدی تک مسلمانوں کے بارے میں امریکی علم ملکہ ازابیلا اور ہسپانیہ کے حوالے سے اندلسی مسلمانوں تک ہی محدود تھا سو عین ممکن ہے کہ پرنس عبدالرحمٰن نے اس امریکی لاعلمی کی درستگی پر وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ اخبارات نے بغیر کسی تحقیق و تصدیق کے انہیں مورش پرنس لکھنا شروع کردیا، پرنس عبدالرحمٰن نے اس کی تردید مناسب نہ سمجھی اور وہ مورش پرنس مشہور ہو گئے۔

1810 کے عشرے میں ایک طرف تو امریکہ میں پرنس عبدالرحمٰن کی شہرت و مقبولیت بڑھ رہی تھی اور دوسری طرف تھامس فوسٹر کی پرنس عبدالرحمٰن کو آزاد نہ کرنے کی ضد۔ تھامس فوسٹر کسی بھی قیمت پر، پرنس کو آزاد کردینے پر تیار نہیں تھا۔ وہ ڈاکٹر جان کاکس کی ہر پیشکش کو ٹھکرا چکا تھا اور ہر کوشش ناکام بنا چکا تھا۔ ڈاکٹر کاکس پرنس عبدالرحمٰن کو افریقہ واپس بھیج کر ابراہیما ثوری کے جس احسان کا بدلہ چکانا چاہتے تھے کوشش کے باوجود ان کی زندگی میں ایسا نہ ہو سکا۔ اپنی زندگی کے آخری دس سال انہوں نے پرنس عبدالرحمٰن کی آزادی کی جنگ لڑی لیکن ان کا مقابلہ تھامس فوسٹر جیسے تنگ نظر اور پیچیدہ ذہنیت کے ایسے جاگیر دار سے تھا جو جنوبی ریاستوں میں غلامی کے حق میں کمر بستہ و متفق جاگیرداروں کے گٹھ جوڑ کا اہم مہرہ تھا۔ ڈاکٹر جان کاکس پرنس عبدالرحمٰن کو آزاد ہوتے اور افریقہ جاتے نہ دیکھ سکے اور 1816 میں انتقال کر گئے۔ ڈاکٹر کاکس کے بعد ان کے بیٹے ولیم روسیو کاکس نے اپنے باپ کے مشن کو 1828

تک جاری رکھا۔

ڈاکٹر جان کاکس اور ولیم کاکس کی جدوجہد اپنی جگہ لیکن پرنس عبدالرحمٰن کی جدوجہد آزادی میں فیصلہ کن لمحہ انتہائی غیر متوقع طور پر 1826 میں اس وقت آیا جب وہ اپنے پرانے رفیق کار اور ہمنوا مسی سپی ہیرالڈ کے نامہ نگار اور نیٹ چز ایڈوٹائزر کے ایڈیٹر اینڈریو مارز چک سے محو گفتگو تھے۔ دوران گفتگو پرنس عبدالرحمٰن نے ایک خط افریقہ بھیجنے کا عندیہ ظاہر کیا جس کے جواب میں اینڈریو مارز چک نے خط کو افریقہ تک پہنچانے کی ذمہ داری لے لی۔ ٹیری الفورڈ لکھتے ہیں:

> ''40 سال بعد پرنس عبدالرحمٰن قرآنی آیات کے سوا بیشتر عربی گرامر اور عربی لکھنا بھول چکے تھے لہٰذا اس خط میں بھی انہوں نے قرآنی آیات لکھیں لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انہوں نے کونسی سورۃ تحریر کی۔''

20۔ (ٹیری الفورڈ: 1977)

(وضاحت: پرنس عبدالرحمٰن کے اس خط کا کوئی ریکارڈ یو ایس سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ واشنگٹن ڈی سی یا مراکش کی وزارت خارجیہ میں موجود نہیں ہے۔ نہ ہی اس خط کا کوئی حوالہ رائل لائبریری رباط یا رباط آرکائیوز میں موجود ہے۔ مصنف) پرنس عبدالرحمٰن کا یہ خط تو محفوظ نہیں رہ سکا لیکن اینڈریو مارز چک، سینیٹر تھامس ریڈ کے نام تعارفی سرنامہ میں لکھتے ہیں:

> نیٹ چیز
> 3 اکتوبر 1826
>
> ڈیر سر:
>
> یہ منسلکہ خط عربی میں، میرے سامنے ایک قابل احترام پرنس نامی بوڑھے غلام نے تحریر کیا ہے جو اس کاؤنٹی میں مسٹر تھامس فوسٹر سے متعلق ہے۔ میں اسے عرصہ 15 سال سے جانتا ہوں اور میں اس کے صاحب کردار ہونے کی گواہی دیتا ہوں۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا تعلق مراکش کے شاہی خاندان سے ہے اور یہ خط جیسا کہ اس نے مجھے بتایا ہے اپنے رشتہ داروں کا حال احوال جاننے اور ان سے جا ملنے کی امید میں لکھا گیا

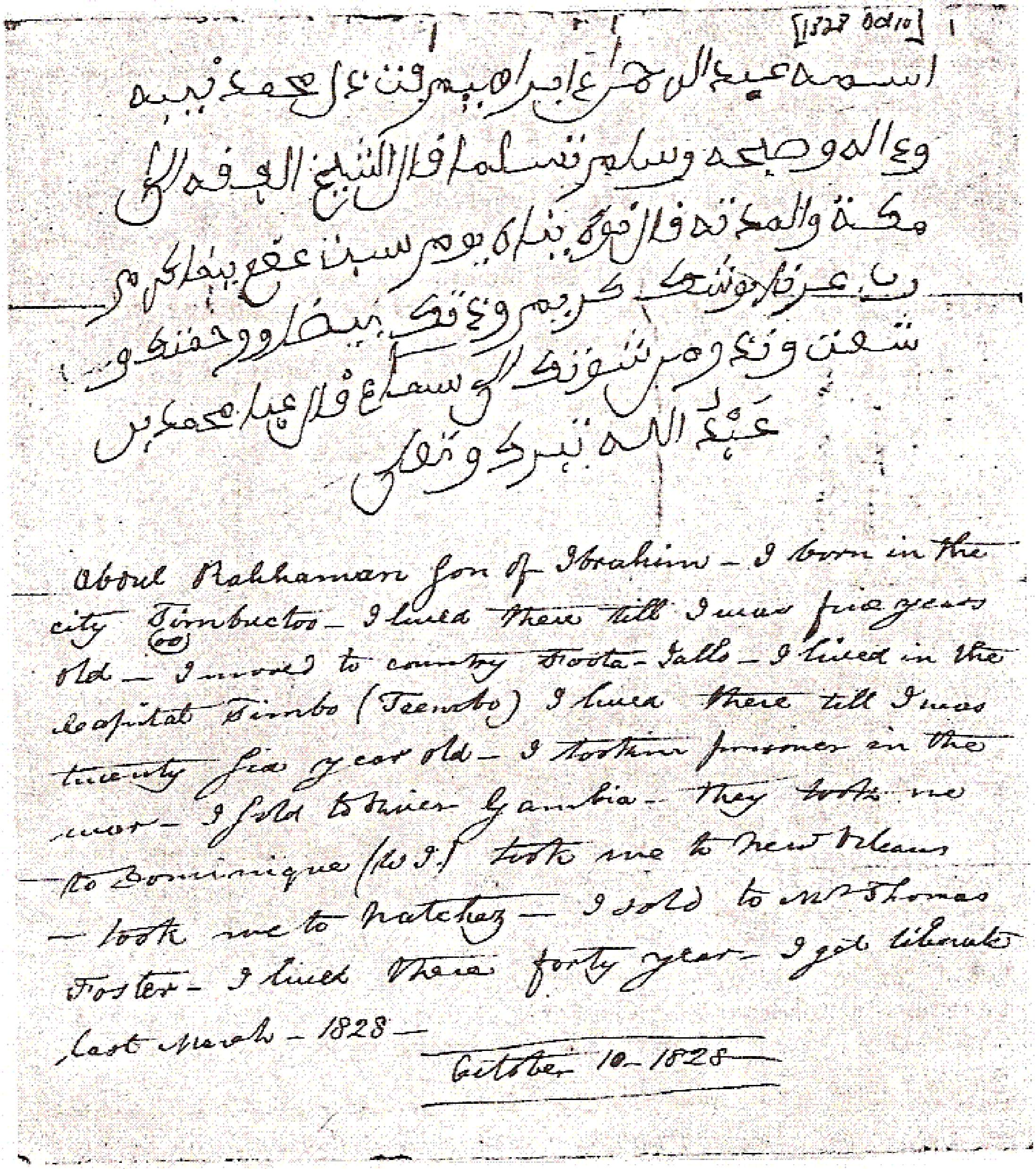

[1828 Oct 10] 1

اسمه عبد الرحمن ابراهيم [illegible] على محمد نبيه
وعلى اله وصحبه وسلم تسليما قال الشيخ [illegible]
مكة والمدينة قال [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
عنه الله [illegible]
[illegible]

Abdul Rahhaman Son of Ibrahim – I born in the city Timbuctoo – I lived there till I was five years old – I moved to country Foota-Jallo – I lived in the capital Timbo (Teembo) I lived there till I was twenty five year old – I tooken prisoner in the war – I sold to river Gambia – they took me to Dominique (W.I.) took me to New Orleans – took me to Natchez – I sold to Mr Thomas Foster – I lived there forty year – I got liberate last March – 1828 –

October 10 – 1828

پرنس ابراہیما عبدالرحمٰن ثوری کی عربی اور انگریزی تحریر کا عکس

اکتوبر 1828ء

> ہے۔ میں نے اس خط کو منزل مقصود تک پہنچانے کی ذمہ داری لی ہے اور اس معاملہ کو آپ کی نگرانی میں دیتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ آپ بوڑھے غلام کی خواہشات کی تکمیل میں اس کی مدد فرمائیں گے۔

اینڈریو مارز چک

21۔ (سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ مائیکروفلم ریکارڈ: 1827)

سینیٹر تھامس ریڈ نے اس خط کو سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے حوالے کردیا وہاں سے یہ خط طنجہ میں امریکی سفیر کو روانہ کیا گیا۔ 14 مارچ 1827 کو یہ خط امریکی سفیر تھامس ملاؤ نے کو موصول ہوا تو وہ ایک موقع ہاتھ آجانے کے خیال سے اس عربی تحریر کو دیکھ کر سرشار ہوگیا۔ افریقی ساحلوں پر مراکشی حکومت نے سیاہ فاموں کے اغوا پر سخت پابندیاں عاید کررکھی تھیں۔ ان پابندیوں کو توڑتے ہوئے چند ایک امریکی مہم جو مراکشی حکومت کے ہتھے چڑھ گئے تھے امریکی سفیر ان امریکی خرکاروں کی رہائی کے بدلے میں مورش پرنس کی رہائی کا منصوبہ باندھ کر پاشا عبدالرحمٰن دوئم امیر مراکش کی خدمت میں پیش ہوا اور پرنس عبدالرحمٰن کا خط پیش کیا۔ امریکہ کے قیام سے انیسویں صدی کے وسط تک مراکش واحد ایسی اسلامی مملکت تھی جس سے امریکہ کے خصوصی اور سفارتی تعلقات قائم رہے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ حقیت پر مبنی ہے کہ امریکہ کے نزدیک اسلامی دنیا صرف مراکش تک محدود تھی۔ یہ تاریخی ستم ظریفی بھی اپنی جگہ خوب ہے کہ امریکہ کے اعلان آزادی کے بعد برطانوی مخالفت' دباؤ اور دبدبے کے باوجود امریکہ کو تسلیم کرنے والا سب سے پہلا ملک مراکش ایک اسلامی ملک ہی تھا۔ 1777 میں مراکش نے سب سے پہلے امریکہ کو بحیثیت آزاد وخودمختار ریاست تسلیم کرکے اسلامی دنیا کی امریکہ سے تعاون کی جو بنیاد رکھی تھی اسے اسلام دشمنی سے آلودہ ملکہ ازابیلا کے ورثاء نے کوئی اہمیت نہ دی۔ ورثائے ازابیلا کے موجودہ اسلام دشمن رویے پر حیران ہونے کی بجائے امہ کی اس لاعلمی پر ماتم کیا جانا چاہیے کہ وہ امریکی سرشت میں پوشیدہ مسلمان مخاصمت اور اسلام دشمنی کے رجحان اور رویے کو پہچاننے میں ہمیشہ ناکام رہی ہے۔

پاشا عبدالرحمٰن دوئم نے پرنس عبدالرحمٰن کے خط کو غور سے پڑھا' تشویش سے دیکھا اور سرعت سے فیصلہ کیا کہ شاہی حکومت کے اخراجات پر اس شخص کو فوراً امریکہ سے مراکش لایا جائے۔ پاشا نے سفیر کو دوٹوک ہدایت دیتے ہوئے کہا ”اس مد میں تمام مصارف فوراً ادا کردیے جائیں گے۔“

22۔ (ہنری کلے پیپرز: 1827)

پاشا عبدالرحمٰن دوئم کے اس دوٹوک فیصلے کے بعد امریکی سفیر تھامس ملاؤ نے ' نے سیکریٹری آف سٹیٹ ہنری کلے کو خط بھیجا:

24 مارچ 1827

قابل احترام سیکریٹری آف سٹیٹ کے نام میں یہ مشورہ بھیج رہا ہوں کہ اس شخص (پرنس عبدالرحمٰن) کو آزاد کر کے گھر بھیج دیا جائے اس سے مستقبل میں ہمارے ان بدقسمت اشخاص کو فائدہ ہوسکتا ہے جو کسی بھی حادثے کی وجہ سے اس سلطنت کے قبضے میں آسکتے ہیں ۔ (یعنی سیاہ فاموں کو اغوا کرتے ہوئے امریکی اغوا کار اور جہاز ران وغیرہ ۔ مصنف) ۔ میں انتہائی اخلاص سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اس شخص کو مجھے بھیج دیا جائے تاکہ میں خود اسے بادشاہ کے حوالے کروں ۔ اگر سیکریٹری آف سٹیٹ میری تجویز سے اتفاق کریں تو اس شخص کو جبرالٹر میں امریکی سفارت خانے بھجوا دیں ۔ اس (پرنس عبدالرحمٰن) کی آزادی سے مجھے یہاں خصوصی قوت حاصل ہوگی ۔ اس سے مسلمانوں پر ہمارا احسان ثابت ہوجائے گا جو کہ پہلے ہی شکر گزاری کی اضافی صفت کے حامل ہیں ۔

تھامس ملاؤ نے

دستخط

24 مارچ 1827

23 ۔ (تھامس ملاؤ نے : 1827 سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ مائیکروفلم ریکارڈ : 1827)

5 جون 1827 کو اس خط پر سیکرٹری آف سٹیٹ ہنری کلے نے اپنے نوٹ میں لکھا:

''رحمدلی کی مروجہ روایت میں اس غلام کو خرید کر باعزت طریقے سے اس کے وطن روانہ کرنے کی سفارش کی جاتی ہے ۔''

ہنری کلے ۔ سیکریٹری آف سٹیٹ

دستخط

5 جون 1827

دس جولائی 1827 کو یہ خط وائٹ ہاؤس میں صدر جان کیونسی ایڈمز کو پیش کیا گیا۔ اسی زات صدر نے اپنے ذاتی روزنامچے میں لکھا:

> ،،مسٹر برنٹ ایک افریقی کے بارے میں کچھ کاغذات لائے جو مراکو کے بادشاہ کا تعلق دار لگتا ہے لیکن یہ جارجیا میں غلام ہے مسٹر برنٹ نے مجھے وہ خط دکھایا جو اس غلام کے بارے میں مراکو کے بادشاہ نے مسٹر ملاؤ نے کے توسط سے بھجوایا ہے۔ مسٹر ملاؤ نے' نے ترجمہ کیئے ہوئے اس خط میں پر زور سفارش کی ہے کہ حکومت امریکہ اس شخص کو خرید کر مراکش کے بادشاہ سے خیر سگالی کے اظہار کے طور پر روانہ کردے۔ میں نے مسٹر برنٹ سے کہا ہے کہ وہ جارجیا خط لکھ کر پوچھیں کہ اسے کتنے میں خریدا جاسکتا ہے اور اگر یہ عملی طور پر ممکن ہو تو مسٹر ملاؤ نے کی خواہش پر عمل درآمد کیا جائے۔"

24۔(میساچوسٹس ہسٹاریکل سوسائٹی ریکارڈ' جان کیونسی ایڈمز پیپرز: 1827)

یو ایس سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے چیف کلرک مسٹر برنٹ کا خط 20 اگست 1827 کو اینڈریو مارز چک کو وصول ہوا جس میں صدر جان ایڈمز کی طرف سے پرنس عبدالرحمٰن کو ان کے آقا سے خریدنے کا معاملہ طے کرنے کی ہدایت کی گئی۔ اینڈریو مارز چک نے جو اس معاملے میں روز اول سے ہی سرگرمی سے شریک تھے بلا توقف تھامس فوسٹر سے سودا طے کرنے کی پوری کوشش کی لیکن ادھر ایک ہی جواب تھا' یہ نہیں ہوسکتا 'یہ ممکن نہیں ہے۔ پرنس عبدالرحمٰن کی آزادی کے لیے ڈاکٹر جان کاکس کی 1807 سے شروع کردہ جدوجہد پر ناکامی کے بیس سال گزر چکے تھے۔ اس دوران تھامس فوسٹر کی ایک ضد اور ایک 'ناں' نے ہر اس کوشش کو ناکام بنا دیا تھا جو پرنس عبدالرحمٰن کو آزاد کرانے کے ضمن میں کی گئی تھی حالانکہ ان کوشش کرنے والوں میں گورنر' سینیٹر' ڈاکٹر' چرچ کے نمائندے' سیاہ فاموں کے حقوق کی تنظیمیں' حریت پسند خیالات کے رہنما' صحافی' اہل قلم اور صدر امریکہ تک سب شامل تھے۔

پھر ایک دن یکا یک پرنس عبدالرحمٰن کی قسمت نے یاوری کی۔

22 فروری 1828 کو چشم فلک نے ایک مختلف منظر دیکھا۔ دو ہم عمر بوڑھے آدمی جو ایک ہی سال پیدا ہوئے تھے اور ایک ہی سال فوت ہوئے خاموشی سے گھوڑوں پر سوار نیٹ چز

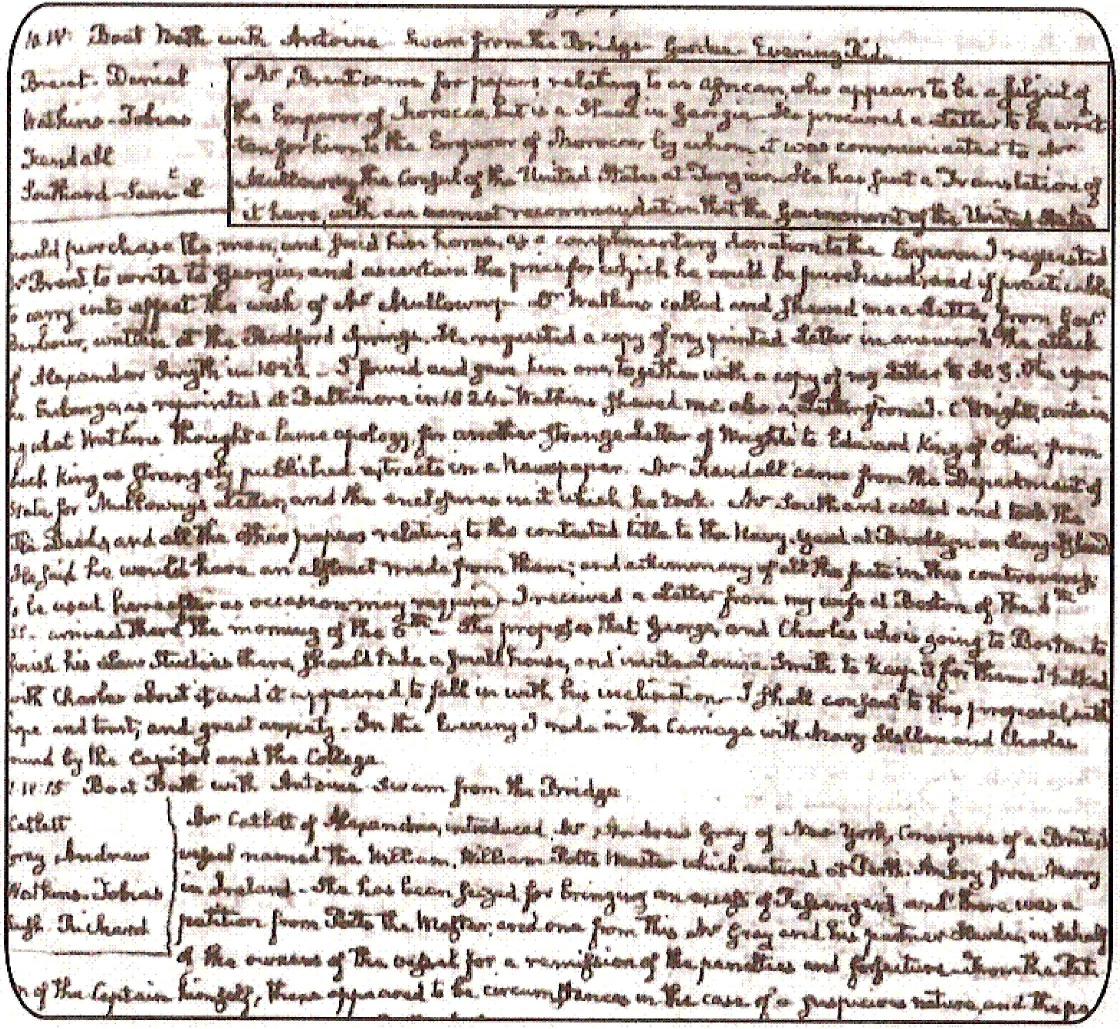

10.W: Boat Bath with Antoine. Swam from the Bridge. Garden. Evening Ride.

Brent. Daniel
Watkins-Tobias
Randall
Southard-Saml. L.

Mr. Brent came for papers relating to an African, who appears to be a subject of
the Emperor of Morocco, but is a Slave in Georgia. He procured a Letter to be writ-
ten for him to the Emperor of Morocco by whom it was communicated to Mr.
Mullowny the Consul of the United States at Tangier. He has sent a Translation of
it here, with an earnest recommendation that the Government of the United States
ould purchase the man, and send him home, as a complimentary donation to the Emperor. I requested
r Brent to write to Georgia, and ascertain the price for which he could be purchased, and if practicable
o carry into effect the wish of Mr. Mullowny. Mr. Watkins called and shewed me a Letter from Govr.
Barbour, written at the Bedford Springs. He requested a copy of my printed Letter in answer to the attack
f Alexander Smyth in 1822. I found and gave him one together with a copy of my Letter to H. G. O. upon
e Embargo, as reprinted at Baltimore in 1824. Watkins shewed me also a Letter from R. C. Wright, contain
g what Watkins thought a lame apology for another strange Letter of Wright's to Edward King of Ohio, from
hich King so strangely published extracts in a Newspaper. Mr. Randall came from the Department of
tate for Mullowny's Letter, and the enclosures in it which he took. Mr. Southard called and took the
title Deeds and all the other papers relating to the contested title to the Navy-yard at Brooklyn on Long-Island.
He said he would have an abstract made from them; and a summary of all the facts in the controversy,
o be used hereafter as occasion may require. I received a Letter from my wife at Boston of the 3d
st. arrived there the morning of the 2d. She proposes that George, and Charles who is going to Boston to
finish his Law Studies there, should take a small house, and invite Louisa Smith to keep it for them. I talked
with Charles about it and it appeared to fall in with his inclination. I shall consent to this proposal, with
ope and trust; and great anxiety. In the Evening I rode in the Carriage with Mary Hellen and Charles
ound by the Capitol and the College.

1.11.15 Boat Bath with Antoine. Swam from the Bridge.

Catlett
Gray Andrew
Watkins. Tobias
Smyth. Richard

Mr. Catlett of Alexandria, introduced Mr. Andrew Gray of New York, Consignee of a British
vessel named the William, William Potts Master which entered at Perth Amboy from Newry
in Ireland. She has been seized for bringing an excess of Passengers; and there was a
petition from Potts the Master, and one from this Mr. Gray and his partner Stanley, in behalf
of the owners of the vessel for a remission of the penalties and forfeiture. From the state
n of the Captain himself, there appeared to be circumstances in the case of a suspicious nature, and the p

پرنس عبدالرحمٰن کے بارے میں صدر جان کیونسی ایڈمز
کی تحریر کا عکس (ایڈمز ڈائری: 1827)

کاؤنٹی آفس کی طرف جارہے تھے۔ 40 سال پہلے 1788 میں بھی وہ اسی طرح اس دفتر میں آئے تھے اس وقت وہ جوان' اولوالعزم' باتونی اور جارح تھے انہیں آنے والے سالوں کی سوچ درپیش تھی لیکن آج وہ خاموش' دفاعی' تھکے ہارے' غمزدہ اور تقدیر پر شاکر تھے۔ اب انہیں سالوں کا نہیں مہینوں کا سوچنا رہ گیا تھا۔ ان کے بال سفید ہو چکے تھے' وہ قدرے ٹھہر کر بولتے تھے اور گھوڑوں پر سواری کرتے ہوئے ان کی بے زاری صاف دیکھی جا سکتی تھی لیکن چہروں پر یکساں بے زاری کے باوصف ان کی مشیت مختلف تھی۔

یہ دو بوڑھے تھامس فوسٹر اور پرنس عبدالرحمٰن تھے۔

تھامس فوسٹر غیر متوقع طور پر' پرنس عبدالرحمٰن کو آزاد کرنے پر رضا مند ہو گئے بشرطیکہ انہیں فوراً امریکہ سے افریقہ روانہ کر دیا جائے اور وہ یہاں امریکہ میں بطور آزاد شہری قیام نہیں کر سکتے۔ اگر کسی بھی وجہ سے انہیں افریقہ نہ بھیجا جا سکے تو وہ دوبارہ میری غلامی میں آجائیں گے اور پرنس عبدالرحمٰن پر میری ملکیت برقرار رہے گی۔ 25۔ (ٹیری الفورڈ: 1977)

چالیس برس قبل تھامس فوسٹر نے اسی دفتر میں پرنس عبدالرحمٰن کو خریدنے کی دستاویز پر دستخط کیئے تھے آج وہ انہیں آزاد کرنے کی دستاویز پر دستخط کرنے آرہے تھے۔ گو کہ تقدیر دونوں کے فیصلوں پر بہت پہلے اپنے دستخط کر چکی تھی لیکن فیصلہ ہنوز باقی تھا۔ ایک اپنے ترکش میں زہر بجھا ہر تیر آزمائے' سرنہوڑے' آنکھیں سکیڑے کانپتے ہاتھوں سے لگامیں تھامے محوسفر مگر اختتام سفر پر تھا اور دوسرا محض اس لیے محوسفر تھا کہ ایک اور طویل سفر پر روانہ ہو سکے۔ غالباً بہت ہی طویل۔ تھامس فوسٹر نے پرنس عبدالرحمٰن کے پروانہ آزادی پر دستخط کرتے ہوئے لکھا:

> ریاست مسی سپی
> ایڈمز کاؤنٹی
>
> مطلع کیا جاتا ہے کہ میں تھامس فوسٹر سکنہ ایڈمز کاؤنٹی' ریاست مسی سپی اس وقت پرنس نامی غلام کا مالک ہوں۔ آج کے دن سے میں اس غلام کو اینڈریو مارز چک رہائشی نیٹ چز ریاست مسی سپی کی تحویل میں صرف اور واحد اس مقصد کے لیے دیتا ہوں کہ حکومت امریکہ اس نوشتہ میں تحریر کردہ شرط سے متفق ہوتے ہوئے اس پرنس نامی غلام کو اس کے آبائی وطن روانہ کر دے لیکن پرنس کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں آزاد شہری

کی مراعات وحقوق حاصل نہیں ہوں گے۔

اس نوشتہ کی تصدیق کرتے ہوئے بمقام نیٹ چز' آج ماہ فروری کے بائیسویں دن سال مسیح ایک ہزار آٹھ سو اٹھائیس' اپنے دستخط ثبت کرتا ہوں۔

تھامس فوسٹر	عینی گواہ نوشتہ:
مہر/دستخط	گیبریل ڈنبار
	چانسری کلرک آفس
	نیٹ چز' مسی سپی 1828

26۔ (ایڈمز کاؤنٹی چانسری کلرک آفس ریکارڈ: 1828)

40 سالہ غلامی کے مصائب' زلت' بے وطنی اور تحقیر کے بعد حامل پروانہ آزادی کے جذبات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ میں اور آپ نہ تو ایسی جذبات بھری ساعت کا تعین کر سکتے ہیں نہ اس دلی مسرت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو اس طرح کی ساعت خوش بخت سے پھوٹتی ہوگی۔ لیکن ہمارے اندازوں کے برعکس اس ساعت خوش ندا نے پرنس عبدالرحمٰن کو آزردہ کر دیا۔ تھامس فوسٹر کی شرط کے مطابق آزاد شہری کی حیثیت سے وہ امریکہ میں رہ نہیں سکتے تھے جبکہ ان کے نو بچے اور بیوی ازابیلا جس سے 37 سالہ رفاقت رہی تھی ہنوز تھامس فوسٹر کی غلامی میں تھے۔ اب ان کے ایک ہاتھ میں اپنے لیئے پروانہ آزادی تھا اور دوسرے میں اپنے اقرباء کے لیے نذرانہ آزادی۔ ان کے پاس وقت کم تھا اور فیصلہ کٹھن' راہ دشوار گزار تھی اور ابتلا کڑی۔ انہوں نے ہمت نہ ہارنے اور حالات سے لڑتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ اینڈریو مارز چک ایک بار پھر تھامس فوسٹر سے عرض گزار ہوئے۔ ''ایسی آزادی کا کیا فائدہ؟ وہ احسان ہی کیا جو ادھورا ہو ...... جانے لمحہ قبولیت کا تھا کہ مزید آزمائش کا تھامس فوسٹر نے دو سو ڈالر میں ازابیلا مسز عبدالرحمٰن کو آزاد کر دینے کی حامی بھر لی جو فوری طور پر نیٹ چز کے شہریوں نے چندہ کر کے اکٹھے کیئے اور ازابیلا کو رہائی نصیب ہوئی۔ تاہم پرنس عبدالرحمٰن کے بچے ابھی تک تھامس فوسٹر کی غلامی میں تھے ان کی بازیابی کے لیے انہوں نے صدر امریکہ سے ذاتی طور پر مل کر عرض گزارنے کا قصد کیا۔

پرنس عبدالرحمٰن نو اپریل 1828 کو نیٹ چز سے واشنگٹن کے لیے روانہ ہوئے۔ دوران

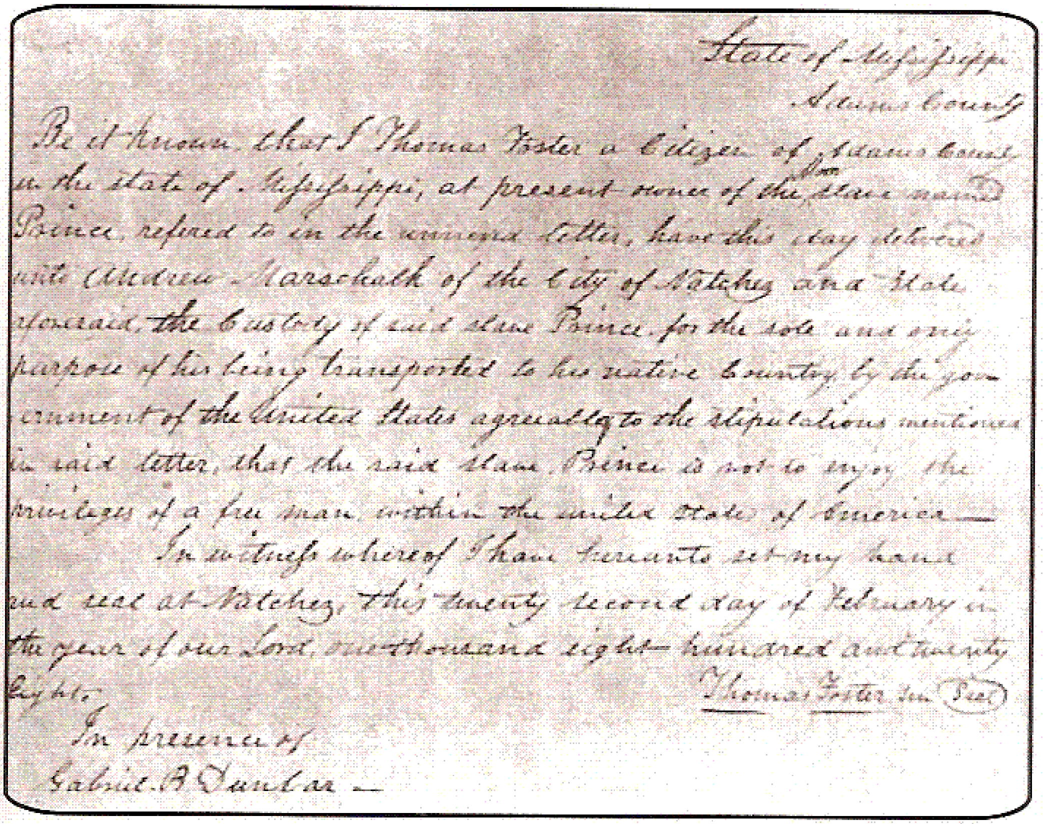

State of Mississippi
Adams County

Be it known that I Thomas Foster a Citizen of Adams County in the state of Mississippi, at present owner of the slave named Prince, refered to in the annexed letter, have this day delivered unto Andrew Marschalk of the City of Natchez and State aforesaid, the Custody of said slave Prince, for the sole and only purpose of his being transported to his native Country by the government of the United States agreeably to the stipulations mentioned in said letter, that the said slave Prince is not to enjoy the privileges of a free man within the united State of America —

In witness whereof I have hereunto set my hand and seal at Natchez, this twenty second day of February in the year of our Lord, one thousand eight hundred and twenty eight.

Thomas Foster Sen (Seal)

In presence of
Gabriel B Dunbar —

دستاویز آزادی پرنس عبدالرحمٰن
تھامس فوسٹر کا تحریر کردہ پروانہ آزادی :1828

سفر اہم شہروں میں ملاقاتیں اور تقریریں کرتے ہوئے وہ بالٹی مور پہنچے جہاں وہ بنجامن لنڈی کے مہمان ہوئے۔ بنجامن لنڈی غلاموں کے خلاف امریکہ کے موثر ترین اخبار ”جینیس آف یونیورسل امانسی پیشن“ کے ایڈیٹر تھے۔ دس مئی کو اس اخبار کے وقائع نگار ولیم سویم نے پرنس عبدالرحمٰن پر اپنے خصوصی فیچر میں لکھا:

> ”اگرچہ ظلم وستم کے شکار اس شخص کو خاصی تاخیر سے زندگی کے فطری حقوق سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ہے تاہم اس کے بچے ابھی تک غلامی میں ہیں۔ ہمیں اپنے درد بھرے حقائق سے آگاہ کرتے ہوئے آنسو بے ساختہ اس کی آنکھوں سے نکلے اور رخساروں پر بہنے لگے۔“

27۔ (ولیم سویم: 1828)

اسی روز (دس مئی) کو سیکرٹری ہنری کلے بالٹی مور میں موجود تھے۔ پرنس عبدالرحمٰن ان سے ملے۔ سیکرٹری ہنری کلے پرنس کے اطوار، گفتگو اور ذہانت سے متاثر ہوئے۔ انہیں واشنگٹن آنے کی دعوت دی اور ان کے مسئلے پر ہمدردانہ غور کا وعدہ کیا۔

15 مئی کو پرنس عبدالرحمٰن وہائٹ ہاؤس میں صدر کیونسی ایڈمز سے ملنے آئے اور ان سے دو معاملات میں مدد کی درخواست کی۔ اوّل ...... وہ مراکش نہیں بلکہ لائبیریا جانا چاہتے ہیں جہاں کے ساحل سے ان کا گھر قریب تر ہے۔ دوئم ان کے بچے اور پوتے، پوتیاں نیٹ چز میں تھامس فوسٹر کی غلامی میں ہیں جنہیں وہ ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ انہیں چھوڑ کر جانا ان کی آزادی کو سوالیہ بنا دے گا۔ انہوں نے صدر جان ایڈمز پر زور دیتے ہوئے کہا کہ:

> ”مجھے آزاد کرا کے آپ نے ایک مسئلہ ختم کرتے ہوئے تیرہ مزید پیدا کر لیئے ہیں حتیٰ کہ ان کو بھی آزاد کرا دیا جائے۔“

28۔ (جان ایڈمز ڈائری: 1828)

اس نئی صورت حال نے صدر سمیت امریکی انتظامیہ کو ایک عجیب مخمصے سے دو چار کر دیا۔ اب جبکہ پرنس عبدالرحمٰن کی آزادی کی بنیاد مراکش کے پاشا عبدالرحمٰن دوئم کی اس خواہش پر رکھی تھی کہ انہیں آزاد کر کے مراکش بھیج دیا جائے اور اب وہ وہاں جانا نہیں چاہتے تھے۔ مراکش جانے سے انکار نے منطقی طور پر ان وجوہات کی نفی کر دی جن کی بنیاد پر امریکی انتظامیہ پرنس عبدالرحمٰن کو آزادی دلا کر مراکش بھیجنا چاہتی تھی۔ پرنس عبدالرحمٰن کے انکار نے اس معاملے

میں امریکی دلچسپی اور مفادات پر پانی پھیر دیا۔ امریکی انتظامیہ کی عدم دلچسپی پرنس عبدالرحمٰن کی آزادی پر خط تنسیخ کھینچ کر انہیں دوبارہ تھامس فوسٹر کے پاس پہنچا سکتی تھی لیکن ان کی دل زدہ سنجیدگی، قوت استدلال، مہذب اطوار اور متاثر کن شخصیت نے امریکی انتظامیہ کو ہمدردانہ رویے پر مائل کیئے رکھا۔ صدر جان ایڈمز سے پرنس عبدالرحمٰن کی ملاقات کے موقع پر واشنگٹن ڈی سی کے ایک مذہبی رہنما آر بی سی ہاول جو وہاں موجود تھے لکھتے ہیں:

> "اس (پرنس عبدالرحمٰن) کے طور طریقوں میں نچلے طبقے کے افراد جیسی کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ وہ کسی بھی قابل احترام، تعلیم یافتہ اور باوقار شخص کی طرح پیش آیا۔ اس کے پرسکون رویے میں ذہانت، برابری اور آزادی نمایاں تھی۔" 29۔ (آر۔بی۔سی۔ہاول: 1829)

صدارتی انتخابی سال ہونے کی وجہ سے ایک طرف تو صدر ایڈمز کوئی بھی ایسا فیصلہ کرنے میں خاصے محتاط تھے جو تنقید کا در وا کردے اور دوسری طرف انہیں ایک ایسا فیصلہ کرنا تھا جس کی بنیاد میں شگاف پڑ چکا تھا۔ اس معاملے پر ان کے ہر فیصلے پر تنقید کی جا سکتی تھی۔ سیکریٹری ہنری کلے اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

> "صدر جان ایڈمز کو ایک مشکل فیصلہ کرنا تھا ان کے سامنے بظاہر دو ہی راستے تھے اوّل یہ کہ پرنس کو اس کی مرضی کے خلاف مراکش بھیج دیا جائے۔ دوئم اسے واپس تھامس فوسٹر کے پاس نیٹ چز بھیج دیا جائے۔ لیکن صدر ایڈمز نے ایک تیسرا فیصلہ کیا جو، ان دونوں سے نسبتاً کہیں کم باعث شرمندگی تھا۔" 30۔ (ہنری کلے: نیشنل آرکائیوز ریکارڈ: 1829)

15 مئی 1828 کو صدر جان ایڈمز نے پرنس عبدالرحمٰن سے ملاقات کا احوال اپنے روزنامچے میں قلم بند کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پرنس عبدالرحمٰن کی آزادی تنسیخ کے کس قدر قریب آ چکی تھی۔ صدر لکھتے ہیں:

> عبدالرحمٰن ایک مور (اندلسی مسلمان) ہے جسے پرنس یا ابراہیم کہا جاتا ہے وہ اس ملک میں 40 سال سے غلام ہے اس نے دو تین سال پہلے ایک خط عربی میں مراکش کے بادشاہ کو ارسال کیا تھا جس کے نتیجے میں مراکش

> کے بادشاہ نے اس شخص کو آزاد کر کے مراکش بھیجنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ نیٹ چز، مسی سپی میں اس کے مالک نے اسے اس شرط پر آزاد کیا کہ حکومت امریکہ اسے واپس بھیج دے۔ وہ آج مجھ سے اس وقت ملنے آیا جب مسٹر ساؤ تھارڈ (سیکریٹری نیول فورسز) بھی میرے پاس تھے۔ ہم نے بات چیت کے دوران ان سے بھی رائے لی کہ اسے کب اور کیسے اس کے گھر بھیجا جائے جو کہ اب اس کے کہنے کے مطابق ٹمبکٹو میں ہے۔ چونکہ مراکش کے بادشاہ نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اسے بھیج دیا جائے سو، اسے واپس بھیجنے میں ہماری حکومت کی دلچسپی صرف اسی وجہ سے تھی۔“ 31۔ (ایڈمز پیپرز: 1828)

صدر جان ایڈمز سے ملاقات کو 6ماہ ہو چکے تھے اور 1829 آن پہنچا تھا۔ پرنس عبدالرحمٰن اور ان کی زوجہ ازابیلا پر شک، بے یقینی اور ناکامی کے خوف کی پرچھائیاں گہری ہوتی جاتی تھیں۔ انہیں صدر جان ایڈمز کے فیصلے کا شدت سے انتظار تھا۔ بالٹی مور، بوسٹن، واشنگٹن، نیو جرسی وغیرہ میں ان کا قیام 8ماہ سے زیادہ ہوچکا تھا۔ یوں تو اسد اللہ خان غالب نے مرجانے کو ناامیدی کی انتہا قرار دیا ہے لیکن ناامیدی کی مسلسل توقع بھی کسی انتہا سے کم نہیں ہے، سو کچھ اسی طرح کی امید و بیم میں پرنس عبدالرحمٰن صبح سے شام کرتے اور شام سے سحر کہ اچانک انہیں سیکریٹری آف سٹیٹ ہنری کلے کی جانب سے جاری کردہ خصوصی پاسپورٹ مع راہداری سفر موصول ہوا۔ پرنس عبدالرحمٰن کو مراکش کی بجائے لائبیریا جانے کی اجازت دے دی گئی تھی:

> سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ
> واشنگٹن ڈی سی
>
> 17 جنوری 1829
>
> صدر، ریاستہائے متحدہ امریکہ کو مطلع کیا گیا تھا کہ حامل راہداری ہذا عبدالرحمٰن ایک امریکی شہری کی غلامی میں پابند ہے جس کا تعلق مورش (اندلسی مسلمانوں) سے ہے۔ یہ شخص افریقہ کے اپنے آبائی وطن میں

احترام و مراعات کا حامل ہوتا۔ مراکش کے بادشاہ اس کی موجودہ غلامی کے خاتمے پر متفق ہیں۔ زیر دستخط سیکریٹری آف سٹیٹ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے صدر امریکہ کی ہدایت پر مذکورہ مورش مسلمان عبدالرحمٰن کی آزادی اور اس کے آبائی وطن بھیجنے کے اقدامات کیئے ہیں ۔ امریکی شہری سے کہ یہ جس کی غلامی میں تھا جائز طریقے سے اس کی آزادی حاصل کی گئی ہے ۔ پچھلے موسم بہار میں حکومت امریکہ کے اخراجات پر عبدالرحمٰن کو اس شہر (واشنگٹن) میں لایا گیا ۔ صدر کا ارادہ تھا کہ اسے شہنشاہ مراکش کی تحویل میں دینے کے لیے طنجہ بھیج دیا جائے لیکن جیسا کہ عبدالرحمٰن کی خواہش ہے کہ اسے افریقہ کے ساحل پر لائبیریا بھیج دیا جائے جہاں سے وہ اپنے رشتہ داروں کے پاس پہنچ جانے کی توقع رکھتا ہے ۔

صدر نے اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس امر کی اجازت دے دی ہے ۔ عبدالرحمٰن اپنی بیوی کی معیت میں نارفورک سے حکومت امریکہ کے اخراجات پر بذریعہ ہیریٹ نامی جہاز پر جسے امریکن کالونیز سوسائٹی نے لائبیریا جانے کے لیے کرایہ پر حاصل کیا ہے جو' اس ماہ کی قریب 20 تاریخ کو روانہ ہوگا ۔

میں اس امر کی تصدیق کرتے ہوئے اپنے دستخط اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی مہر آج بتاریخ 17 جنوری سال مسیح 1829 ثبت کرتا ہوں ۔

ہنری کلے

مہر/دستخط 32۔ (سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ریکارڈ نیشنل آرکائیوز: 1829)

7 فروری 1829 کو ہیریٹ نارفورک (ورجینیا) سے لائبیریا کے لیے روانہ ہوا جس کے مسافروں میں پرنس عبدالرحمٰن اور مسز ازابیلا عبدالرحمٰن کے علاوہ جوزف رابرٹس بھی سوار تھے جو 1837 میں لائبیریا کے صدر بنے ۔ پرنس عبدالرحمٰن اس امید اور مشورے پر اپنے بچوں کو امریکہ چھوڑ گئے کہ وہ افریقہ جاتے ہی بچوں کی آزادی کے لیے طلب کردہ قیمت چھ ہزار ڈالر روانہ

کردیں گے جو تھامس فوسٹر کو بچوں کی آزادی کے عوض ادا کردی جائے گی اور انہیں ان کے والدین کے پاس لائبیریا بھیج دیا جائے گا لیکن ابھی پرنس عبدالرحمٰن کی بلائیں تمام نہیں ہوئی تھیں اور ان بلاؤں میں مرگ ناگہاں بھی شامل تھی۔ 14 مارچ 1829 کو بچوں کی جدائی سے بے حال غمزدہ ماں باپ لائبیریا کے ساحل پر اترے۔ اب انہیں ٹیمبو جانے کا مرحلہ درپیش تھا جو ساحل لائبیریا سے 15 دنوں کی دشوار گزار مسافت پر واقع تھا ابھی وہاں جانے کے انتظامات بھی نہیں ہوئے تھے کہ پرنس عبدالرحمٰن بیمار پڑ گئے۔ وطن آتے ہی انہیں شام غریباں نے آلیا جبکہ بے وطنی میں وہ طویل غریب الوطنی پہلے ہی کاٹ چکے تھے۔ ادھر انہیں گھر جانے کی جلدی تھی ادھر اجل ان کی تاک میں تھی۔ بیماری نے زور پکڑا' وہ چلنے پھرنے کے قابل بھی نہ رہے۔ پرنس عبدالرحمٰن کی مرگ ناگہاں نے انہیں 6 جولائی کو سر ساحل ہی آلیا۔

پرنس عبدالرحمٰن سر ساحل افریقہ انتقال کر گئے۔ اپنی مملکت میں جانا اور اپنے عزیز و اقارب سے ملنا ان کے نصیب میں نہیں تھا۔ دم آخر روتی سسکتی بلکتی غمزدہ ازابیلا کے سوا' اور کوئی ان کے پاس نہیں تھا۔ ان کے بچے تھامس فوسٹر کی غلامی میں اس رقم کے منتظر رہے جو پرنس عبدالرحمٰن نے ان کی آزادی کے لیے بھیجنی تھی اور گھر والے اس انتظار میں رہے کہ عبدالرحمٰن آتے ہی ہوں گے۔ دل زدگی کے اس سارے واقع میں پرنس عبدالرحمٰن کے لیے ساعت نزاع میں شاید ایک اور افریقی غلام مبوشو سامبا کا یہ ادب پارہ وجہ قرار رہا ہو کہ جو مٹی انہیں کھینچتی تھی ناآسودہ ہی سہی وہ بہرحال اسی میں خاک ہوئے جبکہ لاکھوں سیاہ فام کلمہ گو اسی مٹی کو یاد کرتے' روتے ناآشنا زمینوں میں پیوند خاک ہوئے:

اے مادر وطن افریقہ
تیرے بیٹے تجھ سے پوچھتے ہیں
کہ تجھ سے منسوب تاریکی
کیا یہاں کی قبروں سے بھی تاریک تر ہے
کہ تیرے جواں سال و سیاہ زاد
جبر و ناچارگی کے پردے میں
نامہرباں زمینوں پر
نامانوس قبروں میں

چپ چاپ سوئے جاتے ہیں
اے افریقہ
تیری مٹی کو روتے جاتے ہیں (مبوشو سامبا)

جس طرح مسلمانوں کے لیے امریکہ نیا نہیں ہے اسی طرح امریکہ کے ہاتھوں مسلمانوں کی قتل و غارت بھی پہلی نہیں ہے۔ براعظم امریکہ میں مسلم موجودگی 942 عیسوی سے مسلمہ ہے۔ حسین مسعودی کے مضامین میں سن 942 میں براعظم امریکہ کے سفر کے حوالے سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان دسویں صدی میں ہی یہاں پہنچ چکے تھے۔ 33۔(ابوالحسن علی ابن حسین مسعودی: 943) لیکن موجودہ امریکہ میں سب سے پہلے مسلمان کی موجودگی 1539 میں ثابت ہوتی ہے۔ برنٹ کینیڈی لکھتے ہیں کہ اصطفان نامی مراکشی مسلمان ان ہسپانوی مہم جوؤں کا گائیڈ تھا جو میکسیکو کے شمال مغرب میں آباد ہوئے تھے بعد میں یہ علاقہ امریکہ کی موجودہ ریاست ایری زونا میں شمار ہوا۔ برنٹ کینیڈی اصطفان کو امریکہ میں پہلا مسلمان قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "اصطفان 1527 میں پین فیلو ڈی نارویز کی اس بحری مہم میں شامل تھا جو ناکام ہوگئی تھی اس مہم میں شامل 300 افراد میں سے جو 4 افراد ڈوبنے سے بچ رہے تھے وہ پانچ ہزار میل دور امریکہ کے جنوب مغربی ساحل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تھے، اصطفان بھی ان میں شامل تھا۔ امریکہ کے اس ساحلی علاقے میں اصطفان نے 1539 تک گائیڈ کی خدمات انجام دیں وہ فرانسسکن فرائر اور مارکوس نیزا کی مہم میں ان کا، گائیڈ رہا تھا حتیٰ کہ 1539 میں ریڈ انڈینز کے ایک حملے میں اصطفان قتل ہوگیا۔"
>
> 34۔(برنٹ کینیڈی: 1994)

(وضاحت برنٹ کینیڈی نے جس شخص کو اصطفان لکھا ہے ہمارے خیال میں یہ مصطفان ہے سولہویں اور سترہویں صدی میں مغربی افریقہ کے اسلامی خطوں میں عثمان، حمدان، مصطفان اور مروان نام مروّج تھے جبکہ جے بی بیر نے اسی شخص کو مصافان لکھا ہے جس سے ہمارے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ اس شخص کا نام مصطفان ہے۔ مصنف)

امریکہ میں اسی دورانیے میں ایک اور عرب مسلمان نصر الدین کی موجودگی بھی ثابت

ہوتی ہے جو یہاں مستقلاً قیام پذیر تھا۔ نصر الدین ریڈ انڈین قبیلے موہاک کی شہزادی کے قتل سے بہت مشہور ہوا۔ اس شہزادی نے نصر الدین کی شدید خواہش کے باوجود اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا جس سے مشتعل ہو کر نصر الدین نے شہزادی کو قتل کر دیا۔

35۔ (ویدر جے وان ویکٹن: 1991)

سالم الجیرین جو امریکی قیام، آئینی جدو جہد اور امریکی جنگ آزادی میں سرگرمی سے شریک ہوئے، ان کا تعلق الجیریا کے شاہی خاندان سے تھا۔ 1731 میں انہیں دریائے گیمبیا اور سینیگال کے درمیانی علاقے سے اغوا کر کے امریکہ لایا گیا۔ سالم الجیرین جنہوں نے قسطنطنیہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی، حصول علم کے بعد الجیریا واپس جاتے ہوئے اغوا ہوئے اور نیو آرلینز (لوئزیانا) میں فروخت ہوئے۔ وہ یہاں سے فرار ہوگئے اور ریڈ انڈین قبائل کے ساتھ رہائش اختیار کرلی۔ ورجینیا میں ریڈ انڈین قبائل کے ساتھ وہ کافی عرصہ مقیم رہے اور انہی کی بودوباش اختیار کرلی اسی دوران وہ عیسائیت کی طرف مائل ہوگئے اور ترک اسلام کے بعد الجیریا چلے گئے تا کہ وہاں عیسائیت کو فروغ دیں۔ الجیریا میں انہیں مرتد ہوجانے پر سزائے موت ہوگئی لیکن وہ فرار ہو کر پھر امریکہ آگئے۔ ترک اسلام، قبول عیسائیت، الجیریا واپسی، سزائے موت اور پھر امریکہ واپسی......ان سنسنی خیز واقعات نے سالم الجیرین کو ورجینیا میں موضوع گفتگو بنا دیا اور تھامس جیفرسن ان کے دوست بن گئے (جو بعد میں امریکہ کے صدر اور بہت بڑے سیاسی دانشور بنے) سالم الجیرین امریکی آزادی کے لیے ہونے والی سب سے پہلی کانٹی نینٹل کانگریس میں تھامس جیفرسن کے ہمراہ شریک ہوئے۔ وہ ورجینیا کے اعلیٰ سیاسی حلقوں میں دانشور، تعلیم یافتہ اور ایک ایسے فرد سمجھے جاتے تھے جس نے امریکہ کی خاطر اپنا مذہب، وطن اور خاندان ترک کر دیا تھا۔ کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے دوران رکن کانگریس مسٹر بیج (جن کی جاگیر پر سالم الجیرین مقیم تھے) کی خواہش پر آرٹسٹ چارلس ولسن پیلے نے سالم الجیرین کی تصویر بنائی۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں سالم الجیرین مخبوط الحواس ہو چکے تھے اور اس مخبوط الحواسی کی وجہ ترک اسلام قرار دیتے تھے۔ آخر آخر وہ پھر مسلمان ہوگئے اور عیسائیت پر تنقید شروع کردی اور اسی کیفیت میں ان کا انتقال ہوا۔ 36۔ (جے بی بیرز: 1884)

(وضاحت: 1881 تک سالم الجیرن کی مذکورہ تصویر بیج اسٹیٹ ورجینیا میں موجود تھی لیکن اس کے بعد سے یہ تصویر ناپید ہے۔ پہلی کانٹی نینٹل کانگریس کے شرکاء کی جو سرکاری تصاویر

موجود ہیں ان میں چارلس ولسن پیلے کی بنائی گئی تصاویر میں سالم الجیرین کا حوالہ موجود ہے لیکن تصویر موجود نہیں ہے ۔ گراہم میگزین نیو یارک نے 1857 میں سالم الجیرین کی جو تصویر شائع کی اس تصویر کو چارلس ولسن پیلے کی بنائی ہوئی تصویر کی کاپی کہا جاتا ہے ۔ مصنف)

1770 کے عشرے میں شمالی کیرولائنا میں وہاب برادرز مشہور مسلمان خاندان تھا یہ خاندان 1770 میں اس بحری جہاز کی غرقابی سے بچنے میں کامیاب رہا تھا جس میں بہت سے مسلمان شمالی کیرولائنا کے ساحلی علاقے میں ڈوب گئے تھے ۔ محمد عبداللہ الہاری لکھتے ہیں کہ اس خاندان کے بارے میں واقعاتی تفصیل کا واحد حوالہ مورخ تھامس پیرامور کا وہ خط ہے جس میں انہوں نے وہاب برادرز کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ محمد عبداللہ الہاری اس شبے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ” وہاب خاندان کے ورثاء اپنے مذہبی عقیدے پر قائم نہیں رہے لیکن بزنس میں بہت کامیاب رہے آج کل پرائیویٹ ہوٹلز کی کئی شاخیں وہاب خاندان کی ملکیت ہیں۔“ 37۔ (محمد عبداللہ الہاری بخاشی: 1995)

ایوب ابن سلیمان جالو' باندو (سینیگال) کے ایک خوش حال تاجر' عالم فاضل اور خوش الحان قاری تھے انہیں 1730 میں اغوا کر کے انا پولس (میری لینڈ) میں لا کر فروخت کیا گیا ۔ امریکہ میں سب سے پہلے جس مسلمان پر کچھ لکھا گیا وہ ایوب سلیمان جالو ہی تھے انہوں نے اپنی علمیت سے ہر خاص و عام امریکی کو متاثر کیا خصوصاً ریاست میری لینڈ میں ان کا شمار غلام ہونے کے باوجود محترم افراد میں ہوتا تھا ۔ میری لینڈ میں قیام کے دوران ایوب سلیمان نے اپنے والد کو خط لکھا جو ریاست جارجیا کے بانی جیمز اوگل تھارپ کی نظر سے گزرا ۔ وہ طرز تحریر سے متاثر اور نفاست تحریر سے متجسس ہوئے ۔ انہوں نے ایوب سلیمان کو آزادی دلا کر لنڈن بھیج دیا جہاں وہ رائل افریقن کمپنی کے نمائندہ بن کر افریقہ واپس چلے گئے ۔ لنڈن میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے قرآن پاک کے تین نسخے اپنے ہاتھ سے تحریر کیئے ۔ برطانیہ میں انہوں نے برٹش میوزیم کے لیے پرانے سکوں پر عربی تحریر کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور مغربی افریقہ کے نقشے مرتب کرنے میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی معاونت کی (ان نقشوں میں افریقی علاقوں/ممالک کی ان کے عربی ناموں سے نشان دہی کی گئی ہے ۔ مصنف) 1733 میں قیام برطانیہ کے دوران آرٹسٹ ولیم ہوارے نے ان کی تصویر بنائی جو برٹش میوزیم میں 'افریقی سکالر' کے نام سے

میوزیم کی زینت بنی۔ ایوب سلیمان جالو کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہیں امریکہ میں ایسا مسلمان قرار دیا جاتا ہے کہ جس نے بر سرِ عام نماز ادا کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ وہ عوامی اجتماعات اور عوام کی موجودگی میں نماز کا وقت ہوتے ہی قبلہ رخ اور دو زانو ہو جاتے وہ جب تک نماز میں مصروف رہتے امریکی مرد و زن حیرت سے انہیں دیکھتے رہتے۔ ذہانت، حافظہ اور اعلیٰ علمی و ادبی صلاحیتوں نے انہیں بیک وقت افریقہ، امریکہ اور یورپ میں ممتاز دانشور، مسلم سکالر اور افریقی مورخ کے طور پر مشہور کر دیا تھا۔

ایوب سلیمان جالو کے ساتھ ہی ایک اور مسلمان مغوی عبدل امین کیبی (لیمن کیبی) بھی میری لینڈ میں فروخت ہوئے۔ عبدل امین کو امریکہ میں ماہر لسانیات اور ایک ایسا پروفیسر مانا جاتا تھا جس کی کوئی کلاس اور طلباء نہ ہوں۔ عبدل امین کو جب اغوا کر کے لایا گیا تو وہ عربی اور فرانسیسی کے علاوہ کئی افریقی زبانیں جانتے تھے انہیں انگریزی سیکھنے میں بھی دیر نہ لگی۔ عبدل امین کو کئی علوم پر عبور حاصل تھا۔ اپنے اسی علم و فضل کے بل بوتے پر وہ خود اپنی آزادی خریدنے میں کامیاب رہے اور 1735 میں سینیگال واپس لوٹ گئے۔ عبدل امین کی تحریر سے ایک اقتباس کو قبول عام کا درجہ حاصل ہوا اور اسے سینکڑوں کتابوں اور ہزاروں مضامین میں سند کے طور پر لکھا گیا اور حرف آخر کے طور پر مانا گیا۔ بات خواہ امریکہ میں سیاہ فام غلاموں کی ہو یا سیاہ فام مسلمان غلاموں کی، اس موضوع پر لکھنے والے مصنف، محقق، تاریخ دان اور لکھاریوں کو اس وادی پر خار میں عبدل امین کے دو ٹوک تجزیاتی سنگ میل سے ہی ہو کر گزرنا پڑتا ہے، عبدل امین لکھتے ہیں:

> ''امریکہ میں اچھے لوگ موجود ہیں لیکن افریقہ کے بارے میں وہ سب
> بے حس ہیں۔'' 38۔(عبدل امین :1835)

1977 میں ایلن آسٹن نے جب اپنی مشہور زمانہ کتاب ''خانہ جنگی سے پہلے امریکہ میں افریقی مسلمان'' لکھی اور وہ حسب دستور عبدل امین کے نصب کردہ سنگ میل سے گزرے تو انہوں نے اس قول میں ''اور اس کے مسلمانوں'' کا اضافہ کر کے عبدل امین کے قول کو ایک اور سمت، ایک اور سچائی سے وابستہ کر دیا۔ ایلن آسٹن کے اضافے نے عبدل امین کے قول کو اس طرح بدل دیا:

> ''امریکہ میں اچھے لوگ موجود ہیں لیکن افریقہ ''اور اس کے مسلمانوں''

کے بارے میں وہ سب بے حس ہیں۔" 39۔(ایلن آسٹن:1977)

اپنی کم ہمتی اور بے حیثیتی کے کارن ایلن آسٹن کے برعکس ہم عبدل امین کے اس قول میں اضافے کی بجائے ترمیم کے مرتکب ہوئے۔ ہم نے اس قول میں سے افریقہ کا جھنجھٹ منہا کر کے اُمہ کے موجودہ محضر نامے کے مطابق اس کی حد کو حدِ قل تک بڑھا دیا ہے:

> "امریکہ میں اچھے لوگ موجود ہیں لیکن "مسلم امہ کے بارے میں" وہ سب بے حس ہیں"۔ (مصنف)

وائے ناکامی کہ عبدل امین کا سنگ میل، چراغ راہ سے چراغ شب گوں میں بدل گیا مگر چراغ راہ سے چراغِ عالم افروز نہ بن سکا۔

1741 کے موسم سرما میں نیو یارک کے ساحل پر ایک ہسپانوی جہاز سے تین اندلسی مسلمان جہاز رانوں کو اغوا کر کے فروخت کیا گیا۔ اغوا کردہ ان مسلمانوں نے اپنے اغوا سے حالت غلامی تک مزاحمت جاری رکھی اور کسی طرح "مطیع" ہو کر نہ دیئے جس سے دوسرے غلاموں کو بھی تحریک ملی۔ 1742 کے موسم بہار تک نیو یارک میں حالات بہت مخدوش ہو گئے اور غلاموں کی بغاوت شروع ہو گئی۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے 23 افراد کو سرعام پھانسی دی گئی جن میں یہ تینوں مسلمان بھی شامل تھے۔ نیو یارک کے حکام اور شہریوں کے مطابق اس بغاوت کے ذمہ دار مور (اندلسی مسلمان) تھے۔ 40۔(امیر محمد: 1996)

مارچ 1753 میں عبدالقادر اور محمد نامی دو غلاموں نے عربی میں اپنی رہائی کا مقدمہ جنوبی کیرولائنا کی رائل کورٹ میں دائر کیا ان کا تعلق ازا ئیلا (مراکش) سے تھا انہوں نے اپنے دعویٰ میں لکھا کہ 1736 میں وہ پرتگالیوں کے ہمراہ ایک لڑائی میں شریک ہوئے اور شکست ہونے پر قیدی بنا لیئے گئے۔ ایک امریکن آرمی آفیسر کیپٹن ہنری کی پیشکش پر وہ اس کے لیے کیرولائنا میں کام کرنے پر رضامند ہو گئے اس معاہدے کی مدت پانچ سال تھی لیکن کیرولائنا پہنچنے کے کچھ دنوں بعد کیپٹن ہنری نے انہیں ڈینیل لاروش کی تحویل میں دے دیا۔ ڈینیل لاروش نے معاہدے کی اصل پانچ سالہ مدت پر پندرہ سال گزر جانے کے باوجود انہیں آزاد نہیں کیا سو انہیں آزادی دلائی جائے۔ 41۔(ساؤتھ کیرولائنا کونسل جنرل: 1753)

22 نومبر 1769 کو سوانا جارجیا گزٹ میں دو مفرور مسلمان غلام خواتین کے بارے میں اشتہار شائع ہوا کہ:

> ”دو جوان مسلمان عورتیں اپنے مالک مسٹر لیچلن گلیورے کے زرعی فارم سے فرار ہوگئی ہیں۔ جمینا جو مضبوط جسامت کی عورت ہے اس کا قد 5 فٹ 6 انچ ہے جبکہ حاجرہ جو قدرے کم عمر ہے اس کا قد 5 فٹ 5 انچ ہے۔ حاجرہ کے چہرے پر ہلکے قبائلی نشان موجود ہیں۔ ان دونوں کا تعلق ملک گنی سے ہے۔ ان عورتوں نے مخصوص سفید نیگرو کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ یہ یقینی نہیں ہے کہ وہ کس طرف گئی ہیں انہیں جو بھی پکڑ کر لائے گا اسے اس کی زحمت اور فاصلے کے مطابق معقول معاوضہ دیا جائے گا۔“ المشتہر: لیچلن گلیورے 22 نومبر 1769

42۔ (سواناہ جارجیا گزٹ: 1769)

17 جون 1775 کو برطانوی افواج اور امریکی انقلابی افواج بنکر ہل چارلسٹن (میسا چوسٹس کے فیصلہ کن معرکے میں ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوئیں۔ اس شب خون معرکے میں امریکی فوج دباؤ اور گھیرے میں آگئی قریب تھا کہ امریکی فون اس معرکے میں شکست سے دو چار ہو جاتی کہ ایسے میں ایک سیاہ فام مسلمان سپاہی سلیم مفلس' کی حاضر دماغی' جراتمندی' شجاعت اور بے خوفی نے جنگ کا پانسا پلٹ دیا۔ سلیم کے ہاتھوں چشم زدن میں 14 برطانوی فوجی مارے گئے جن میں ایک کرنل اور دو میجر بھی شامل تھے۔ سلیم کے اس کارہائے نمایاں پر اسے بہادری کے جنگی اعزاز کے لیئے نامزد کیا گیا۔ سلیم کا شمار صدر' جنرل جارج واشنگٹن کے ان ہیروز میں کیا گیا جو پس منظر میں رہ گئے اور ان کے کارناموں کی بروقت تحسین نہ کی جاسکی۔ 43۔ (مارک مونیز: 2005)

سلیم 1750 میں میسا چوسٹس میں ایک مسلمان غلام کے ہاں پیدا ہوا سلیم کے آقا نے اسے 1769 میں میجر لاسن بک منسٹر کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ سلیم کا اصل نام سلیم تھا جسے میجر لاسن نے اپنے آبائی زرعی فارم واقع سلیم کے نام پر سلیم رکھ دیا تھا۔ سلیم سے سلیم ہوجانے کے بعد میجر لاسن نے سلیم کو اس شرط پر آزاد کردیا کہ وہ جنرل جارج واشنگٹن کی انقلابی امریکی آرمی میں بھرتی ہوجائے۔ اپنے افلاس اور بے سروسامانی کی وجہ سے سلیم امریکی آرمی میں 'poor' مشہور ہوگیا۔ جو بات مذاق میں کہی گئی تھی وہ ساری عمر کے لیے سلیم کے نام کا لازمہ بن کر رہ گئی۔ 1774 میں جب سلیم امریکی فوج میں بھرتی کے لیے کیپٹن بنجامن کے سامنے پیش ہوئے

اور ان سے ان کا پورا نام پوچھا گیا ۔ یعنی سلیم کے آگے ......سلیم اور کیا؟ تو وہ خاموش رہے‘ جب خاموشی طویل اور جواب دینے کا وقفہ طویل تر ہوگیا تو سلیم کی افلاس زدہ حالت کے پیش نظر کسی نے کہا ’Poor‘ جس پر سب ہنسنے لگے لیکن کیپٹن بنجامن نے سلیم کے نام کے ساتھ پوور کا اضافہ کرکے سلیم کو سلیم مفلس بنا دیا۔ یہ نام اتنا مشہور ہوا کہ پھر ہمیشہ وہ اسی نام سے شناخت کیے گئے حتیٰ کہ سرکاری کاغذات میں بھی وہ سلیم پوور ہی لکھے گئے۔

1975 میں امریکی آزادی کی دو سو سالہ تقریبات میں ان گمنام ہیروز کی خدمات کا سرکاری اعتراف کیا گیا جنہوں نے امریکی آزادی میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں لیکن وہ اعزاز سے محروم رہے تھے‘ ان میں سلیم بھی شامل تھے ۔ اس موقع پر سلیم پوور کی خدمات کے اعتراف میں محکمہ ڈاک نے ان کے اعزاز میں ایک یادگاری ٹکٹ جاری کیا ۔ نام کی غریبی نے سلیم پر حقیقی اثر ڈالا‘ وہ واقعتاً افلاس زدہ ہی رہے ۔ امریکی آرمی سے فراغت کے بعد انہوں نے بید سے کرسیاں بُننے کا پیشہ اختیار کیا جو چل کر نہ دیا ۔ 1816 میں ایک خیراتی پناہ گاہ کے یخ بستہ اور تاریک کمرے میں سلیم کا انتقال ہوا ۔ سلیم امریکہ میں ان ہزاروں مسلمان غلاموں میں سے ایک تھے جنہیں بوقت مرگ نہ کوئی آیت الکرسی سنانے والا موجود تھا نہ کلمہ پڑھانے والا ۔ نہ جن کی غسل میت اسلامی طریقے سے ہوئی نہ تجہیز و تکفین‘ نہ یہ قبلہ رخ رکھے گئے نہ ان کی قبروں پر فاتحہ پڑھی جا سکی ۔

1790 کے آخر میں 8 مسلمان مرد اور عورتوں پر مشتمل ایک گروپ نے جنوبی کیرولائنا کی ریاستی اسمبلی میں ایک مشترکہ درخواست پیش کی ۔ ان درخواست گزاروں میں فاطمہ‘ سارہ فلورا‘ کلبرنڈا‘ فرانسس‘ ڈینیل‘ ہیمنڈ اور سیموئیل شامل تھے ۔ آقا کی طرف سے دیئے گئے غیر اسلامی ناموں کے باوجود ان لوگوں کے موقف سے اس اسلامی حمیت کا اظہار ہوتا ہے جو مسلمانوں کا وصف ہے ۔ ان درخواست گزاروں نے موقف اختیار کیا کہ انہیں سفید فام امریکی شہریوں کے برابر حقوق دیئے جائیں ۔ تفصیل میں لکھا گیا کہ انہیں مراکش کے مسلمان بادشاہ کی حمایت میں افریقی قبائل کے خلاف لڑائی کے دوران کیپٹن کلارک نے زیر حراست لے لیا‘ وہ اس شرط پر کیپٹن کلارک کے جہاز میں سفر کرنے پر تیار ہو گئے کہ وہ انہیں برطانیہ لے جائے گا جہاں مراکش کا سفیر انہیں خرید کر آزاد کردے گا جبکہ کیپٹن کلارک انہیں برطانیہ لے جانے کی بجائے فریب دہی سے امریکہ لے آیا اور جنوبی کیرولائنا میں انہیں فروخت کردیا ۔ جنوبی کیرولائنا

Salem Poor
Commemorative Stamp

[illegible]

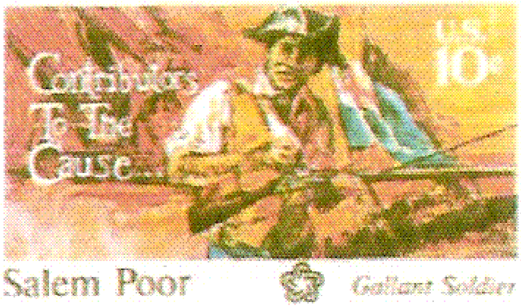
Contributors To The Cause...
U.S. 10c
Salem Poor
Gallant Soldier

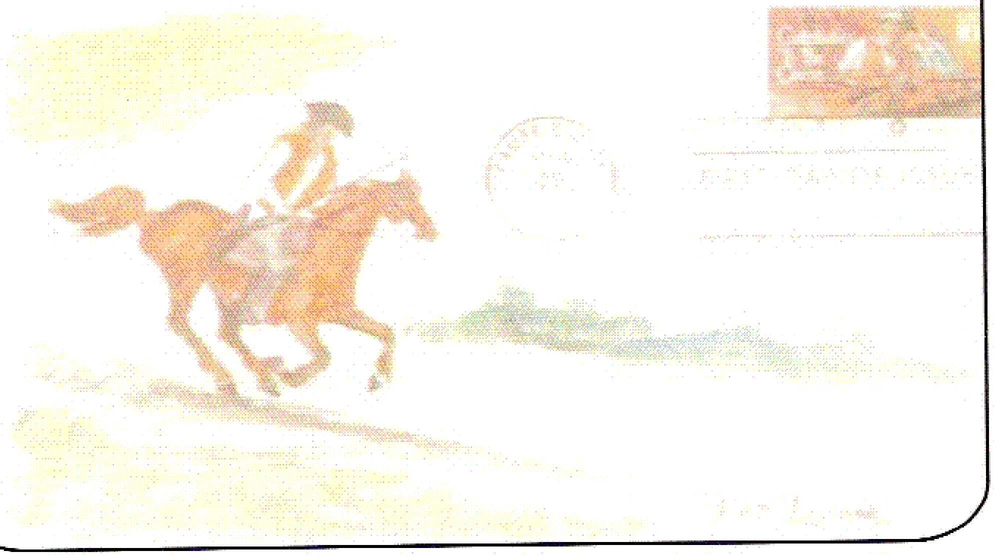

کے ایک شہری کی صریحاً وعدہ خلافی اورفریب دہی کی تلافی کرتے ہوئے انہیں آزاد کردیا جائے۔ 44۔ (مائیکل سٹیونز: 1981)

یہ سادہ لوح مسلمان کیپٹن کلارک کے جس عمل کو وعدہ خلافی اور فریب دہی سمجھتے تھے درحقیقت ایک ایسا غیر انسانی کاروبار تھا جسے یورپی اور امریکی حکومتوں کی حمایت حاصل تھی۔

1790 میں ہی جنوبی کیرولائنا کی مردم شماری میں سمٹر کاؤنٹی کے رہائشی یوسف ابن علی کا نام ریکارڈ کیا گیا جو جنرل تھامس سمٹر کی جاگیر (سٹیٹ برگ) سمٹر میں مقیم تھا۔ 1780 کے عشرے میں امریکن آرمی کے جنرل تھامس سمٹر نے اپنے خصوصی اختیارات کے تحت ایک عرب مسلمان یوسف ابن علی کو امریکی فوج میں شامل کرکے اپنا ذاتی محافظ مقرر کیا۔ جنرل سمٹر' یوسف ابن علی پر بہت بھروسہ کرتے تھے۔ دوران جنگ یوسف ابن علی نے جنرل سمٹر کے لیے شاندار خدمات انجام دیں۔ جنگ کے اختتام پر جنرل سمٹر' یوسف کو اپنے ساتھ لے گئے جہاں یوسف ابن علی طویل عرصے تک سٹیٹ برگ میں مقیم رہے۔ سمٹر میں یوسف ابن علی کے ورثاء اپنی چمکدار سیاہ آنکھوں اور طویل قامتی کے باعث سمٹر کے ترک مشہور ہوئے جو آج بھی وہاں اسی حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ 1792 میں جنوبی کیرولائنا کی ریاستی اسمبلی نے ایک آئینی شق کے ذریعے کیرولائنا کی حدود میں اندلسی مسلمان غلاموں کی آمد اور خریدوفروخت پر پابندی عائد کردی۔ قانون میں کہا گیا کہ اندلسی مسلمانوں پر نہ تو عرصہ غلامی کی متعینہ مدت کا اطلاق ہوگا اور نہ ہی انہیں ریاست میں درآمد کیا جاسکتا ہے۔ اس قانون کے پس منظر میں یہ ریاستی تجربہ کارفرما تھا کہ اندلسی مسلمان غلام دوسرے افریقی غلاموں سے زیادہ تعلیم یافتہ اور بیشتر امور میں اپنے سفید فام آقاؤں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ قیادت کی فطری صلاحیت' ذہنی آزادی' قوت استدلال' اور تعلیم کے باعث انہیں غلام رکھنا چیلنج ثابت ہوا تھا۔ اکثر اندلسی غلام نہ صرف غلامی کی زنجیر کاٹنے میں کامیاب رہے تھے بلکہ وہ دوسرے غلاموں کے لیے باعثِ بغاوت خیال کیئے جاتے تھے۔ (45۔ جیمز ہیگی: 1993)

”سور کھانا اورشراب پینا انتہائی براہے۔“

یہ الفاظ یارو مرموط کے ہیں اور یہ انہوں نے واشنگٹن ڈی سی میں اس وقت کہے جب انہیں امریکہ میں رہتے ہوئے ایک سو ایک سال بیت چکے تھے۔ ایک صدی سے وہ ایسے لوگوں کے درمیان تنہا تھے جو سور کھاتے تھے اور شراب بھی پیتے تھے لیکن یارو مرموط نے وہ اسلامی

احکامات یاد رکھے جو انہوں نے اپنے لڑکپن میں سنے تھے۔ یارو مرموط 1711 کے لگ بھگ گنی میں پیدا ہوئے۔ 14 سال کی عمر میں وہ اغوا ہوئے اور فروخت در فروخت ہوتے ہوئے جارج ٹاؤن (موجودہ واشنگٹن ڈی سی) میں لا کر نیلام کیئے گئے۔ انہوں نے بلا توقف اور بے جھجک نماز ادا کرنے کا شعار اپنائے رکھا۔ گلی' بازار' گھر' سڑک' خلوت' محفل ...... انہوں نے قبلہ رو ہونے اور سر جھکانے میں نہ عار کبھی نہ کوتاہی کی۔ لڑکے بالے انہیں چھیڑتے' لوفر آوازیں کستے لیکن خوش دلی اور خندہ پیشانی نے ان کی ابتلا کو احترام میں بدل دیا۔ رفتہ رفتہ "مسلمان ...... جو ہر جگہ عبادت کرسکتا ہے" ان کی وجہ شہرت بن گئی۔ واشنگٹن ڈی سی میں شاید ہی کوئی قطعہ زمین ایسا رہا ہو کہ جس پر یارو مرموط نے سجدہ نہ کیا ہو۔ عین اس وقت جب واشنگٹن ڈی سی کی بنیادیں رکھی جارہی تھیں یارو مرموط یہاں سجود و قیام میں مصروف تھے۔ جس طرح نئے گھروں میں آباد ہونے سے پہلے وہاں بھوت' پریت' آسیب' سایہ اور نحسی کو ٹالنے اور برکت' رحمت اور نیک شگون کے لیے ختم قرآن کراتے ہیں' آیت کریمہ کا ورد کرتے ہیں اور سجدہ کیا جاتا ہے کیا عجب کہ یارو مرموط واشنگٹن ڈی سی کو پاک اور بابرکت بنانے پر معمور ہوئے ہوں اب یہ ہمارے نصیب کہ ان کے سجود و قیام ہمارے اوپر آنے والے بار کو نہ ٹال سکے۔ ان کی دعائے نیم شبی اس شہر بے اماں میں مسلمانوں کے لیے ڈھال نہ بن سکی۔ ان کی خوش الحان قرأت' شب زندہ داری' ریاضت و عبادت اس اُمہ مخالف مرکز کو مسلمانوں کے حق میں استوار نہ کرسکی۔ اسے امریکہ کی سیاہ بختی کہیئے کہ اُمہ کی کہ جہاں معین الدین چشتی یا ابوالحسن ہجویری کی ضرورت تھی وہاں صرف یارو مرموط ہی میسر آسکے۔

یارو مرموط نے طویل عمر پائی۔ وہ 133 برس حیات رہے۔ یارو مرموط کو طویل العمر امریکی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ سخت محنت' جانفشانی اور دیانت کی صفات ان کی غلامی کے خاتمے کا باعث بنیں۔ 1805 میں ان کے آقا مسٹر بل نے یارو مرموط سے وعدہ کیا کہ اگر وہ جارج ٹاؤن میں ان کے نئے گھر کی تعمیر کے لیے اینٹیں بنا دیں تو وہ تکمیل تعمیر پر انہیں آزاد کردیں گے۔ یارو مرموط دل و جان سے اینٹیں بنانے میں لگ گئے۔ گھر کی تعمیر میں تین سال لگ گئے لیکن یارو مرموط نے اینٹیں کم نہ پڑنے دیں لیکن تعمیر کے ساتھ ہی مسٹر بل کے دن بھی پورے ہوگئے۔ جس دن گھر مکمل ہوا مسٹر بل وفات پاگئے یوں یارو مرموط آزاد ہونے سے پہلے ہی پھر گرفتار بلا ہو رہے۔ قریب تھا کہ ان کی آزادی ہمیشہ کے لیے خواب بن جاتی کہ مسٹر بل

کی بیوہ نے 1807 میں ان کی بے لوث خدمات کے پیش نظر انہیں اپنی غلامی سے آزاد کر دیا۔ یارو مرموط کو جب آزادی میسر آئی تو وہ قریب سو سال کے تھے۔ اب انہیں آزادانہ زندگی گزارنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ انہوں نے نئے سرے سے عزم حیات باندھا اور مزید محنت میں لگ گئے۔ سو ڈالر جمع کرنے میں انہیں ایک سال لگا جس سے وہ کوئی کام شروع کرنا چاہتے تھے جس بھلے مانس کے پاس سو ڈالر امانتاً رکھوائے وہ دیوالیہ ہوگیا، مرموط کی رقم ڈوب گئی، اگلے سو ڈالر جمع کرنے میں انہیں دو سال لگے اس بار جس کو امین ٹھہرایا وہ فوت ہوگیا، مرموط کی رقم پھر ڈوب گئی۔ اسی دوران واشنگٹن ڈی سی میں پہلا بنک قائم ہوا، انہیں مشورہ دیا گیا کہ بنک ٹرائی کر دیکھیں۔ یارو مرموط نے کولمبیا بنک کے حصص خرید لیئے جس سے خاطر خواہ منافع ہوا۔ انہوں نے جارج ٹاؤن میں زمین خریدی۔ یارو مرموط کو قدرے سکھ کا سانس آیا ہی تھا کہ انہیں قضا نے آن لیا وہ 1844 میں 133 برس کی عمر میں واشنگٹن ڈی سی میں فوت ہوگئے۔

1800 میں واشنگٹن ڈی سی میں پہلی مردم شماری کے ریکارڈ میں یارو مرموط کا اندراج یارو نیگرو کے طور پر کیا گیا۔ 1810 کی مردم شماری میں ان کا نام یارو مرمود لکھا گیا اور 1820 کے مردم شماری ریکارڈ میں ان کا نام یارو مرموط، صاحب جائیداد کے طور پر موجود ہے۔ (سینسس ریکارڈ: ڈسٹرکٹ آف کولمبیا 1800-1820) ۔ انیسویں صدی کے مشہور ترین امریکی آرٹسٹ چارلس ولسن پیلے نے 1819 میں یارو مرموط کی تصویر کشی کی۔ انہیں یارو کی تصویر بنانے میں تین دن لگ گئے جو ان کی توقع سے کہیں زیادہ تھے۔ وہ تصویر بناتے وقت ان سے مصروف گفتگو رہے۔ اس گفت و شنید سے مصور پر ایک مختلف ثقافت، زبان، مذہب اور تصور حیات کا ایک نیا عالم آشکار ہوا یوں یارو مرموط میں چارلس ولسن کی دلچسپی اور تجسس سوا ہوگیا اور انہوں نے یارو مرموط کی سابقہ زندگی پر تحقیق شروع کر دی۔ اس تحقیق کے نتائج انہوں نے اپنی ڈائری میں قلم بند کیے۔ (اب اسی ڈائری کو یارو مرموط کے حالات زندگی کا مستند ماخذ سمجھا جاتا ہے۔ اس موضوع پر درج بالا بیشتر مواد اسی ڈائری سے مستعار ہے۔ مصنف) 46۔ (چارلس ولسن پیلے: 1819)

1922 میں جارج ٹاؤن کے ایک آرٹسٹ جیمز الیگزینڈر سمپسن نے بھی یارو مرموط کی تصویر بنائی۔ یہ تصویر طویل عرصے سے جارج ٹاؤن پبلک لائبریری کی زینت بنی ہوئی ہے جب کہ چارلس ولسن پیلے کی بنائی ہوئی تصویر ہسٹوریکل سوسائٹی آف پنسلوینیا میں آویزاں ہے۔

محمد باقو اقوا 1820ء کے عشرے میں زوزو، وسطی افریقہ میں پیدا ہوئے بعد میں یہ علاقہ

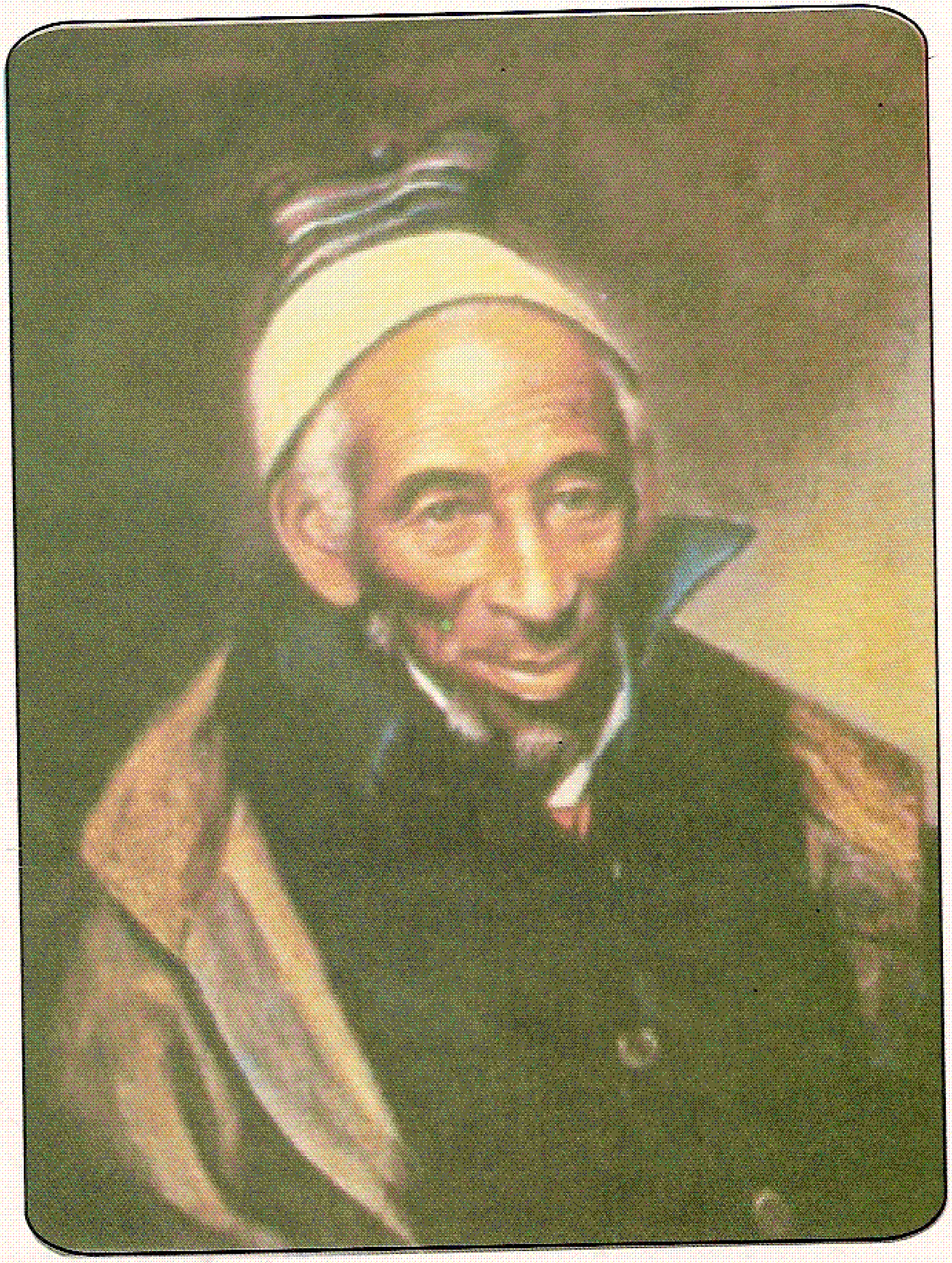

یارو مرموط (1711-1844)
آرٹسٹ چارلس ولسن پیلے :1819

ریاست بنین میں شامل ہوا جو اب مستقلاً ملک بنین کا حصہ ہے۔ 1844ء میں محمد باقو اقوا کو اغوا کر کے برازیل میں ایک نانبائی کے ہاتھوں فروخت کیا گیا وہ اس کے ظلم وستم سے تنگ آ کر وہاں سے فرار ہوکر نیو یارک پہنچے۔ نیویارک میں ان کی مخبری ہوگئی تو وہ بوسٹن جا چھپے۔ محمد باقو اقوا کے کئی سال بھاگنے اور پکڑے جانے میں صرف ہوئے حتی کہ وہ ہیٹی چلے گئے۔ وہاں پکڑے جانے کے خوف سے عیسائی ہوگئے۔ ان کے عیسائی ہونے کی ایک یہ وجہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ہیٹی میں چرچ کے جن لوگوں نے ان کی مدد کی تھی وہ انہیں یہ باور کرانے میں کامیاب رہے تھے کہ عیسائیت انہیں آزادی سے ہمکنار کرسکتی ہے اور بعد میں اسی طرح ہوا بھی۔ ہیٹی سے وہ واپس نیو یارک آئے اور سنٹرل کالج نیویارک میں داخل ہوگئے۔ اس وقت پورے امریکہ میں صرف یہی ایک کالج ایسا تھا جہاں سیاہ فام پڑھ سکتے تھے، سنٹرل کالج میں اس وقت تین سیاہ فام پروفیسرز پڑھاتے تھے جوانہونی بات تھی۔ 47۔ (ایلن آسٹن: 1977)

1854ء میں محمد باقو اقوا نے ڈیٹرائٹ مشی گن سے اپنی سوانح عمری شائع کی جس سے ان کی علمیت، نقطہ نظر اور ذہنی وسعت کا اظہار ہوا۔ امریکہ میں یہ پہلی ایسی کتاب تھی جس میں اسلام اور افریقہ کے بارے میں ذاتی تجربات تحریر کیے گئے تھے۔ 6 حصوں میں منقسم اس سوانح عمری میں مذہب، عقیدہ، اسلام، افریقہ کا جغرافیہ، زراعت، ماحولیات، افریقی رسم و رواج، لوگ، سرکاری تقریبوں کا ذکر، تجارت، قبائلی تنازعات، غلامی اور معیشت کے تذکرے نے محمد باقو اقوا کی سوانح عمری کو ایک ایسی کثیر الجہت دستاویز میں بدل دیا جو اس زمانے میں مروج نہیں تھی۔ طرز تحریر میں بے مثال اس سوانح عمری نے امریکی ادب میں طرز اظہار کی مختلف اساس ڈالی۔ محمد باقو اقوا، اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ میرے والدین مختلف النسل تھے ان کا ثقافتی پس منظر جداگانہ تھا میرے والد کھلتے رنگ کے عرب تھے جن کے لب و لہجے پر عربی زبان و ثقافت کی گہری چھاپ تھی جب کہ میری والدہ زوزو کے مقامی قبیلے کا شنا کی انتہائی سیاہ فام خاتون تھیں۔ میرے والد صبح سویرے چار بجے اُٹھ کر عبادت میں مصروف ہو جاتے دن چڑھے وہ پھر سو جاتے اور اٹھنے پر پھر نماز ادا کرتے اس کے بعد وہ دوپہر شام اور رات کی نماز پڑھتے، ہر سال باقاعدگی سے ایک ماہ کے روزے رکھتے۔ میرے چچا امام مسجد تھے جن کے پیچھے اپنی عمر کے حساب سے لوگ صفیں باندھ کر نماز ادا کرتے۔

افریقہ میں حکومتوں کا کوئی شائع شدہ آئین موجود نہیں ہے لیکن اس کے باوجود لوگوں

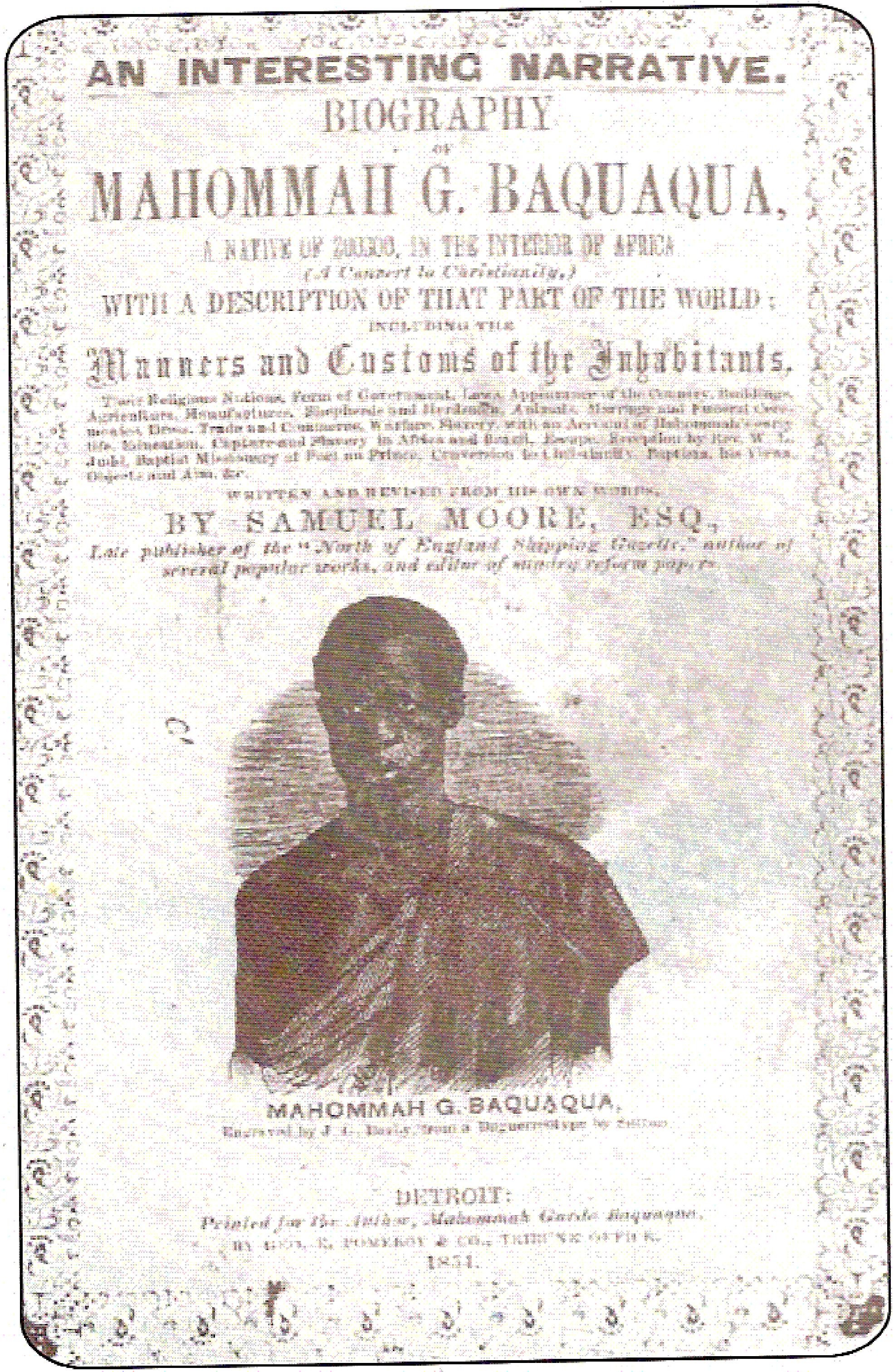

AN INTERESTING NARRATIVE.
BIOGRAPHY
OF
MAHOMMAH G. BAQUAQUA,
A NATIVE OF ZOOGOO, IN THE INTERIOR OF AFRICA
(A Convert to Christianity,)
WITH A DESCRIPTION OF THAT PART OF THE WORLD;
INCLUDING THE
Manners and Customs of the Inhabitants,

Their Religious Notions, Form of Government, Laws, Appearance of the Country, Buildings, Agriculture, Manufactures, Shepherds and Herdsmen, Animals, Marriage and Funeral Ceremonies, Dress, Trade and Commerce, Warfare, Slavery, with an Account of Mahommah's early life, Education, Capture and Slavery in Africa and Brazil, Escape, Reception by Rev. W. L. Judd, Baptist Missionary at Port au Prince, Conversion to Christianity, Baptism, his Views, Objects and Aim, &c.

WRITTEN AND REVISED FROM HIS OWN WORDS,
BY SAMUEL MOORE, ESQ.,
Late publisher of the "North of England Shipping Gazette," author of several popular works, and editor of sundry reform papers.

MAHOMMAH G. BAQUAQUA.
Engraved by J. L. Davis, from a Daguerreotype by [illegible]

DETROIT:
Printed for the Author, Mahommah Gardo Baquaqua,
BY GEO. E. POMEROY & CO., TRIBUNE OFFICE.
1854.

محمد باقواقوا کی خودنوشت سوانح کا سرورق: 1854

پر ضابطہ قانون اور پابندیوں کا اطلاق ہوتا ہے، بادشاہ، چیف، حکام، عمال اور اسی طرح درجہ بدرجہ منصب داروں کے باہمی اعمال سے حکومت چلائی جاتی ہے۔ افریقہ میں چور کو بدترین مجرم سمجھا جاتا ہے جس پر سزائے موت مقرر ہے جو سنگ ساری کی صورت میں بھی دی جاتی ہے جب کہ قتل کرنے والوں کو ملک بدر یا فروخت کردیا جاتا ہے۔ حرام کاری پر سب سے سنگین سزا مقرر ہے جو عموماً مرد کو دی جاتی ہے۔ مالیہ، لگان اور ٹیکس بادشاہ اپنی صوابدید سے مقرر کرتا ہے جس میں انصاف اور آسانی کو مدنظر رکھا جاتا ہے اور اس کی وصولی کا شفاف اور کڑا نظام موجود ہے فوجیوں کو مراعات حاصل ہیں، یہ طبقہ مراعات یافتہ ہے انہیں جو بھی مطلوب ہو دیہات اور شہروں سے بلا معاوضہ وصول کرلیتے ہیں، ان کے خلاف شکایت اور عذرداری داخل کرنے کا رواج نہیں ہے۔ افریقہ میں میرے جائے پیدائش کا محل وقوع بیان کرنا مشکل ہے، تاہم یہ دس سے بیس درجے طول البلد شمال میں واقع ہے جو کہ خط استوا گرین وچ کے قریب سے گزرتا ہے۔ اسی مقام پر عظیم دریا نائیجیریا اپنا رخ بدلتا ہے۔

افریقہ میں نیچی چھتوں والے بغیر چمنی کے مٹی سے بنے گھروں کا رواج ہے جن میں کھڑکیاں نہیں رکھی جاتیں۔ گول دائرے میں چھوٹے چھوٹے کمرے بنالیے جاتے ہیں جو بیرونی دیوار سے منسلک ہوتے ہیں۔ یوں احاطہ وجود میں آجاتا ہے جس میں ایک خاندان کے لوگ اپنے اپنے کمروں میں رہائش رکھتے ہیں۔ ہر شہر میں بادشاہ کی طرف سے مجسٹریٹ مقرر ہوتا ہے جو شہر کا نظام چلاتا ہے۔

زرعی ہونے کے باوجود افریقہ میں زراعت ابتری کا شکار ہے۔ پانی افراط سے ہے۔ چاول، مکئی، آلو، چنا، گندم عام فصلیں ہیں پیاز بہت کھائی جاتی ہے اور اس کا استعمال خوردونوش میں سب سے زیادہ ہے پھل بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ اناناس کھانے سے لوگ ڈرتے ہیں کہ یہ زہریلا نہ ہو۔ لیکن یہ ڈر آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ افریقہ خوراک میں خود کفیل ہو جائے گا۔ صنعتی طور پر افریقہ بدحالی کا شکار ہے عموماً زرعی آلات، برتن، کاٹن، ریشم کے کپڑوں اور ہاتھ سے سوئیاں بنانے کے علاوہ کوئی قابل ذکر صنعت نہیں ہے۔ ریشم کے کیڑے بکثرت پائے جانے کے باوجود ریشم کا کپڑا اتنی مقدار میں تیار نہیں کیا جاتا جتنا کیا جانا چاہیے۔ کپاس کا پودا دوسرے ممالک کے پودوں سے زیادہ طویل ہوتا ہے اور عمدہ قسم کی کپاس اترتی ہے۔ کپاس کی خام فصل سے کپڑے بننے تک کے مراحل عورتوں کے ہاتھوں سے گزرتے ہیں۔

مکئی پیسنے کا کام بھی عورتوں کے سپرد ہے۔ اجناس پیسنے کی چکیوں کی طرز پر گھر گھر پاٹ لگے ہیں اور عورتیں انہیں ریندھتی ہیں۔

چرواہا گری اور گلہ بانی عام پیشے ہیں لیکن ان لوگوں کا شمار محکوم اور نچلے طبقے میں ہوتا ہے۔ ان کے بال سیدھے اور لمبے ہوتے ہیں اور ان کا رنگ گہرا نہیں ہوتا۔ جنوبی یورپ کے باشندوں کی طرح ان کا رنگ جاذب ہوتا ہے لوگ بالعموم محمد (ﷺ) کے پیرو کار ہیں اور اپنے مذہبی عقائد پر کاربند ہیں۔ وہ عربی اور فیولانی بولتے ہیں عربی بولنے والوں کا تعلق عرب سے جوڑا جاتا ہے لیکن ہم اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، سماجی نظام میں عزت و احترام راج ہے۔ بڑوں کی عزت کی جاتی ہے انہیں مخاطب کرنے کے لیے ان کے نام کے ساتھ ماں، باپ، بہن یا بھائی کا لاحقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ بچوں کو بڑوں کے درمیان یا ان کی مجلس میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ بڑوں کو آتا دیکھ کر احتراماً سر اور پاؤں برہنہ کر دیے جانے کا رواج ہے۔ ہماری زمین کی ثقافت اور اخلاقی اقدار کے تسلسل کے لیے یہ ضروری ہے کہ بچے شروع ہی سے احترام سیکھ لیں یوں جب وہ بڑے ہوں تو مرد اور عورت چھوٹے اور بڑوں کے حقوق سے آشنا ہوں۔

لڑائیاں روز مرہ کا معمول ہیں۔ لیکن اس کو بہ نظر تحقیر نہیں دیکھا جاتا۔ شہروں اور دیہاتوں میں جگہ بہ جگہ ایسی جگہیں موجود ہیں جہاں لڑنے والے اپنا شوق پورا کر لیتے ہیں۔ عورتوں کو مردوں سے کمتر سمجھا جاتا ہے جب کہ ایک مرد کی کئی کئی بیویاں ہوتی ہیں اور یہ اپنے شوہر کی ملکیت تصور ہوتی ہیں۔ عورتیں مردوں کے برابر یا سامنے بیٹھ کر نہیں کھا سکتیں۔ نہ ہی مردوں کی برابری کر سکتی ہیں۔ افریقہ میں عورتوں کے حقوق اسی قدر خستہ حال ہیں جتنا کہ کسی غیر مہذب ملک میں ہو سکتے ہیں۔ افریقی تو ہم پرست واقع ہوئے ہیں۔ معجزے اور ماورائے فطرت پر یقین رکھتے ہیں۔ مافوق الفطرت کے متلاشی رہتے ہیں۔ لوگوں پر جن قابض ہو جاتے ہیں مگر انہیں اُتارنے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ جن یا خبیث ارواح کے اتارنے کے نتیجے میں موت واقع ہو جانا عام بات ہے۔ جن، بھوت پریت نکالنے والے یہ سلطان العارفین گلی گلی پائے جاتے ہیں۔ اپنی کثرت، فراغت اور کاروبار کی خاطر یہ سلاطین العرفاء ہر کسی کو قبضہ قدرت میں ہونے کی بجائے قبضہ جن میں سمجھتے ہیں ان کے علاوہ شفا گر بھی ہوتے ہیں یہ شفا گر ان خبیث ارواح کو مارنے کا کام کرتے ہیں۔ یہ شفا گر برہنہ رہتے ہیں جانوروں کا

خون پیتے ہیں اور کچا گوشت کھاتے ہیں۔ مسلمان ان لوگوں کو بہت بُرا سمجھتے ہیں اور ان سے دور رہتے ہیں۔ افریقہ میں جنگ و جدل روز کا معمول ہے اس سے ریاست چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر نئی ریاستوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ تقسیم در تقسیم کا یہ عمل جاری رہتا ہے اور قبائل حالت جنگ میں ہی زندگی گزار دیتے ہیں۔ بادشاہ کے مر جانے پر کسی کو وراثت تفویض نہیں کی جاتی بلکہ ورثاء میں سے طاقت اور جوانمردی کے زور پر جو بھی اپنا حق ثابت کر دے وہی بادشاہ بن جاتا ہے۔ افریقی ہمیشہ مسلح اور تیار رہتے ہیں۔ خنجر' تلوار' نیزہ' بندوق جو بھی ممکن ہو ساتھ رکھتے ہیں۔

افریقہ میں غلامی افسوس ناک اور بدترین پہلو ہے۔ غلاموں کی تجارت انتہائی قبیح اور بے رحمانہ فعل ہے۔ جو ظالمانہ طریقے سے روبہ عمل لائی جاتی ہے۔ لوگوں کو اندرون ریاست سے پکڑ کر بہ عجلت تمام ساحل سمندر کی طرف ہنکایا جاتا ہے جہاں انہیں رم' تمباکو' اون' نمک' وہسکی' شیشہ اور ایسی ہی اشیاء کے بدلے فروخت کر دیا جاتا ہے۔ غلامی کا یہ نظام مسلسل خون خرابے کا باعث ہے اور مصائب کو جنم دیتا ہے۔ میں (محمد باقو اقوا) بذات خود ایک بار نوعمری میں بھی پکڑ کر غلام بنالیا گیا تھا اور میری ماں نے جزیہ دے کر مجھے چھڑایا تھا۔

افریقہ کے تذکرے کے بعد اب میں اپنی سوانح بیان کرتا ہوں جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ میرے والد عرب مسلمان اور محمد رسول اللہ ﷺ کے پیروکار تھے۔ لیکن میری والدہ کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ میرے والد اپنی والدہ یعنی میری دادی کے بارے میں بتاتے تھے کہ وہ بڑی سرگرم مذہبی خاتون تھیں لیکن عبادات کے بارے میں غیر مستقل مزاج تھیں جب کہ دین محمد (ﷺ) کے پیروکار عبادت میں عیسائیوں سے زیادہ سرگرم ہوتے ہیں اور خشوع و خضوع سے مصروف عبادات رہتے ہیں۔ میں دو جڑواں بھائیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور میری تین بہنیں تھیں میری ماں مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی اور گھر میں میری اہمیت ہر کسی سے زیادہ تھی۔ میرا ایک ماموں بہت امیر کبیر آدمی تھی جو بادشاہ کا لوہار ہونے کی وجہ سے شاہی حکومت کے لیے ہتھیار بناتا تھا وہ مجھے بھی یہی کام سکھانا چاہتا تھا لیکن میرے والد نے مجھے مسجد میں مدرسے کے حوالے کر دیا اور توقع رکھی کہ میں جلد ہی دین محمد کا سرگرم پیروکار بن جاؤں گا لیکن یہاں میرا دل نہ لگا اور میں بھاگ کر ماموں کے پاس چلا گیا جہاں میں نے خنجر گری سیکھی۔ میرے والد مجھے پکڑ لائے اور ایک اور مدرسے کے حوالے کر دیا لیکن میں یہاں سے بھی بھاگ نکلا۔

دراصل پابندی میری فطرت کے خلاف تھی اور مجھے اپنا معلم بھی پسند نہیں تھا سیکھنے کا یہ طریقہ تھا کہ دیوار پر سبق لکھ دیا جاتا جسے دیکھ کر لکھنے پڑھنے کی مشق کی جاتی جب یاد ہو جاتا تو دیوار پر دوسرا سبق لکھ دیا جاتا۔ طلباء کو غیر حاضری کی اجازت نہیں تھی اور حصول علم کے بعد تمام فیس یکمشت ادا کی جاتی۔ تکمیل علم کا پیمانہ یہ تھا کہ مسجد میں اساتذہ کی مجلس ہوتی اور طلباء کو بلالیا جاتا اُمیدوار کو بیس پارے پڑھ کر سنانا ہوتے جو بغیر کسی غلطی کے سنانا ضروری تھے جو اس معیار پر پورا اترتا تو اسے تکمیل علم کی سند عطا ہوتی اور مدرسے سے جان چھوٹ جاتی۔

سالگر شہر میں میرے ماموں کا انتقال ہوگیا اور اس کی بہت بڑی جائداد میری والدہ کو مل گئی۔ سالگر میں، میں نے ایک اور رشتہ دار سے زیورات بنانا سیکھے یہ بہت محنت طلب کام تھا جو میں زیادہ دیر جاری نہ رکھ سکا۔

افریقہ کا آئرن جس کی کوالٹی امریکی آئرن سے کئی درجہ بہتر ہے، میں نے اسی آئرن سے کئی اشیاء بنانا سیکھ لیں تھیں۔ افریقہ ہر اعتبار سے امریکہ پر اولیت رکھتا ہے بجز علم کے، سفید فام علم کی افریقہ کو ضرورت ہے لیکن سفید فام آواز کی نہیں لیکن افریقہ کون جائے گا جو افریقیوں کو پڑھا سکے۔ غریب افریقیوں کو آرٹ اور سائنس کون پڑھائے گا؟ بائبل کے احکامات کے مطابق اے سفید فاموں "جاؤ ان سب کو بچاؤ جو علم کی کمی سے نابود ہوتے جا رہے ہیں، تمہیں علم سے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے روانگی کی طاقت دی گئی ہے، اب توقف نہ کرو کہ وقت آ گیا ہے، قبولیت کا وقت، رات کو تو لوگ کام نہیں کرتے لیکن یہ تو دن ہے کہ عیسائی دوست نکلیں اور کام پر روانہ ہوں۔"

میرا بھائی قسمت کا حال بتانے کا کام کرتا تھا۔ بادشاہ جب بھی جنگ پر روانہ ہوتا میرے بھائی کو طلب کیا جاتا کہ یہ مہم بادشاہ کے حق میں رہے گی کہ مخالف۔ ستاروں کی گردش اور زمین پر کھینچے گئے ہندسوں، علامتوں کے حساب سے میرا بھائی پیشن گوئی کرتا جس پر یقین کرلیا جاتا۔ اس کی پیش گوئی اس قدر بااثر ہوتی کہ مہم کے بارے میں بادشاہ کے فیصلے کو بدل دیتی۔ زوزو کا بادشاہ میری ماں کا رشتہ دار تھا اس نے مجھے بلا بھیجا اور اپنے ذاتی محافظوں میں میرا تقرر کردیا۔ میرے اور بادشاہ کے درمیان دو منصب دار حائل ہوتے یہ دو محافظ عہدے میں مجھ سے بڑے تھے میں بادشاہ کے ساتھ ہی کھاتا پیتا، اس سے تنہائی میں باتیں کرتا اور شہر سے باہر اس کے پیغامات لے جاتا۔ بادشاہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتا تھا بجز ان معاملات کے جن میں

مجھ سے زیادہ تجربہ کار معاونین کی ضرورت ہوتی۔ بادشاہ فیاض' عادل اور دعوتیں کرنے کا شوقین تھا۔ سؤ ہر سو چہل پہل لگی رہتی جس سے بادشاہ کی مقبولیت ظاہر ہوتی تھی۔ مجھے یہ اندازہ نہیں کہ میں کتنی دیر بادشاہ کے پاس رہا لیکن یہ ایک معقول عرصہ تھا بادشاہ کے عمال' حکام' محافظ اور شاہی عملے کے ارکان بدمعاش اور بُرے کردار کے لوگ تھے جس سے میں بھی لازمی طور پر متاثر ہوا تھا۔ بادشاہ کی قربت کی وجہ سے کسی کو بھی جواب دہی کا خوف نہیں تھا۔ سؤ اپنی جگہ ہر کوئی شتر بے مہار بنا رہتا تھا۔ اس بادشاہ کی وراثت سیابا کے نام سے چلی جس طرح پرانے زمانے میں فرعون کے نام سے کئی بادشاہ ہوگزرے ہیں۔ میری ذمہ داریوں میں دو کام اہم تھے ایک تو یہ کہ جب بادشاہ پائن کی شراب پیتا تو میں اپنی ہتھیلی اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھے بیٹھا رہتا کہ کوئی قطرہ اس کی پوشاک پر نہ گرے۔ یہ کام عموماً اس کی بیوی کرتی لیکن کبھی کبھار مجھے بھی طلب کرلیا جاتا۔ میرے ذمہ دوسرا کام یہ تھا کہ بادشاہ کی طرف سے دی گئی دعوتوں میں بھاگ دوڑ اور مہمانوں تک پیغام رسانی کروں۔ بادشاہ کے احکامات سن کر چلنا منع تھا بلکہ بھاگ کر تعمیل کرنے کا حکم تھا۔ سؤ یہ بھاگ دوڑ مجھے بہت تھکا دیتی۔

اب میں اپنی زندگی کے اس تلخ ترین تجربے کی طرف آتا ہوں کہ مجھے کس طرح پکڑ کر ہمیشہ کے لیے غلامی کے حوالے کردیا گیا۔ بادشاہ کے قرب اور اعتماد نے میرے حریف پیدا کردیئے تھے۔ جو اندر خانے میرے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے اور مجھے راہ سے ہٹانے کے جتن کرتے رہتے تھے ایک دن میں اپنی ماں سے ملنے روانہ ہوا' ابھی میں راستہ میں ہی تھا کہ کچھ لوگ میری شان میں قصیدے پڑھتے اور نعرے لگاتے نمودار ہوئے اور مجھے شراب پیش کی اور کھانا کھلایا اس کے بعد وہ مجھے ایک اور جگہ لے جانے پر بضد ہوگئے جہاں ایک سردار ٹھہرا ہوا تھا اور مجھ سے ملنا چاہتا تھا میں نے ان کی بات مان لی اور روانہ ہوئے ہم راستے میں شراب پیتے' غل مچاتے اور اٹھکیلیاں کرتے جاتے تھے۔ وہاں پہنچنے پر میری شاندار ضیافت کی گئی اور بے تحاشا شراب پلائی گئی اگلی صبح جب میں بیدار ہوا تو وہاں کوئی مانوس چہرہ نہیں تھا اور مجھے قیدی بنالیا گیا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ میں اپنے دشمنوں کی سازش کا شکار ہوچکا ہوں۔ مجھے غلام کی حیثیت سے فروخت کردیا گیا۔ میں اس وقت کے اذیت ناک سانحہ کو لکھنے پر قادر نہیں ہوں۔ مجھے ماں کا خیال آتا تھا۔ کبھی آزادی کے سلب ہو جانے کا' بادشاہ کی قربت' بڑا منصب' خوشحالی سب کچھ چھن گیا تھا۔ اب میں جس آدمی کے قبضے میں تھا اس نے لکڑی کا دو شاخہ میری گردن میں

لوہے کے آنکڑے سے کس دیا اور مجھے ساحل کی طرف ہانکنے لگا۔ راستے میں ہم جب بھی رات کو رکتے وہ میری کڑی نگرانی کرتا رہتا۔ وہ مجھے بھاگنے کا کوئی موقع نہیں دیتا تھا۔ چار دنوں کے مسلسل سفر کے بعد وہ مجھے ایسی جگہ لے آیا جس کا نام بھی مجھے معلوم نہیں تھا۔ یہاں پر مجھے ایک عورت کے ہاتھوں فروخت کردیا گیا۔ اب وہ مجھے لے کر ایک اور سفر پروانہ ہوگئی اس کے ساتھ کئی مرد تھے جو اس کے احکامات مانتے اور خاموش رہتے۔ وہ مجھے گھنے جنگلوں میں لئے جاتے تھے جہاں راستہ بنانے میں تگ و دو کرنی پڑتی۔ چاروں طرف پانی کی افراط تھی جنگلی درندے عام تھے اور موسم خوشگوار تھا غالباً ہم کسی خوبصورت ملک سے گزر رہے تھے۔

کئی دنوں کے سفر کے بعد ہم ایسی جگہ پہنچے جہاں اس عورت کے عزیز رہتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے اچھا سلوک کیا لیکن میری سخت نگرانی کی جاتی تھی مبادا میں فرار نہ ہو جاؤں دو دن یہاں ٹھہرنے کے بعد ہم پھر روانہ ہوئے اور افاؤ پہنچے اور یہاں پہنچ کر اس عورت نے مجھے فروخت کردیا اور غائب ہوگئی بوقت روانگی وہ مجھے فروخت کرنے پر شرمسار اور غمزدہ لگتی تھی۔ اس نے مجھے ایک تحفہ دیا اور چلی گئی اب مجھے جس آدمی نے خریدا وہ بڑا امیر کبیر آدمی تھا۔ اس کی بہت سی بیویاں اور خدمت گار تھے۔ یہاں مجھے ایک بوڑھے غلام کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ پھر وہاں ایک رقص کا آغاز ہوا جس سے میں خوفزدہ ہوگیا کہ اب مجھے قتل کردیا جائے گا چونکہ میں سن چکا تھا کہ اس طرح کے رقص قربانی کی رسم کا ابتدائیہ ہوتے ہیں۔ میں افاؤ میں کئی ماہ تک رہا اور مجھ سے اچھا سلوک کیا جاتا رہا لیکن رات کو مجھ پر پہرہ لگادیا جاتا۔ افاؤ سے روانہ ہوکر ہم سیدھے دوھاما پہنچے رات کو ہم سفر کرتے اور دن کو جنگل میں چھپے رہتے۔ افاؤ سے دوھاما تک پہاڑی علاقہ ہے جو سرسبز جنگل سے ڈھکا ہوا ہے دوھاما میں، میں نے پہلی بار سنگترے دیکھے۔ دوھاما پہنچنے میں ہمیں چار دن لگے۔ یہاں آنے کے بعد میری واپسی کی ساری اُمیدیں ختم ہوگئیں کہ میں کبھی دوبارہ اپنے گھر جاسکوں گا مجھے جب بھی اپنا گھر، ماں، آزادی اور اقرباء یاد آتے میرا دل ڈوب جاتا اور بے ساختہ آنسو بہنے لگتے۔ امریکیوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ افریقیوں کے سینے میں دل نہیں ہوتے اور وہ جذبات سے عاری ہوتے ہیں یا وہ رحمدلی کی انسانی صفات سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔

افریقہ میں جداگانہ رنگ کے سوا ہر چیز ویسی ہی ہے جیسی کہ دوسری انسانی نسلوں میں ہے۔ محبت، نفرت، رحمدلی، غصہ، فیاضی، دفاعی صلاحیت، آواز، خون، درد اور خواہشات کے افریقی

جذبات کسی دوسرے سے مختلف نہیں ہیں۔ دو دن کی مزید مسافت طے کرنے کے بعد ہم گریفی پہنچے۔ یہاں میں نے پہلی بار سفید فام شخص دیکھا۔ یہاں سے دریا میں سفر شروع ہوا۔ جو آہستگی سے تین دن جاری رہا۔ پھر ہم ایسی جگہ آن پہنچے جہاں مجھ جیسے غلام ایک احاطے میں بند تھے۔ یہاں بولنے یا حکم عدولی کی اجازت نہیں تھی ایک آدمی لمبا سا ہنٹر لیے منتظر رہتا تھا کہ کس کی چمڑی ادھیڑے' اسی اثنا میں ایک اور آدمی لوہے کی گرم سلاخ سے ہمارے اوپر نمبر داغنے آ گیا جس طرح مال کے بکسوں پر نمبر لکھے جاتے ہیں۔ ہم پر نمبر داغ دیے جانے کے بعد ہمیں سفر کے لیے تیار کر دیا گیا۔ ہمیں اجتماعی طور پر زنجیروں میں جکڑ دیئے جانے کے بعد ہر ایک کی گردن میں رسی کا پھندا ڈال کر ایک موٹی زنجیر سے باندھ دیا گیا۔ اس کے بعد ہمیں سمندری ساحل کی طرف دھکیلنا شروع کیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں قربانی کے لیے قتل گاہ کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ لیکن ہمیں سمندر کے کنارے ٹھہرنے کا حکم ملا۔ یہاں ہمیں افراط سے کھانے کو دیا گیا۔ جس میں چاول' مچھلی' گوشت وغیرہ کی بہتات تھی۔ مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ افریقہ میں یہ میرا آخری کھانا ہے۔ مجھے اپنی تقدیر اور منزل معلوم نہیں تھی ملک بھر سے غلام پکڑ کر جو یہاں لا کر رکھے گئے تھے اب انہیں ساحل سے کشتی میں بٹھا کر جہاز کی طرف لے جایا جا رہا تھا کشتی جونہی جہاز کے قریب پہنچی ایک طوفانی لہر سے ٹکرا کر عمودی کھڑی ہوگئی جس سے ایک غلام جس پر 30 کا ہندسہ داغا گیا تھا سمندر میں ڈوب گیا دوسری کشتی میں مجھے سوار کیا گیا اور ہم جہاز کی طرف بڑھنے لگے۔ غلاموں سے بھرا جہاز' اللہ تعالیٰ اس کی خوفناکی سے پناہ دے۔ اس بحری جہاز کا تذکرہ کیسے کروں؟

اے انسانیت کے نام لیوا دوستو' افریقیوں پر رحم کرو' کون ہیں کہ وہ جنہیں گھروں سے پکڑ کر فروخت کیا گیا ہے یہ کسے بحری جہازوں کے تہہ خانوں اور سوراخوں میں بند کیا گیا ہے؟ ہم افریقیوں کو؟ جہاز کے تہہ خانے کی چھت اس قدر نیچی تھی کہ وہاں کھڑا نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ صرف رینگنا ممکن تھا سو ایک طرف برہنہ مرد رینگتے تھے اور دوسری طرف برہنہ عورتیں۔ جہاز کے تہہ خانے میں دن اور رات کی تمیز نہیں تھی اور جگہ کی قلت کے باعث سونا ممکن نہیں تھا۔ تھکن اور بھوک سے ہم نڈھال تھے اس جگہ کی نجاست' تعفن اور ہولناکی میری یاد سے کبھی محو نہیں ہوسکتی۔ میں آج بھی جب اس تہہ خانے کا سوچتا ہوں تو مجھے متلی ہونے لگتی ہے۔ انسانیت کے ان نام لیواؤں کو جو غلامی کے حق میں ہیں صرف ایک بار اس بحری جہاز کے تہہ خانے میں

افریقہ سے امریکہ لایا جائے تو وہ یقیناً اس سوراخ سے باہر آتے ہی غلامی کی رہائی کے حق میں ہو جائیں گے۔ اگر نہ ہوں تو انہیں انسان کی بجائے لوہے کا فریم کہنا مناسب ہوگا۔ ایسا فریم کہ جس میں نہ دل ہو' نہ دماغ 'نہ روح' اس سفر کے دوران جو کھانا ہمیں دیا گیا وہ اُبلی ہوئی مکئی اور بھیگی ہوئی مکئی پر مشتمل تھا۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں ہے کہ ہم کتنی دیر اس حالت عذاب میں محو سفر رہے اس تمام سفر میں ہم پانی کے لیے ترستے رہے جو دن میں چند قطروں سے زیادہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اس مسلسل حالت جان کنی سے کئی غلام آزاد ہوتے جاتے تھے۔ جنہیں سمندر کی نظر کر دیا جاتا تھا۔ جب ہم میں سے کوئی حالت دیوانگی میں چلانے لگتا تو خنجر سے اُس کی کھال کاٹ کر اس میں مرچیں اور سرکہ بھر دیا جاتا جس سے وہ پھر عالم دیوانگی سے عالم بے چارگی میں واپس آ جاتا۔

اس پر مستزاد سمندری سفر کی تکلیف اور بیماری جس سے ہم شدید نقاہت اور تکلیف میں تھے لیکن حیران کن حد تک ہمارے سفید فام آقاؤں پر اس سمندری سفر کی تکلیف کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے مصائب ہی ہمارے تھے نہ کوئی غمگسار تھا نہ ہمدرد' جونہی کسی پر یہ شک پڑتا کہ یہ مرنے والا ہے اسے عرشے پر پٹخ دیا جاتا اور عرشے سے سمندر میں پھینک دیا جاتا۔ دوران سفر ہمیں ایک بار عرشے پر لے جا کر نہانے کا موقع دیا گیا اور دوبارہ اس وقت کہ جب امریکی ساحل آنے والا تھا۔

بالآخر پرنا میکو (برازیل) کے ساحل پر صبح سویرے ہمیں اتارا گیا۔ شہر سے دور یہ اجاڑ جگہ تھی۔ ہمیں ایک فارم ہاؤس میں لے جایا گیا یہ جگہ غلاموں کی منڈی کے طور استعمال ہوتی تھی۔ یہاں جو شخص موجود تھا اس کے بہت سے غلام ادھر اُدھر پھر رہے تھے اور وہ ایک نوجوان لڑکے کو ہنٹر سے مارنے میں مصروف تھا جس کی دل آزار چیخ و پکار نے میرے دل پر گہرا اثر کیا میرا دل کہتا تھا کہ یہی سلوک مجھ سے بھی ہونے والا ہے۔ ہائے افسوس کہ میرے خدشات کس قدر جلد حقیقت میں بدل گئے۔

غلاموں کی آمد کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح شہر تک پہنچی۔ اگلے روز لوگ غول در غول غلاموں کو خریدنے آ گئے۔ ہر کوئی اپنی مختلف ضرورت کے لیے ہمیں خریدنا چاہتا تھا یوں جیسے سامان اور اشیاء خریدی جاتی ہوں۔ جیسے بیل اور گھوڑے خریدے جاتے ہوں۔ میں پھر فروخت ہوا۔ اس بار مجھے پرنا میکو کے ایک نانبائی نے خریدا۔ یہ نانبائی عقیدے کا پکا رومن

کیتھولک، کٹر مذہبی اور ظالم شخص تھا۔

اس گھرانے میں اس کی بیوی، دو بچے اور ایک رشتہ دار عورت شامل تھی۔ جب کہ دوسرے غلام بھی موجود تھے۔ یہ خاندان دن میں دوبار باقاعدگی سے عبادت کرتا، داخلی دروازے کے اندر کی طرف ایک بڑا سا گھڑیال نصب تھا۔ جس کی علامتوں پر، صلیب اور مٹی سے بنی عیسیٰ اور مریم کی شبیہہ نقش تھی۔ اس گھڑیال کی طرف منہ کرکے ہمیں گھٹنوں کے بل جھکنا ہوتا تھا۔ ہمارے آگے آقا اور ہم غلام ان کے پیچھے۔ اس عبادت کے دوران آقا کی نظر غلاموں پر رہتی جونہی کوئی غلام عدم توجہ کا شکار ہو جاتا آقا اس کی چمڑی ادھیڑ کے رکھ دیتا۔ جلد ہی مجھے سخت مشقت پر لگا دیا گیا ایسی مشقت جو صرف غلام، گھوڑے یا بیل ہی انجام دے سکتے تھے۔ نانبائی کا مکان زیر تعمیر تھا جس کے لیے چوتھائی میل دور پانی کی ترائی سے پتھر کی بھاری سلیں اٹھا کر لانا ہوتیں۔ ایک سِل بھی اس قدر بھاری ہوتی جو بمشکل تمام تین آدمی اٹھا کر میرے سر پر رکھتے جو مجھے بلا توقف صبح سے رات گئے تک ڈھونا ہوتیں۔ میرا آقا مجھے پرتگیزی میں اوکسوری، یعنی او کتے کہہ کر مخاطب کرتا میں نے جلد ہی پرتگیزی میں شد بد حاصل کر لی اور قرب و جوار سے آگاہ ہو گیا۔ پتھر ڈھونے کے بعد مجھے روٹیاں بیچنے کا کام تفویض ہوا جو مجھے شام کے وقت گلی، محلّوں میں بیچنا ہوتیں جو بچ جاتیں انہیں بازار میں بیچتا۔ جس دن نہ بیچ سکتا مالک مجھے کوڑے مارتا۔ سو مجھے پتہ ہوتا تھا کہ آج میری خیر نہیں ہے۔ میں نے محنت، ایمانداری، اخلاص اور تابعداری سے مالک کا دل جیتنے کی ہر ممکن کوشش کر دیکھی۔ وہ حقیقتاً بد فطرت اور ظالم آدمی تھا۔ حالات سے بد دل ہوکر میں وہاں سے بھاگ نکلا مگر جلد ہی پکڑ کر واپس لایا گیا۔ ہر طرح کے افعال اچھے اور بُرے دونوں کا نتیجہ ایک ہی تھا۔ سو میں نے دوسری راہ اختیار کر لی۔ ایک دن روٹیاں بیچ کر واپس آتے ہوئے مالک کی رقم سے میں نے جی بھر کر وہسکی پی اور نشے میں بدمست واپس آ گیا۔ صورت حال جاننے پر آقا نے میری چمڑی ادھیڑ کر رکھ دی۔ وہ یہی کر سکتا تھا جو اس نے کیا بصورت دیگر بھی اس نے یہی کرنا تھا۔ پھر میں نے آقا کو قتل کرنے کا ارادہ باندھا کہ اسے قتل کرکے خودکشی کر لوں۔ مجھے غلامی سے نفرت ہو چکی تھی اور میں غلام بن کر زندگی نہیں گزار سکتا تھا بالآخر میں نے ایک دن اپنے آپ کو لہروں کے حوالے کر دیا لیکن کچھ ملاحوں نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا اور ساحل پر لے آئے یہاں سے مجھے وہ نانبائی کے پاس لے گئے جس نے مجھے ہاتھ پاؤں باندھ کر بہت بے دردی سے مارا پیٹا۔ میں جب نڈھال ہو جاتا تو وہ میرا منہ

دروازے کی چوکھٹ پر دے مارتا جس سے میرا منہ لہولہان ہوگیا اور زخم پڑ گئے۔ ان زخموں کے نشان میں آج بھی اپنے منہ پر لیے پھرتا ہوں اور یہ غالباً ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے جو مجھے اس اذیت ناک واقع کی یاد دلاتے رہیں گے۔

تنگ آ کر نانبائی مجھے فروخت کرنے پر آمادہ ہوگیا اور مجھے اپنے سے بدتر انسان نما وحشی جانور کے ہاتھ فروخت کردیا۔ اس مالک نے میرے ساتھ دو غلام لڑکیاں بھی خریدیں جن میں سے ایک بہت خوب روتھی لیکن مالک اس خوبصورت لڑکی سے قصداً انسانیت سوز سلوک کرتا جس کی وجہ سمجھنے سے میں قاصر تھا۔ دو ہفتے کے بعد ہی اس مالک نے مجھے فروخت کردیا۔ اس بار مجھے ایک جہاز کے کپتان نے خریدا۔ یہاں میرا کام کیبن کا فرش چمکانا' عرشے پر صفائی اور اسی طرح کے چھوٹے موٹے کام تھے' جلد ہی میری ترقی ہوگئی اور مجھے سٹیورڈ بنادیا گیا۔ لیکن کیپٹن کی داشتہ جو اس کیبن میں مقیم تھی میرے لیے مسلسل مسئلہ بنی رہی وہ کبھی مہربان ہوجاتی تو کیپٹن سے میری سزا معاف کرادیتی اور کبھی بلاوجہ مجھے کوڑے لگواتی اس کی عجیب وغریب ظالمانہ سرشت میرے لیے وجہ عذاب بنی رہی۔ رحمدلی اور انسانیت سوز افعال کے ناقابل یقین عناصر کے مرکب نے اس کی شخصیاتی طلسم کو پیچیدہ بنادیا تھا۔ اس دوران مجھے مسلسل بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا اتنا زیادہ کہ شاید زندگی بھر میں کبھی اس ظلم کا شکار نہیں ہوا تھا مجھے جہاز پر آئے ابھی کچھ دن ہی گزرے تھے کہ ہم ریوگرنیڈے (خلیج میکسیکو) کے لیے روانہ ہوئے ہم قریب ڈیڑھ ماہ ریوگرنیڈے میں ٹھہرے جہاں میں مسلسل یہ سنتا رہا تھا کہ قریب ہی ایک ایسا آزاد ملک امریکہ نام کا پایا جاتا ہے کہ جہاں غلام تو ہیں لیکن ایک شہر نیویارک میں غلام آزاد ہیں۔ سو اگر میں کسی طرح نیو یارک پہنچ جاؤں تو میں غلامی کے اس چنگل سے آزاد ہوسکتا ہوں۔ آزادی کا خیال ہی مجھے شرسار کردینے کے لیے کافی تھا میں دل ہی دل میں منصوبے باندھتا اور خیال ہی خیال میں اپنے آپ کو آزاد انسان محسوس کرتا۔ آزادی کے خیال سے میری کارکردگی میں بہتری آچکی تھی اور وہ دن میرے لیے بہت مسحور کن تھے۔ ان دنوں سورج پوری آب وتاب سے چمکتا تھا اور شامیں خوبصورت ہوتی تھیں ابھی میرے خیالات آزادی کی تڑپ سے منور ہی تھے کہ ایک دن اعلان ہوا کہ ہمارا جہاز ریوگرنیڈے سے نیویارک روانہ ہوگا۔ اس اعلان پر میری خوشی کی انتہا کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہونا چاہئے۔ ہم نیویارک روانہ ہوئے۔ ہوا بھی امریکہ ہی کی طرف چلتی تھی' سو ہم بناتشویش و بلاتردّد نیویارک کی طرف رواں دواں رہے

ہم لحظہ بہ لحظہ نیویارک کے قریب آتے جاتے تھے کہ ایک طوفان نے ہمیں آن گھیرا۔ یکا یک بلند و بالا طوفانی لہریں اُمڈ آئیں، اندھیرا چھا گیا اور جہاز ہچکولے کھانے لگا۔ ہوا کی شدت سے قطب نما پڑھنے والا لیمپ بجھ گیا اور جہاز پر مکمل تاریکی چھا گئی۔ کپتان نے مجھے لیمپ جلانے کا حکم دیا لیکن ہوا کی شدت، سمندری پھوار اور ہچکولوں کی شدت سے میں لیمپ جلانے میں ناکام رہا۔ میری اس ناکامی نے کپتان کو آگ بگولہ کردیا لیکن میری سزا مؤخر کردی گئی۔ کچھ دیر بعد جب طوفان تھم گیا تو میری سزا کا طوفان شروع ہوا کپتان اپنے کیبن سے باہر آیا اس کے ہاتھ میں بڑا سا مضبوط ڈنڈا تھا۔ جو اس نے پوری شدت سے میرے سر پر مارا لیکن اس وار کو میں نے اپنے ہاتھ سے روک لیا۔ کپتان کی کوشش تھی میرے ہاتھ زخمی نہ ہوں تاکہ میں کام کرنے کے قابل رہوں جب کہ میری کوشش تھی کہ میرے سر پر ضرب نہ آئے تاکہ میرا دماغ کام کرنے کے قابل رہے وہ ہر ضرب پر مجھے ہاتھ نیچے رکھنے کا حکم دیتا رہا لیکن میں ہر بار سر کو بچاتا رہا۔ تنگ آکر کپتان نے مزید غلاموں کو بلایا اور مجھے جہاز پر لگی توپ کے منہ پر باندھنے کا حکم دیا گیا۔ غالباً میرا آخری وقت آن پہنچا تھا مجھے توپ پر اس طرح باندھا گیا کہ میرا سر نیچے لٹکا ہوا تھا میرے جسم کے ہر حصے سے خون کی بوندیں سر تک آتیں پھر قطرہ قطرہ نیچے گرتیں میں منتظر تھا کہ توپ چلاکر میرے جسم کے حصے بخرے کردیئے جائیں گے جو سمندر میں جا پڑیں گے۔ لیکن کپتان نے اس شرط پر جان بخشی کی پیشکش کی کہ میں غلطی کی معافی مانگ کر رحم کا طلبگار ہوں جس کے جواب میں، میں نے کہا تم مجھے مار تو سکتے ہو لیکن رحم مانگنے پر مجبور نہیں کرسکتے سو، میں تمہاری پیشکش کو حقارت سے ٹھکراتا ہوں اور مرنے کے لیے آمادہ ہوں مجھے مرنے پر آمادہ دیکھ کر کپتان نے مجھے توپ سے اتار کر جہاز کے تہہ خانے میں بند کرنے کا حکم دیا۔ شدید ضربات اور درد سے میں کام کے قابل نہیں رہا تھا مجھے باقاعدگی سے کھانا بھیجا جاتا رہا کہ میں جلد صحت مند ہوکر کام شروع کرسکوں لیکن اس بار مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ جہاز پر موجود غلام عورتوں سے کپتان کا سلوک مزید وحشیانہ ہوتا، وہ اس چلتی پھرتی چھوٹی سی مملکت کا حاکم اعلیٰ تھا جس کے غضب، اختیارات اور حکم کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہاں مجھے اندازہ ہوا کہ غلامی کس قدر بُری چیز ہے میں سوچتا تھا کہ یہ شخص اپنے جرائم کا حساب کس طرح دے گا۔ جس روز اس کی کتاب کھولی جائے گی تو یہ کیا کہے گا۔ انسانی مخلوق پر اس کے ہاتھوں لگے زخم اللہ کی بے پناہ رحمت سے ہی معاف ہوسکتے ہیں۔ میں نے انگریزی کا جو سب سے پہلا

لفظ سیکھا وہ لفظ تھا...... 'فری'۔ جہاز پر ایک بوڑھے جیمز نامی انگریز نے مجھے یہی لفظ سکھایا تھا۔
فری ' فری ' فری..........

FREE

FREE

FREE

میں دن رات یہی لفظ دہراتا رہتا تھا۔ اسی بوڑھے انگریز نے جو پرتگیزی بولتا تھا مجھے نیویارک سے بھی آشنا کردیا تھا۔ نیویارک پہنچنے پر جونہی ہمارا جہاز لنگر انداز ہوا ہمیں پتہ چلا کہ اپنے آپ کو آزاد قرار دے دینے پر جہاز کا کپتان ہمیں اپنا غلام نہیں رکھ سکتا چونکہ جہاز پر کام کرنے والے ملازمین کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں نہ کہ غلاموں کے۔ اس قانون کا پتہ چلتے ہی میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اب جہاز پر نہیں رہونگا۔

اگلی صبح کافی سارے لوگ جن میں طرح طرح کے لوگ تھے ہمارے جہاز پر آ گئے جو یہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا جہاز پر کچھ غلام بھی ہیں غالباً وہ غلام خریدنا چاہتے تھے۔ اسی دوران کپتان نے مجھے ایک کوٹھڑی میں بند کردیا تھا مبادا کہ میں اپنے آپ کو آزاد قرار دے کر جہاز سے اتر نہ جاؤں۔ میں نے اس کوٹھڑی میں قید کے دوران لوہے کی ایک سلاخ حاصل کرلی تھی، اگلے دن جب مجھے کھانا دینے کے لیے دروازہ کھولا گیا تو میں نے پوری قوت سے سلاخ کو کھانا لانے والے سر پر دے مارا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ عرشے پر کھڑی کپتان کی داشتہ نیویارک کا نظارہ کررہی تھی وہ مجھے دیکھتے ہی چلائی کہ مجھے کس نے کوٹھڑی سے نکالا ہے لیکن میں اسے دھکا دیتے ہوئے اس تختے پر بھاگتا چلا گیا جو جہاز سے سامان اتارنے کے لیے زمین تک پھیلا ہوا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ کچھ لوگ میرے پیچھے بھاگ رہے تھے بالآخر وہ مجھے پکڑنے میں کامیاب ہوگئے اور مجھے پکڑ کر ایک بڑی سی عمارت میں لے گئے جسے وہ پولیس کہتے تھے۔ وہاں مجھ سے پوچھا گیا کہ میں یہاں آزاد رہنا چاہتا ہوں یا کپتان کے ساتھ جہاز پر جانا چاہتا ہوں۔ میرے آزاد رہنے کے اعلان پر انہوں نے مجھے جیل میں بند کردیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ مجھے نکال کر ایک بڑی عمارت میں لے گئے۔ میں نے اس سے بڑی اور خوبصورت عمارت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس بڑی عمارت کی سیڑھیوں پر بھی مَر مَر لگا تھا اور جگہ بہ جگہ خوبصورتی سے

درخت لگے تھے اس عمارت کا کمرہ جہاں مجھے لے جایا گیا تھا اتنا بڑا تھا کہ میں حیران رہ گیا۔ وہاں بہت سارے لوگ تھے جو مسلسل باتوں میں مصروف تھے کافی دیر کے بعد ایک شخص آیا جسے دیکھ کر سب خاموش ہوگئے۔ پھر مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا میں برازیل واپس جانا چاہتا ہوں یا یہیں رہنا چاہتا ہوں میں نے بآواز بلند جواب دیا کہ مجھے یہاں موت بھی منظور ہے اور میں کسی صورت برازیل جانے پر رضا مند نہیں ہوں۔ میرے جواب پر کپتان کے منہ پر بے زاری چھا گئی جب کہ جہاز پر غلام عورتوں میں سے کچھ عورتوں نے جہاز پر واپس جانے پر رضا مندی کا اظہار کیا۔ مبادا کہ اگر وہ کسی وجہ سے آزاد نہ ہوسکیں تو کپتان ان سے ناراض ہوکر ان سے انتقام لینے پر نہ اتر آئے مجھے پتہ چلا کہ اس عمارت کو نیو یارک سٹی ہال کہتے ہیں اور یہاں غلاموں کی عدالت لگتی ہے۔ اس سوال و جواب کے بعد مجھے پھر جیل میں بند کردیا گیا جس کی وجہ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی۔ کئی دنوں بعد مجھے پھر اسی عدالت میں لایا گیا اور مزید سوال پوچھے گئے۔ انہی سوالوں کے آخر میں مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا میں برطانیہ جانا چاہتا ہوں یا ہیٹی۔ میری دانست میں ہیٹی بہتر تھا چونکہ میں برطانیہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا سو میں نے ہیٹی جانے پر رضا مندی ظاہر کردی۔

ہیٹی (پورٹ پرنس) پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ میں ایسے لوگوں میں آ گیا ہوں کہ جن کی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا۔ یہاں پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ میرے لیے یہاں نہ جائے پناہ ہے نہ کوئی غمخوار' نہ میں اپنا مدعا بیان کرسکتا ہوں نہ کسی کی بات سمجھ سکتا ہوں۔ بلا مقصد چلتے چلتے میں بادشاہ کے محل کے سامنے سے گزرا اور اندر چلا گیا وہاں مجھ پر ترس کھا کر مجھے کھانے کو دیا گیا اور شراب پلائی گئی۔ میں پھر جگہ بہ جگہ مارا مارا پھرتا رہا۔ خوراک کی قلت' کمزوری اور نقاہت سے چلنے کے قابل نہیں رہا تھا' میں راتیں کھلے آسمان تلے اور دن درختوں تلے گزارتا رہا' لوگ سمجھتے تھے کہ مین نشے میں بدمست ہونے کی وجہ سے ڈگمگا رہا ہوں۔ جب کہ میں بوجہ کمزوری حرکت نہیں کرسکتا تھا۔ ہیٹی میں میرے کسی انجانے خیر خواہ نے اطلاع کردی کہ میں نے ہیٹی آنے کے لیے رضا کارانہ حامی بھری تھی۔ جب کہ میں یہاں بے یارو مددگار بھوکا پیاسا پھر رہا ہوں۔ اس کے بعد مشنری چرچ کے پادری مسٹر جڈ نے مجھے اپنے گھر رکھ لیا اور مجھ سے انتہائی شفقت سے پیش آئے' میرے دل میں ان کی بیوی مسز جڈ کا بڑا احترام ہے چونکہ ان دونوں نے مجھ سے ایسا عمدہ سلوک کیا کہ جس کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔ میں اعتراف کرتا

ہوں کہ اکثر اوقات میرا سلوک ان سے اس قدر اچھا نہیں ہوتا تھا جتنا کہ ان کا، لیکن اس کے باوجود مسٹر اور مسز جڈ کے سلوک حسن میں کبھی بھی کمی نہیں آئی میں ان کے پاس دو سال تک مقیم رہا۔ میرے خیال میں مسٹر جڈ سے بہتر کوئی عیسائی مشکل سے ہی ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ اسی دوران ہیٹی میں لازمی ملیشیا تربیت کا اطلاق ہوا۔ میں چونکہ تازہ بتازہ عیسائی خیالات کی وجہ سے کسی بھی جنگ و جدل اور قتل و غارت کے خلاف تھا اور میرے محسنین بھی اسی طرح کے خیالات کے مالک تھے۔ سو یہ فیصلہ کیا گیا کہ میں ہیٹی چھوڑ کر امریکہ واپس چلا جاؤں اور وہاں سے تعلیم حاصل کروں اور افریقہ واپس جا کر عیسائیت پھیلاؤں یہ فیصلہ ہوتے ہی مسٹر جڈ مجھے نیویارک لے جانے کے لیے تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ مسٹر جڈ کی ایک ہمشیرہ جو نیو یارک میں مقیم تھیں انہیں آمد کی اطلاع دینے کے بعد ہم نیویارک کے لیے روانہ ہوگئے۔ تمام راستہ خراب موسم، طوفان، بارش اور آسمانی بجلی سے طے کرنے کے بعد ہم امریکہ کی جنوبی ریاستوں کی بندر گاہ پر اترے جہاں تھوڑی دیر قیام کے بعد ہم نیویارک روانہ ہوگئے۔ نیویارک میں ہم ملفورڈ پہنچے جہاں مسز جڈ کا میکہ تھا یہ لوگ ہم سے بہت اچھی طرح پیش آئے۔ یہاں دو ہفتے قیام کے بعد ڈیلاویر روانہ ہوا تا کہ مشنری تنظیم سے حصول تعلیم میں مدد طلب کرسکوں۔ انہوں نے مجھے لیک گراول میں سائرسن گراسز کے پاس بھیج دیا جو کالج کے صدر تھے۔ مسٹر گراسز نہایت نفیس انسان تھے، وہ مجھ سے اخلاص اور ہمدردی سے پیش آئے اور مجھے کالج میں داخل کرلیا۔ میں یہاں تین سال رہا اور میں نے بہت کچھ سیکھا۔ یہاں سے میری روانگی کے موقع پر ایک سفید فام خاتون پروفیسر میری کنگ نے ایک خصوصی الوداعی نظم لکھی جو میں نے کالج کی الوداعی تقریب میں پڑھی۔

افریقیوں پر رحم

زخموں سے رِستے افریقہ کے دوستو
انسانوں کی سب کاوشیں اکارت جاچکی ہیں
انسان ہی انسان کے لیے زنجیر بنا رہے ہیں
ہمیشہ کے راست باز خدا
یہ کیسا انصاف ہے
میں جنہیں دیکھتا ہوں

جن پر اعتبار کرتا ہوں
ان افریقیوں کی مناجاتیں
دعائیں اور خواہشیں
خس وخاشاک کی طرح بے وقعت
ضائع ہوتی جاتیں ہیں
یسوع مسیح کے واسطے سے سہی
کچلے ہوئے، خانماں خاک میں غلطاں
افریقیوں پر اب تو رحم ہو۔ (پروفیسر میری کنگ)

یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد فری مشنز نے مجھے مزید تعلیم کے حصول کے لیے فری ٹاؤن کارنز میں داخل کرا دیا۔ جہاں میں نے اپنے ایک پروفیسر کے ساتھ قیام کیا۔ یہاں سے حصول علم کے بعد میں لیک گرا واپس آ گیا۔ اور ملکہ وکٹوریہ کے زیر انتظام کینیڈا جانے کی ٹھان لی۔ جو میرے خیال میں میرے لیے بہترین جگہ ہو سکتی تھی۔ کینیڈا میں مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ وہاں نسلی امتیاز اور نسلی تعصب کا کوئی تجربہ نہیں ہوا۔ وہ لوگ مجھ پر بہت مہربان تھے اور میرا رنگ میرے رستے میں حائل نہیں تھا۔ وہاں چرچ کے میز بانوں کے مشورے پر میں ملکہ وکٹوریہ کی سلطنت کینیڈا میں مستقلاً رہائش پر رضا مند ہو گیا۔ میں نے ملکہ وکٹوریہ سے وفاداری کا پیمان باندھا، حلف اٹھایا اور کینیڈا کا شہری بن گیا۔ کینیڈا کی شہریت اختیار کرنے کے بعد میں نے اپنی آزادی کو محسوس کیا اور اس سے لطف اندوز ہوا۔ اپنے انجیر کے درخت کے نیچے بیٹھنے سے جو آزادی منسلک ہے اس کے تجربے نے مجھے نہال کر دیا۔ اب جبکہ میں دوستوں میں گھرا، آزادی، امن اور خوشحالی کے درمیان ہوں تو مناسب سمجھا کہ وہ سب کچھ سپرد قلم کروں جو کہ ان صفحات میں کر چکا ہوں۔ 48۔(محمد باقوا قوا:1854)

محمد باقوا قوا کی اس سوانح کو عالمی ادب میں اس ہمہ جہتی طرز اسلوب کا امام قرار دیا گیا جس سے بیسویں صدی کے امریکی ادب پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ انہوں نے اپنی مختصر سی سوانح میں افریقہ کا جغرافیہ، ثقافت، سیاست، چلن، رواج، قانون، زراعت، معیشت اور معاشرت کو پیش کرتے ہو علم وفکر کے سو زاویے واضح کر دیے۔ افریقہ پر سو مدلل کتابیں بھی وہ کام نہ کر سکیں جو مختصر سی آپ بیتی نے کر دکھایا۔ اس ہمہ جہت طرز نگاری کے علاوہ

باقوا قوا کی نثر نے امریکی ادب کو کم و بیش اسی طرح متاثر کیا جس طرح پشکن نے روسی ادب کو کیا تھا۔ اختصار، دلکش ادائیگی، سیدھی بات، سادہ جملے اور صادق لہجہ، محمد باقوا قوا کے اندر چھپے بہت بڑے ادیب پر گواہ ہے۔

محمد باقوا قوا، امریکہ میں ایک صدی سے پوچھے جانے والے سوال کا واضح جواب ہیں کہ آخر امریکہ کے سیاہ فام غلام گئے کہاں ؟ ان پر کیا گزری وہ کہاں گئے اور ان کا کیا بنا ؟ انیسویں صدی کے پہلے وسط میں ایک منظم منصوبے کے تحت امریکہ میں مسلمانوں کو عیسائیت کا بپتسما دیا گیا۔ اسے بپتسما ثانی کہیے یا اندلس میں مسلمانوں کو دیے گئے بپتسما اوّل کا تسلسل، نتیجہ دونوں کا ایک ہی نکلا۔ مسلمان سپین کی سرزمین سے نابود ہوئے اور امریکی زمین میں ناپید۔ عمر ابن سعد، محمد باقوا قوا، سالم الجبرین اور محمد علی سعید ان بپتسما زدوں کی مصدق مثال ہیں۔ جو عیسائیت کے بپتسما سے بچے وہ امریکہ کی خانہ جنگی (1861-1865) کی بھینٹ چڑھ گئے۔ بے شمار مسلمان اس خانہ جنگی میں دونوں اطراف سے (جنوبی و شمالی افواج) کی اگلی صفوں میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ محمد علی بن سعید، چارنو، سالم الجبرین اور سلیم مفلس امریکی افواج میں مسلمان افریقیوں کی موجودگی ثابت کرتے ہیں۔ ایسی موجودگی جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

افریقی مسلمان جو امریکی بازاروں میں نیلام ہوئے، جہاز کے عرشوں پر فروخت ہوئے اور امریکی منڈیوں میں جن کے سودے ہوئے وہ اپنے ہونے کے ثبوت میں، تحریر، تقریر، تصویر، سوانح، نظم، خطاطی، شعر، گواہی، تصدیق، دستاویز، اقوال، ادبی اسلوب، طرزِ سخن اور بے نام و نشان قبروں کے علاوہ ایک معجزہ بھی چھوڑ گئے لیکن تالے لگے امریکی قلوب پر اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ امریکن مسلم کونسل کے فرید نعمان لکھتے ہیں کہ:

> ”امریکی خانہ جنگی کے دوران شمالی ریاستوں (مع وفاقی حکومت) کی 'خاکستر کردو' پالیسی کے تحت جو، جنوبی ریاستوں کے خلاف اپنائی گئی تھی، جنوبی ریاستوں میں چرچ، زرعی فارم، سکول، لائبریریز اور ہسپتال اس پالیسی کے تحت جلا کر خاکستر کردیے گئے۔ چار اپریل 1865ء کی صبح وفاقی دستے الباما یونیورسٹی لائبریری کو خاکستر کر دینے کے احکامات کے ساتھ کیمپس پہنچ گئے۔ لسانیات کے پروفیسر اور لائبریری کے نگران آندرے ڈلوفرے نے کمانڈنگ آفیسر سے امریکہ کی اس اعلیٰ ترین لائبریری کو بچالینے کی اپیل کی۔

کمانڈنگ آفیسر نے ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنرل کروکٹسن سے لائبریری کو نذر آتش نہ کرنے کی اجازت مانگی لیکن جنرل کروکٹسن نے لائبریری کو نذر آتش کرنے کے احکامات پر نظر ثانی کرنے سے انکار کردیا کمانڈنگ آفیسر نے اس واقعے کی یادگار کے طور پر آندرے ڈلوفرے کو لائبریری کی لاکھوں کتابوں میں سے کوئی ایک جلد بچالینے کی پیشکش کی۔ جس جلد کو آتشزدگی سے بچالینے کے لیے منتخب کیا گیا وہ قرآن شریف کا ایک نسخہ تھا۔" 49۔(فرید نعمان: 1992)

لیکن وہ گئے کہاں؟

مورخین و محققین اس سوال کا جواب مختلف طرح سے دینے کی کوشش تو ضرور کرتے ہیں لیکن کسی بھی جواب کو حتمی نہیں کہا جا سکتا ہمارے خیال اور کھوج کے مطابق درج ذیل پانچ عناصر امریکہ میں مسلمانوں کے ناپید ہو جانے کا سبب بنے۔

1۔ بپتسما عیسائیت

2۔ امریکی خانہ جنگی (1861-1865) میں مسلم اموات

3۔ سماجی دھارے میں شمولیت کا دباؤ

4۔ خاندانی اکائی کی تقسیم وریخت

5۔ امریکہ میں مولویت کے ادارے کا عدم وجود

بپتسما عیسائیت کا جبر امریکہ کی ماں' ملکہ ازابیلا کے ہاتھوں اندلس کی طرح امریکہ کی زمین بھی سنگلاخ کر گیا۔ مسلمان نسبتاً دوسرے مذاہب کے افراد سے تعداد میں کہیں زیادہ کم ہونے کی وجہ سے امریکی بپتسما کا آسان شکار ثابت ہوئے۔ سفید فام امریکی (شمالی و جنوبی) افواج کی قیادت نے عیاری سے امریکی خانہ جنگی کے پانچ سالوں میں غیر سفید فاموں کو جن میں ریڈ انڈینز' سیاہ فام اور افریقی مسلمان شامل تھے' ہراول دستوں میں شامل کر کے اگلی صفوں میں بے دردی سے قتل کروا دیا۔ سو وہ اپنی آبادی کے تناسب سے سفید فاموں کی نسبت کہیں زیادہ مارے گئے۔ مسلمان چونکہ پہلے ہی آبادی کا قلیل ترین اور سب سے چھوٹا عنصر تھے نتیجتاً امریکی خانہ جنگی کے اختتام پر وہ نابود ہوگئے۔ مر جانے والے مسلمانوں کے اہل خانہ کو اس سے بھی بڑی ابتری کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ تقسیم کر دیے گئے۔ بیٹی' نیو یارک میں نیلام کی گئی اور ماں

میری لینڈ میں، بھائی اری زونا میں بکا اور بہوبالٹی مور میں، اس خاندانی ریخت کے رونما ہوتے ہی بچے کھچے کم عمر مسلمان سماجی دھارے میں شمولیت کے دباؤ کا شکار ہو گئے۔ اپنے مذہب پر قائم رہنے کے لیے ان کے پاس نہ کوئی مدرسہ تھا نہ مسجد، نہ کوئی قرآن تھا، نہ قرآن پڑھانے والا، نہ کوئی موذن تھا، نہ اذان دینے والا، کوئی مبلغ تھا، نہ تبلیغ کرنے والا کوئی مولوی تھا نہ خوف دلانے والا۔ یوں خانہ جنگی کے خاتمے پر شروع ہونے والی خانماں بربادی کے محض 10 سالوں میں لگ بھگ 1875 کے، امریکہ میں سجدہ گزاروں کا نام و نشان مٹ گیا۔ افریقی مسلمان مذہبی استقامت میں اندلسی مسلمانوں سے کہیں کمتر نکلے۔ وہ نسبتاً عیسائی بپتسما کا آسانی سے شکار ہو گئے۔ امریکہ میں مولویت کی عدم موجودگی بھی اس کا سبب رہی ہو گی لیکن ان کی آزمائش بھی کچھ کم کڑی نہیں تھی۔

امریکی زمین کی وسعت، انسانی برابری کا دعویٰ، آئینی جمہوریت اور انسانی حقوق ان مٹھی بھر افتادگان کو بھی پناہ نہ دے سکے کہ جن کا نام امریکی تعمیر، معیشت، معاشرت، دفاع اور ادب میں محترم ہے۔ امریکی مؤرخ، دانشور اور محقق اپنے ضمیر کی آنکھ میں 'وہ کہاں گئے' کا، کانٹا چبھے ہونے کے باوجود افریقی مسلمانوں کے بارے میں عمومی امریکی پالیسی کی بے حسی سے متاثر ہو کر اپنی غیر جانبداری قائم نہیں رکھ سکے۔ سلویانا ڈیوف لکھتی ہیں:

> ''امریکی سکالرز نے غلامی کی تاریخ، افریقی ثقافت اور ان کے مذہبی بقا کے موضوع اور تحقیق میں ساری دنیا سے زیادہ کام کیا ہے لیکن اس مطالعے میں مسلمانوں کے تذکرے کی عدم موجودگی واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ غلاموں کی تجارت اور غلامی کے موضوع پر قابل ذکر مطالعے میں اسلام اور مسلمانوں کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ افریقی ثقافت اور مذہب کے تذکرے میں مسلمانوں کی کہانی، ان کی موجودگی، ان کے کردار اور حصے کو یکسر فراموش کر دیا گیا ہے۔'' 50۔ (سلویانا ڈیوف: 1998)

یوں وقت کے جبر نے افریقی مسلمانوں کا نام تو امریکی تاریخ کے صفحات سے قلم زد کر دیا مگر امریکی زمین میں ان کی قبریں بے نشان ہونے کے باوجود ان کے ہونے کی شہادت دیتی ہیں۔

وَلا غَالب اِلاّ اللّٰه   وَلا غَالب اِلاّ اللّٰه

* * *

ان لوگوں کی زبانوں سے تو دشمنی ظاہر ہو ہی چکی ہے اور جو کینے ان کے سینوں میں مخفی ہیں وہ کہیں زیادہ ہیں۔

(سورۃ آلِ عمران)

منتظرِ تیغِ جفا......

انسانی تاریخ اپنی تاریخ کے اس مقام پر آن پہنچی ہے جہاں اسے دوبارہ لکھے جانے کا مرحلہ درپیش ہے۔ معیار، مثال، علامت اور استعارہ بدل چکا ہے۔ چنگیز خان کی منگول فتوحات میں 34 ملین افراد تہ تیغ ہوئے تھے جبکہ ہلاکو خان کی خون آشامی 4 ملین کے سر لے گئی تھی۔ امیر تیمور گورگان کی گردن پر 14 ملین افراد کا بار ہے جبکہ نازی جرمنی کے ایڈولف ہٹلر پر 21 ملین کے قتل کی ذمہ داری عائد ہے۔ اگر یہ قاتلین انسانیت جو مجموعی طور پر 73 ملین افراد کے قتل پر ظلم و بربریت کا استعارہ بنے ہوئے ہیں تو سو ملین ریڈ انڈینیز، 60 ملین افریقی، 10 ملین ویت نامی، دو ملین افغانی اور ایک ملین عراقیوں کے قاتل کو کیا کہا جائے گا؟

دنیا بھر کے دانشور، مفکر اور اہل قلم اس اُدھیڑ بُن میں مبتلا ہیں کہ خون آشامی کے معیار بدلیں کہ بربریت کی مثالیں، انسانی قتل کی نئی شرح لکھیں یا قتل آمادہ جمہوریت کی توصیف بیان کریں۔ امریکی جنگی قوت کو انسانی قتل کے استعارہ کے طور پر استعمال کیا جائے یا اسے جنگل کے قانون کی طرف مراجعت کی مجبوری سمجھا جائے۔ دنیا کی مہلک ترین جنگی مشینری پر دسترس ہونا، عالمی قیادت کے لئے مطلوبہ تقاضا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ واحد سپر پاور ہونے کے ناطے سے عالمی قیادت کے لئے امریکہ کے اخلاقی افعال اس کی راہ میں سب سے بڑی روکاوٹ ہیں۔ عالمی قیادت کے لئے جس کڑے اخلاقی ضابطے پر پورا اترنا ضروری ہے امریکہ اسی سے محروم ہے۔

امریکہ کے اعلان آزادی (1776) سے 2005ء تک امریکی مسلح افواج 220 مرتبہ اقوام عالم کے خلاف جارحیت کی مرتکب ہو چکی ہیں۔ ان دو سو تیس سالوں میں، دو سو بیس مرتبہ

جارحیت کے ارتکاب کی یہ شرح کسی بھی ملک کی شرح جارحیت سے کئی گناہ زیادہ اور بیشتر صورتوں میں کئی سو گناہ زیادہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے امریکہ تئیس ملکوں پر بمباری کا مرتکب ہو چکا ہے، ان ممالک میں چین (دو مرتبہ) گوئٹے مالا (تین مرتبہ) کوریا، انڈونیشیا، کیوبا، کانگو، پیرو، سوڈان، افغانستان لاؤس، ویت نام، کمبوڈیا، گرینیڈا، لبنان، لیبیا، السالویڈور، نکارا گوا، پاناما، عراق، (دو مرتبہ) اور یوگوسلاویہ شامل ہیں۔

عالمی دانشوروں کے اٹھائے گئے سوال کا جواب دیا جانا ضروری ہے۔ ان کا اٹھایا گیا سوال جس قدر دو ٹوک، سادہ اور منطقی ہے، اس کا جواب اسی قدر مبہم، پیچیدہ اور غیر واضح ہے۔ وہ اپنے سوال میں پوچھتے ہیں کہ کیا کسی ایسی مہلک جنگی مشینری کو عالمی قیادت کے منصب پر فائز کیا جا سکتا ہے جو دنیا کی دو تہائی آبادی کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کر چکی ہو۔ جس کی گردن پر پہلے جوہری بم کے استعمال سے چشم زدن میں ڈیڑھ لاکھ افراد کو قتل کر دینے سے عراق کی ابو غریب جیل تک غیر انسانی افعال کا بار ہو۔ انسانی ضمیر اس سوال کا جواب ڈھونڈتا ہے کہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں دی گئی یکساں انسانی حقوق کی ضمانت کے باوجود فلسطینیوں کے انسانی حقوق، اسرائیلیوں کے حقوق سے کمتر کیوں ہیں؟ کویت، قطر، مصر، سعودی عرب، پاکستان، اردن اور دوسرے اسلامی ممالک میں جمہوریت اسی قدر ضروری کیوں نہیں ہے جتنی کہ اس کی ضرورت عراق میں سمجھی جا رہی ہے۔ مسئلہ کشمیر کو عالمی جمہوری اصول کے تحت کیوں حل نہیں کیا جا سکتا؟

ان سوالوں کا کوئی بھی امریکی جواب انسانی ضمیر، دانش، اصول، منطق اور معیار پر پورا نہیں اترتا۔ اس سوال کے جواب میں پاکستانی حکومت کے غیر نمائندہ، دم بخود، دباؤ اور "دلیس سر" کے رٹے ہوئے جواب کو جانے دیجئے لیکن انصاف کی آنکھ نظریہ حفظ ماتقدم کو بہ نظر دگر دیکھتی ہے۔ وہ اس نظریے کو جنگل کے سیدھے سادھے قانون سے تعبیر کرتی ہے جس میں، جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا غیر جمہوری، غیر انسانی اور غیر روشن خیال فارمولا کارفرما ہے۔ اس نظریہ حفظ ماتقدم کے پروان (خدانخواستہ) چڑھنے سے پچھلے ایک ہزار سال کے انسانی شعور کا جمہوری ارتقاء، علم و عرفان، بنیادی انسانی حقوق، جمہوری اٹھکیلیاں اور عورتوں کی دوڑ بمعہ بھاگ دوڑ سب کچھ زیاں کی زد میں ہے۔ نظریہ حفظ ماتقدم میں اگر کسی کو تحفظ ہے تو وہ امریکی حلیفوں کو ہے، ان فطری حلیفوں میں اسرائیل، برطانیہ، بھارت اور مسلم امہ کے حکمران و شیوخ تو شامل ہیں لیکن ان میں تیسری دنیا، اسلامی دنیا اور ضمیر کی آواز شامل نہیں ہے (ضمیر کی اس آواز کو پاکستان اسمبلی

کے نمائندگان کی ضمیر کی آواز سے مختلف سمجھا جائے)۔

تاریخ کہتی ہے کہ ہمارے حکمران ہمیں جن کے ساتھ جوڑنے کی کوشش میں مصروف ہیں وہ فاتحین اندلس مسلمانوں کے لئے ایک اور سقوط کا باعث تو ہو سکتے ہیں لیکن ہمارے تحفظ کی ضمانت نہیں ہو سکتے۔ امریکہ مسلمانوں کے لئے سورۃ التکویر کی عملی تفسیر اور سورۃ الرعد کا تسلسل تو ہو سکتا ہے مگر سورۃ النصر کی نوید نہیں ہو سکتا چونکہ امریکی سرشت' سائیکی' خمیر اور اجزائے ترکیبی میں اسلام دشمنی اہم ترین جزو کی حیثیت سے پانچ صدیوں سے شامل ہے۔

عالمی دانشوروں کا سوال ہنوز تشنہ جواب ہے' وہ بجا طور پر پوچھتے ہیں کہ اگر امریکہ عالمی قیادت کے منصب پر فائز اور اس کا اہل ہے تو اس کے ماننے والے کہاں ہیں؟ جبکہ حقائق یہ ہیں کہ امریکہ بہ مقابلہ اقوام عالم صف آراء تو ضرور ہے مگر اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کی قرارد دادیں اس کا واضح ثبوت ہیں کہ حق و انصاف کے ہر معرکے میں امریکہ' اقوام عالم کے خلاف مزاحم تو رہا ہے مگر اس کے ساتھ نہیں رہا۔ 1978 سے 1987ء کے ایک عشرے میں اقوام متحدہ کی ستر قراردادوں میں اوسطاً 134 ممالک کے خلاف واحد مزاحمتی ووٹ امریکہ نے دیا ہے جبکہ 42 قرادادوں میں سے 40 مرتبہ یہ ایک اور ملک اسرائیل تھا جبکہ باقی دو قرار دادوں میں برطانیہ اور کینیڈا یہ اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ ان مذکورہ 134 قراردادوں کی اکثریت مسئلہ فلسطین' انسانی حقوق' ماحولیات اور عالمی انصاف کے ضابطوں پر مشتمل تھی اس امریکی مخالفت کی زد تیسری دنیا پر پڑی اور اس کا شکار بالعموم مسلمان ہی ہوئے۔

یوں تو ہنکائی جانے والی بھیڑیں کیا اور ان کا ساتھ کیا لیکن تاریخ کا احترام نہ کرنے والے بھی محترم نہیں رہتے' اس سوال کا جواب دیا جانا چاہیے کہ روشن خیالی کی اس بھگدڑ میں ہم جن کے لئے ہلکان ہو رہے ہیں کیا وہ کبھی بھی ہمارے ساتھ تھے' ہیں'......یا ہو سکتے ہیں؟

ہمارا مرنا تو دونوں طرح سے ہے۔

ہم جن کے ساتھ ہیں' وہ اس ساتھ کی قیمت لگائے بیٹھے ہیں اور اس ساتھ میں ہم جن کے خلاف ہو گئے ہیں وہ اس مخالفت کا معاوضہ مانگ رہے ہیں۔ تاریخ کہتی ہے کہ ہمیں ہر دونوں کو یہ ادائیگی عندلطلب سروں کی جنس میں کرنی ہوگی۔ فصلِ سر کٹے گی تو یہ ادا ہوگی۔

جو بات سرِ وادی سینا میں دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی دُعا سے شروع ہوئی تھی سرِ وادی سینا ہی اسے جھٹک دینے کی شدید ضرورت تک آن پہنچی۔ 28 جولائی 2006ء سے 6 اگست

2006 تک وادی بکّہ (لبنان) میں دو سو معصوم بچے اور قریب اتنی ہی بے گناہ خواتین ایف16 طیاروں کی اسرائیلی بمباری سے شہید کی جاچکی ہیں جب کہ انہی ایف16 طیاروں کے استعمال پر حلیف ہراول مگر منتظرین تیغ جفا پر یہ شرط عائد کردی گئی ہے کہ ان طیاروں کو جارحانہ مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

آج کے دِن نہ پوچھو میرے دوستو
زخم کتنے ابھی بختِ بسمل میں ہیں
دشت کتنے ابھی راہِ منزل میں ہیں
تیر کتنے ابھی دستِ قاتل میں ہیں

(سرِ وادی سینا)

* * *

حوالہ جات

سحر سے نوحہ گری رہی

1. Washington, Irving. (1850). A Chronicle of Conquest of Granada. New York: The Co-Operative Publication Society, Inc.

2. Columbus, Christopher. (1492). Journal of First Voyage to America. New York: Albert & Charles Boni, 1924

3. Our Country: American History Chronicles, Vol.1. (1800's). "Christopher Columbus in Spain."

4. Pope Nicholas V. (1455). Bull Romanus Pontifex. January 8, 1455. National Archives Lisbon, de Bullas: maco 7, no.29

5. Thacher, Boyd John. (1903). Christopher Columbus Vol. II. New York: G.P. Putman's Sons

6. Pope Alexander VI. (1493). Papa Bull Inter Caetera, May 4,1493

7. Ibid.

8. Koning, Hans. (1993). "The Conquest of American: How the Indians Nations Lost their Continent", Monthly Review Press. New York

9. Navarro, Mireya. (1999). The New York Times, March 7, 1999. New York

10. Casas, Bartolomo de las. (1552). The Devastation of the Indies: A Brief Account (translated by Herma Briffault). Baltimore, Maryland: John Hopkins University Press, 1992

11. Rubios, Juan Lopez de Palacios. (1513). The Requirement (translated by Arthur Helps). The Spanish Conquest in America, Vol. I. London: John Lane, 1900

12. Armstrong, Karen. (1992). Holy War: The Crusaders and Their Impact on Today's World, London: Macmillan

یا اللہ لگا نہ ہو

1. Washington, Irving. (1850). A Chronicle of the Conquest of Granada, New York: The Co-Operative Publication Society, Inc.

2. Zurita, Jeronimo. (1562). Annels de la Corona del Aragon. (translated by Angel C. Lopez). 1967

3. Roberts, Les. (2004).100,000 Excess Iraqi Deaths Since War. London: Reuters

4. Simancas Archive (Valladolid). Spain. Document 207ES. 47161. AGS/REAL-II

5. Mariana, de Juan. (1592). Historiae de rebus Hispaniae: A History of Spain from its earliest times.

6. Salik, Siddiq. (1977). Witness to Surrender. Karachi: Oxford University Press.

7. Ibid.

8. Bangla Desh Liberation War Museum: Bangla Desh Papers. 1971

9. Ibid. Mariana

10. Ibid. Salik

11. Shaw, George Bernard. (1901). Three Plays for Puritans. Sherman Oaks, CA: B&L. Rootenberg Rare Books

12. Ullah, Jaffpr A. H. (2004). On General Niazi's Departure to the Other World. Pakistan Today: Los Angeles. February 6, 2004

13. Niazi, Ajmal Mohammed. (2005). Nawai Waqt, Lahore. December 30, 2005

14. Simancas Archive (Valladolid). Spain. Document 12RSO:2

15. Quiroga, Gaspar de. Papal Documents: Granada Archive, Spain

16. King Philip 3rd. (Royal Papers). King's Documents. Madrid

Archive .Madrid, Spain

17. Lapeyre, Henry. (1986).Geografia de la Espana Morisca, Valencia

18. Brownlee. C.W. (1834). Letters in Roman Catholic Controversy. New York: New York Press

19. Ibid. (1836). Popery the Enemy of Civil and Religious Liberty

20. Elahi, Manzoor Sheikh. (1996) Nairang-e-Andalus, Lahore: Sang-e-Meel Publications

21. Blair, David. (2003). Thieves of Baghdad rob Museums of Priceless Treasure, Telegraph, London: April 14,2003

22. Baez, Fernando.(2004). Biggest Cultural Disaster Since 1258, Caracar, (IPS). February 15, 2004

23. Dawn Editorial. Second Sack of Baghdad, Karachi: April 19, 2003

24. Curtis, John. 8,000 Artifacts Stolen from Iraq Museum Untraced. British Museum: London, May 23, 2005

دستاویزات رستاخیز

1. Alfonse x the Learned, King of Castile. (1955). Primera Cronica General de Espana, Vol.2. Madrid

2. Barcelona Archives Corona de Aragon. Document number 23, (manuscripts).

3. Makkari, Abul-Abbas Ahmad Ibn Mohammed. (1840). The Breath of Perfume from the Branch of Green Andalusia and Memorials of its Vizier Lisan ud-Din ibn ul-Khattb. Translated by P de Gayangos, London

4. Archive of the House of Zafra, Legal Folder: A.

5. Ibid. Folder: C, File number 41. Document number 7

6. Simancas Archive (Valladolid). Document number LXXXVIII

7. Ibid. Zafra, Folder A. Document number 7

8. Archive of Marques de Corvera. Original manuscript number CCC1XJX

9. Ibid.CCCX1X

10. Ibid. Zafra, Folder D. Document 10

11. Ibid. Folder F. Document 9

12. Ibid. Folder C, File 7. Document 17

13. Ibid. Folder C, File 43. Document 7

14. Ibid. Folder C, File 3 vuelto. Document 7

15. Ibid. Folder C, File 3. Document

16. Ibid. Folder C, File 11, vuelto

17. Ibid. Folder C, File 41. Document 7

18. Ibid. Folder C, File 42,

19. Simancas Archive (Valladolid). Capitulaciones con Moros Y caballeros de Cartilla. July7, 1548

20. Ibid. Zafra, Folder C, File number 4. Document 5

21. Ibid. Folder E. Document 5

22. Ibid. Folder C5. Document 5

23. Ibid.Folder C, File 26. Document 7

24. Ibid. Folder C, File 28 Document N7

25. Ibid. Folder C, File 40. Document 7. (scratched, corrected and rewritten version)

26. Ibid Folder B. Document 15

27. Ibid. Folder C, File 19. Document 7

مہر بر محضر

1. Adler, Joseph. (1962). Political, Social, and Economic Theories of a Realist. The Herzl Paradox: New York: Hadrian Press

2. Yitzhak, Baer. (1961). A History of Jews in Christian Spain, Vol. 2. Philadelphia: The Jewish Publication Society of America

3. Amber, Francis J. (1991). Christopher Columbus's Jewish Roots. Northval, New Jersey: Jason Aronson, Inc.

4. Minking, Jackob S. (1938). Abrabanel and the Expulsion of the Jews from Spain. New York: New York Berman's Jewish Book House

5. Thatcher, Boyd John. (1903). Christopher Columbus, His Life, His Work, His Remains. Vol.1. New York: GP Putman's Sons

6. Wiesenthal, Simon. (1973). Sails of Hope: The Secret Mission of Columbus. New York: Macmillan Publishing Company

جوع الارض وجاه

1. Harrisse, Henry. (1872). Bibliotheca Amerieana Vetustissima: A Description of Works Relating to America Published between the Years 1492-1551, Paris: Tross

2. Columbus, Christopher. (1492). Journal of First Voyage to America, New York: Albert & Charles Boni, 1924

3. The Gospel of Redman. (1937). Compiled by Ernest Thompson Seton and Julia M. Seton, London: Methuen

4. Lopez, Barry. (1990). The Rediscovery of North America. Lexington, Kentucky: University Press of Kentucky

5. Kneib, Martha. (2003). Christopher Columbus: Master Italian Navigator in the Court of Spain, New York: Rosen Publishing Group, Inc.

6. Rivet, Paul. (1924). "Langues Americaines", Antoine Meillet and Marcel Cohen, eds., Les Langues du monde, Vol. 16. Paris: Societe de Linguistique de Paris

7. Sapper, Karl. (1924). Proceedings of the Twenty First International Congress of Americanistas, First Part, Leiden: E., J. Brill

8. Spinden, H.J. (1928). "The Population of Ancient American", The Geographical Review 28

9. Steward, Julian H. (1945). "The Changing American Indian", Ralph Linton. ed., The Science of Man in the World Crises, New York: Columbia University Press

10. Borah, Woodrow. (1964). "America as Model: The Demographic Impact of European Expansion upon the Non-European World", Acts Y Memorias, Vol. 3, XXXV Congresso Intgernacional de Americanistas, Mexico, 1962. Mexico, D.F.: Editorial Libros de Mexico.

11. Dobyns, Henry F., and R.C. Euler. (1967). The Ghost Dance of

1889 Among the Pai Indians of Northwestern Arizona, Prescott, A2: Prescott College Press

12. Standard, David E. (1992). American Holocaust: The Conquest of the New World, Oxford: Oxford University Press

13. Ibid. Dobyns

14. Durand. John D. (1977) "Historical Estimates of World Population: An Evaluation", Population and Development Review 3

15. Population Reference Bureau (2004)I World Population Data Sheet, 2004: Washington, D.C.

16. Zinn, Howard, (1980). A People's History of the United States, New York: Harper Collins Publishers Inc.

17. Casas, Bartolomo de las. (1552). The Devastation of the Indies A Brief Account (translated by Herma Briffault). Baltimore, Maryland: John Hopkins University Press, 1992

18. North, Douglas C. (1966). The Economic Growth of the United States, 1790 - 1860, New York: W.W. Norton & Co. Inc.

19. Sombart, Warner. (1906). Why Is There No Socialism in the United States? Translated by Patricia M. Hocking and C.T. Husbands, White Plains, NY: M.E. Sharpe, 1976

20. Parker, William N. (1980). "Historiography of American Economic History", Studies of the Principal Movements and Ideas, New York: Scribner's

21. Marx, Carl. (1844). Karl Marx Works: Economic and Philosophic Manuscript of 1844, Moscow: Progress Publishers,1959

22. Luxemburg, Rosa. (1913). The Accumulation of Capital, London: Routledge and Kegan Paul Ltd., 1951

23. Brave Bird, Mary and Richard Erdoes. (1990). Lakota Women. New York: G. Weidenfeld

24. U.S. Census Bureau Record. (1790 - 2000). U.S. Population, Land Area and Density Record

الامان الحفیظ

1. Elahi, Manzoor Sheikh. (1996). Nairang-e-Andalus, Lahore: Sang-e-Meel Publications

2. Heaton, Vernon. (1980). The Mayflower, Exeter, Devon, England: We & Bower (Publishers) Limited

صف مشق ستم

1. American Indian Grand Governing Council. (1927). Minneapolis, MN

2. Harvard University. (2004). Guide to Treaties and International Agreements, Cambridge: College of Law, Indian Legal Program

3. Loewen, James W. (1995). Lies My Teacher Told Me: Everything Your American History Textbook got Wrong, New York: New Press

4. Kay, Smith L. (1975). From Hopewell to New Echota: Cherokee Treaties with the United States Government, 1785-1835

5. The Indian Removal Act (1830) U.S. Congressional Documents and Debates 1774-1875. Washington, D.C.

6. Jackson, Andrew. (1820's). Special Collections: Andrew Jackson Papers: University Archives.

7. Washington, George. (1790). George Washington Papers: Manuscript Division. December 29, 1790. Library of Congress: Washington, D.C.

8. Logan, Charles Russell. (1955). The Promised Land: The Cherokees, Arkansas, and Removal, 1794-1839 Little Rock, AR: The Arkansas Historic Preservation Program

9. Kirst, Sean. (1991). A Claim for Land and Justice, Syracuse Post Standard, May 22, 1991. Syracuse, NY: New York

10. Drinnon, Richard. (1992). Facing West: The Metaphysics of Indian - Hating & Empire Building, Norman, OK: University of Oklahoma Press

11. Stannard, David E. (1992). American Holocaust: The conquest of

the New World. Oxford: Oxford University Press

12. Seale, Doris and Slaping, Beverly. (1998). Through Indian Eyes. Berkeley: University of California

13. Jennings, Francis. (1990). Empire of Fortune: Crown, Colonies, and Tribes in the Seven Years War in America. New York: W.W. Norton & Co.

14. Regan, Edward. (2000). No Thanks: Another View of Colonists and Indian, Associated Press article, November 22, 2000.

15. Jones, Landon Y. (2000). The Essential Lewis and Clark. New York: Harper Collins Publishers Inc.,

16. Kirsch, Jonathan. (2004) Review of William Clark and the Shaping of the West. Los Angeles Times, June 6, 2004

17. Rider, David P. (2001). "Indians" and Animals: A Comparative Essay, Xavier University Louisiana

18. Ibid. Stannard

19. Takaki, Ronald T. (1994). The Metaphysics of Civilization: Indians and the age of Jackson, New York: Oxford University Press

20. Paul, Daniel N. (1998). We were not the Savages: First Nation History. Nova Scotia: Indian Brook Reserve

21. Johnson, Andrew. (1867). Message to Congress. 1867

22. Melville, Herman. (1857). The Confidence Man: His Masquerade. New York: Dix & Edwards

23. Ibid. The Writings of Herman Melville, Vol. 4, eds. Harrison Hayford, (1969).

24. Marx, Carl. (1857). The Indian Question. New York Daily Tribune, August 14, 1857

25. Greeley, Horace. (1859). An Overland Journey from New York to San Francisco in the Summer of 1859. New York: New York Daily Tribune

26. Ibid.

27. Thompson, Jerry Don. (1971). Colonel John Robert Baylor, Hillsboro, TX: Hill Junior College Press

28. American Cultural Roots. (2001). A Shining City on a Hill: What American Believe. Peace Party Publisher

29. Beck, Warren A. (1962). New Mexico: A History of Four Centuries, Norman, OK: University of Oklahoma Press

30. U.S. Supreme Court. (1823). Johnson V. M'Intosh, 21 U.S. 543, 5L.Ed.681, 543 (1823). March 10, 1823

31. Ibid. Marshall

32. History of Italian Law. C. Calisse, translated by L.B. Register. Boston: Little Brown, 1928 (legal history series, no. 8)

اے روزگار کیوں تیری گردش نہ تھم گئی

1. Casas, Bartolomo de las. (1552). The Devastation of the Indies: A Brief Account (translated by Herma Briffault). Baltimore, Maryland: John Hopkins University Press, 1992

2. Lopez, Barry. (1990. The Rediscovery of North America, Lexington, Kentucky: University Press of Kentucky

3. Ibid. Lopez

4. Ibid. Lopez

سر جادہ گریہ

1. Underwood Thomas, B. (1961). Story of the Cherokee People, Cherokee NC: Cherokee Publications

2. Dunaway Wilma, A,. (1995). Speculators and Settler Capitalists: Unthinking the Mythology about Appalachian Landholding, 1790-1860. Chapel Hills: University of North Carolina Press

3. Harris, Barbara. (2003) Black Indians and Freedmen of the Five Civilized Tribes, Jackson MI: Jackson Advocate News Service

4. Marshall, John. (1831). Cherokee Nation V. the State of Georgia., 30 U.S.1 (Pet.): United States Supreme Court

5. Ehle, John. (1925). Trail of Tears: The Rise and Fall of the Cherokee Nation, New York: Anchor Books, Random House Inc.

6. George Don, Chief. (1974). My Heart Soars: The Best of Chief Don George, Saanichton, B.C. Hancock House Publishers

7. Underwood Thomas, B. (1956). Cherokee Legends and the Trail of Tears: John Burnett's famous diary account of Trail of Tears, Tennessee: Book Publishing Company

فریب کاری شب

1. Andress, David. (2005). The Terror: Civil War in the French Revolution, London: Little Brown

2. Robespierre, Maximilien. (1997). Justification of the use of Terror, Modern History Sourcebook

3. Quoted in Documentary History of Liberal Ideas. (1880). London: Independent Press

4. Lenin, V.I. (1946). Left Wing Communism: An Infaxtile Disorder, Selected Works, Volume 10, London: UK

5. Laqueur, Walter. (1999). The New Terrorism: Fanaticism and the Arms of Mass destruction. New York: Oxford University Press

6. Hoffman, Bruce. (1988). Inside Terrorism, New York: Columbia University Press

7. Encyclopedia Wikipedia. (2005).

8. Musaji, Sheila. (2005) Through the Looking Glass, Mediamonitor

9. U.S. Department of State. (2005). Significant Terrorist Incidents 1961-2003: A Brief Chronology. Office of the Historian, Bureau of Public Affairs

10. Center for Defense and International Security Studies. (2005). Terrorism 1970-1979

11. Emergency and Disaster Management. (2005). Los Angeles, CA

12. Musaji, Sheila. (2005). Through the Looking Glass, Mediamonitor

حال بد حال

1. Appleby, Andrew B. (1980). The Disappearance of Plague: A continuing Puzzle, The Economic History Review, 2nd Series, 33

2. Elliot, H.J. (1964). Imperial Spain, 1469-1716, New York: St. Martin's Press

3. Stone, Lawrence. (1977). The Family, Sex and Marriage in England, 1500-1800. New York: Harper & Row

4. Quoted in Jacques Boulangor, The Seventeenth Century in France, New York: Capricorn Books

5. Stannard, David E. (1992). American Holocaust: The Conquest of the New World. New York: Oxford University Press

6. Boswell, John. (1988). The kindness of Strangers: The Abandonment of Children in Western Europe from Late Antiquity to the Renaissance, New York: Pantheon Books

7. Pagden, Anthony. (1986). The Fall of Natural Man: the American Indian and the Origins of Comparative Ethnology, Cambridge: Cambridge University Press

8. Senarega, Bartholomew. (1514). Du Rubus Genuensibus, 1388-1514

9. Ibid., Senarega

10. Barq, Ghulam Jilani. (1977). یورپ پر اسلام کے احسانات , Lahore: Sheikh Ghulam Ali

11. Korejah, Tahir Mahmood. (1995). نوادرات , Lahore: Darul - Balag

12. Columbus's Letter to the Sovereigns on His First Voyage 15 February - 4 March, 1493, in Samuel Eliot Morision, ed., Journals and Other Documents on the life and Voyage of Christopher Columbus. New York: The Heritage Press

13. The Papers of Thomas Jefferson. (1950). Edited by Julian P. Boydetal. Princeton, NJ: Princeton University Press

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں

1. Blackburn, Robin. (1997). The Making of New World Slavery: From the Baroque to the Modern 1492-1800. New York: Guilford & King's Lynn, Biddles Ltd.

2. Inikori, Joseph & Engerman, Stanley L. (1986). African Slavery in Latin America and the Caribbean. New York: Oxford University Press

3. Facts and Observations on the African Slave Trade: Legislation of the United States on the Foreign Slave Trade. (1841). The Religious Society of Friends, New Jersey: Joseph & William Kite Printers. Philadelphia, PA

4. Pope Nicholas V. (1452). Bull Dum Diversas, June 18, 1452

5. Ibid. (1455). Bull Romanus Pontifex, January 8, 1455. National Archives Lisbon, de bullas: maco 7, no.29

6. Alcantara, Godoy J. (1868). Historia de los falsos cronicones, Madrid

7. Thomas, Hugh. (1977). The Slave Trade: 1440-1870. New York: Touchstone

8. Human Rights Watch World Report. (2000). New York: USA

9. The Papers of George Washington. (1786). University of Virginia, Charlottesville, VA: University of Virginia Press

10. Flaxner, James T. (1969). George Washington: Anguish and Farewell. Little Brown: Boston

11. Ibid.

12. Bigelow, John. (1885). Jefferson's Financial Diary. Harper's March 1885. V70

13. Brant, Irving. (1970). The Fourth President: A Life of James Madison. Indianapolis, IN: Bobbs Merril

14. Willis, Garry. (2003). Negro President: Jefferson and the Slave Power. New York: Houghton Mifflin Company

15. Polk, James K. (1910). The Diary of James K. Polk. Chicago: McClurg

16. Cole, Donald B. (1984). Martin Van Buren and the American Political System. Princeton, NJ: Princeton University Press

17.Cleaves, Freeman. (1939). Old Tippecanoe. Washington, NY: Kenninat Press

18. Ibid. Willis

19. Ibid. Willis

20. Hamilton, Holman. (1951). Zachary Taylor: Soldier in the White House

21. Thomas, Lately. (1968). The First President Johnson. New York: William Morrow and Company

22. Simon, John Y. (1967). The Papers of Ulysses S. Grant. Carbondale, IL: Southern Illinois University Press

23. Jefferson, Thomas. (1776). The Declaration of Independence.

24. U.S. Census Bureau. (1970) Population Division, Washington, D.C.

25. Ibid. (1970)

26. Ibid. Willis

27. Davis B. David. (1969). The Problems of Slavery in Western Culture. Ithaca, NY: Cornell University Press

28. Virginia Historical History. (1957). Jamestown Exposition Celebrates 350th Anniversary. Richmond, VA

29. Callender James T. (1802). "The President Again," Richmond Recorder, September1, 1802

30. The Economist, November 7th - 13th, 1998. London

31. James, Marquis. (1937). Portrait of a President. Indianapolis:

Bobbs Merill

32. Ibid.

33. Tyler, Lyon G. (1884). The Letter and Times of the Tyler. Richmond, VA: Whittet and Shepperson

34. Conn, Peter. (1996). Pearl S. Buck: A cultural Biography. Cambridge, UK: Cambridge University Press

35. Basler, Roy P. (1865). The Collected Works of Abraham Lincoln, Vol II. "House Divided Speech". June 16, 1858

36. Ibid. (1865). Volume VIII, "Speech to one Hundred Fortieth Indiana Regiment." March 17, 1865

37. Pilgrim, David. (2000). What was Jim Crow, Big Rapids, MI: Ferris State University

38. Kennedy,. Stetson. (1959). Jim Crow Guide: The Way It was. Boca Raton: Florida Atlantic University Press

39. National Historic Interpretive Staff. (1998). This list was derived from a large list Composed by the Martin Luther King, Jr., National Historic Interpretive Staff.

40. Zangrando, Robert L. (1979). Women's Campaign Against Lynching, The Oxford Companion to women's writing in the United States: Oxford University Press

41. The New York Times. (1935). "The Suspect, booked as Rubin Stacy", New York: The New York Times

42. Duster, A. (1970). Crusade For Justice: Autobiography of Ida B. Wells. Chicago: Chicago University Press

43. The Charleston Gazette. (1918). Editorial: Why do they Lynch Negroes, Anyhow?, Charleston: Virginia

44. Ibid.

45. Meeropol, Abel. (1939). "Strange Fruit", New Masses (Journal). London: New Masses Publications

46. Emery, M. & Emery, E. (1996). The Press and America: An Interpretive History of the Mass Media (8th ed.) Boston: Allyn and Bacon

47. Brundage, Fitzhugh W. (1993). Lynching in the New South: Georgia and Virginia, 1880-1930. Chicago: University of Illinois Press

48. Wells, Ida B. (1909). Epidemic of Lynching and Mob Murder in a Christian Nation. African American Intellectual Tradition: Oxford University Press

49. Raper, Arthur. (1933). The Tragedy of Lynching. Mineola, NY: Dover Publications Inc.,

50. Cutler, Jams E. (1905). Lynch Law: An Investigation into the History of Lynching in the United States. New York: Longmans Green

51. Robeson, Paul. (1946). Speech on Lynching. September 12, 1946. Madison Square Garden, New York

52. Wexler, Laura. (2003). Fire in a Canebrake: the Last Mass Lynching in America. New York: Scribner

وہ کون تھے، وہ کہاں گئے

1. Austin, Allen D. (1987). "Muhammed Ali bin Said: Travels on Five Continents", Contributions in Black Studies. Amherst, MA: Five College Black Studies

2. Rawley, James A. (1981). The Transatlantie Slave Trade, New York: W. W. Norton

3. Abarry, Abu S. and Asante, Molefik (1996). African Intellectual Heritage: A book of Sources. Philadelphia: Tample University

4. Austin, Allen D. (1984). African Muslims in Antellum America: A sourcebook, New York: Garland Publishing, Inc.

5. Palmer, Colin A. (1998). An Interpretive History of Black America, Volume 1: 1619-1865. New York: Harcourt Brace

6. Hugh, Thomas. (1999). The Slave Trade the Story of the Atlantic Slave Trade, 1440-1870, New York: Simon & Schuster

7. Barboza, Steven. (1994). American Jihad: Islam After Malcom X, Boston: Doubleday

8. Gomez, Michael. (1994). "Muslims in Early America," Journal of Southern History. Hanover, PA. The Southern Historical Association, Sheridan Press

9. Diouf, Sylviane A. (1998). Servants of Allah: African Muslims Enslaved in the Americas. New York: New York University Press

10. Ibid. Diouf

11. Baron, Roger. (1828). Keledor, histoire africaine, Paris: Nepveu

12. Ibid. Diouf

13. Said, Omar ben. (1831). Arabic Manuscript, Life of Omar Ben Said: Bladen, Carolina

14. Barry, Allen. (1998). "Owning Omar: After Buying the long-lost story of a Muslim Slave collector Derrick Beard turns Publicist, detective, and missionary" News & Opinion. Boston: The Boston Phoenix

15. Ibid. Austin

16. Chancery Clerk Office Record. (1788). Adams Country: Natchez. Mississippi

17. Alford, Terry. (1977). Prince Among Slaves, New York & London: Harcourt Brace Jovanovich

18. Rahaman, Abdul Ibrahima. (1828). Outline of his Life, New Haven: Yale University, John Trumbull Papers

19. Ibid. Austin

20. Ibid. Alford

21. U.S. Department of State (1827) Record. Microfilm copy. The National Archives and Record Service, Washington, D.C.

22. Ibid. National Archives and Record Service, Washington, D.C.

23. Ibid. U.S. Department of State

24. Adams Papers. (1827). John Quincy Adams Diary 37: 1825-1828. Boston: MA. Massachusetts Historical Society

25. Ibid. Alford

26. Ibid. Chancery Clerk Office Record (1828).

27. Swaim, William. (1828). "The Genius of Universal Emancipation", May 1828: Mount Pleasant, Ohio

28. Ibid. Adams Papers. (1828). 37: 1825-1828

29. Howell, C.B.R. (1829). "Richmond Religious Herald", February, 1829: Richmond, Virginia

30. Clay, Henry. (1829). U.S. Department of State (1829) Record. The National Archives and Record Service, Washington, D.C.

31. Ibid. Adams Papers. (1828). 37: 1825-1828

32. Ibid. U.S. Department of State. (1829).

33. Masudi, Abul Hasan Ali ibn al-Husayn. (943). Maruj adh - Dhahab wa Ma 'adin al - Jawahir.(مروج الذہب و معادن الجواہر). Arabic manuscript.

34. Kennedey, Brent. (1994). Islamic Horizon, November - December, 1994. Islamic Society of North America, Plainfield: Indiana

35. Vedder, J. Van Vechten. (1991). History of Greene County: New York 1651-1800, New York: Hope Farm Press

36. Beers, J. B . (1884). History of Greene Country, New York: with biographical Sketches of its prominent men, New York: J.B. Beers & Co

37. Ahari, Abdullah Muhammed Bektashi. (1995). Islam in America: Origins & Later Developments. Chicago: Magribine Press of Chicago

38. Amin, Abdul. (1835). African Repository, XI (July 1835). Washington, D.C.

39. Ibid. Austin (1984).

40. Muhammed, Amir. (1996). Muslims in America-1700's, Washington, D.C.: Collections & Stories of American Muslims

41. South Carolina Council Journal. (1753). Petition For Freedom. No.21, PT.1, South Carolina State Record

42. Savannah Georgia Gazette. (1769). November, 1769. Savannah, GE

43. Moniz, Marc J. (2005). George Washington's Unsung Heroes, Poway, CA.: American Revolution Publishing

44. Stevens, Michael E. (1981). Journals of the House of Representative: State Records of South Carolina, Columbia: South Carolina department of Archives and History, University of South Carolina Press

45. Hagy, James W. (1993). The Ummah Slowly Bled: Muslim Slaves, Abducted Moors, African Jews, Misnamed..., South Carolina Historical Society, Charleston, SC

46. Peale, Charles Willson. (1819). "Diary 1819", (Unpublished).

American Philosophical Society Library, Philadelphia, PA

47. Ibid. Austin. (1984).

48. Baquaqua, Mahommah G. (1854). Biography of Mahommah G. Baquaqua with a description of that part of the World, Detroit: G.E.O., E, Pomeroy & Co., Tribune Office

49. Numan, Fareed H. (1992). "American Muslim History: A Chronological Observation", American Muslim Council, Washington, D.C.

50. Ibid. Diouf